

ماہنامہ

پاک سوسائٹی

ڈاٹ کام مئی ۲۰۱۳

www.paksociety.com

ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

پوری دنیا سے سب سے سلیس
جسٹس والی شخصیت کا زندگی نامہ

15
پیر صاب
ادارہ

16
شہر خیال
مدیر اعلیٰ

24
عقل کل
ڈاکٹر ساجد امجد

53
غازی
ابن کبیر

67
دوا انگلیوں والے
زین مہدی

73
مہم ساز
مریم کے خان

پاکستان کے اس جانباز کے حوالہ
زیست جس کی مثال نہیں
مسلم صحافت کی کہی ان کی کہانیاں،
مسلم نگری کی باتیں، یادیں

سندھ کے اس گاؤں میں
دو تین انگلیوں والے بستے ہیں
دوران کار ایک شکاری کے تھے
پیش آنے والا عجیب واقعہ

ایک عجیب و غریب
مہم کی دلچسپ روداد
اچھے سفر نامے پڑھنے کے شوقینوں کے لیے
شگفتہ پیرائے میں ایک دلچسپ کہانی

91
فلمی افسانہ
علی سفیان آفاقی

113
خواب گاہ میں چیتا
اسلم فرخی

117
ترکی نامہ
علی سفیان آفاقی

143
مصنف
شکیل ادریس

147
حقیقی اسلام
صائمہ اقبال

161
سچا عشق
اسامہ عطاری

ایک مشہور و معروف مصنف
کے مختصر حالات زندگی

اس نے اپنے عمل سے 9/11 کے بعد
امریکیوں کو اسلام کی جانب متوجہ کیا

ایک ملکہ کے پیار
کی مختصر سی داستان

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح سے ذمہ داری نہیں اٹھاتا۔

وہ زندگی اور موت کے
درمیان پھنس گیا تھا

بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں
سے گندھی تہلکہ خیز داستان

وہ بولنے سے معذور تھتا
لیکن دل بھی رکھتا تھا

163
بازی گر
امجد رئیس

168
سراب
کاشف زبیر

212
گنگی محبت
منظر امام

227
صل علی
شیخ انیس

231
چراغ سے چراغ
میثم شازیہ

239
دشمن
راحیلہ شہزاد

درو کی برکت سے ناممکن
بھی ممکن بن سکتا ہے
اس نے جس پر کیا
مگر انوکھے انداز میں

وہ دونوں باپ بیٹی کون
تھے مقصد کیا تھا
گاڑی میں پیٹرول نہ بھرانے
کی غلطی انہیں لے ڈوبی

جو دوسروں کے لیے گڑھے کھودتا
ہے اس کا مقصد بھی گڑھا ہے!
اس کو ہنس کی چال
چلے تو انجام؟

257
آج کا جرم
ارسلان حمید

265
جھول
رشید

270
سفید ہالو
طارق ظفر

277
امانتا
محمد ایاز راہی

285
آپا میرج بولہ
عمیرہ

000
پاپے
قارئین / ادارہ

بھیڑی نے اے مقام
ماں کا احساس دلایا

نیت سچ ہو تو منزل خود
قدموں تلے آجاتی ہے

دنیا بھر سے مختلف موضوعات
پر معلومات انکشافاتی پاپے

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

مدیرہ اعلیٰ: عذرار رسول

مصورہ: شاہد حسین

شعبہ اشتہارات

نمبر اشتہارات: محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی: محمود خان 0333-2168391

رانا محمد سعید 0323-2895528

نمایندہ لاہور: فروغی نازش 0300-4214400

♦♦♦♦♦

قیمت فی پرچہ: 60 روپے • زیر سالانہ 700 روپے

پبلشر و پریپر انٹر: عذرار رسول

مقام اشاعت: 63-C، فیز II ایکسٹینشن

دفتر کٹرل ایریٹن کورنگی روڈ

کراچی 75500

پرنٹر: جیل حسن

مطبوعہ: ابن جن پرنٹنگ پریس

ہالک اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قارئین کرام!
السلام علیکم!

کچھ ہی دنوں قبل کی بات ہے، اسلام آباد میں وفاقی سیکریٹری خزانہ کی صدارت میں وزارت کا ایک اہم اجلاس ہوا جس میں انکشاف کیا گیا کہ گزشتہ حکومت نے جاتے جاتے عوام کو شدید مالی بوجھ تلے دبا دیا ہے۔ گویا سرکاری طور پر اعتراف تھا کہ وطن عزیز کو شدید بحران میں چھوڑا گیا ہے۔ آئندہ چار ماہ کے دوران حکومت کو ملکی و غیر ملکی قرضوں پر صرف سود کی مد میں 9 کھرب ساٹھ ارب روپے کی ادائیگی کرنی ہے اور خزانے میں رقم موجود نہیں ہے۔ اگر بروقت ادائیگی نہ ہوئی اور روپے کی قیمت میں کمی آئی تو یہ سود گیارہ کھرب میں پہنچ جائے گا یعنی نگران حکومت کے سر پر تلوار لٹکا دی گئی ہے۔ یہ بات ہر ایک کے علم میں ہے کہ ہم فاسٹ میڈیا کے دور میں سانس لے رہے ہیں، ایک سوئی بھی گرتی ہے تو پورے ملک کو میڈیا بتا دیتا ہے۔ گزشتہ حکومت نے پانچ سال میں ملکی و غیر ملکی مالیاتی اداروں سے اتنے قرض لیے کہ قیام پاکستان سے اب تک اس کی نظیر نہیں۔ یہ قرضے کہاں صرف ہوئے اس کا بھی اندازہ ہر صاحب عقل کو ہے۔ تبھی تو سیاستدانوں کا معیار زندگی بلند سے بلند تر ہوا ہے اور عوام کی حالت بد سے بدتر ہوئی ہے۔ سیاست دانوں کی اس بھیڑ سے دوبارہ ہمیں حکمران منتخب کرنے ہیں۔ وقت انتخاب قریب ہے۔ حق رائے دہی استعمال کرتے وقت ذہن پر زور ضرور دیجئے گا..... ورنہ

قافلے دلدلوں میں جاٹھرے
رہنما پھر بھی رہنما ٹھہرے

معراج رسول

پیر صاحب

سرگزشت

اس گھر میں ایک بڑی بی تھیں، اماں نے بتایا کہ یہ اس کی دادی ہیں۔ وہ منہ سے تو انہیں دادی کہتا مگر دل باغی رہتا اس لیے کہ وہ اس کی اماں سے بہت جلتی تھیں۔ بات بات میں فساد برپا کر دیتی تھیں۔ کافی عرصے بعد جب وہ ہوش کی منزلوں پر پہنچا تب پتا چلا کہ اس کی دادی اس کے ابا کی شادی اپنی بھانجی سے کرانا چاہتی تھیں مگر ابا نے اس کی اماں سے شادی کر لی۔ اس شادی سے دو بچے ہوئے۔ ایک وہ اور ایک اس کے بڑے بھائی، ان دو بھائیوں کی زندگی خوش خوشی گزر رہی تھی کہ ایک دن اس کے ابا باہر سے آئے، آتے ہی چادر اوڑھی اور سو گئے۔ ان پر تپ لرزہ کا حملہ ہوا تھا۔ فوراً حکیموں کو بلایا گیا۔ ایک دو نہیں پورے دس حکیم بلوائے گئے تھے۔ سب نے اپنے طور پر کوشش کر لی تھی مگر وہ جانبر نہ ہو سکے۔ نومبر 1903ء کا یہ سانحہ اس کی زندگی میں مظلوم برپا کر گیا۔ اس وقت اس کی والدہ کی عمر 23 سال تھی۔ ان پر تو یہ سانحہ کوہ الم بن کر ٹوٹا۔ وہ سکتے کے عالم میں آ گئیں۔ ان کی اس کیفیت کا لوگوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ گھر میں گویا لوٹ شروع ہو گئی۔ جس کے ہاتھ جو لگا وہ لے بھاگا۔ خصوصاً کاغذات پر ہاتھ صاف کیا گیا۔ اس طرح کس کے ذمے کتنے روپے تھے یہ ثبوت ختم ہو گئے مگر جن مہاجنوں سے قرض لیے گئے تھے وہ ثبوت کے ساتھ دروازے پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ اب حالت یہ تھی کہ گھر پر قرض خواہوں کا تقاضا اور ادائیگی کی صورت نہ تھی، مگر عزت تو بنائے رکھنی تھی۔ خیر سے زمیندار گھرانا کہلاتا تھا اس لیے عزت کا خاص خیال رکھا جانے لگا۔ قرض خواہوں کو تسلی دے دی گئی کہ سب کی رقم ملے گی۔ مگر یہ قرض اس آسانی سے تو اترتا نہیں، برسوں لگ گئے۔ وہ بچہ جوانی کی منزل پر پہنچ گیا۔ گھر میں مولوی عبدالحیڈ نوکی رہ کر عربی کی تعلیم دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ عربی میں خوب مہارت حاصل کر لی پھر اسے مدرسہ عالیہ بھیج دیا گیا۔ سراج السالکین شاہ محی الدین احمد نظامی بریلوی کی شاگردی میں رہے۔ بغداد سے بغرض تبلیغ، ہند آنے والے پیر سید ابراہیم سیف الدین سے بیعت حاصل کی۔ خاندان تو اولیاء کا ہی تھا اس لیے تصوف میں ڈوبتے چلے گئے۔ دور دور تک شہرت پھیلتی چلی گئی۔ اسی دوران اشعار کہنے کا شوق ہوا تو اس دشت کی سیاحت میں اتر پڑے۔ وہ دور شاعری کے عروج کا تھا۔ قافی بدایونی، مانی جاسی، مخدوم اکبر آبادی، مولانا سیماں اکبر آبادی، جوش ملیح آبادی اور نیاز فتح پوری کی صحبت سے فینس یاب ہونے لگے۔ گھر پر بھی شعر کا جھکھار رہنے لگا۔ پنڈت امر ناتھ، ساحر دہلوی، حامد حسن قادری، شاہ وگلیر وغیرہ کی نشست گھر میں رہنے لگی۔ پیر طریقت ہوتے ہوئے بھی خوب خوب شاعری کی۔ نغمہ اور اسلام، میکدہ، حرف تمنا، نقد اقبال اور متفرق مضامین نے قارئین میں خاصی مقبولیت حاصل کی۔ 1906ء میں پیدا ہونے والے اس صاحب طرز قلم کار کا پورا نام پیر محمد علی شاہ المعروف میکش اکبر آبادی ہے جو ہند کے ہر کونے میں پیر صاحب کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔



دلپ کمار کو دیوکارانی نے ہی دریافت کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ اعزاز دیوکارانی کو ہی جاتا ہے۔ اور یوسف خان کا نام دیوکارانی نے تجویز نہیں کیا بلکہ اسی دور کے پروڈیوسر، ڈائریکٹر آنجہانی امیہ چکرورتی نے دو نام تجویز کئے تھے۔ ایک دلپ کمار اور دوسرا دیو داس۔ یوسف خان نے اپنا فلمی نام دلپ کمار پسند کیا۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ دلپ کمار فلم میں آنے سے پہلے آر می سینین دیوالال (ناسک) میں منبر تھے۔ وہ دسمبر 1922ء کو پشاور (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔

☆ محترمہ صوبی شاہ کا شکایت نامہ ہری پور ہزارہ سے "میرا خط تاخیر سے" میں موصول خطوط میں سرفہرست تھا۔ جلدی خط لکھتی ہوں جب بھی شائع نہیں ہوتا اور لیٹ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (وقت پر موصول خط ہر حال میں لگتا ہے) اپریل کا سرگزشت 27 مارچ کو مل گیا تھا۔ فضل رؤف مروت، مکی مروت کا خط پڑھ کر اداکاروں کی تعلیم کے بارے میں بہت سی معلومات ملیں۔ سراب میں فتح خان کا کردار جب بھی سامنے آتا ہے تو دل چاہتا ہے شہباز سے پہلے ہم اسے گولی سے اڑادیں۔ آسیہ کی آپ جتنی تیرے جانے کے بعد پڑھی، سبق حاصل ہوا۔ شوہر حضرات کو چاہیے کہ وہ تمام رشتوں کو مقدم سمجھیں بھی گھر کا نظام درست رہ سکتا ہے۔ بہر حال جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ انتظار لا حاصل میں شاہانہ کی ذرا سی لغزش اس کے گھر کی تباہی کا باعث بن گئی۔ غلطی پڑھ کر حشر پہ غصہ بھی آیا اور رحم بھی۔ پہلے شوہر نے خود ہی اسے مجبور کیا پھر بعد میں طعنے بھی دیتا رہا۔ حشر اگر میرا یہ خط پڑھ رہی ہیں تو پلیز مجھ سے رابطہ کریں۔ میرا سیل نمبر معراج انگل سے لے لیتا۔ ایم ایم عالم صاحب کی وفات کا سن کر بہت دکھ ہوا، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ آخری وقت میں انہوں نے بہت کمپری کی زندگی گزاری۔ وطن عزیز میں ہمارے قوی ہیر و زکی کوئی قدر نہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ اپنے شمارے کے ذریعے ایسے عناصر کو بھی بے نقاب کریں جو ہمارے وطن کے دشمن ہیں۔

☆ آسٹر کراچی کا خط "سلام! میں سرگزشت میں پہلے بھی لکھ چکی ہوں لیکن میری تحاریر کو پرچے کے ایک کونے میں بھی جگہ نہ دی گئی۔ مجھے بے حد دکھ ہے اور سرگزشت نے میری بے حد دل آزاری کی ہے۔ میں نے کئی پرچوں میں اپنی کاوشیں لکھیں اور میں نے ایک ڈراما میں بھی مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ لیکن آج کل جیسا کہ سفارشی لوگ دھڑا دھڑا بھرتی ہو رہے ہیں ڈراموں میں اس لیے میں بھی مزید کہانی کا حصہ نہ بن سکی۔ سفارش جو نہ تھی۔ اب جیسا کہ کئی چینلوں پر اپنی کہانیوں پر ڈرامائی تشکیل دینے کے بھی مواقع تلاش کیے لیکن کسی چینل نے ہامی نہ بھری، میری کہانیوں کو مسٹر وکرو دیا یہ حال ہے آج کل چینلوں ڈراما ڈیپارٹمنٹ کا اور میری کوشش ہے کہ ان انعامی مقابلوں میں مجھے بنا قریب اندازی انعام دیا جائے۔ وجہ یہ ہے کہ میرے والد کا انتقال پچھلے سال ہوا اور ان ہی سے خطوط پوسٹ کروایا کرتی تھی۔ اب بھائی سے مارچ کا سرگزشت منگوایا تو بڑے بھڑکے کر کے لائے تھے۔ (آپ نے موبائل نمبر، ای میل سب لکھ دیا لیکن نام ایک کونے میں وہ بھی آدھا، اہم بات یہ ہے کہ آپ اردو پڑھیں، املا اور تحریر پر توجہ دیں۔)"

☆ طاہر الدین بیگ میر پور خاص سے لکھتے ہیں "زندگی کا زندانی ایک باہمت صحافی کی سرگزشت جسے ادیب اور شاعر حسین اعظمی کے نام سے دنیا پہچانتی ہے بہت زبردست تحریر تھی، معلومات کا خزانہ، سرگزشت کا ایک اور کارنامہ اور ایسے کارنامے سرگزشت کی طرف سے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہ مسکے بازی نہیں ہے ایک اٹل حقیقت ہے۔ شہر خیال میں سعودیہ کے شہر ریاض سے ڈاکٹر آرام ای صاحب کا مراسلہ بڑا زبردست اور کافی بڑا تھا۔ شاہ رخ اور دلپ صاحب پر بڑے عمدہ پیرائے میں لکھا، خاص طور پر اسما سے شادی اور پھر جانے کس خوف سے اسما سے علیحدگی اختیار کر لی، خان صاحب اس معاملہ میں بڑے ہی بزدل واقع ہوئے حالانکہ وہ اولاد کے لیے دوسری شادی کرنے کے مجاز تھے ویسے بھی شریعت میں اس بات کی اجازت ہے، نہ جانے خان صاحب نے کس خوف سے بزدلی کا طوق پہن لیا۔ سٹار صاحب نے بھی خوبصورت لکھا خاص طور پر کہانیوں پر انہوں نے اچھا لکھا۔ سدرہ بانو ناگوری نے کراچی کے حالات پر مختصر مگر اچھا لکھا۔ کراچی کے حالات پر ہر دور مند دل خون کے آنسو روتا ہے۔ جالب صاحب کے شعر کو بڑی ہی معذرت کے ساتھ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ "اس شہر خرابی میں ہم کراچی والے، زندہ ہیں یہی بات ہے پیارے" ابن کبیر صاحب نے مسلم دوست پر خوبصورت انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا، جابجا حیران کن مگر زبردست جملوں سے واسطہ ہوا جیسے ہواؤں میں مسرت تھی بلہروں میں نغمہ گسی تھی۔ ایک ڈھائی سالہ بچے کا فٹ بال کو لگ مارنا، اس کے تاناکا مستقبل کی نشاندہی کر گیا۔ گلیوں میں ٹھنڈی ہوائیں رقصاں تھیں۔ ہم لوڈ شیڈنگ کے عذاب سے دوچار ایسے جملے پڑھ کر ٹھنڈک محسوس کرتے ہیں۔ رونا لڈو عزم و ہمت کا پیکر یہ زبردست قلب لارفٹ بال کے شائقین کے لیے ایک ہیرو کا درجہ رکھتا ہے۔ نور بانو نے نامور لوگوں پر مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ معلومات کا خزانہ ہے۔ لیکن کی لاش (صائمہ اقبال) اپنی طرف بے اختیار کھینچتی ہے۔ بہت اچھا لکھا گیا ہے اسی لیے ہم کہتے ہیں سرگزشت پابندہ باد سرگزشت والے زندہ باد۔"

☆ انجم فاروق ساحلی لاہور سے لکھتے ہیں "سرگزشت حقیقتاً ایک ایسا جام جہاں نما ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو کا عکس جھلکتا



☆ سدرہ بانو ناگوری نے کراچی سے لکھا ہے "اپریل کا شمارہ اس بار ڈرا جلدی یعنی 22 مارچ کو ہی مل گیا۔ "شہر خیال" میں ڈاکٹر صاحب نے طویل خط لکھ کر تبصرے کا بھرپور حق ادا کیا۔ ساتھیوں کے تبصروں پر نگاہ ڈالنے کے بعد اپنے خط پر نظر ڈالی۔ حیرت ہے کہ آپ کو میرا خط لیٹ ملا۔ (بروقت ملتا تو یقیناً صحیح جگہ ملتی)۔ "یک صبحی سرگزشت" میں اپنی پسندیدہ شخصیت کا زندگی نامہ پڑھا "عظیم لوگ"۔ نور بانو صاحبہ معروف شخصیات کا مختصر مختصر تعارف لے کر آئیں۔ "نور بانو صاحبہ" آپ ذرا تفصیلی تعارف بیان کرتیں تو زیادہ مزہ آتا، خیر یہ آپ کی بہت اچھی کاوش ہے۔ اس بار سرگزشت کے صفحات پر سب سے خوبصورت اور شاندار تحریر ابن کبیر کی "مسلم دوست" رہی۔ ابن کبیر نے اپنے منفرد انداز میں ساحرانہ شخصیت کی داستان لکھ کر ہمیں سحر زدہ کر دیا۔ اتنی کم عمری میں اتنی ساری کامیابیاں سیٹنا اور مسلمانوں کے لیے جذبہ ہمدردی رکھنا، واقعی خدا ایسے لوگوں پر بہت زیادہ مہربان ہوتا ہے، جذبہ ہمدردی سے سرشار "رونالڈو" کی شخصیت... آئیڈیل ہے اس کی ذات پر یہ جملہ بالکل فٹ بیٹھتا ہے کہ وہ آیا اس نے دیکھا اور فتح کر لیا۔ "فلمی الف لیلہ" میں ہمارا پسندیدہ موضوع "پرانہ کراچی" زیر گفتگو رہا، ہم تو پرانے کراچی کی تصاویر اور آفاقی انگل کی یادیں پڑھ کر حیران ہوتے رہے، خاص طور پر چٹ پٹے کھانوں کا ذکر، ہوٹل کے بند پر ٹھنڈوں کی شرارتیں اور منوڑہ کی سیر کے دلچسپ قصے یوں لگا جیسے آفاقی انگل کے ساتھ ہم بھی پرانے کراچی کے ریسٹورن گلی کوچے میں نکل آئے ہوں۔ آج کے کراچی میں پرانے کراچی کی ہلکی سی بھی رقی نظر نہیں آتی مگر کراچی کے کھانے آج بھی ہر کسی کو دیوانہ بنا سکتے ہیں۔ پرانا کراچی واقعی "کراچی" تھا یعنی "Old is Gold"۔ "بیت بازی" میں "نگار احمد" کا شعر پسند آیا "سچ بیانیوں" میں پہلی عبرت بھری تحریر "تیرے جانے کے بعد" پڑھی، آسیہ صاحبہ کو خدا نے ان کے صبر اور بے گناہی کا کیسا اچھا صلہ دیا کہ ظالموں کو دنیا ہی میں عبرت کا نشان بنا دیا۔ ظالم ظلم کرنے سے پہلے ایک بار تو سوچ لیتے کہ خدا کی لاشی بے آواز ہے۔ "انتظار لا حاصل" شہانہ کی روداد پڑھ کر ذہن میں مختلف سوچیں در آئیں کہ شہانہ صاحبہ اعجاز کی حوصلہ افزائی کرنے سے پہلے ایک بار تو اپنے والدین کی عزت کا اور اپنی چھوٹی بہنوں کے بارے میں تو سوچ لیتی۔ اس کی اس نادانی نے اعجاز کی جان تو لی بدلے میں اسے کیا ملا۔ باپ اور جوان بھائی کی موت، ماں اور جوان بہنوں کے ساتھ تنہائی کا خوف، لوگوں کی چھٹی نگاہیں، کچی عمر کے خوابوں کو اپنی آنکھوں میں ہی کہیں دفن کر لیتی تو یہ دن تو نہ دیکھنا پڑتا اور موبائل فون تو ہماری نو جوان نسل کو برباد کرنے میں سب سے اہم کردار ادا کر رہا ہے اور آج کل ایک قول بہت مشہور ہو رہا ہے کہ کوئی تمہارے ساتھ برائی کرے تو اسے بدو عائد دو بلکہ ایک موبائل فون لا دو۔"

☆ عبد الحمید جانی کا خط بہاولپور سے "کسی بھی رسالہ میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ مصروفیت کی بنا پر میں مارچ کا شمارہ نہ لے سکا۔ مجبوراً قریبی دوست سے مارچ کا شمارہ لے کر پڑھنا پڑا۔ میں آفاقی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ وہ گاہے بگاہے ہندو پاک کے نامور فنکاروں کے بارے میں لکھتے رہتے ہیں جس کے پڑھنے سے پڑھنے والا اپنے ماضی میں کھو جاتا ہے۔ جوانی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ مارچ کے شمارہ میں فلم "دلا بھئی" کا ذکر تھا۔ جس کے گانے کے بول کچھ اس طرح سے لکھے تھے "سوں تینوں رب دی تو جاویں کبوتر" جبکہ بول اس طرح سے ہیں۔ "واسطہ ای رب داتوں جاویں دے کبوتر" اور پھر آفاقی صاحب نے دلپ کمار کے بارے میں لکھا کہ

دکھائی دیتا ہے۔ اقتباسات اس مرتبہ کافی اچھے تھے۔ صفحہ نمبر 139 پر آل احمد سرور صاحب کا واقعہ بھی خوب تھا۔ مدیر سرگزشت نے کافی محنت سے ان تراشوں کا انتخاب کیا۔ محترم علی سفیان آفاتی نے صفحہ نمبر 100 پر گلوکاراؤں کے خاندانوں کے مناقبہ طرز عمل کو اچھے انداز سے آشکار کیا۔ اس کے علاوہ کراچی کے ماحول کی سیر بھی بہت خوبصورتی سے کردائی اور اداسی نے تصاویر کا بھی اچھا اہتمام کیا۔ لاہور نامہ ماضی تا حال بھی خوبصورت تحریر تھی۔ اس کے علاوہ حقیقی مضامین میں جلالت، عظیم لوگ کے علاوہ دوسرے انتخاب بھی خوب تھے۔ ”تلاش“ معلوماتی، جغرافیائی دلچسپیوں سے مزین مہم تھی۔ ترکی نئی دہلی آفاتی صاحب کا اچھا سلسلہ ہے۔ آپ بیتیوں میں مجرم کون، تیرے جانے کے بعد اور غلطی اچھی تحریریں تھیں۔ گزشتہ دو ماہ بروقت پرچہ ہاتھ نہ لگا اس لیے حاضری نہ دے سکا۔ آدم خورشیدی اور دیگر تحریر شائع ہوتیں تو کچھ اور منفرد تحریروں کا مواد جمع ہوا ہے میں اسے احاطہ تحریر میں لاتا۔ امید ہے توجہ فرما کر شکریہ کا موقع عنایت کریں گے۔“

علامہ خالد کبیر لاہور سے لکھتے ہیں ”ایک لمبا عرصہ کے بعد خط لکھنے کی جرات کر رہا ہوں معلوم نہیں پہلے خط حکمہ ذاک والے کہاں دے آتے تھے یاردی کی نوکری میں پھینک دیئے جاتے تھے۔ شہر خیال میں اس مرتبہ لیٹ داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہوں (واقعی آپ لیٹ ہو گئے تھے)۔ سرگزشت میں گزشتہ چند ماہ سے مضامین بہت دلچسپ شائع ہو رہے ہیں۔ اور دن بدن نکھار آتا جا رہا ہے۔ (چلیے آپ نے بھی تعریف کر دی، ہمیں بھی خوشی ہوئی) شمارے میں شہر خیال کے بایسوں کو میری طرف سے سلام قبول ہو۔ اعجاز حسین سٹار، سردار ہونا گوری، ایم خالق بھٹی، ابن مقبول جاوید صدیقی، سعید احمد چاند، انتساب عباس، مونا گل، آرمین زہب، افتخار احمد کھسٹن اور دیگر باقاعدہ شامل ہونے والے ساتھیوں کو سلام۔ اس دفعہ کے سرگزشت کی نئی بات جو بہت پسند آئی، وہ بلحاظ حروف تہجی پارچہ جات تھے۔ اس دفعہ کا حرف ”آ“ تھا۔ معلوم نہیں کہ ہر ماہ ایک حرف ہوا کرے گا یا ایک حرف کئی ماہ تک آتا رہے گا (اتفاق تھا کہ تمام پارچہ جات تسلسل میں آ گئے تھے)۔ سرگزشت کی تمام ایڈیٹوریل ٹیم کو میری طرف سے مبارکباد اور آخر میں کہنا یہ ہے کہ اس سال کے خاص نمبر کا کوئی اعلان اب تک سامنے نہیں آیا۔ (دینا تاہین نمبر بہت جلد آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا)

علامہ رانا محمد سجاد کی تحصیل و ضلع مظفر گڑھ شاہ جمال سے تشریف آوری ”شمارہ خلاف توقع 25 کو حاصل کر لیا حالانکہ شمارے میں 28 تاریخ کا اعلان ہوا ہے بہت خوشی ہوئی۔ سرورق کوئی خاص پسند نہ آیا اس لیے سرسری نگاہ ڈال کر آگے بڑھے۔ اس وقت وطن عزیز میں الیکشن کا موسم اپنے عروج پر ہے جعلی سندوں کے ذریعے کامیابی کا تاج سر پر رکھنے والوں کو اب جیل کی سزائیں ہو رہی ہیں کہا جا رہا ہے کہ اس بار الیکشن بڑی اہمیت کے حامل ہوں گے۔ جانے والے حکمرانوں کے کارنامے اب اخبارات کی زینت بن رہے ہیں۔ سابقہ حکمران بڑی دیدہ دلیری سے کہہ رہے ہیں کہ ہم نے کتنی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ ایوان زیریں کی صدارت کا عہدہ سنبھالنے والی محترمہ جاتے جاتے اپنے لیے تاحیات مراعات منظور کرائیں اور چند ماہ کے لیے وزیراعظم بننے والے موصوف نے بھی جی بھر کے اپنی حالت سنوارنے کی بڑی کوشش کی ہے۔ ہمارے ملتے کے قومی اسمبلی کے رکن دینی صاحب کو سزا سنائی گئی۔ موصوف جعلی ڈگری کی وجہ سے پابند سلاسل ہوئے ہیں، اب اشکِ ندامت بہا رہے ہیں۔ ان جیسے اور لوگوں کو بھی کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔ ادارے میں نہیں معاہدے کے بارے میں لکھا گیا۔ بلاشبہ ایک اچھا اقدام ہے۔ لیکن ایک سوال کرنے کی جرات کریں گے کہ عوام کو 5 سال دھوکے میں رکھا اور مشقت، تکلیف، پریشانی برداشت کرنے پر مجبور کیا گیا اس وقت یا تو نہ آپا کہ ہمیں گیس کی ضرورت ہے، اب اچانک یہ الہام ہوا کہ گیس کا معاہدہ کرنا چاہیے تاکہ بھولی بھالی عوام کو الیکشن مہم میں اپنے اس عظیم کارنامے سے متاثر کیا جائے۔ بہر حال دیر آید ورسر آید۔ خدا کرے یہ منصوبہ اپنی تکمیل کو پہنچے۔ حسین اعظمی صاحب سے تعارف ادب کے طالب علموں کے لیے خاص تھن تھا۔ شہر خیال ڈاکٹر آرا ایم ای کے خط سے شروع ہوا، بہت عمدہ اور جامع تبصرہ کیا۔ دلپ کمار کے حوالے سے ان کی باتیں بہت اچھی تھیں۔ واقعی اگر کسی انسان کی ذات سے اس کے ارد گرد کے لوگوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچے تو کیا فائدہ۔ انہیں چاہیے تھا کہ اپنی شہرت سے دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچاتے، بالکل یہی معاملہ شاہ رخ خان کا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ شہرت کا آفتاب گہنا جاتا ہے پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ ایک غیر مسلم عورت سے شادی کر کے انہوں نے اپنی عاقبت کو بھی داغدار کیا، انہیں کوئی اور مسلم عورت نہیں ملی؟ اس کے باوجود وہ تعصب کا نشانہ ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک بھارتی مسلم اداکار کا ہندوؤں کی مذہبی تقریب میں حصہ لینے کا پتا چلا، اللہ تعالیٰ اس شہرت اور دولت سے بچائے۔ فضل رؤف مروت کا خط انتہائی معلوماتی رہا، پتا چلا کہ ہمارے فنکار کی تعلیمی حالت کیا ہے۔ بہت خوشی ہوئی کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اس پیشے سے وابستہ ہیں۔ اعجاز حسین سٹار تیسری پوزیشن کے حقدار ٹھہرے، ہمیشہ کی طرح تبصرہ جاندار رہا۔ مبارکباد قبول کیجیے۔ رانا محمد شاہد نے سیاسی حالت پر تبصرہ کیا۔ جناب ہم آپ کے خیالات کی تائید کرتے ہیں۔ شمارے میں فخر پاکستان ایم ایم عالم کی وفات کا تذکرہ تھا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو کرم کروٹ جنت نصیب فرمائے (آمین) کاش ہم ان کو ان کی زندگی میں ان کی شان کے مطابق اعزاز دیتے۔ طاہر الدین بیگ صاحب نے دلپ صاحب کا ذکر کیا۔ آفاتی صاحب نے بھی ذکر کیا ہے اس واقعے کا، پتا نہیں کتنا جھوٹ اور کتنا ج ہے۔ معراج الدین کا خط مردان سے، جناب بس دعا کیجیے اور اب کی بار وٹ کا

استعمال احتیاط سے کیجیے گا۔ عمران جوانی اور سعید احمد چاند کا تبصرہ اچھا رہا۔ رانا فیصل، اس قتل میں حکمرانوں کے ساتھ ہم برابر کے شریک ہیں۔ کیوں ایسے ناموں پر مہر لگا کے آتے ہیں۔ ویسے اب کی بار الیکشن کمیشن نے خالی خانہ رکھا ہے، یہ ایک اچھا فیصلہ ہے۔ سردار ہونا گوری عروس البلاد کے لوگوں کے لیے ہم تہ دل سے دعا کرتے ہیں۔ شاید جہانگیر، روینہ نقی مختصر سے تبصرے کے ساتھ آئیں۔ فردوس فرنگ، لارڈ ڈیوڈی نے اپنے وطن کے لیے کتنی محنت سے کام کیا اور یہاں کے لوگوں کو اپنا غلام بنانے کے لیے کس کس طرح کی چالیں چلیں مگر تحریر جامع نہیں تھی۔ ابن کبیر ”مسلم دوست“ لے کر آئے، بلاشبہ یہ تمام مسلمانوں کے لیے جو اپنے خمیر کو ملا چکے ہیں ایک آئینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو اور زیادہ عروج نصیب فرمائے (آمین)۔ کاش یہ شہرہ آفاق کھلاڑی دین فطرت بھی اختیار کر لے۔ ”عظیم لوگ“ دلچسپ واقعات سے بھرپور تحریر تھی۔ نٹن کی لاش کوئی خاص تحریر نہیں تھی۔ فلمی الف لیلہ میں اس بار شہرے مثال کا تبصرہ خوب رہا۔ تصاویر کا تو جواب نہیں۔ اہل کراچی کے لیے تو یہ خاص تحریر ثابت ہوئی۔ مہناز کا تذکرہ اور دوسری خواتین گلوکاراؤں کے واقعات دلچسپ رہے اور افسوس بھی ہوا کہ ان فنکاراؤں کے ساتھ ان کے گھر والوں کا کیسا سلوک تھا۔ نہ جانے یہ منافقت کب ختم ہوگی۔ تلاش، طارق عزیز احمد خان کی بس ٹھیک ہی تھی کوئی خاص اثر نہیں چھوڑا۔ جلالت، فطرت بالآخر ابھر کر سامنے آئی لیکن رائے کا زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا ہونے کے باوجود موتی کے لیے جذبہ قابل دید ہے۔ ماضی حال، لاہور کے بارے میں واقعی خوبصورت تحریر تھی، محض اپنے انداز تحریر سے انہوں نے قاری کو جکڑے رکھا۔ سراب اپنے دلچسپ مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ فتح خان ایک بار پھر ظاہر ہوا اور آتے ہی پھل مجا دی۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ ”تیرے جانے کے بعد“ ان لوگوں کی کتھا جو دوسروں کے بہکاوے میں آکر اپنا گھر اجاڑ لیتے ہیں لیکن بجائے اس برکسی ندامت کے اظہار کے انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ پھر سے تعلق استوار کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ انتظار لا حاصل، میں شاہانہ نے اپنی ناچھی کے باعث اپنے ہنستے گھر کو بر باد کر لیا اور اس سے بڑھ کر اعجاز کا کردار انتہائی گھٹیا تھا جس نے محض اپنی خواہش کے حصول کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا۔ والدین کو بھی چاہیے کہ ان چیزوں پر خصوصی توجہ رکھیں۔ ”محبوبہ“ شکلیہ نے انتہائی فیصلہ کرنے کی بجائے عقل کا استعمال کیا اور اپنا گھر اجڑنے سے بچالیا۔ ”واپسی“ ایک دلچسپ، سچ بیانی ثابت ہوئی۔ لیکن یاسمین کا کردار بالکل اچھا نہیں لگا۔ غلطی میں نورنگ نفسیاتی مسائل کا شکار نظر آیا۔ جلسہ، آج کے اس دھوکا دہی کے زمانے کی روداد تھی۔ انوکھا برنس، پڑھ کر کراہیت محسوس ہوئی۔ شمارے کی خوبصورت تحریر محبت، ثابت ہوئی۔ واقعی اس جذبے کا کوئی پتا نہیں ہوتا کہ کب یہ دل میں جگہ بنا لیتا ہے۔ جذبہ صادق تھا تو رومی کو آخر میں اپنالیا۔ بہت اچھی تحریر تھی۔“

علامہ رانا محمد شاہد، بورے والا سے لکھتے ہیں ”اپریل کا سرورق جاذب نظر لگا۔ ادارہ ایک اہم موضوع کا احاطہ کر رہا تھا۔ جی ہاں۔ ہم نے ملکی مفادات کے لیے فیصلے کیے ہوتے تو آج نہ صرف ہم گیس، بجلی میں خود فیصل ہوتے بلکہ غیرت و وقار سے بھی زندگی گزار رہے ہوتے جبکہ ہم تو چینک بھی امریکا بھاد کی مرضی کے بغیر نہیں مارتے۔ یک صفی سرگزشت میں حسین اعظمی کی جدوجہد کی کہانی دلچسپ لگی۔ ویسے یہ انسانی جدوجہد ہی ہوتی ہے جسے دنیا یاد کرتی ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ جدوجہد ہی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ ڈاکٹر آرا ایم ای طویل تبصرے کے ساتھ حاضر تھے جبکہ اپنا نام انہوں نے اے بی سی میں چھپا رکھا ہے۔ فضل رؤف مروت نے مختلف اداکاروں کے تعلیمی کیریئر پر روشنی ڈال کر معلومات میں اضافہ کیا۔ ویسے اگر وہ اس میں تھوڑا اضافہ کر کے، مزید دلچسپ بنا کر اسے ایک مضمون کی شکل دیتے تو زیادہ اچھا لگتا۔ اعجاز حسین سٹار نے حج لکھا کہ شہر خیال میں پہلے جیسی بات نہ ہونے کے ہم سب ذمہ دار ہیں، ظاہر ہے خود سٹار صاحب اپنے خطوط میں بہت ہی کم کسی کو مخاطب کرتے ہیں۔ ایم ایم عالم، امیر اسلام ہاشمی اور پروفیسر سبط جعفر کو اللہ اپنے جوار رحمت میں جگہ دے (آمین)۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایم ایم عالم جیسے لوگ ہی حقیقی معنوں میں اس قوم کے ہیرو ہیں۔ ایم ایم عالم نے قضائے سے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے آبائی شہر ڈھاکا کا اپنے رشتے داروں کے پاس جانے کی بجائے پاکستان میں رہنے کو ترجیح دی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس ملک کے قیام کے لیے ان کے آباؤ اجداد نے بہت قربانیاں دی تھیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی، وہ کراچی میں پاک فضائیہ سے متعلق رہائش رکھتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے باقی زندگی کتابوں کے مطالعہ میں گزار دی۔ سرفرانز رفیقی، میجر عزیز بھٹی، میجر شفقت بلوچ، جنرل عبدالعلی ملک، سبیل چوہدری، بریگیڈیئر شامی اور درجنوں دلیر اور نڈر لوگ جنگِ تمہر کے ہیرو تھے۔ لیکن ان سب میں اگر کوئی اقبال کے شاہین کے بلند مرتبے پر فائز ہوا تو وہ ایم ایم عالم تھا۔ برصغیر پر حکومت کرنے والے ایک جابر حکمران لارڈ ڈیوڈی کے بارے میں ڈاکٹر ساجد امجد کی تحقیق ایک بہترین کاوش تھی۔ ابن کبیر نے فٹ بال کی دنیا کے ایک بڑے کھلاڑی رونالدو کی زندگی کے کچھ گوشوں سے آگاہ کیا۔ آپ ہر دفعہ کسی نہ کسی بڑے کھلاڑی کی سرگزشت سناتے ہیں، یہ اسپورٹس سے لگاؤ رکھنے والوں کے لیے اچھا سلسلہ ہے۔ نور بانو کی تحریر عظیم لوگ، معلوماتی تھی مگر سرگزشت جیسے ڈائجسٹ کے شایانِ شان نہیں۔ اگر اس تحریر کو تھوڑا تفصیل سے لکھا جاتا تو بہتر ہوتا۔ صائمہ اقبال کی تحریر نٹن کی لاش معلوماتی اور سسپنس سے بھرپور تھی۔ اس واقعے پر مبنی تحریر ہم نے بھی چند ماہ قبل بھیجی تھی لیکن صائمہ کی تحریر اس لیے زیادہ اچھی تھی کہ اس میں طوالت، مکالمے اور دلچسپی ہماری تحریر سے زیادہ تھی۔ (اب آپ سمجھ گئے ناں کہ سرگزشت کے لیے کیسی تحریر بھیجینی چاہئے، تو قلم اٹھائی لیں) فلمی الف لیلہ میں اس دفعہ

پرانے کراچی کا احوال، اس دور کے امن اور خوبصورتی کو بڑے اچھے پیرائے میں بیان کیا گیا۔ مگر آج کراچی کی صورت حال واقعی صیب جالب کے شعر کے دوسرے مصرعے کی تشریح ہے ”زندہ ہیں یہی بات بڑی بات ہے پیارے“ اسی طرح لاہور شہر کی خوبصورتی اور اس کے نشیب و فراز سے پردہ اٹھانی عائشہ بخاری کی تحریر ماضی کا حال بھی معلوماتی اور دلچسپ بھی۔ مئی میں الیکشن ہیں کوشش کیجیے گا کہ کسی ایسے شخص کو ووٹ دیں جو آپ کے خیال میں کسی نہ کسی حد تک انسانیت سے محبت کرنے والا ہو۔“

☆ محمد عمران خان بھکر سے لکھتے ہیں ”میں سرگزشت کا خاموش قاری ہوں شہر خیال میں پہلی دفعہ حاضر ہوا ہوں (خوش آمدید) قوی امید ہے کہ میرا خط آپ کے شمارے کی زینت بنے گا۔ (دیکھیں بن گیا) اب آتا ہوں تحریروں کی طرف جنہوں نے شہر خیال میں حاضری دینے پر مجبور کیا۔ ابن کبیر کی مسلم دوست جو رونالڈ کی زندگی کے حالات و واقعات پر مبنی تھی بہت پسند آئی۔ کرسٹیا نورونالڈ کی مسلمان بچوں کی مدد کا پڑھ کر حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی۔ اس نے ثابت کیا کہ وہ صرف عظیم کھلاڑی ہی نہیں بلکہ ایک عظیم انسان بھی ہے۔ عظیم لوگ معلوماتی اور دلچسپ تحریر بھی۔ صائرہ اقبال کی لیکن کی تلاش بہت متاثر کن تھی۔ سفر نامہ ”ترکی فی دایم“ پڑھ کر بہت مزہ آیا اور اس میں ہنسی کا پہلو بھی شامل تھا۔ عائشہ بخاری کی ماضی کا حال واقعی عام ڈگر سے ہٹ کر تھی۔ انداز تحریر بہت اچھا تھا۔ نہایت جامع اور معلوماتی تحریر بھی۔ اب آتا ہوں سچ بیانیوں کی طرف۔ سچ بیانیوں میں انتظار لا حاصل پڑھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ کس طرح دو جوان موت کے گھاٹ اتر گئے۔ شاہانہ کی غفلت نے اسے بھائی اور باپ کی شفقت سے محروم کر دیا۔ میرے خیال میں آج کے اس دور میں محبت کم اور ہوس زیادہ ہے۔ اس کی ایک وجہ دین سے دوری بھی ہے۔ شاہانہ کو ماں باپ کی عزت کا خیال رکھنا چاہیے تھا اور اعجاز کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے تھی۔ آج ہمارے معاشرے میں بے حیائی ایک دہان کر پھیل چکی ہے۔ اگر ہمارے اندر حیا ہو تو شاید ایسے واقعات رونما نہ ہوں۔ تیرے جانے کے بعد، بھی اچھی کہانی تھی۔ ساس بہو اور نندوں کے ایسے واقعات ہمارے معاشرے میں بہت رونما ہوتے ہیں۔ محبوبہ، اور واپسی بھی اچھی تحریریں تھیں۔ دوسرے نمبر پر جس کہانی نے متاثر کیا وہ حشر کی غلطی تھی۔ میرے خیال میں حشر کو ماں باپ کی نافرمانی کی سزا ملی اور وہ اپنی عزت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔ نورنگ واقعی کم ظرف تھا جس نے حشر کو لٹنے پر مجبور بھی کیا اور پھر اسے طے بھی دیے۔ وہ واقعی حشر کی محبت کو نہ سمجھ سکا۔ جیسا پڑھ کر عقل و نگ رہ گئی کہ کیسے ایک شاطر اور مکار لڑکی آئی اور کس طرح سوٹ لے اڑی۔ آخری سچ بیانی مجھٹ کافی حیران کن تحریر تھی واقعی انسانی نفسیات سمجھنا اتنا آسان نہیں۔ عمران نے روی کو اپنا کر یہ ثابت کر دیا کہ اس کی محبت سچی تھی۔ شہر خیال میں جن کے تبصرے پسند آئے ان میں ڈاکٹر آرمی ای اور میرے بڑی مطلع سے اعجاز حسین سٹار شامل ہیں۔ رانا محمد شاہد (بورے والا) طاہر الدین بیگ، معراج الدین (مردان) اور محمد عمران جوانانی (کراچی) سے خیال آرائی اچھی لگی۔“

☆ مظفر علی خان لاہور سے رقمطراز ہیں ”شہر خیال میں کئی مہینوں سے حاضر نہ ہو سکا۔ ابتدائیہ میں میں تحریر ہے کہ حکومت نے ایک عوامی مفاد کا کام کر دیا ہے۔ اس پر ہم یقین نہیں کر سکتے۔ یہاں منافقت، ریاکاری اور سیاست زیادہ اور عملی کام کم ہوتے ہیں۔ وسائل کے باوجود افراد اور وسائل میں دوری نے جہاں بے روزگاری اور غربت کو جنم دیا ہے وہیں پاک وطن کی سوناٹھی راکھ کا ڈھیر بنتی دکھائی دیتی ہے۔ کاش کچھ اچھے لوگ سامنے آئیں اور قوم کی قسمت سدھر جائے۔ اعجاز حسین سٹار صاحب کی سرگزشت میں دلچسپی اور سیر حاصل تبصرہ پسند آیا۔ ہم بھی نور پور تھل کے قرب و جوار سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور تھل میں خصوصاً بابا سیدن شاہ کے میلے پردہاں کا چکر لگتا ہے۔ وقت ہوا تو ان سے ملیں گے۔ لارڈ ڈلبوزی کا زندگی نامہ پڑھا۔ لارڈ کلائیو کے بعد لارڈ ڈلبوزی کا برصغیر کے لوگوں کو غلامی کی دلدل میں دھکیلنے میں اہم کردار ہے۔ ایام غلامی کا تذکرہ کیا کریں کہ ہم اب تک غلام ہیں، صرف زنجیر بدل دی گئی ہے۔ مسلم دوست کھلاڑی کا تذکرہ غزہ کے حوالے سے مناسب اور عظیم لوگ میں نامور شخصیات کا تعارف معلومات میں اضافہ ہے۔ لیکن کی لاش، چرانے کی روداد دلچسپ تھی۔ جبکہ فلمی الف لیلا میں کراچی کے زندگی سے بھرپور اور محفوظ شب و روز کا ذکر اچھے ونوں کی یاد بنے۔ تلاش کے عنوان سے بحری ہم جو کی خوب سہی مگر تروتازگی سے محروم ہے۔ جہلت، لاکھ سدھاؤ مگر حیوانی جہلت غلبہ کر لے تو جان مصیبت میں پڑ جاتی ہے۔ ماضی کا حال صدیوں کا سفر ہے مگر حال اور ماضی کا موازنہ خلفشار پیدا کرتا ہے۔ اور لطف بیان و تحریر سے محروم کر دیتا ہے۔ سرباب، ولولہ انگیز سہی مگر تو اتر سے ٹکرا کا شکار نظر آتی ہے۔ مرشد فاضل، فتح خان کے کردار لذت پیدا کرنے کی کوشش کے باوجود یکسانیت کا شکار ہیں۔ آپ بیٹیوں میں تیرے جانے کے بعد اچھی تحریر ہے۔ انتظار لا حاصل سبق آموز ہے۔ محبوبہ بلا وجہ ترک نہیں کرنا چاہیے اور شوہر پر اعتماد رکھنا چاہئے۔ واپسی کے عنوان سے ایک شوخ لڑکی کا طرز عمل عجیب لگتا ہے۔ واقعاتی سے زیادہ تحریر میں حسن ہے۔ غلطی مادی حقائق کے ساتھ ایڈوینچر کا درس دیتی ہے۔ نبھا سکونہ اگر تم تو دوستی چھوڑو۔ مجرم کون؟ کاروبار میں سب چلتا ہے، ورنہ کاروبار نہیں چلتا۔ اپنی رائے تو یہ نہیں مگر موجودہ معاشرہ میں اکثر کی رائے یہی ہے کہ محبت کے حادثات سے ہزاروں کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ چن بانی عمر میں کئی۔۔۔ لوگوں کے ساتھ ایسا ہو جاتا ہے۔ یہ آپ کی بھنوں یا کسی مینوال کا دور نہ سہی مگر محبت کی کئی ایک کہانیاں جزی نظر آئیں گی۔ محبت کی شدت کو آئندہ بھی رسالہ کی پالیسی کا حصہ بنائیے گا۔“

☆ وحید ریاست بھٹی نے ٹکرسیدان، راولپنڈی سے لکھا ہے ”گزشتہ دو ہفتوں سے زائد عرصہ ہو چلا ہے آپ کے میگزین سرگزشت کا قاری ہوں، آپ کے رسالے کا انتظار بڑی بیتابی سے رہتا ہے۔ شاہد جہانگیر شاہ صاحب کی تحریر پر اشارہ، نے ماضی کی یادوں میں دھکیل دیا، کیا خوبصورت مضمون تھا مرحوم گل حمید پ۔ میری جانب سے شاہد جہانگیر شاہ صاحب کو ڈھیروں مبارکباد عرض کرو دیجیے گا۔ (ان سطور کے ذریعہ مبارکباد پہنچ گئی) آپ سے ایک گزارش کر رہا ہوں کہ محترم ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کے تمام تحقیقی مضامین جو انہوں نے سرگزشت کے لیے لکھے ہیں وہ مضامین اگر آپ کا ادارہ کتابی شکل میں شائع کر دے تو آپ یقین مانیں آپ کی طرف سے اردو ادب کی اس گزشتے دور میں بہت بڑی خدمت ہوگی۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کو انری پٹی ایچ ڈی ڈگری ضرور عنایت کرنے کے متعلق سوچے گا (وہ پی ایچ ڈی ہیں) باقی رسالے کا معیار ہر لحاظ سے بین الاقوامی معیار کا ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ پر فیکٹ ہے، علی سفیان آفاقی کی خدمت میں سلام عرض کر دیجیے گا اور جناب کافی عرصہ سے تیمور صاحب کی کوئی تحریر نظر نواز نہیں ہوئی۔ اشتہار پڑھا کہ اس دفعہ سرگزشت کی ٹیم ہمیں ایک اور تاریخی دستاویز کی صورت میں بیٹا نابینا نمبر، کا تحفہ دینے چلی ہے ہر جہاں ہر جہاں، ماضی کے مشہور، مگلوکار، موسیقار اور اداکار K.C. DEY جو کہ ہندی سینما کے ماتھے کا جھومر تھے اور آنکھوں سے محروم تھے یعنی نابینا تھے ان کے حوالے سے ایک مختصر تحریر روانہ کر رہا ہوں، پسند آئے تو قارئین سرگزشت کی نذر کر دیجیے گا۔“

☆ ایم افضل کھل، عظیم والا نکانہ صاحب سے رقمطراز ہیں ”شہر خیال میں ڈاکٹر آرمی ای سودیہ خوبصورت تبصرے کے ساتھ جلوہ گر تھے۔ فضل رؤف مروت، اعجاز حسین سٹار نور پور تھل، بھائی صاحب میں ہی نہیں کبھی کہتے ہیں کہ آپ کی تحریروں میں حقیقت نظر آتی ہے اور ہمیں پڑھ کر بہت سرور آتا ہے۔ میری خداوند کریم سے التجا ہے کہ آپ ہمیشہ ہمیشہ ایسی اچھی تحریریں لکھتے رہیں۔ رانا محمد سجاد (مظفر گڑھ) اور سدرہ بانو ناگوری (کراچی) ان دونوں کا تبصرہ ایک ہی بات پر مبنی تھا کہ عباس ناؤن میں ہونے والے دھماکے نے میرے جذبات کو ہلا کر رکھ دیا۔ اے بھائی ذرا سوچو تم چند نونوں کی خاطر اپنے ہی مسلمان بھائیوں کا خون بہا رہے ہو۔ نجانے ایسا کرنے میں تمہیں کیا ملتا ہے۔ ہر پل میں تو سوچتا رہتا ہوں کہ ہمارے پیارے وطن میں غداروں کا غلبہ کہاں سے ہوا ہے اور ان کا یہ غلبہ کب ختم ہوگا۔ کہانیوں کی وادی پہلے کی طرح مہک رہی تھی۔ ماضی کا حال، کافی دلچسپ تحریر بھی۔ جہلت، کو پڑھ کر احساس ہوا کہ جنگی جانوروں کو ان کی حیثیت کے مطابق رکھنا چاہیے۔ تیرے جانے کے بعد، مس آسید لاہور سے آپ کی کہانی بدلتی ہوئی رتوں کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ محبوبہ، واپسی، خواجہ احمد کی تحریر دل کو بہت اچھی لگی۔ غلطی میں حشر نے جو کچھ بھی کیا حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا۔ مجرم کون، انوکھا بنس، اچھی لگی۔ محبت کے عمران صدیقی، آپ کی محبت تو بھارتی اداکار عامر خان کو بھی پیچھے چھوڑ گئی۔ عامر خان کو بھی پہلی محبت اپنی بچہ سے ہوئی تھی۔ آپ کا اس کے لیے سہارا بن جانا اس وقت ڈوبتے کو تنکے کا سہارے کی مانند ٹھہرا۔ روی آپ کا مقدر آپ کے سامنے آ گیا۔ یہی سب سے بڑھ کر خوشی تھی۔“

☆ ناصرہ احمد کا خط نیویارک امریکا سے ”میں آپ کو پہلی بار خط لکھ رہی ہوں قریباً 5 برس سے سرگزشت کا مطالعہ کر رہی ہوں ایک سے بڑھ کر ایک کہانی ہوتی ہے۔ مجھے سب سے اول تو زندگی نامے اور فلمی الف لیلا لگتے ہیں۔ بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ عرصہ ہوا آپ نے پاکستان کے اکلوتے نوبل پرائز لینے والے ڈاکٹر عبدالسلام کا ایک صفحہ پر مشتمل زندگی نامہ لکھا تھا۔ اب آپ نے مسٹر نوبل کی سوانح بھی لکھی ہے۔ اب وقت ہے کہ ڈاکٹر عبدالسلام کی زیست حیات کے بارے میں بھی لکھا جائے۔ امید ہے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب اس پر توجہ فرمائیں گے۔ معراج رسول صاحب آپ کے رسالوں میں ایسے بہت سے قصے پڑھنے میں آتے ہیں جن کے بارے میں یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ لکھنے والے کی آپ بیتی ہے یا کسی اور کی، سرگزشت جو لکھاری اپنے الفاظ میں لکھ رہا ہے مثال کے طور پر فروری 2013ء کے شمارے میں افریقا اور افریقا، الطاف شیخ کی کہانی کا ترجمہ ابراہیم جمالی نے کیا تھا لیکن سمندر کے مکین، مختار آزاد کے نام سے تھی۔ وہ لکھتے ہیں، مجھے ان ہی کا انتظار تھا، یا میری تحقیق مکمل ہو چکی تھی اب مجھے لوٹنا تھا، کیا یہ محقق خود مختار آزاد تھے یا وہ کسی اور کی روداد کا ترجمہ کر رہے تھے۔ اگر وہ خود تھے تو ان کی کیا بات ہے۔ اور اگر یہ کسی اور کی روداد ہے تو پھر اس لکھاری کا نام بھی دیا جانا چاہیے تھا۔ کہیں نہ کہیں حوالہ ضرور ہونا چاہیے۔ میں نے اس سے قبل کئی مضامین آپ کے رسالے میں پڑھے ہیں جن کو میں انگریزی رسالوں میں پڑھ چکی ہوں۔ لیکن آپ کے لکھاری اور جنگل لکھنے والے کا نام نہیں دیتے۔ اگر اصل لکھاری کا حوالہ دیا جائے تو اس سلسلے میں مزید معلومات بھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ امید ہے آپ کو میری اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ (مشورہ قابل غور ہے)“

☆ عمران جوانانی کا مکتوب کراچی سے ”مارچ اپریل کے مہینے میں الیکشن کی گہما گہمی عروج پر ہے۔ لیڈرز کی لوٹ پلوٹ لگی ہوئی ہے۔ ہر ساز اور ڈیزائن کے لیڈر دستیاب ہیں۔ اللہ مثبت اور برکتوں والی تبدیلی نصیب فرمائے۔ معراج صاحب نے گیس پائپ لائن منصوبے کے حوالے سے سچ کہا ”دیر آید درست آید“ والا معاملہ ہے۔ اب اس کا سارا بوجھ آنے والی حکومت کو عسکرت کے

ساتھ اٹھانا ہوگا۔ یک صفی سرگزشت کا عنوان حسب حال تھا، کچھ لوگوں کی زندگی محنت کا دوسرا نام ہے، وہ نہیں دیکھتے کہ زندگی نے انہیں کیا دیا بس اپنا کام کرتے چلے جاتے ہیں۔ ”قلی الف لیلہ“ میں اس مرتبہ آفاقی صاحب کے جادوئی قلم سے کراچی کا تفصیلی تذکرہ پڑھ کر بے انتہا خوشی ہوئی جس طرح آپ نے کچھ عرصہ قبل لاہور کے بارے میں تفصیل سے لکھا تھا کراچی کے بارے میں بھی پڑھ کر مزہ آگیا۔ ساتھ ہی اس زمانے کی یادگار تصویریں تھیں۔ میں نے اپنے بڑوں سے اس زمانے کے کراچی کا بار بار ذکر سنا ہے خاص کر 65 کی جنگ، ایوب صاحب کا دور، ان کا پسندیدہ اور دلچسپ موضوع ہے۔ آج وہ کراچی آبادی اور بدلتی کے بوجھ تلے دب چکا ہے۔ قیام پاکستان کے وقت کراچی کی زیادہ تر آبادی سیماڑی سے نمائش چوری کے درمیان تھی۔ ان علاقوں میں آج بھی گہرائی میں جا کر دیکھیں تو اس زمانے کی رمت باقی ہے۔ برنس روڈ، رنچو لائن، جوہی، سعید منزل کے علاقوں میں آج بھی قدیم درخت اور عمارتیں موجود ہیں مگر کسے فرصت ہے کہ آنکھ اٹھائے۔ مہناز صاحبہ کی وفات پر بہت سے مضمون لکھے گئے مگر جو بات آفاقی صاحب کے قلم میں ہے وہ کہیں اور نہیں۔ چکر م، کی داستان میں ایک جہاں آباد ہے۔ ایک ہی شمارہ میں آفاقی صاحب کی دوسری تحریر دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ بلکہ پچھلے انداز میں معلومات دینا اور قاری کو ساتھ لے کر چلنا آپ ہی کا خاصہ ہے۔ ترکی سے ویسے ہی مسلمانوں کی جذباتی وابستگی ہے۔ جبلت، صابٹیک کا مختصر لیکن اثر دار مضمون تھا۔ پورا منظر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اب آتے ہیں اس تحریر کی طرف جس نے سب سے زیادہ متاثر کیا ”ماضی تاحال“ مختلف پیرائے میں لکھی گئی اس تحریر نے آخر تک اپنے اثر میں جکڑے رکھا، انارکلی بازار اور لاہور کے بارے میں کافی کچھ پڑھا ہے پر اس سیر کا مزہ کچھ اور تھا، PTV کے ٹیلی ٹیمپ جیسا۔ سچ بیانیاں اس مرتبہ بھی ملی جلی تھیں، آخری سچ جیٹی محبت، سب سے زیادہ پسند آئی۔ حقیقت میں محبت نام ہی اس کا ہے جو بلا ارادہ بھی کسی سے ہو جائے اور اگر قسمت ساتھ دے تو کبھی نہ کبھی ملن ہوئی جاتا ہے ورنہ انسان یہی کہہ کر خود کو سولی دیتا ہے کہ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ شہر خیال کے حوالے سے آپ کے انتخاب کی داد دیتا ہوں، ڈاکٹر آراہم ای کا خط بجا طور پر کرسی صدارت کا حق تھا۔ ”انکار“ کے بارے میں آپ کے تبصرے نے ایک نئے انداز سے سوچنے پر مجبور کیا۔ آپ کی فہم و فراست اور مطالعہ کی گہرائی تحریر سے صاف ظاہر ہوتی ہے۔ انڈیا کے مسلمان اداکاروں کے حوالے سے تبلیغ مگر سچی باتیں کہیں، عام طور پر ہم لوگ ان کے بارے میں جذباتی ہو کر سوچتے ہیں۔ عبدالقیوم نے سرگودھا سے لکھا ہے کہ انہوں نے پورا شمارہ ایک ہی نشست میں پڑھا۔ بھائی میرے خیال میں تو یہ اپنی بیٹائی پر ظلم ہے بہر حال آپ کی لگن کی داد دیتا ہوں۔ رانا محمد جادو صاحب اسی طرح اہل وطن کو دعاؤں میں یاد رکھیں۔“

☆ احمد خان توحیدی نے کراچی سے لکھا ہے ”27 رمضان المبارک، بابرکت دن ملنے والی اسلامی مملکت کے موجودہ کرتا دھرتا اللہ تعالیٰ کی بجائے امریکا بھادر کے سامنے سرنگوں ہیں۔ 1990ء کا منصوبہ اب بھی زبانی جمع خرچ ہے۔ ایران، عراق، مشرق وسطیٰ سے تجارت پر تکلیف مگر انڈیا، اسرائیل کی سینہ زوری پر سکوت ہے۔ یہ مسلمانوں کی نا اتفاقی کا نتیجہ ہے۔ یک صفی زندگی کا زندانی، حسین آفٹھی کا نام یاد نہیں۔ قومی ہیر و ایم ایم عالم کی رحلت کی خبر ملی وی پر آئی تھی۔ اللہ رحمت بر سائے۔ ڈاکٹر ایم آراہی، کرسی صدارت پر نظر آئے۔ عالم فاضل کا لا جواب تبصرہ تھا، ڈبل مبارک۔ ساتھیوں کے تبصرے اچھے مگر طویل تھے۔ کراچی کے حالات واقعی اف ہائے کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ فرزند فرنگ، ڈاکٹر ساجد امجد کی لا روڈ ڈیوڑھی کو تاریخ میں پڑھا اچھی تحریر تھی۔ سات نامور عظیم لوگ، نور بانو کی لا جواب اور مع تصاویر مگر مختصر تحریر تھی۔ امداہام لکھن، پہلے امریکی صدر کے بارے میں صائمہ اقبال کی اچھی تحریر تھی۔ قلی الف لیلہ، آفاقی صاحب کی سولہ اصول تصاویر کے ساتھ دلچسپ تحریر تھی۔ ترکی نمی و انم، سفر نامہ بھی کمال کا ہے۔ دوسری قسط کا انتظار رہے گا۔ طارق عزیز کی دوسری قسط تلاش خوب رہی۔ جبلت، میں درندے پر اعتماد لے ڈوبا۔ عائشہ بخاری کا ماضی تاحال، انارکلی کو بہت پڑھا اور بازار بھی آنکھوں سے خوب دیکھا۔ تحریر اچھی ہے۔ تیرے جانے کے بعد، کے بارے میں یہی کہتا ہے کہ والدین کو چھان بین لازمی کرنی چاہیے۔ آسیہ کوہر کا مینھا پھل ملا۔ فریدہ، نجمہ، ارشد، مکافات عمل کی زد میں نظر آئے۔ گڈ اسٹوری۔ انتظار لا حاصل، پھر سے پیام و سلام شانی کی غلطی تھی۔ محبوبہ، ویری گڈ اسٹوری۔ واپسی، یاسمین کا زندگی سے بیزار غیر محرم افراد کے نجی معاملات میں دخل غلط اقدام ہے۔ غلطی، حشر نے والدین سے بغاوت کر کے عزت کی نیلامی کی، ساتھ نورنگ نے بھی خودکشی کی سزا پائی۔ مجرم کون، بے وفائی تنویر کی موت کا باعث بنی۔ جلساڑ، ایسے واقعات کراچی میں کثیر تعداد میں ہو چکے ہیں۔ عبدالقیوم کو ایمانداری کا نیک صلہ ملا۔ انوکھا بزنس، گندی اسٹوری صفحات کا ضیاع۔ محبت، ویری گڈ اسٹوری، عمران نے بیوہ رومی سے شادی کر کے نیک کام کیا۔ حضرت خدیجہ کی عمر رسول پاک سے پندرہ سال زیادہ تھی۔ بیوہ کا تجربہ اور سلیقہ اچھا ہوتا ہے۔ سراب پڑھنا باقی ہے۔ الیکشن سر پر ہے اللہ قوم کو صادق و امین قیادت کے انتخاب کی توفیق دے۔ (خط ربط میں لکھا کریں بے ربط خط رومی کی نوکری میں جگہ پاتا ہے)“

☆ ڈاکٹر روبینہ نقیس ثاقب انصاری کا بکھر سے پیام ”اپریل کا سرگزشت اپنی تمام تر آب و تاب کے ساتھ میرے ہاتھوں میں جگمگا رہا ہے۔ سرورق کے کونے میں ایک صاحب جو تے چوتھے نظر آئے (یہ وہ جو تے جسے حاصل کرنے کے لیے عالمی ماہنامہ سرگزشت

پینے پر فٹ بالرز سر دھڑکی بازی لگا دیتے ہیں) اعجاز حسین صاحب! یاد تو سب کو کرتے ہیں پھر بھی آج خصوصی طور سے اظہار کر رہی ہوں۔ اب تو خوش ہیں ناں۔ ہاں، یہ پہلی نہیں سرگزشت میں چھپنے والی دوسری کہانی ہے۔ دیگر پڑچوں میں چھپنے والی کہانیوں کو شامل نہیں کیا ہے۔ یہ والی کہانی پسند کرنے کا بہت شکر ہے۔ رانا شاہد، میں ہومیو ڈاکٹر ہوں اور اللہ نے ہاتھوں میں شفا بھی دی ہے کیونکہ میری ڈگری جعلی نہیں ہے۔ اسرار الحق کہانی پسند کرنے کا شکر ہے۔ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کس کھیت کی مولیٰ ہیں یعنی کس شہر کے ہیں۔ معراج الدین میری ذاتی رائے مردوں کے بارے میں یہ ہے کہ سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ آج کے دور میں بھی چند مرد بہت با وفا ہوتے ہیں اور بہت غلط بھی۔ ایم عمران جو نانی شکر ہے کہ آپ کو میرا خط سب سے زیادہ پسند آیا۔ چلو سب تالیاں بجاؤ۔ رانا سجاد اگر آپ نہیں چاہتے کہ میں عید کا چاند بنوں تو خوش ہو جائیں میں پھر آپ سب کے درمیان ہوں۔ سعید احمد چاند آپ بھی کوئی بھولنے والی چیز ہیں۔ کراچی ہی کیا پورے پاکستان کے حالات خراب سے خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ طاہر الدین صاحب کہانی پسند کرنے کا شکر ہے۔ ان دنوں میں بہت پریشان ہوں پلیز آپ سب میرے لیے دعا کرنا۔ کہانیوں میں غلطی اور محبت پڑھی۔ دونوں کہانیاں بہت اچھی تھیں۔“

☆ امجد شاہ، ٹھٹھہ سے رقمطراز ہیں ”اپریل کا شمارہ ہر لحاظ سے منفرد اور دلچسپ تھا۔ مسلم دوست مجھے بہت پسند آئی۔ انداز و بیانی بہت دلچسپ ہے۔ تلاش معلوماتی مضمون ہے۔ ترکی نمی و انم میں صرف الفاظ کا کھیل ہے۔ عام طور سے سرگزشت کے سفر نامے معلومات سے بھر پور ہوتے ہیں لیکن اس میں ایسا کچھ نظر نہیں آیا۔“

☆ ایم اے خالق، بھٹی، صدر پریس کلب اللہ آباد رحیم یار خان کا غلوں نامہ ”اس بار تو کمال ہو گیا۔ وقت نے چار دن پہلے شمارہ مل گیا۔ ہر کہانی خاص کہانی ثابت ہوئی، مسلم دوست کا تو جواب نہیں۔ فرزند فرنگ نے تاریخ یاد کروادی۔ ایام غلامی میں کیا کیا ستم ڈھائے گئے پڑھ کر بزرگوں سے سنے ہوئے واقعات ذہن میں تازہ ہو گئے۔ ماضی تاحال بھی کم دلچسپ نہ تھا، نہایت خوبصورت انداز میں زبردست لکھا گیا ہے۔ لگتا ہے عائشہ بخاری بہت منجھی ہوئی رائٹر ہیں۔ عظیم لوگ بھی جاندار کہانی تھی معلومات کا خزانہ تھا۔ لیکن کی لاش اور تلاش معلومات سے اتنی ہوئی کہانی تھی۔ ترکی نمی و انم پسند نہیں آئی۔ پسند اپنی، اپنی، خیال اپنا، اپنا اور اصل ہم لوگ معلوماتی مضامین پڑھنے کے عادی ہیں۔ جبلت بھی اچھی تھی کہ کسی کی جبلت کو بدلنا نہیں جاسکتا۔ ہمارے وہ قارئین جو اس بار ووٹ ڈالیں گے اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ جبلت کبھی نہیں بدلتی۔ اس لیے صرف ایمان دار اور با کردار کو ووٹ دیں۔ کہانیوں میں تیرے جانے کے بعد لا جواب سچ بیانی تھی۔ انتظار لا حاصل بھی دلچسپ لگی۔ جلساڑ نے بہت لطف دیا۔ محبت کا جواب نہیں، بہت دلچسپ اور معرکتہ آرا سچ بیانی تھی۔“

☆ احمد رشید جنجوعہ نے لاہور سے لکھا ہے۔ ”شمارہ اپریل میں فرزند فرنگ پڑھی۔ ہم نے آنکھیں کھولیں تو ملک آزاد تھا۔ غلامی کے آزار کا ہمیں پتا نہیں اس لیے ہم اپنی آزادی کی قدر و قیمت سے آگاہ نہیں۔ کاش آج کے یہ مفاد پرست سیاسی وڈیرے، چوہدری اور خان اس دور کی مشکلات کا ادراک کر سکیں۔ ہمارے بزرگوں نے کیسے کیسے مصائب برداشت کیے۔ دوسری کہانی جو مجھے بہت پسند آئی وہ مسلم دوست ہے۔ ماضی تاحال بھی دلچسپ تحریر ہے۔ سچ بیانوں میں تیرے جانے کے بعد اور محبت، پسند آئی۔ انتظار لا حاصل بھی اچھی کہانی تھی۔ جلساڑ پڑھ کر میں بہت دیر تک ہستار رہا۔ کیسی عیار لڑکی تھی کہ لباس چرانے کے لیے گھر سے باہر تک برہنہ چلی آئی۔ اللہ سب کو ہدایت دے، عقل دے۔“

☆ نسیم احمد کھرل کا کراچی سے خط اس بار محبت نے جینجوڑ کر رکھ دیا۔ اسے ابتدا میں ہونا چاہیے تھا پہلی کہانی کے طور پر۔ واپسی، انوکھا بزنس، مجرم کون بھی پسند آئی۔ تیرے جانے کے بعد بھی بہت اچھی سچ بیانی تھی۔“

تاخیر سے موصول مخطوط
عباس سید، تو سین مرتضیٰ (کراچی)، بگت غفار (لاہور)، نسیم شیخ پوری، امداد حسین (سکھر)، ارشد عباس (کوئٹہ)، نواز ش خان (سرگودھا)، اسرار احمد (منڈی بہاؤ الدین)، کرار حسین (سیالکوٹ)، شاعری قریشی (دینا پور)، مظفر جلالی (حیدر آباد)، خوشنود خان (جہلم)، آفتاب وٹو (گجرات)، ضیا الدین (کاموٹی)، ارشد شاہ (مظفر گڑھ)، نازنین قریشی (اسلام آباد)، ماہم واسطی (ملتان)، سید فصیح الدین، حیدر علی قریشی (اسلام آباد)، نگار حسین (دہلی یو اے ای)، ذیشان حیدر (فیصل آباد)، کاشف جواد (شیخوپورہ)، امیر احمد (بکھر)، نیاز احمد صدیقی (رحیم یار خان)

انسانی بقا اور اس کے ارتقا کے لیے تعلیم ایک جزو لاینفک ہے اور ساتھ ہی معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں اس کا کلیدی کردار ہوتا ہے۔ افراد، معاشرہ، ادارے اور حکومت اپنی اپنی غرض و غایت کے مطابق تعلیم سے توقعات رکھتے ہیں۔ والدین اپنی اولاد کی ایسی تعلیم و تربیت کے متمنی ہوتے ہیں جس سے ان کی اولاد کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو۔ ایک معلم کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بچہ اچھے اخلاق و کردار کا حامل ہو اور سبق کے مواد کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے۔ اہل سیاست کے نزدیک بچوں کی تعلیم و تربیت کا یہی منشا ہوتا ہے کہ اچھے شہری بنیں اور ملک کے نظام و قوانین کی من و عن پاسداری کریں اور ایک ذمے دار شہری کی طرح ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے اپنی خدمات پیش کریں۔ وہ بھی اسی غرض سے جہالت کے اندھیرے کو دور کرنے کی سعی میں تھا اور مروجہ طریقے کار کے مطابق تقاریر کرتا، عقل کی باتیں بقاتا، اور یہی بات ارباب اختیار کو پسند نہ آئی۔

اپنے ہاتھوں میں لہر کا پیالہ لے کر اس نے بتا دیا کہ علم کو موت نہیں ہے

تو تھی کہ اپنا یہ نام اسے برا لگتا۔ جلد ہی اس مینڈک نے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کر دیے۔ جس نے اس کا نام بگاڑا اس نے اس کا چہرہ بگاڑ دیا۔ جب دو تین لڑکوں کی اچھی طرح پٹائی ہو گئی تو سارے بد معاش متحد ہو گئے اور ایک دن سب اس پر ٹوٹ پڑے۔

وہ زخمی ہو گیا تھا۔ اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا اور وہ زمین پر لیٹا ہوا تھا۔ سارے لڑکے اسے مار پیٹ کر بھاگ چکے تھے۔ ایک لڑکا جو اسے مارنے والوں میں شامل نہیں تھا اس کے قریب آیا اور اسے سہارا دے کر اٹھانے لگا۔

”میرا نام کراٹھو ہے۔ مجھے اپنا ہمدرد سمجھو۔“

”میرا نام سقراط ہے۔“ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”مگر لڑکے مجھے مینڈک کہتے ہیں۔ تم مجھے اس نام سے کیوں نہیں پکارتے۔“

”تمہارا جھگڑا اسی بات پر ہوا ہوگا۔“

”ہاں۔ مگر اب سوچ رہا ہوں اس میں لڑنے کی کیا بات ہے۔ میں دوسروں سے ہر طرح سے مختلف ہوں۔ دوسرے صرف ایک ہی سمت دیکھ سکتے ہیں۔ میری آنکھیں ہر سمت دیکھنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ بھدی چپٹی سی ناک

اک تماشا تھا جو بچوں کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ مگر وہ تماشا نہیں تھا۔ دوسرے بچوں کی طرح ایک بچہ تھا۔ ایک طالب علم تھا جسے دوسرے والدین کی طرح اس کے والدین نے بھی اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔

پہلے ایک بچے نے دیکھا، پھر دوسرے نے اور پھر پورا اسکول اس کے گرد جمع ہو گیا۔ وہ طالب علم سے تماشا بن کر رہ گیا۔ بچے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں مینڈک کی آنکھوں کی طرح باہر نکلی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹ موٹے تھے اور اس کی چپٹی ناک یوں نظر آتی تھی جیسے کسی نے بچپن ہی میں اسے مروڑ کر رکھ دیا ہو۔ جس گوشت پوست سے وہ بنا تھا وہ دوسرے بچوں کے مقابلے میں زیادہ سخت معلوم ہوتا تھا۔

اسکول کے بچوں نے بہت جلد اس کے حسب حال اس کا نام ”مینڈک“ تجویز کر دیا۔

پہلے ایک بچے نے کہا، پھر دوسرے نے اور پھر پورا اسکول اسے مینڈک کہہ کر پکارنے لگا۔ وہ جس طرف سے گزرتا، مینڈک مینڈک کی صدا سنیں گونجے لگتیں۔ وہ شرمیلا بھی تھا اور کچھ خاموش طبع بھی لیکن اتنی عقل



میں لمبی ستواں ناک کے مقابلے میں سوگھنے کی قوت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ لڑکے اس لیے مجھ سے جلتے ہیں۔ یہ سب کچھ انہیں نصیب نہیں۔ یہ سب تو محض کھیتوں کے تیل ہیں جو ارد گرد نہیں دیکھتے بس سیدھے چلتے رہتے ہیں۔

”شاباش سقراط! تمہیں دوسروں کے کہنے کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ تم جو ہوسو ہو۔ اور مجھے اپنا دوست سمجھو۔“

اس دن کے بعد سے کرائٹا اس کا ہر وقت کا ساتھی بن گیا۔ چچی ناک والے مینڈک سقراط کا یہ اسکول ڈھائی ہزار سال پہلے (یعنی تقریباً چار سو پچاس سال قبل مسیح) کے قدیم شہر ایتھنز (یونان) میں واقع تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب روم کی حیثیت محض ایک غیر معروف قصبے کی سی تھی۔ انگلستان ملاحوں کی زبان زد ایک داستان سے زیادہ نہیں تھا اور امریکا گویا جو خواب تھا۔ مغربی دنیا کی نگاہیں بس یونان پر مرکوز تھیں جہاں فلسفی پیدا ہو رہے تھے، سائنس دان بھی اور شاعر بھی۔ روایتی میدانوں میں عقل کے گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ اسکولوں میں سورماؤں کے گیت پڑھائے جاتے تھے اور ورزش گاہ میں کشتیوں کے مقابلے ہوتے تھے۔

☆☆☆

سوفرونس کس ایتھنز کا مشہور سنگ تراش تھا۔ اس نے سنگ تراشی میں خوب پیسا کمایا تھا۔ ایتھنز کی مشہور ترین عمارتیں اس کے فن کی بہترین نمائش کرتی نظر آتی تھیں۔ مہارت سے تراشے ہوئے وہ کتبے اس کے فن کا کمال تھے جن پر قومی دستاویزات اور قوانین ثبت کئے گئے تھے۔ اس کا بیشتر وقت کاریگروں کے ساتھ گھر سے باہر گزرتا تھا لیکن کبھی کبھی اسے یہ کام گھر پر بھی کرنے پڑتے تھے۔

سوفرونس کس فیض اور نازک کاموں کے لیے یونٹی لیکوس کے پہاڑوں کا دودھیا، سفید چکنا سنگ مرمر استعمال کرتا تھا۔ اس کے اوزار وہی تھے جو اس کے باپ دادا استعمال کرتے چلے آئے تھے۔ نوکیلے ہتھوڑے جن سے پتھر توڑنے کا کام لیا جاتا تھا۔ خم دار تیشے جن سے پتھر کی سطح ہموار کی جاتی تھی۔ نوکدار برے جن سے وہ پتھروں میں سوراخ کرتا تھا۔ سقراط نے اپنے باپ کو یہ اوزار استعمال کرتے ہوئے سیکڑوں مرتبہ دیکھا ہوگا لیکن آج اسے اسکول میں ایک ایسا تجربہ ہوا تھا کہ وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

اس روز وہ اسکول سے آیا تو گھر کے محن میں سیدھا باپ کے پاس چلا گیا جہاں اس کا باپ فوارے کے لیے شیر کا سر بنارہا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنا محو تھا کہ اسے یہ معلوم

ہی نہ ہوسکا کہ سقراط کب آیا اور کب اس کے پاس بیٹھ کر اسے کام کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔

اس کا باپ چوکور، ٹیلی اور تیز سینوں سے کام لے رہا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا نازک اوزار سنبھال لیتا تھا۔ شیر کا منہ اور چچی ناک بن چکی تھی۔ اب خوفناک آنکھوں کا مرحلہ تھا جنہیں وہ بڑی مہارت سے تراش رہا تھا۔ سقراط کو یاد آیا کہ ابھی چند روز پہلے سنگ مرمر کا ایک گول ٹکڑا یہاں پڑا تھا۔ اس کے باپ نے اسے تراش کر شیر کی شکل دے دی ہے۔

سوفرونس کس نے کچھ دیر کے لیے ماتھے کا پسینا پونچھتے ہوئے ہتھوڑی ہاتھ سے رکھی تو سقراط کو کچھ پوچھنے کا موقع مل گیا۔

”آپ کو یہ اندازہ کس طرح ہو جاتا ہے تیشہ کہاں کہاں رکھیں اور اس پر کتنی سخت چوٹ لگائیں؟“

سوفرونس کس کے پاس اس سوال کا صحیح جواب شاید تھا ہی نہیں یا پھر ابھی اتنی فرصت نہیں تھی۔ اس نے پسینا صاف کیا اور پھر اوزار سنبھال لیے۔

سقراط کو یہ اچھا نہیں لگا کہ وہ سوال کرے اور اس کا باپ جواب نہ دے۔ اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

”بتائیے نا آپ کو کیسے اندازہ ہو جاتا ہے؟“

”اس سے پہلے تو تم نے یہ سوال کبھی نہیں کیا۔“

”مجھے شیر کی چچی ناک دیکھ کر یہ خیال آیا۔“

”تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ جب یہ فن میں تمہیں سکھاؤ گا تو اس سوال کا جواب تمہیں خود مل جائے گا۔“

”کیا یہ فن میں ابھی نہیں سیکھ سکتا۔“

”نہیں۔ ابھی تم اسکول جاؤ۔ ورزش کرو، کشتی لڑو، تلواریں چلانا سیکھو۔ جب تمہارے بازو مضبوط ہو جائیں گے تو یہ فن میں تمہیں خود سکھاؤں گا۔ جس طرح تمہارے دادا نے مجھے سکھایا تھا۔“

”میں بڑے ہونے تک جواب کا انتظار نہیں کر سکتا۔“

”تو بڑا ضدی ہے۔ جس بات کے پیچھے پڑ جاتا ہے پوچھے بغیر دم نہیں لیتا۔“ اس نے ایک مرتبہ پھر اوزار ہاتھ سے رکھ دیے۔

”یوں سمجھو، سب سے پہلے تمہیں شیر پتھر میں دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ محسوس کرو کہ شیر پتھر کے اندر قید ہے اور یہ طے کر دو کہ تمہیں اسے آزاد کرانا ہے۔ اب جتنی اچھی طرح تم شیر کو دیکھ سکو اتنے ہی یقین کے ساتھ تمہیں یہ بات معلوم

ہوگی کہ تمہیں تیشہ کہاں رکھنا ہے اور کتنی سخت چوٹ لگانا ہے۔ یہ سب آتا ہے مشق اور تربیت سے۔ ابھی تم پتھر توڑ دو گے اور اس کے اندر پیچھے ہوئے شیر کو بھی نقصان پہنچاؤ گے۔ بڑے ہو جاؤ پھر میں تمہیں خود پتھر سے شیر نکالنا سکھا دوں گا۔ اب یہاں سے بھاگو۔ تمہاری ماں آگنی ہے، اس کے پاس جا کر بیٹھو۔“

باپ کے کہنے کے باوجود وہ بڑی دیر تک وہیں بیٹھا رہا اور باپ کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ اس کی کچھ میں کچھ بھی تو نہ آسکا۔ پھر وہ اٹھ کر ماں کے پاس آ گیا۔

اس کی ماں کا نام ریتے فیتی تھا اور قرب وجوار میں وہ دائی کے کام میں بہت ماہر بھی جاتی تھی۔ اس کام کے لیے اور بھی عورتیں موجود تھیں لیکن بڑے بڑے گھرانوں میں ریتے فیتی ہی کو بلایا جاتا تھا۔ ابھی سقراط کو اتنا شعور نہیں تھا کہ ماں سے اس کی مہارت کے بارے میں سوال کرتا لیکن بہت بعد میں اس نے ماں سے بھی یہ سوال پوچھ ہی لیا تھا۔

”ماں تم یہ کام کس طرح کر لیتی ہو؟“

ماں نے جواب دیا تھا ”میں خود کچھ بھی نہیں کرتی۔ میں تو بچے کو آزاد کرانے میں اس کی مددگار بنتی ہوں۔“

وہ چپ چاپ آیا اور چمڑے کے بستر پر ماں کے برابر لیٹ گیا۔ باپ کی باتیں ابھی تک کانوں میں گونج رہی تھیں۔ آنکھیں بند کر کے ان سے کوئی مطلب نکالنے پر غور کرنے لگا اور پھر وہ بے خبر سو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو چراغ میں زیتون کا تیل ڈالا جا چکا تھا۔ محن سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے باپ نے کام بند کر دیا ہے اور اب وہ دوستوں سے گپ شپ کے لیے باہر جا چکا ہے۔

ایتھنز کے لوگ باتوں کے بہت شوقین تھے۔ بازاروں میں، ورزش گاہوں میں، دعوتوں اور محفلوں میں ہر طرف باتیں ہی باتیں تھیں۔ کھیل، سیاست، جنگ و امن ہر موضوع پر باتیں ہی باتیں۔ سوفرونس کس بھی اسی معاشرے کا حصہ تھا لہذا کام نمٹاتے ہی دوستوں میں جا کر بیٹھ جاتا تھا اور پھر رات گئے ہی لوٹا تھا۔

سقراط کی ماں اپنے شوہر کی واپسی تک سقراط کو دیوتاؤں کی کہانیاں سناتی تھی تاکہ دیوتاؤں کی محبت اس کے دل میں جاگزیں ہو اور اس کے کردار میں بہتری آئے۔ یہ دلچسپ کہانیاں سقراط کو اچھی بھی بہت لگتی تھیں۔

ریتے فیتی گوشت بھون کر لے آئی تھی۔ دونوں نے

ساتھ بیٹھ کر گوشت کھایا۔

کمرے میں چراغ ٹٹمارہا تھا۔ باہر دل و ہلا دینے والا اندھیرا تھا لیکن یہ ان کے لیے غیر معمولی بات نہیں تھی البتہ یہ غیر معمولی بات تھی کہ تیز ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ اب اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ سوفرونس کس کی واپسی تک نیند کی دیوی کو آواز نہ دی جائے۔

”شاید سمندر کا دیوتا پوزائیڈن کی بات پر ناراض ہے۔“

”جب وہ ناراض ہوتا ہے تو یہ ہوتا ہے۔“

”ہاں!“

”مگر وہ ناراض کیوں ہوتا ہے۔ دیوتاؤں کو تو ناراض نہیں ہونا چاہیے۔“

”تم ابھی چھوٹے ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھو گے۔“

”بتاؤ نا، پوزائیڈن کو غصہ کیوں آ جاتا ہے۔“

”چلو آج میں تمہیں یہی کہانی سناتی ہوں۔“

سقراط سنبھل کر لیٹ گیا۔

ریتے فیتی نے کہانی سنائی شروع کی۔

”اوڈی سیس جب بھی مصیبت میں مبتلا ہوتا تھا، عظیمند

استھیا کبھی چھپ کر اور کبھی دراز قامت خوبصورت عورت کے روپ میں اس کی مدد کرتی تھی۔

وہ جہاں بھی ہوتی اس کی فریاد سن کر اس کی مدد کو پہنچ جاتی۔ بعض اوقات یہ ہوتا تھا کہ اوڈی سیس کے مخالف دیوتا

استھیا کو مدد کرنے سے باز رکھتے تھے۔ ایسی حالت میں اوڈی سیس کو اکیلے ہی آفتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔

ایک بار سمندر کے دیوتا پوزائیڈن کے بیٹے سائی کلوپس سے اوڈی سیس کا مقابلہ ہو گیا۔ اوڈی سیس نے اسے اندھا کر دیا۔

اس نے یہ قدم اپنی مدافعت میں اٹھایا تھا لیکن اس سے غلطی یہ ہوئی کہ جوش میں آکر فخر کے ساتھ اس کا ڈھنڈورا پیٹنا پھرا۔

”کیا دیوتاؤں سے بھی غلطی ہوتی ہے۔“ سقراط نے بیچ میں ٹوکا۔

”اگر تم نے بیچ میں ٹوکا تو میں آگے نہیں سناؤں گی۔“

”اچھا سناؤ۔۔۔۔۔ میں نہیں بولوں گا پھر کیا ہوا۔“

”ہونا کیا تھا۔ سائی کلوپس نے اپنے باپ سے شکایت کی اور اس پر زور دیا کہ وہ اوڈی سیس سے بدلہ لے۔

پوزائیڈن نے اس دن کے بعد سے یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ وہ جب بھی اوڈی سیس کو سمندر میں دیکھتا تو ایک طوفان

اٹھا دیتا۔ اوڈی سیس کو گرفتار نہ کر سکتا تو جہاز کے کپتان اور ملاحوں کو سزا دیتا کہ انہوں نے اوڈی سیس کو پناہ کیوں دی۔ ایک مرتبہ اسی بنا پر اوڈی سیس کے جہاز سے اترتے ہی اس کے جہاز کو پتھر میں تبدیل کر دیا۔ جہاز پانی میں بیٹھ گیا اور ایک جزیرہ بن گیا تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں کہ پانی کے دیوتا کے دشمنوں کی مدد کرنے والوں کا یہ حشر ہوتا ہے۔

”کیا دیوتا بھی انسانوں کی طرح ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں اور آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں۔ انہیں تو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔“

”خبردار! دیوتاؤں کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کرتے۔ تمہاری طرح کئی اور لوگ بھی دیوتاؤں کے بارے میں ایسی باتیں کرتے تھے۔ اسی لیے دیوتاؤں نے انسانوں میں آنا چھوڑ دیا ورنہ کچھ برس پہلے تک جن لوگوں کو وہ پسند کرتے تھے ان کی مدد کو آیا کرتے تھے۔ وہ آپس میں اپنے لیے نہیں ہم جیسے انسانوں کے لیے لڑتے جھگڑتے تھے۔ ایسا ہی ایک واقعہ تمہاری پیدائش سے دس بارہ سال پہلے ہوا تھا۔“

”اچھا وہ کیا واقعہ تھا؟“

”ایران کے بادشاہ نے یونان پر حملہ کر دیا تھا۔ ایران کی ٹنڈی دل فوج یونان پر ٹوٹ پڑی۔ یہ فوج تعداد میں اتنی تھی کہ ان کی پیاس بجھاتے بجھاتے دریا خشک ہو گئے۔ تیراں کثرت سے برس رہے تھے کہ سورج نظر نہیں آتا تھا۔ ایران کے بادشاہ نے بیلنس پولٹ پر کشتیوں کا ایک پل بنوایا لیکن یہ پل سپاہیوں کے بوجھ سے ٹوٹ گیا۔ شہنشاہ کو اپنی طاقت کا اتنا غرور تھا کہ اس نے پانی کو اس طرح کوڑے لگوائے جیسے سمندر اس کا نافرمان غلام ہو۔

دیوتاؤں کو اس کا یہ غرور قطعی پسند نہ آیا۔ یہ جنگ انسانوں کی تھی لیکن دیوتا بھی اس میں شامل ہو گئے۔ دیوتا تو اس کا ساتھ دیتے ہیں جو حق پر ہوتا ہے۔ ایرانیوں نے غرور کیا تھا۔ دیوتاؤں کو انہیں اس کی سزا دینی تھی۔ وہ یونانیوں کی مدد کو مل گئے۔ جب یونانی بیڑے کا ایرانیوں سے مقابلہ ہوا تو دیوتا یونانیوں کے ساتھ تھے۔

ایران کا شہنشاہ سمندر کے کنارے زرق برق لباس پہنے اپنے تخت پر بیٹھا لڑائی دیکھ رہا تھا۔ ایرانیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان کی فتح یقینی تھی لیکن اچانک پانسہ پلٹا اور انہیں پسپا ہونا پڑا۔ یہ سزا انہیں اس لیے بھی ملی کہ انہوں نے ایکرو پولس کے مندروں کو جلا کر خاک کر دیا تھا۔

ان کے جہاز ٹکڑوں کی طرح پانی میں تیرتے رہے اور

پھر ڈوب گئے۔ ان کے سورما بڑی تعداد میں قتل ہوئے۔ یہ دیوتاؤں ہی کا کرشمہ تھا کہ ایران میں بغاوت ہو گئی لہذا شہنشاہ کو یونان چھوڑ کر اپنی سلطنت کی طرف بھاگنا پڑا۔

”کیا تم اب بھی شک کرو گے کہ دیوتا، انسانوں کی مدد نہیں کرتے۔ تمہارا باپ جو پتھروں کا سینہ چیر کر نقش و نگار بناتا ہے یہ بھی دیوتاؤں کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔“

اتنی کہانیاں سننے کے بعد بھی سوفرونس کس گھر نہیں لوٹا تھا۔ اب ریتے فیتی کو اپنے شوہر پر غصہ آنے لگا تھا۔ بھلا کوئی اتنی رات تک بھی گھر سے باہر رہتا ہے۔ تھوڑی دیر میں چراغ کا تیل بھی ختم ہو جائے گا۔ اس نے سقراط کو حکم دیا کہ وہ اپنے بستر پر چلا جائے۔

سقراط کو بستر پر گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ صحن میں آہٹ ہوئی۔ اس کا باپ گھر میں داخل ہوا تھا۔ ریتے فیتی اس سے خفا تھی لیکن اس نے اندر آتے ہی ایک ایسی بات کہہ دی کہ اس کا غصہ جاتا رہا۔

”سقراط کی ماں، کیا ہم مذہب سے اتنی دور ہو گئے ہیں کہ ہمیں مذہبی تہوار بھی یاد نہیں رہتے۔“

”میں تو یاد رکھتی ہوں آپ ہی بھول جاتے ہیں۔“

”پھر بتاؤ، اب سے دس دن بعد کون سا تہوار آنے والا ہے۔“

”گھر کے کاموں کا براہو۔ میں بھی بھول گئی۔“

”اتھینا کے بت کو غسل دینے کا تہوار ہے۔ مجھے ابھی دوستوں نے بتایا ہے۔ وہ سب تیاری کر رہے ہیں اور ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں، ہمیں یاد ہی نہیں۔“

”خیر ابھی تو دس دن ہیں۔ میں تیاری کر لوں گی۔ قربانی دینا ہے، نذر چڑھانی ہے۔ سب ہو جائے گا۔“

”اس مرتبہ سقراط کو بھی ساتھ لے کر جائیں گے۔“

پچھلے سال یہ بیمار ہو گیا تھا۔ اب بڑا بھی ہو گیا ہے۔ پیدل چل سکتا ہے۔“

سقراط سویا نہیں تھا۔ تمام باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا اور دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اسے مندر جانے کا موقع ملے گا۔ یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ دوسرے دن وہ اسکول گیا تو اسکول سے کچھ فاصلے پر کراٹھو اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

”دوست، آج ہم دونوں مل کر اسکول چلیں گے تاکہ لڑکے تمہیں مینڈک کہہ کر پریشان نہ کریں۔ تمہیں معلوم ہے میں کتنی اچھی کشتی لڑتا ہوں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے۔ سارے ہی لڑکے مجھ سے ڈرتے ہیں۔“

وہ دونوں اسکول کی طرف بڑھے۔ بہت سے لڑکے جمع تھے۔ کراٹھو اس کے ساتھ دیکھ کر سب چپ ہو گئے۔ کسی نے دبے لفظوں میں ”مینڈک“ کا نعرہ لگایا بھی تو کراٹھو نے اسے نظر انداز کر دیا۔

موسیقی کی کلاس تھی۔ موسیقی کا بوڑھا استاد گلاس کلاس میں داخل ہوا تو تمام لڑکے اس کی تعظیم میں کھڑے ہو گئے۔ گلاس نے اپنا ڈنڈا ایک طرف رکھا جو وہ لڑکوں کو ڈرانے کے لیے ہمیشہ اپنے ساتھ لاتا تھا۔ کراٹھو اور سقراط ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ گلاس نے ہومر کے اشعار ایک خاص دھن میں پڑھنا شروع کیے۔ ان اشعار کو لڑکے اس کے ساتھ ساتھ دہراتے جا رہے تھے۔

”بہادر! کی لیز بادشاہ سے الجھ پڑا جنگ کرنے سے انکار کر دیا بادشاہ نے اس کی جگہ اس کے دوست کو بھیج دیا جب یہ دوست جنگ میں مارا گیا تو ایک لیز کو جنگ میں شامل ہونے سے کوئی نہ روک سکا اس کی ماں بھی نہیں جو ایک دیوی تھی اس کی ماں نے اسے روکا کہ وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے مجھے مرنا قبول ہے لیکن میں دوست سے غداری نہیں کر سکتا

اگر میں نے اس وقت لڑائی سے جان چرائی تو میں زمین کا بوجھ بن کر رہ جاؤں گا ایک لیز نے کہا اے ماں جو تم کہہ رہی ہو وہ لفظ بہ لفظ ٹھیک ہے عنقریب میرے کھوڑے میرا ماتم کریں گے لیکن میں اپنے دوست سے غداری نہیں کر سکتا اب یہ جنگ بادشاہ کی نہیں میری ہے کراٹھو نے پسندیدہ نظروں سے سقراط کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو تمہیں یہ اشعار کیسے لگے۔

”کتنے حسین اشعار تھے یہ لیکن گلاس کے ڈر سے میں زیادہ تعریف نہیں کر سکتا۔“ سقراط نے کہا اور دوبارہ گلاس کی طرف دیکھنے لگا۔

گلاس ختم ہوئی تو تمام لڑکے ورزش گاہ کی طرف چل دیے جہاں کشتی کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ ننھے پہلوان زور آزمائی کرتے تھے۔

کشتی کے فن میں کراٹھو کا بڑا نام تھا۔ ابھی اس کا ابتدائی زمانہ تھا۔ کسی بڑے کھیل میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ آگے چل کر وہ بہت نام پیدا کرے گا۔

سقراط اکھاڑے کے کنارے بیٹھا کراٹھو کو لڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کراٹھو کا مقابلہ آج دوسرے شہر کے پہلوان لڑکے سے تھا جو کراٹھو کو بار بار اٹھا کر بیچ رہا تھا۔ سقراط دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ کراٹھو کو فتح ملے۔ اس کی عادت تھی کہ جب خوش ہوتا تھا تو دعا مانگنے لگتا تھا۔

کراٹھو اس پہلوان سے مسلسل دب رہا تھا لیکن اچانک اس کے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اب وہ اپنے حریف پر حاوی ہو گیا تھا۔ پورا اکھاڑا تالیوں اور سیٹوں کے شور سے گونج رہا تھا اور پھر کراٹھو نے اپنے حریف کو اٹھا کر پٹھا اور اس کے سینے پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

کشتی ختم ہونے کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کپڑے بدلنے کے کمرے میں آ گئے۔ سقراط کا بد صورت چہرہ اندرونی خوشی سے دمک رہا تھا۔

”یار کراٹھو، کتنی حسین کشتی ہوئی۔“ سقراط نے کہا۔ ”اور وہ تقریر بھی حسین تھی جو ہومر کے اشعار میں ایک لیز نے کی تھی۔ یہ اس کشتی سے مختلف بات تھی لیکن تھی حسین۔ میں سوچتا ہوں دونوں میں کیا فرق تھا۔“

اور پھر وہ سوچتے لگا۔ کراٹھو کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ سقراط کو سوچتے ہوئے دیکھتا رہتا۔ اس نے اسے جھنجھوڑا اور باہر آیا لیکن اب سقراط کے بجائے کراٹھو سوچ رہا تھا کہ لفظ حسین سے سقراط کا کیا مطلب ہے اور وہ بار بار اس لفظ کو کیوں دہرا رہا ہے۔

وہ گھر کی طرف واپس ہوا تو سالانہ تہوار کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ دیوی ایتھینا کے بت بنائے جا رہے تھے۔ ایک جگہ کچھ بوڑھے بیٹھے پانے ڈال رہے تھے۔ کچھ نوجوانوں کو دیکھا کہ بدن پر تیل کی مالش کر کے فرائے بھرتے گھڑ دوڑ کے میدان کی طرف چلے جا رہے تھے۔ ایک میدان میں دھات کا طشت گھما کر پھینکنے کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر ان کھلاڑیوں کے دل پزیر توازن کا مظاہرہ دیکھتا رہا۔ رات کو مشعلیں اٹھا کر دوڑنے کا مقابلہ ہوتا تھا جس کی تیاریاں ابھی سے ہو رہی تھیں۔ وہ رات تک یہاں نہیں ٹھہر سکتا تھا اس لیے گھر کی طرف چل دیا۔ گھر پہنچ کر اس نے اپنی ماں کو بھی ان تیاریوں میں مشغول دیکھا۔ لکڑی کا بنا ہوا ایتھینا کا بت صحن

میں رکھا ہوا تھا۔ ایک بڑے مرتبان میں زیتون کا تیل تھا جو پرستش کے دن لکڑی کے بت پر بہایا جاتا۔

اس نے راستے میں ہونے والی تیاریوں سے ماں کو آگاہ کیا۔ وہ بھی مذہبی جذبات سے اتنی مغلوب تھی کہ بڑی دیر تک دیوی اتھنیا کی تعریف و توصیف کرتی رہی۔

”ایتھنز میں شمال کی طرف ایک پہاڑی ہے جسے ”شہر کی چھت“ کہا جاتا ہے۔ اسے نہایت مقدس سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہاں سمندر کے دیوتا اور دیوی اتھنیا کا مقابلہ ہوا تھا۔ شہر کی سرپرستی کا مقام حاصل کرنے کے لیے دونوں تحائف پیش کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔ سمندر کے دیوتا پوزائیڈن نے تختے میں جنگی گھوڑا دیا تھا۔ اس نے اپنی دو شاخہ چھتری زمین پر ماری تو وہاں ایک چشمہ ابل پڑا۔ وہ چشمہ اب تک موجود ہے۔ ہماری دیوی اتھنیا نے زیتون کا تھنہ دیا تھا۔ اس چشمے کا بھلا زیتون سے کیا مقابلہ۔

اتھنیا شہر کی دیوی ہو گئی اور ایتھنز زیتون کے باغوں سے بھر گیا۔ تم دیکھ رہے ہو آج تک یہ زیتون ہمارے کتنا کام آ رہا ہے۔

اہل فارس کا براہو کہ انہوں نے ایتھنز پر حملہ کر دیا اور بد بختوں نے اتھنیا اکیرو پولس کے مندر کو جلا کر خاک کر دیا۔ اس کے ستونوں میں اب تک دھواں بھرا ہوا ہے۔ تم وہاں جاؤ گے تو خود دیکھو گے۔ اتھنیا کے ہم اہل ایتھنز پر بہت احسان ہیں۔ اس کی پرستش کرنا اور نذر چڑھانا ہم پر فرض ہے۔ اس لیے ہم ہر سال یہ تہوار مناتے ہیں۔ ہمارا رہنما فارقلیس اب ان ستونوں کو دوبارہ تعمیر کرانا چاہتا ہے۔ دیوتا اس کی مدد ضرور کریں گے۔“

”ماں، تم کیا قربانی دو گی۔“

”دیکھو ابھی تو کچھ طے نہیں ہوا۔“

”میں وہاں ہڈیوں کا پانسہ پھینکنے والی ٹولی میں شامل ہو جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے، تم جو چاہو کھیل کھیلنا۔“

اس وقت یہی طریقہ کار تھا۔ انفرادی عبادت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اجتماعی پرستش ان کا تصور عبادت تھا۔

جیسے جیسے تہوار کے دن قریب آ رہے تھے، ایتھنز کا شہر ایک بڑے میلے کا روپ دھارنے لگا تھا۔ سوانگ بھرے جا رہے تھے، دکانیں بج گئی تھیں۔ دن دن بھر لڑکے ادھر سے ادھر دوڑتے پھرتے تھے۔ سقراط بھی ان ٹولیوں میں

شامل ہو کر اتھنیا دیوی کے نعرے بلند کرتا پھر رہا تھا۔ آخر وہ دن آ گیا جب اسے اپنے ماں باپ اور بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ جلوس کی شکل میں مندر کی طرف جانا تھا۔ اس کی ماں نے اس کے چہرے پر طرح طرح کے رنگ پھیر دیے۔ اس کا چہرہ مزید بھیا تک ہو گیا۔ اتنا بھیا تک کہ جلوس میں شامل لڑکوں نے اسے دیکھا تو ان کی ہنسی نکل گئی۔ بچے تو بچے بعض بڑے بھی اپنے چہروں پر لال پیلے رنگ لگائے ہوئے تھے۔ اچھلتے کودتے عجیب و غریب حرکتیں کرتے جا رہے تھے۔ سقراط کے دل میں بھی تو عقیدت جگہ بنا لیتی تھی کبھی سوچنے لگتا تھا کہ یہ سب ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ رنج اسے اس بات کا تھا کہ اس دیوی کی وجہ سے لڑکوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع مل رہا ہے۔ وہ کبھی اپنی ماں کی انگلی تھام لیتا، کبھی انگلی چھڑا کر بیٹھڑ میں گم ہو جاتا۔ بالآخر وہ جگہ آگئی جہاں جلوس میں شامل لوگوں کو بھیئت چڑھانی تھی اور دیگر رسوم ادا کرنی تھیں۔

وہ راستے بھر اپنی بد صورتی کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ لڑکوں کی ہنسی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی لہذا جب اس کی ماں نے اسے دعا مانگنے کے لیے کہا تو بد صورتی سے نجات کی دعا اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔

”میری شکل تو اب بدل نہیں سکتی۔ میرے باطن کو حسین بنا دے۔ مجھے عقل کی دولت عطا ہو اور ایسی متوازن روح بھی نصیب ہو جو عقل کی دولت کا بوجھ اٹھا سکے۔ دیوتاؤں کو غرور ناپسند ہے۔ مجھ میں کبھی غرور نہ پیدا ہو۔“

یہ دعا اس کی طبیعت کے عین مطابق تھی۔ بہت دن سے وہ اس بات پر غور کر رہا تھا کہ حسن کی حقیقت کیا ہے۔

حسین ہونے کے اصل معنی کیا ہیں۔ اس کے ذہن میں اب بھی کوئی واضح تصور نہیں تھا۔ پھر بھی اتنا سمجھ سکا تھا کہ اچھی عادتیں حسن ہیں۔ اسی لیے اس نے دعا مانگی تھی کہ اس کا باطن حسین ہو۔

اس کی عمر بڑھتی جا رہی تھی۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کی الجھنوں اور سوالوں کا سلسلہ بھی دراز ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی الجھنوں کو دور کرنے کے لیے مختلف لوگوں سے ملنے بھی لگا تھا۔ ان میں ایک ماؤس کہہ رہی تھا۔ خوبصورت برتن بنانے کی وجہ سے سارے ایتھنز میں اس کی شہرت تھی۔ سقراط اب یہ سوچنے لگا تھا کہ برتن تو سب بناتے ہیں پھر ماؤس کے برتن خوبصورت کیوں ہوتے ہیں۔ ان میں وہ کیا بات ہوتی ہے جو انہیں ”حسین“ بناتی ہے۔ یہ بات معلوم ہو جائے تو

حسن کی حقیقت بھی ظاہر ہو جائے گی۔ کرائٹو دیکھ رہا تھا کہ سقراط بہت خاموش رہنے لگا ہے۔ ہر وقت کچھ سوچتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ کبھی اس خاموشی کی وجہ پوچھو بھی تو ناٹ جاتا ہے۔

ایسے خاموش دوست کی صحبت میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ پھر ایک دن سقراط نے اسے اس قید سے نجات دلائی۔ وہ دونوں اسکول سے نکلے تھے کہ آٹھ راستے کو چھوڑ کر وہ کرائٹو کو لے کر کسی دوسری سڑک پر چل دیا۔

”یہ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“ کرائٹو نے کہا۔

”اپنے ایک دوست سے ملوانا ہے۔“

”اس سے پہلے تو تم نے کبھی تذکرہ نہیں کیا کہ تمہارا کوئی اور دوست بھی ہے۔“

”ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔ آج وہ وقت آ گیا ہے کہ تم اس سے ملو۔“

کرائٹو کو کبھی کبھی اس سے ڈر لگنے لگتا تھا۔ یہ وقت وہی تھا۔ سقراط اپنی عمر سے بہت بڑی باتیں کر رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگا۔

ماؤس کی دکان کے سامنے جب سقراط رکا تو کرائٹو کو سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ اس دکان کے سامنے سے کئی مرتبہ گزرا تھا لیکن کبھی اندر نہیں گیا تھا۔ اسے خوشی ہو رہی تھی کہ وہ سقراط کے ساتھ ماؤس کہہ رہا ہے۔ سقراط ہی ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ سقراط نے اس سے کس طرح آشنائی پیدا کر لی کیونکہ ماؤس بہت تک چڑھا سمجھا جاتا تھا۔ کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتا تھا۔

جب وہ دونوں اندر گئے تو ماؤس کہہ رہی تھی کہ ایک بڑا سا ڈھیر چاک پر چڑھا رکھا تھا۔ سقراط نے کرائٹو کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اسے لے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ ماؤس کہہ رہی تھی کہ چاک گھوم رہا تھا۔ اس کے ہاتھ مٹی کو کبھی لبا کر دیتے تھے کبھی پھر نیچے بٹھا دیتے تھے۔ اس کے برابر ایک لڑکا کھڑا تھا جو برابر چاک کو گھمائے جا رہا تھا۔ لڑکا ایک تبدیلی واقع ہوئی۔ ماؤس نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور مٹی میں انگوٹھے گاڑ دیے۔ دیکھتے دیکھتے برتن کی شکل ظاہر ہونے لگی۔ سقراط تو یہ منظر شاید پہلے بھی دیکھ چکا ہو لیکن کرائٹو کے لیے یہ بالکل نئی بات تھی۔ جو کچھ نہیں تھا وہ اب تھا۔ مٹی کا ڈھیر برتن کی شکل میں ظاہر ہو گیا تھا۔ جیتا جاگتا، بالکل کسی جاندار کی طرح۔

تھوڑی دیر کے لیے کچھ تاپنے کے لیے چاک کو روکا تو سقراط کو موقع مل گیا۔

”ماؤس یہ حسین ہے۔“ سقراط نے کہا۔

”ہاں تم اسے حسین کہہ سکتے ہو حالانکہ اس میں ابھی بہت کام باقی ہے۔“

”یہ اب بھی حسین ہے۔“ سقراط نے پھر کہا۔

”میرا ابھی یہی خیال ہے۔“ ماؤس نے برتن کی گردن پر ہاتھ پھیرا۔ ”اور وہ برتن بھی حسین ہے جو وہاں رکھا ہے۔ جو برتن تم نے کل دیکھا تھا وہ حسین نہیں تھا۔ وہ مجھ سے خراب ہو گیا تھا حالانکہ اس کا عیب پوشیدہ تھا۔ عام آدمی کی سمجھ میں نہیں آ سکتا تھا۔“

”لوگ ہمیشہ یہی کرتے ہیں جو تم کر رہے ہو۔ دو چیزوں کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں کہ یہ حسین ہیں۔ میں تو یہ جاننا چاہتا ہوں کہ دونوں میں کیا قدر مشترک ہے جس کی وجہ سے یہ دونوں برتن حسین ہیں۔ حسن ہے کیا؟ تم حسین چیزیں بناتے ہو۔ تم ہی اس کا جواب دے سکتے ہو۔“

”سقراط! مجھے یہ معلوم نہیں۔ میں تو صرف اچھے برتن بناتا ہوں اور یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک اچھا بے عیب برتن حسین برتن ہوتا ہے۔“

”لیکن ماؤس! وہ اچھا کیوں ہوتا ہے؟“

”اچھا برتن وہ ہوتا ہے کہ جس کام کے لیے بنایا گیا ہو وہ کام اچھی طرح انجام دے۔ اب اس صراحی کو لے لو اگر اس کا نچلا حصہ بڑھا دو تو لڑھک کر گر پڑے گی اور ساری شراب بہہ جائے گی۔ پھر اسے اچھی صراحی نہیں کہا جاسکے گا۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ چیز اچھی ہو تو حسین اور کارآمد ہوتی ہے۔“

”میرا ابھی یہی خیال ہے پیارے سقراط۔“

”اب ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ سب اچھی صراحیوں کیوں نہیں بناتے۔“

”شاید اس لیے کہ انہیں اچھی صراحی بنانے کا قاعدہ معلوم نہیں ہوگا۔“

”اگر انہیں یہ قاعدہ معلوم ہو جائے تو کیا وہ بھی اچھی صراحیوں بنا سکتے ہیں لیکن یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ یہ قاعدہ یا نقشہ بنایا کس نے۔“

”برتن بنانے والے مدت سے یہ کام کر رہے ہیں۔“

”صراحیوں کا نقشہ تمہارے ذہن میں آتا کہاں سے ہے۔“

”مجھے یہ معلوم نہیں کہ کیسے اور کہاں سے آتا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم یہ کام سیکھ لو پھر تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔“

دو پہر بھر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب وہ وہاں سے اٹھے تو کرائٹو کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ ایتھنز میں ایک نیا

فلسفی پیدا ہو چکا ہے۔

انہی سوال و جواب میں دن گزرتے گئے۔ وہ شہر کے عقل مندوں میں اٹھتا بیٹھتا رہا اور اپنے اندر اٹھنے والے سوالوں کے جواب تلاش کرتا رہا۔

اس وقت کا قاعدہ ہی یہ تھا کہ باپ کا پیشہ بیٹا اختیار کرتا تھا لہذا جب اس کی عمر تیرہ چودہ سال کی ہوئی تو اس کے باپ نے اسے اسکول سے اٹھالیا۔

سقراط کو اسکول چھوڑنے کا ذرا بھی رنج نہ ہوا۔ اسکول سے جتنا فائدہ اسے اٹھانا تھا اس نے اٹھالیا تھا۔ پرانے سوراخوں کے گیت اس کے کانوں میں پڑ چکے تھے۔ کشتی لڑنے، دوڑنے اور ورزش گاہ کے کھیلوں کی تربیت حاصل کر لی تھی۔ وہ کسی فن میں اچھا کھلاڑی تو نہیں بن سکا تھا لیکن معمولی واقفیت ضرور حاصل ہو گئی تھی۔

اب اسے سنگ تراشی کا پیشہ اختیار کرنا تھا کیونکہ اس کے باپ کے بقول اس کام میں بہت پیسا تھا۔ سقراط کو یہ دلچسپی تھی کہ وہ پتھر میں چھپی ہوئی چیزوں کو نمودار ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔ ماؤس کہہ رہی باتیں ابھی تک اس کے ذہن میں تازہ تھیں۔

وہ اپنے باپ کے پاس کام کرنے بیٹھا تو عرصہ دراز تک صرف تراش خراش کے ابتدائی کام کرتا رہا۔ اس کا باپ ابتدا ہی میں کوئی بڑا کام اس کے ہاتھ میں دے کر سنگ مرمر جیسی قیمتی چیز کو ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سطح کے ہموار ہو جانے کے بعد جب اصل کام شروع ہو جاتا تو سقراط کا باپ خود کام کرنے لگتا اور سقراط ایک ایک کر کے اسے اوزار دیتا رہتا اور باپ کی ہدایت کے مطابق کام کو فور سے دیکھتا رہتا۔

پتھروں کے اندر سے کئی قابل شناخت چیزیں برآمد ہونیں تو سقراط کے دل میں امنگوں اور ولولوں کی لہریں اٹھنے لگیں۔ اسی طرح کسی دن میرے سوالوں کے جواب بھی قید سے رہائی پالیں گے۔

ایک سال کے اندر ہی اس کے باپ نے اندازہ لگا لیا کہ سقراط میں ایک اچھا سنگ تراش بننے کی صلاحیت نہیں۔ اس کی وجہ کام چوری نہیں تھی بلکہ وہ محتاط نہیں تھا۔ ہر وقت یہ ڈر رہتا تھا کہ تھوڑے کی سخت ضرب سے وہ پتھر ہی نہ توڑ دے۔

سقراط کو بھی اپنی اس بے احتیاطی کا علم تھا لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ یہاں تک کہ باپ کے سامنے بھی نہیں کیونکہ یہ کسی جرم سے کم نہیں تھا کہ وہ آبائی پیشہ ترک کر کے

کوئی اور کام سیکھ لے۔ اس پر لازم تھا کہ آبائی پیشہ ہی اختیار کرے اور بس لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کی مہارت انسان سے متعلق تھی پتھر سے نہیں۔ اسے کام سے زیادہ گاہکوں سے مل کر اور ان سے باتیں کر کے خوشی ہوتی تھی۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں یہ خواہش شور مچانے لگی تھی کہ باہر نکل کر دیکھے دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔

سقراط کا زمانہ وہ تھا جب ایتھنز میں نئے نئے تجربے ہو رہے تھے۔ اہم خیالات اور تصورات کی چھان بھونک ہو رہی تھی اور اتنی خوبصورت چیزیں بن رہی تھیں کہ دوسرے شہر اس کا عشرِ عشر بھی پیش نہیں کر سکتے تھے۔ سو فرانس کس کے پاس جو گاہک آتے تھے، سقراط ان سے دنیا جہان کی باتیں کرتا تھا۔ اس سال اولیک مقابلوں میں کشتی کون جیتے گا؟ فارقلیس کی جیوری آج کل کیا سوچ رہی ہے۔

جب وہ کچھ اور بڑا ہو گیا اور باپ کی گرفت اس پر کمزور ہو گئی، آزادانہ گھومنے پھرنے لگا تو وہ ایتھنز کے شہریوں کی مجلس میں جو بازار کے قریب ایک پہاڑی پر منعقد ہوا کرتی تھی، وہاں جا کر بیٹھنے لگا۔ ان مجالس میں صقلیہ، مصر، ایشیائے کوچک اور بحیرہ اسود کے مسائل زیر بحث آتے رہتے تھے۔ باہر سے آنے والوں میں ایرانی بھی شامل تھے اور وہ ملاح بھی جو جنوبی روس کی بندرگاہوں سے اس طرح واقف تھے جس طرح اپنی بندرگاہوں سے۔ وہ اپنے سفر کے تجربات سناتے تھے۔ سقراط یونان سے باہر کی دنیا سے بھی واقف ہوتا جا رہا تھا۔

بحیرہ روم کے تمام علاقوں کے فنکار اور کاریگر ایتھنز میں آتے تھے۔ وہ لوگ ان کے علاوہ تھے جنہیں خود ایتھنز کی سرزمین نے جنم دیا تھا۔ شاعر، موسیقار، انجینئر، معمار، تاجر۔ سقراط کو ان دلچسپ ترین لوگوں کو دیکھنے اور سننے کے لیے کہیں دور جانا نہیں پڑا۔ یہ نمائش اس کے شہر میں لگی ہوئی تھی۔

ان ملاقاتوں اور باتوں نے سقراط کی طبیعت پر تازیانے کا کام کیا۔ وہ ان باتوں کو دوسرے نوجوانوں کی طرح صرف سنتا نہیں تھا بلکہ ان پر غور کر کے اپنے ذہن میں خیالات کو مرتب کرتا تھا۔ وہ بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ لوگ بس باتیں کرتے ہیں، ان پر غور نہیں کرتے۔ بس قصہ بیان کر دیتے ہیں۔ سوال سے سوال پیدا نہیں کرتے تاکہ بات کی تہ تک پہنچ سکیں۔ اب وہ بچہ نہیں رہا تھا کہ لوگ اس کی بات کو نظر انداز کر دیں۔ اس نے گفتگو کا مخصوص انداز

اختیار کیا۔ وہ لگاتار ایک سوال کے بعد دوسرا سوال کرتا چلا جاتا اور اپنے مخاطب کو پریشانی میں مبتلا کر دیتا۔ اس کا یہ انداز اتنا مقبول ہوا کہ لوگ جان بوجھ کر اس سے کوئی سوال کرتے اور پھر وہ اس سوال کے ہزار سوال بنا لیتا۔ اس شعبہ بازی سے لوگ لطف اندوز ہونے لگے تھے۔

اس کی عمر اب بیس سال ہو چکی تھی۔ اس کا دائرہ ملاقات بھی بڑھ گیا تھا۔ اب وہ ایک بات بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ ہر شخص اپنے شعبہ کار تک محدود ہے۔ اس کے شہر کے لوگوں کے خیالات منتشر ہیں۔ اگر کوئی کہہ رہا ہے تو وہ صرف برتنوں کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جو باتیں ہیں ان کے متعلق اس کا ذہن صاف نہیں۔

ایتھنز کی زندگی میں دیوی دیوتاؤں کا بڑا دخل تھا لیکن لوگوں کے ذہنوں میں دیوتاؤں کے متعلق الجھنیں سی تھیں، ذہنوں میں سنی سنائی کہانیاں تھیں لیکن کسی معیار کو سامنے رکھ کر تصورات کو سلجھانے کا کوئی رواج نہیں تھا اور جیسا کہ عموماً ہوتا ہے دیوتاؤں کے متعلق کوئی منفی بات سننے کو کوئی تیار نہیں۔ جب وہ دیوتاؤں کے متعلق سوالات کرتا تو وہ جواب میں اسے مختلف قسم کی کہانیاں سنا دیتے۔ مثلاً یہ کہ پہلے دیوتا آدمیوں کے معاملات میں بہت دلچسپی لیتے تھے لیکن اب وہ ان سے دور ہو گئے ہیں۔ دیوتاؤں کے دشمن بھی ہوتے تھے جن سے وہ نفرت کرتے تھے۔ لوگ دیوتاؤں کے متعلق یہ خیال کرتے تھے کہ ایک زمانے میں وہ اوپس پہاڑ پر رہتے تھے جو آسمان پر ہے اور ایسے انسانوں کی طرح تھے جو طاقتور اور مضبوط ارادے والے ہوں۔ پہاڑوں پر وہ دعوتیں اڑاتے تھے اور منظور نظر انسانوں کے لیے آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے۔

ان سب اچھے برے خیالات کے باوجود دیوتاؤں کی پرستش کرنے میں بے شک کوئی برائی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ جلوس نکلتے تھے اور قربانیاں کی جاتی تھیں بلکہ اتنی پابندی کی جاتی تھی کہ یہ جملہ عام تھا "جو شخص عبادت میں شریک نہیں ہوتا اس کا شہر میں پھر کام ہی کیا ہے۔"

دیوتا اب شہروں کے دیوتا تھے اور انسانوں میں سے کوئی ان کا منظور نظر نہیں تھا لیکن سزائیں دینے پر وہ اب بھی قادر تھے۔ اسی لیے لوگ دیوتاؤں سے ڈرتے تھے اور ان کی قسم کھا کر قسم ضرور پوری کرتے تھے۔

پرانے زمانے میں دیوتا جھگڑتے تھے، جھوٹ بولتے

ماہنامہ سرگزشت

33

تھے، چوری کرتے تھے اور آدمیوں کے بھیس میں دندناتے پھرتے تھے۔ سقراط کے زمانے میں یہ تصور عام ہو گیا تھا کہ دیوتا اب ویسے نہیں رہے لیکن پھر بھی طاقتور تھے۔ بدکاری اور قتل کو ناقابل معافی جرم سمجھتے تھے۔

معاشرہ ایک تضاد کا شکار تھا۔ اس کے دوست اکیلے ہی دیوتاؤں کی چالاکیوں کا مذاق اڑاتے تھے جبکہ ڈراموں میں گناہ گاروں کو دیوتاؤں کے ہاتھوں سزا دی جاتی تھی۔ روزمرہ کی زندگی میں بے ایمانی سے کام لیتے تھے اور خلوص قلب سے پرستش بھی کرتے تھے۔

وہ دیوتاؤں کی طرف سے الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اب اس نے نیک و بد کے لیے اپنی ذات کو مرکز بنالیا۔ یہ عمل اس نے خود اختیار نہیں کیا تھا بلکہ کبھی کبھی اس پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ یہ کیفیت اسے کوئی کام کرنے سے روک دیتی تھی۔ اس کا یہ بھی تجربہ تھا کہ اس کام کے رک جانے سے اسے "مسرت" حاصل ہوتی تھی اور انجام بخیر ہوتا تھا۔ اس کا یہ بھی عقیدہ ہو گیا کہ اسے روکنے والی طاقت ضرور دیوتاؤں کی طاقت ہے۔ اس لیے اس نے اپنی اس کیفیت کو "نشان ربانی" کا نام دے رکھا تھا اور عزم کیا تھا کہ وہ ہمیشہ اس "نشان ربانی" پر بھروسہ کرے گا۔ وہ سمجھتا تھا کہ دیوتا اسے کسی نیک راستے کی طرف لے جا رہے ہیں اس لیے ان کا حکم ماننا چاہیے۔ اس کی اس کیفیت نے دیوتاؤں کے متعلق اس کی سوچ کو بدل دیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ دیوتا انسانوں کا خیال رکھتے ہیں۔ سب کے سب دیوتا نیک ہیں۔ حاسد، جھوٹ بولنے والے اور نقصان پہنچانے والے غضب ناک دیوتاؤں کی کہانیاں محض گھڑی ہوئی باتیں ہیں۔ دیوتاؤں پر ایمان لانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ انسان خود بھی نیکی اختیار کرے۔ دیوتاؤں کی شکل و صورت کے بارے میں لوگوں کے جو خیالات تھے وہ ان پر بھی یقین نہیں کرتا تھا۔

آہستہ آہستہ ظاہر ہونے لگا کہ دیوتاؤں اور نیکی کے بارے میں اس کے تصورات اور عام لوگوں کے تصورات میں فرق ہے۔ یہی فرق آہستہ آہستہ شدت اختیار کرنے لگا اور لوگ اس سے نفرت یا محبت کرنے لگے۔

☆ ☆ ☆

ایکروپولس کے جلے ہوئے مندرا ایتھنز کی خوبصورتی پر بدتمنا دھبا بنے ہوئے تھے۔ جب کسی قوم کے پاس سوچنے کی دانش بھی نہیں تھی اس وقت ایتھنز میں فلسفی پیدا ہو رہے

ماہنامہ سرگزشت

32

www.paksociety.com

تھے اور یہ جلی ہوئی عمارتیں۔ سب سے پہلے اس مسئلے پر فارلیس نے توجہ دی جو جمہوریہ یونان کے سیاسی رہنماؤں کی صوبہ اول میں تھا۔ وہ ایرانیوں کی طرف سے ہمیشہ چوکنا رہتا تھا۔ اس نے ایرانیوں کے حملے کا جواب دینے کے لیے بہت سی رقم جمع کر لی تھی۔ وہ اب اس رقم کو مندروں کی تعمیر پر صرف کرنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ کام شروع بھی کر دیا تھا لیکن ہمسایوں کے حسد نے جنگ مسلط کر دی۔

سپاہیوں کا شہر اسپارٹا بھی ایتھنز کی بڑھتی ہوئی قوت سے حسد کرتا تھا کیونکہ ایتھنز صرف دفاعی تنظیم کا رہنما نہیں رہا تھا بلکہ ایک منظم بحری سلطنت کا مرکزی شہر بنتا جا رہا تھا۔ آئندہ چل کر یہ حسد ایک خوفناک جنگ میں تبدیل ہونا تھا۔ ذہنوں میں جنگ کی تھنشاں شور مچانے لگی تھیں۔ تو جوان سقراط کے دل میں ایسا جوش اور ولولہ پیدا ہوا کہ وہ اور اس کا دوست کراٹو فوج میں بھرتی ہو گئے۔ بھرتی کیا ہوئے بس نام لکھوا دیا کہ اگر اسپارٹا والوں نے حملہ کیا تو وہ بھی ایتھنز کی حفاظت کے لیے فوج کے ساتھ ہوں گے۔ انہیں ضروری تربیت سے گزارا گیا۔

کئی سال بعد وہ وقت آ گیا جس کا اندیشہ تھا۔ اسپارٹا کے بادشاہ نے جنگ کا بگل بجا دیا۔ ایتھنز کے نوجوان سپاہی جنرل اینڈوسیڈیز کی رہنمائی میں روایتی ہتھیار سجائے ڈھول تاشوں کے شور میں، دیوبی دیوتاؤں کو پکڑے ہوئے ایتھنز سے نکلے۔ بوڑھے سنگتراش نے چھاتی پھلاتے ہوئے بیٹے کو رخصت کیا۔

”تیرے مضبوط ہاتھ اسپارٹا کی گردن مروڑنے کے لیے بہت ہیں میرے بیٹے۔“

اس منظم فوج نے ایتھنز سے دو دن کے فاصلے پر ایک درے میں کمپ لگا دیے۔ عام خیال یہی تھا کہ اسپارٹا کے سپاہی ایتھنز پر حملہ آور ہونے کے لیے اسی طرف سے گزریں گے۔ انہیں یہیں تلواریں پر رکھ لیا جائے گا۔ اس درے میں قیام کا فیصلہ اس لیے بھی کیا گیا تھا کہ یہ علاقہ دوست قبیلے میگرا کی عمل داری میں تھا۔ یہاں ایتھنز والوں کو کسی خطرے کا سامنا نہیں ہو سکتا تھا۔

جنگل کے کنارے پہرے والے سنتریوں کو کھڑا کر دیا گیا تھا جن کی آوازیں رات کا سینہ چیر کر کمپ تک پہنچتی رہتی تھیں۔

کئی تاریک راتیں آگ کے گرد بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے گزر گئی تھیں۔ اسپارٹا کا لشکر راستہ بھول کر بھی اس

طرف نہیں آیا تھا۔

پہرے دار رات کے وقت پہرا دیتے تھے اور دن کے وقت جنرل اینڈوسیڈیز کی شکایتیں کرتے تھے کہ ایک محفوظ علاقے میں ہونے کے باوجود اتنے سخت پہرے کی کیا ضرورت ہے۔

آج پانچویں رات تھی۔ وہ آگ کے الاؤ کے گرد لیٹا ہوا تھا۔ کراٹو اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اسے بے تحاشا ایتھنز کی یاد آ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بھی جنرل کی شکایت آ گئی۔

”جنرل کو یہ کیا سوچھی ہے۔ ہمیں آگے لے جاتا اور ہم لڑ بھڑ کر معاملہ ختم کر دیتے مگر وہ تو اس درے میں اس طرح بیٹھ گیا ہے جیسے ایک مینے تک یہیں رہے گا۔ ہمیں نہ جانے کب ایتھنز کی شکل دیکھنے کو ملے گی۔“

”ابھی صرف پانچ دن ہوئے ہیں اور تم ایتھنز جانے کے لیے بے چین ہو رہے ہو۔“

”پانچ دن بہت ہوتے ہیں۔ اگر حملہ آوروں کو آنا ہوتا تو اب تک آپکے ہوتے۔“

”تم اسپارٹا والوں کو نہیں جانتے۔ یہ بات ان کی فطرت سے بعید نہیں کہ وہ ہماری عقلیت سے فائدہ اٹھا کر جسکے سے ان دڑوں سے گزریں اور ایتھنز پر حملہ کر دیں۔ مجلس کے ارکان اسی مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔“

”ہمارے آدمی مجلس میں غور بھی کرتے ہیں۔“ سقراط نے طنز کیا اور سب لوگ ہنس پڑے۔

”سقراط تمہیں یاد ہے؟“ کراٹو نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”ہم صرف اٹھارہ سال کے تھے جب تربیت کے لیے بلائے گئے تھے اور ہم سے حلف لیا گیا تھا۔“

”میں نے کبھی حلف سے روگردانی نہیں کی۔ میں اب بھی اپنے ہتھیاروں کی بے حرمتی نہیں کروں گا۔ میں دیوتاؤں اور انسانوں کی چیزوں کے لیے جنگ کروں گا۔ دیوتا اس کے شاہد ہیں گے۔“

سب لوگوں نے سقراط کی پیروی کی اور حلف کے الفاظ پل کر دہرائے۔

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ سقراط کے لیے اس سے بڑی تکلیف اور کوئی نہیں تھی کہ چند لوگ بیٹھے ہوں اور خاموشی چھا جائے۔ اس نے پھر ایک سوال اٹھا دیا۔

”میں نے تم لوگوں سے کل کہا تھا کہ میں اپنے وطن کو پہلے سے بہتر حالت میں چھوڑ کر مروں گا۔“

”ہاں کہا تو تھا۔“

”کیا تم بتا سکتے ہو بہتر سے مراد کیا ہے۔“

”اس کا جواب کون سا مشکل ہے۔“ ایک اور سپاہی نے کہا جس کا نام ارشن تھا۔ وہ نادانستگی میں سقراط کو چیلنج کر چکا تھا۔

”تو پھر بتاؤ وطن کو بہتر حالت میں چھوڑنے سے میری کیا مراد تھی۔“

”اس کے معنی ہیں بہتر عمارتیں، زیادہ جانور، بے پناہ ہتھیار۔“

”ہرگز نہیں۔“ سقراط نے کہا ”شہر اس وقت بہتر ہوتا ہے جب وہ زیادہ مضبوط ہو اور اس کے شہری نہ صرف زیادہ کام کریں بلکہ حسب مرضی کام کریں۔“

”میرا مطلب بھی یہی تھا۔“ ارشن نے کہا۔

”اگر تمہارا یہی مطلب تھا تو آؤ اس سوال پر دوسری طرح غور کرتے ہیں۔ تم بتاؤ کسے بہتر سمجھتے ہو بہادر کو یا بزدل کو۔“

”ظاہر ہے بہادر آدمی بزدل سے بہتر ہے۔“

”اور آدمی کے بہادر یا بزدل ہونے کا پتا کیسے چلے گا۔“

”اس کا پتا نہ میدان جنگ ہے۔“

”جب دشمن غالب آ جائے تو ایک سپاہی رحم کی بھیک بھی مانگ سکتا ہے اور میدان سے بھاگ کر بھی اپنی جان بچا سکتا ہے۔“

”یہ کام بزدلوں کے ہوتے ہیں۔“ ارشن نے جوش میں آ کر جواب دیا۔

”کیا یہ حقیقت نہیں کہ بہادر آدمی صرف ایک کام کر سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اپنے افسر کے حکم کی اطاعت کرے اور آگے بڑھتا چلا جائے۔ ممکن ہے اس میں اس کی اپنی مرضی کا دخل نہ ہو۔“

ارشن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سقراط یہ سوالات کیوں کر رہا ہے۔ اسے کس جال میں پھنسانا چاہتا ہے۔ اسے کہنا پڑا کہ ہاں بہادر آدمی آگے بڑھتا ہے پیٹھ نہیں دکھاتا۔“

”بس تو پھر تم نے خود مان لیا کہ بہادر آدمی کے مقابلے میں بزدل آدمی جو چاہے کر سکتا ہے۔“

”یہی صحیح ہے۔“

”ابھی تو تم نے میری اس بات سے اتفاق کیا تھا کہ شہر اس وقت بہتر ہے جب شہر کے لوگ ہر کام حسب مرضی

کر سکیں۔“

”تو؟“

”تو یہ کہ حسب مرضی کام تو بزدل آدمی کر رہا ہے نہ کہ بہادر۔ ایک اپنی مرضی کا راستہ اختیار کر رہا ہے دوسرا اپنے افسر کی اطاعت کا پابند ہے۔ پھر بتاؤ بہتر کون ہوا۔ حسب مرضی کام کرنے والا یا اطاعت کا پابند۔“

”سقراط تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو۔“

”میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اپنی مرضی کے مطابق کام کرنا اچھا اور بہتر ہونے کا ثبوت نہیں۔“

ابھی بحث اسی موڑ تک پہنچی تھی۔ ممکن ہے سقراط کچھ اور کہتا کہ اندھیرے میں کوئی آتا دکھائی دیا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ دشمن کا کوئی جاسوس ہو۔ سب نے ہتھیاروں پر ہاتھ ڈال دیے اور آنے والے کا انتظار کرنے لگے۔

جب وہ قریب آیا تو کراٹو نے اس کی چال ہی سے اسے پہچان لیا۔

”ارے یہ تو سکلیئر ہے۔ اسے بھی تنہائی نے کاٹا ہوگا جو باتیں کرنے چلا آیا۔“

”دوستو، میں باتیں کرنے نہیں اہم اطلاع دینے آیا ہوں۔“

ارشن نے شکر کیا کہ سقراط سے بحث سے جان چھوٹی۔ کراٹو نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ سقراط سے بحث میں کوئی نہیں جیت سکتا۔ یہ مظاہرہ آج اس نے دیکھ بھی لیا تھا۔

”کیسی اطلاع“ کراٹو اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”میگرا میں رؤسا کی جماعت نے ہماری فوج کے دستے کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ پورا ملک باغی ہو گیا ہے۔ باغیوں نے ایتھنز کی سڑک پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔“

”میگرا تو ہمارا دوست تھا۔ اسے تو دوسرا ایتھنز کہا جاتا تھا۔ وہاں بھی؟“

”ہاں وہاں بھی۔ اس طرف یہ بغاوت ہو گئی دوسری جانب اسپارٹا والے ہم پر کسی بھی وقت حملہ کر سکتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی کوچ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

”تمہیں سب باتیں کس نے بتائیں۔“

”میں ابھی جنرل اینڈوسیڈیز کے پاس سے چلا آ رہا ہوں۔“

وہ ایسی اطلاع لایا تھا کہ اسی وقت سے صبح کی تیاری شروع ہو گئی۔ سقراط کی یہ پہلی مہم تھی جو چند گھنٹوں بعد شروع ہونے والی تھی۔

وہ سوئے کب تھے کہ اٹھتے۔ اطلاع لانے والے کی اطلاع درست تھی۔ سورج نکلنے ہی احکام صادر کر دیے

گئے۔ کوچ کی تیاری ہونے لگی۔

وہ جنگل میں خاموشی سے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ نہایت احتیاط سے قدم رکھ رہے تھے کہ دشمن کسی طرف سے بھی نمودار ہو سکتا تھا۔

ایک اونچی پہاڑی سے نیچے اتر کر جنرل نے اپنے پیچھے چلنے والوں کو ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا۔ اسے اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کس طرف جائے۔ یہاں سے دو راستے نکلتے تھے دائیں طرف کا راستہ میکر اہو کر ایتھنز جاتا تھا لیکن پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ اس سڑک پر باغیوں کا قبضہ ہے۔ یہ اطلاع بھی مل چکی تھی کہ اسپارٹا کے سپاہی کسی دوسرے راستے سے ایتھنز کی طرف بڑھنے لگے ہیں۔ اب انہیں جلد سے جلد ایتھنز پہنچنا تھا۔ باغیوں سے اچھے بغیر ایتھنز پہنچنے کے لیے بائیں طرف مڑنا ضروری تھا۔ جنرل نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور بائیں طرف مڑ گیا۔

بائیں طرف جانے والی سڑک سمندر کے قریب پہنچ کر ختم ہو گئی۔ اب انہیں کنارے کنارے چلنا تھا۔ یہ راستہ نہایت ناہموار تھا چلتے ہوئے پاؤں بھستے تھے۔

راستے میں کئی کھیتوں سے گزرنا پڑا۔ کئی گاؤں بھی نظر آئے۔ کچڑ اور دلدل سے گزرتے ہوئے بالآخر وہ ایک ویران قلعے میں پہنچ گئے جہاں وہ ٹھکن اتار سکتے تھے۔

ایتھنز والوں کو کچھ خبر نہیں تھی کہ اس جھکے ہوئے ریوڑ پر کیا بیت رہی ہے۔ اس لیے یہ امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ کوئی جہاز انہیں لینے آجائے گا۔

دور تک بلند پہاڑ تھے۔ ان پہاڑوں سے گزر کر ہی انہیں ایتھنز پہنچنا تھا۔ ان پہاڑوں اور یہاں کے رہنے والوں کے متعلق خوفناک کہانیاں مشہور تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ یہاں شراب کے دیوتا کے نیم بچاری رہتے ہیں۔ یہاں کی عورتیں اپنے ہاتھوں سے جنگلی جانوروں کو چیر کر رکھ دیتی ہیں۔ ان پہاڑوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو جانے کا بھی خطرہ تھا۔ یہ راستہ کسی مقامی آدمی کی رہنمائی کے بغیر طے نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی آدمی کو آمادہ کرنے کے لیے سقراط کو ایک قریبی گاؤں میں بھیجا گیا۔ سقراط کا انتخاب ظاہر ہے اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ باتیں بنانے کا ماہر تھا۔

سقراط اس گاؤں سے پی تحسین نامی ایک آدمی کو پکڑ کر لے آیا۔ وہ اس علاقے کے چتے چتے سے واقف تھا مگر وہ صرف راستہ بتا سکتا تھا۔ راستے کی مشکلوں کو دور نہیں کر سکتا تھا۔ پہاڑیوں پر چڑھنا سخت دشوار تھا۔ جگہ جگہ جھاڑیوں

میں پاؤں الجھ جاتے تھے، بڑے بڑے پتھر آگے چلنے والے سپاہیوں کے پیروں تلے آکر نیچے کی طرف لڑھک آتے تھے۔ پیچھے چلنے والوں کا ان سے بچنا مشکل ہو رہا تھا۔ ان پتھروں سے کئی لوگ زخمی ہو گئے۔ ایک جگہ کچھ پہاڑی لوگ ان کے مقابل آگئے لیکن پیشہ ور سپاہیوں سے ان کا لڑنا مشکل تھا۔ سپاہیوں کے نیزے ان کے جسموں کے پار اتر گئے۔ بہر حال جیسے تیسے یہ راستہ طے ہوا۔

پہاڑ کا موڑ کاٹتے ہی کسی نے شور مچایا۔

”ایتھنز، وہ رہا ایتھنز۔ ہم پہنچ گئے۔ وہ رہا سمندر“ مجلس کی عمارت بہت دور سے صاف نظر آرہی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے کسی اور قسم کے نعرے لگنے لگے۔

”وہ دیکھو۔ مغربی میدان میں نیزے چمک رہے ہیں۔ شاید کوئی فوج ہے۔“

اسپارٹا کے لوگ ایتھنز کے بالکل سامنے پڑاؤ ڈالے بڑے تھے۔ رات کے وقت ان کے پڑاؤ میں چلنے والی آگ صاف نظر آرہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کل معرکہ ضرور پیش آئے گا۔

دوسرے دن تیاری بالکل مکمل تھی لیکن اسپارٹا والوں نے پہل نہیں کی۔ اس کے بعد ایک دن اور گزر گیا اور پھر تیسرے دن یہ منظر سب نے دیکھا کہ اسپارٹا والے اپنی چھوٹی دریاں باندھ کر چلتے بنے۔

کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ لوگوں نے صرف اتنا دیکھا تھا کہ فارقلیس ایتھنز سے نکل کر اسپارٹا والوں سے ملا تھا اور اس کے لوٹتے ہی خیمے اکھاڑے جانے لگے تھے۔

یہ تو بہت بعد میں راز کھلا کہ فارقلیس نے ایک بھاری رقم دے کر انہیں حملہ نہ کرنے پر رضامند کر لیا تھا۔

سقراط کے لیے یہ معرکہ گرم ہونے سے پہلے ہی سرد ہو گیا لیکن بعد میں اس نے کئی جنگوں میں حصہ لیا اور اپنی بہادری کا لوہا منوایا۔

اسپارٹا والوں کے لوٹتے ہی ایتھنز میں ایک مرتبہ پھر امن کا دور شروع ہو گیا۔ نانباؤیوں نے اپنی دکانیں کھول لیں، لوہاروں کے کارخانوں میں بھٹیاں سلگنے لگیں۔ ہتھوڑے چلنے لگے۔ ورزش گاہوں میں کھلاڑی جمع ہونے لگے۔ ایتھنز پہلے جیسا ایتھنز بن گیا۔

قاعدہ یہی تھا کہ جنگ کے اوقات میں سپاہی بلا لیے جاتے تھے۔ باقی دنوں میں وہ اپنے اپنے کاموں سے لگ جاتے تھے۔ سقراط بھی ان دنوں خالی بیٹھا تھا۔

امن کا دور دورہ ہوا تو فارقلیس کو اپنے عزائم یاد آئے۔ وہ ایتھنیا کا نیا مندر ایکروپولس کے جنوب میں تعمیر کرانے کا عزم کر رہا تھا کہ اسپارٹا کی سرکشی شروع ہو گئی۔ ایتھنز جوانوں اور کارگروں سے خالی ہو گیا۔ اب جنگ کے بادل چھٹے تو اس نے کارگروں کو جمع کرنا شروع کیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ شہر میں کوئی تعمیراتی منصوبہ شروع ہو اور سو فرائس کس جیسے ماہر سنگ تراش کو نہ بلایا جائے۔ شاہی کارندے اس کے پاس بھی آئے۔ جو کام اسے بتایا گیا وہ سخت بھی تھا اور مشکل بھی اور وہ اب بوڑھا بھی ہو گیا تھا لیکن سقراط جوان بھی تھا اور مضبوط بھی۔ سو فرائس کس نے اس کے سہارے پر اتنا بڑا ٹھیکا لے لیا۔

اسے مندر کے ستون بنانے تھے۔

سقراط کے گھر کے سامنے ضرورت مند مزدوروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ سو فرائس کس کو ٹھیکا ملا ہے۔ اسے مزدوروں اور غلاموں کی ضرورت ہوگی۔ سقراط اور سو فرائس کس ہر مزدور کی قابلیت کا جائزہ لے رہے تھے اور بھرتی کرتے جا رہے تھے۔

کام کا آغاز ہو گیا۔

سنگ مرمر کی بھاری سلیں نیل گاڑیوں پر لاد کر لائی جا رہی تھیں۔ یہ سلیں اتنی بھاری تھیں کہ مزدور انہیں سخت محنت اور دشواری سے اتار پارہے تھے۔ مہینوں تک ان پتھروں کی کٹائی کا کام ہوتا رہا۔ سقراط اس تمام کام کی نگرانی کر رہا تھا۔

جب ستون کھڑے ہو گئے تو سقراط چچان پر چڑھ گیا تاکہ پتھروں کے بالائی حصے کو چھیل کر نیچے کے حصے سے ہم آہنگ کر دے۔

اس چچان پر کام کرتے ہوئے سقراط کے کئی گھٹنے گزر جاتے تھے۔ بلندی سے نہایت دلچسپ مناظر نظر آتے تھے۔ کھیل کے میدان صاف نظر آتے تھے۔ ساحل نظر آتا تھا جہاں ہر وقت بادبان لہراتے نظر آتے تھے۔ وہ پہاڑیاں نظر آ سکتی تھیں جہاں سنگ مرمر کی کانیں تھیں۔ وہ پہاڑ بھی نظر آتا تھا جو شہر کی مکھیاؤں کا مخزن تھا۔

ایک نمائش کا دروازہ تھا جو سقراط کے سامنے کھلا ہوا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو ان مناظر سے برسوں بہلتا رہتا لیکن اس کی مطالعہ گاہ تو انسان تھے۔ انسانوں کے بغیر ہر منظر غیر دلچسپ تھا۔ وہ جب تک اکٹاتا اس وقت تک بالائی حصے کا کام ختم ہو گیا۔

اسے اصلی خوشی اس وقت ہوئی جب اسے مزدوروں اور دوستوں کے ساتھ مندر کے فرش پر کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ چہل پہل یہ گرم بازاری اس کے مطلب کی چیز تھی۔ فارقلیس جو ایتھنز کا سربراہ کماندار تھا تقریباً روزانہ معائنے کے لیے آتا تھا۔ اس کے علاوہ اہل شہر بھی بڑی تعداد میں آتے تھے۔ ان میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ جن میں اعلیٰ خاندان کی وہ عورتیں بھی تھیں جو ایسے مجمع میں بھی نہ آتیں لیکن معاملہ مندر کا اور ایتھنز کی خوبصورتی کا تھا۔

ایک دن سقراط اپنے کام میں مشغول تھا کہ فارقلیس وہاں آیا۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھا بھی تھا۔ سقراط ایتھنز کے بھی لوگوں کو جانتا تھا لیکن اس بوڑھے کو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا اور وہ بھی فارقلیس کے ساتھ۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ مگر ہے کون؟ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ ایشائے کوچک کا رہنے والا ہے۔ فارقلیس نے اسے ایتھنز بلایا ہے۔

یہ بھی کوئی تعارف نہیں تھا۔ یہ سوال پھر بھی باقی رہ جاتا تھا کہ وہ ہے کون۔ سقراط کو اس سے ملنے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن اس کا دل اس کی طرف کھینچنے لگا تھا۔ بعض لوگ کچھ اور معلومات بھی فراہم کرتے تھے مثلاً یہ کہ وہ بوڑھا فیثا غورٹ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ہندوستان جا کر گوتم بدھ سے بھی مل چکا ہے۔ اس کی اپنی ایک جماعت اور اپنا فلسفہ حیات ہے۔

اسی طرح کی اور دوسری باتیں لیکن سقراط کو یہ باتیں فضول اور غیر معقول معلوم ہوئی تھیں۔

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ ایتھنز کے بازاروں میں فیثا غورٹ اور اس کے نظریات کا خوب چرچا ہونے لگا۔ فیثا غورٹ نے جب یہ نظریہ پیش کیا کہ آسمان پر پتھر ہیں دیوتا نہیں تو اس کے خلاف مخالفتوں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ فیثا غورٹ کئی برس سے آسمان کے مطالعے میں مشغول تھا بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ سورج کوئی دیوتا نہیں بلکہ چمکتی ہوئی دھات کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ چاند مٹی کا بنا ہوا ہے اور اس میں روشنی نہیں ہے بلکہ اس پر سورج کی روشنی اپنا عکس ڈالتی ہے جس سے وہ چمکتا ہے۔ چاند میں پہاڑ اور وادیاں ہیں اور شاید لوگ بھی آباد ہیں۔

یہ نظریہ سامنے آتا تھا کہ پورا یونان فیثا غورٹ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ اس مخالفت میں وہ لوگ خاص طور پر

شامل تھے جو فارقلیس کے دشمن تھے۔
”یہ شخص (فیثا غورث) ہمارے دیوتاؤں کی توہین کر رہا ہے اور فارقلیس اسے اپنا دوست کہتا ہے۔“
مذہبی لوگ بھی فیثا غورث کے دشمن ہو گئے اور سیاسی لوگ بھی۔

ایکرو پولس کے مندروں کی تعمیر کا کام زور و شور سے جاری تھا لیکن اب یہاں کام سے زیادہ باتیں ہو رہی تھیں۔ یہاں جمع ہونے والے لوگ بہ بائبل دہل کھڑے تھے کہ جب تک فیثا غورث کو موت کی سزائیں دی جاتی ہیں اس وقت تک اس شہر پر دیوتا مہربان نہیں ہوں گے چاہے لاکھ مندر بنالو۔ سقراط اپنی عادت کے برخلاف اس معاملے میں بالکل خاموشی اختیار کیے ہوئے تھا۔ اس کے دوستوں کو سخت الجھن ہو رہی تھی کہ وہ اپنی رائے کیوں نہیں دیتا۔ ایک دن ایک مندر کا غیب دان سقراط کے پاس آیا اور اس معاملے میں اس سے اس کی رائے پوچھی۔

”سقراط کیا تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ سورج کوئی دیوتا نہیں بلکہ دھات کا ٹکڑا ہے۔“
”میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔“
”اس میں فیصلے پر پہنچنے والی کون سی بات ہے۔ کیا ہمارے تمام بزرگ جھوٹے تھے۔“
”ہو سکتا ہے فیثا غورث ہی جھوٹا ہو لیکن ہمیں ہر نئی بات کو اس طرح نہیں جھٹلانا چاہیے۔ فیثا غورث سائنس دان ہے۔ اس نے ایک نظریہ قائم کیا ہے۔ اسے جھٹلانے کے لیے ایک اور سائنس دان کی ضرورت ہوئی۔ اسے جھٹلانا عام آدمی کو زیب نہیں دیتا۔ میں تو یہ سمجھ سکا ہوں کہ اس کے علمی نظریوں کو سیاسی جھگڑوں میں کھینچا جا رہا ہے جو کہ غلط ہے۔“
”مجھے تو تم بھی دیوتاؤں کے مخالف لگتے ہو۔“
”میں ابھی حقیقت کی تلاش میں ہوں لیکن جانتا ہوں یہ مشکل کام ہے۔“

”کیا دیوتا حقیقت نہیں ہیں؟“
”حقیقت وہ ہوتی ہے جو ثابت کی جاسکے۔“
”تم اسے ثابت کرتے رہو۔ مجھے جو کرنا ہے وہ کروں گا۔“ غیب دان نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رات کو چراغ جلے سقراط کے کچھ دوست اس سے ملنے آئے۔ سوفرونس کس بھی ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر مندروں کی تعمیر کی باتیں ہوتی رہیں پھر فیثا غورث کا ذکر نکل آیا۔ سقراط کا رویہ اب بھی اس کے لیے ہمدردانہ تھا البتہ

سوفرونس کس جو پرانے عقائد پر چلتا تھا یہ ضرور کہہ رہا تھا کہ اگر فیثا غورث یہاں نہ آیا ہوتا تو ایجنٹر کی زندگی بڑی پرسکون گزرتی۔
بات یہیں تک پہنچی تھی کہ ڈایون آ گیا۔ ڈایون غیب دان کا رشتہ دار تھا اور سقراط کے ساتھ ستون پر کام کرتا تھا۔ یہ اس طرح اندر داخل ہوا جیسے کوئی اطلاع لے کر آیا ہو۔ اس کے پاس واقعی اطلاع تھی۔
”ایجنٹر کا ہر شہری کل تک خوش ہو جائے گا۔ دیوتاؤں کا دشمن اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔“
سقراط یاد ہاں بیٹھے ہوئے کسی اور شخص کو یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ ”دیوتاؤں کا دشمن“ سے اس کی کیا مراد ہے البتہ سقراط نے اس کی تفصیل ضرور پوچھی۔ ”کل تک ایسا کیا ہونے والا ہے؟“

”دیوتاؤں کے وفادار متحد ہو گئے ہیں۔ انہوں نے فارقلیس کو بھی ہم نوادہ بنالیا ہے۔ ایک نیا قانون پاس ہو رہا ہے۔ یہ ان لوگوں کے خلاف ہوگا جو مذہب پر عمل نہیں کرتے اور آسانی چیزوں کے متعلق نظریات پیش کرتے ہیں۔ کون ہوگا جو اس قانون کی حمایت نہیں کرے گا۔ یہ قانون پاس ہو جائے گا۔ اسی قانون کا سہارا لے کر فیثا غورث کو عدالت میں بلایا جائے گا۔“
دوسرے دن جیسی کہ سب کو امید تھی یہ نیا قانون پاس ہو گیا۔ منصوبے کے مطابق یہ بھی ہو گیا کہ فیثا غورث کو عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ اس پر الحاد کا الزام لگایا گیا تھا۔ اس جرم کی سزا موت بھی ہو سکتی تھی لیکن ایجنٹر میں ملی جلی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایک بڑی تعداد اس کے خلاف تھی تو کچھ لوگ اس کے حق میں بھی تھے لہذا اسے موت کی سزا نہیں دی گئی بلکہ شہر بدر کر دیا گیا۔ وہ ایشیائے کوچک واپس چلا گیا۔

سقراط نے فیثا غورث کو صرف دیکھا تھا اس سے پوری طرح آشنا نہیں ہوا تھا لیکن اس کے چلے جانے کے بعد وہ اس کی کمی محسوس کر رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ جس دانش کی اسے تلاش ہے وہ اس آدمی کے پاس تھی جس کی ہم نے قدر نہیں کی۔ اسے فیثا غورث کا ایک جملہ بار بار یاد آتا تھا۔ اس نے کہا تھا ”وہ شہرت یا عیش و آرام کے لیے نہیں بلکہ چاند، سورج اور زمین کا مطالعہ کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا۔“ اس کا یہ جملہ سقراط کی توجہ علم کی اہمیت کی طرف مبذول کرتا تھا۔ اس کا ایمان ہو گیا کہ حقیقت تک پہنچنے کے

لیے محض حیرت سے کام نہیں چلتا بلکہ اس کے لیے مطالعے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے دنیا کے نظام کے متعلق علما کے اقوال کا مطالعہ شروع کر دیا۔
وہ مطالعہ کرتا رہا۔ ورزش گاہ کے لباس تبدیل کرنے والے کمروں میں جو علماء جمع ہوتے تھے وہ ان کی باتیں غور سے سنتا۔ ان علماء میں فیثا غورث کا ایک شاگرد لاؤس بھی تھا۔ یہ شخص بعد میں سقراط کا استاد بھی کہلایا۔ ورزش گاہ میں بعض ایسے لوگ بھی آتے تھے جو اب بھی فیثا غورث سے روابط رکھتے تھے اور اس کے نظریات کے محرم اسرار تھے سقراط نے ان سے دوستی پیدا کر لی۔

اس کے علم میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا جا رہا تھا اس کی شہرت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اب اس کا شمار ایجنٹر کے فلسفیوں میں ہونے لگا تھا۔ اگر کوئی طالب علم شہر میں آتا تو ممکن نہیں تھا کہ سقراط سے ملے بغیر چلا جاتا۔ رؤسا اور امراء اسے اپنے گھروں میں مدعو کرنے لگے۔ وہ فیثا غورث کا انجام دیکھ چکا تھا لہذا اپنی گفتگو میں بہت محتاط رہتا تھا۔
ان دنوں دنیا اور اس کی تخلیق اس کا موضوع خاص تھا۔ اس تھی کو سمجھانے کے لیے سائنس دانوں کے نظریات اس کی مدد کر سکتے تھے لیکن وہ ان سے بھی مطمئن نہیں تھا۔ ایک روز کسی رئیس کے گھر وہ کھانے پر مدعو تھا کہ اس نے وہاں کاغذوں (ایک خاص قسم کا کاغذ، موجودہ کاغذ نہیں) لکے ہنڈل دیکھے۔ معلوم ہوا یہ فیثا غورث کی کتاب ہے جو ایجنٹر میں حال ہی میں آئی ہے۔
”ایجنٹر والوں کی جہالت نے اس شخص کو شہر بدر کر دیا جبکہ وہ شخص فکر و عمل میں اب بھی مصروف ہے۔“ سقراط بولا۔

”ہاں۔ اور یہ کتاب اس کی گواہ ہے۔“ رئیس نے کہا۔
”کوئی نئی بات جو اس کتاب میں بیان ہوئی ہے؟“
سقراط نے دریافت کیا۔
”فیثا غورث نے ایک نئی بات بیان کی ہے۔ وہ لکھتا ہے ”ہر چیز میں دوسری چیزوں کے اجزاء شامل ہوتے ہیں لیکن ذہن کی طاقت غیر محدود ہے۔ اس میں کوئی چیز شامل نہیں۔ اختیار کامل رکھتا ہے۔ تمام جانداروں پر خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے ہوں اس کی حکمرانی ہے۔“ اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ہیں۔“
”اس کا مطلب ہے فیثا غورث نے ہر سوال کا جواب دریافت کر لیا۔ میرا بھی یہی خیال ہے“ ذہانت

مطلق“ ہی تو ہے جو تمام عالم میں کارفرما ہے۔ محترم! آپ یہ کتاب مجھے دے سکتے ہیں تاکہ میں اس کا مطالعہ کر لوں۔“
”کیوں نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کتاب آپ ہی کے لیے لکھی گئی ہے۔“

سقراط کاغذوں کے اس ہنڈل کو اپنے ساتھ لے آیا۔ ان دنوں لکھنے کا طریقہ بہت الجھنک تھا۔ ایک لفظ دوسرے سے مربوط تھا۔ پھر بھی اس نے پوری کتاب جلدی جلدی پڑھ لی۔ کتاب ختم ہوئی تو اس کے باطن میں روشنی سی بھر گئی لیکن قدرے مایوسی بھی ہوئی۔ اس کے لاتعداد سوالوں میں سے کچھ سوال اب بھی باقی رہ گئے تھے۔ فیثا غورث نے بھی دنیا کی توجیہ دوسروں کی طرح مٹی، ہوا، پانی اور آگ کے نظریے کے ذریعے کی تھی۔ بس ان عناصر کے مرکب کو جدا کرنے اور اشیا کو حرکت دینے کے لیے ذہن کا ذکر کر دیا تھا۔

سقراط نے کتاب اس کے مالک کو واپس کر دی لیکن وہ سخت کوفت میں مبتلا تھا۔ اس کا اعتقاد سائنس دانوں پر سے اٹھنے لگا۔ وہ اتنا تو جانتے ہیں کہ دنیا کیسے وجود میں آئی لیکن یہ جواب دینے سے قاصر ہیں کہ ایسا کیوں ہوا۔ اس ”کیوں“ کا تعلق مادہ سے نہیں بلکہ ذہن کی غایت سے ہے۔ یہی چیز ہے جسے انسان اچھائی کہتا ہے۔ اس ”کیوں“ کا جواب مجھے ہی دینا ہوگا۔ سائنس دان میری مزید مدد نہیں کر سکتے۔ وہ تو صرف ان چیزوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو محسوس کی جاسکیں۔ اس نے جان لیا کہ چاند اور سورج کا مطالعہ بے کار ہے۔ انسانی جسم کا مطالعہ بھی بے سود ہے۔ مجھے تو انسان کے سوچنے اور اس کی خواہشوں سے سروکار ہونا چاہیے۔

وہ چپ چاپ فلسفے کے راستے پر گامزن ہو گیا۔ اس مقصد حیات کو سمجھنے میں اسے کئی سال لگ گئے اور پھر اس نے سنگ تراشی کا پیشہ ترک کر دیا۔ اس عرصے میں سوفرونس کس کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور اس کی ماں کا بھی۔

اس کا یہ یقین روز بروز پختہ ہوتا چلا جا رہا تھا کہ دیوتا اس کے ساتھ ہیں۔ چند برس اور گزرے تو اسے یہ کامل یقین ہونے لگا کہ وہ دیوتاؤں کی طرف سے کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔

اب وہ بازاروں میں یہ کہتا نظر آتا تھا ”عقل مند دیوتاؤں نے مجھے دانش کی جستجو کا حکم دیا ہے۔“
اس پیغام نے اس کے گرد نو جوانوں کی بھیڑ جمع کر دی۔ خوب نو جوان اسے کبھی اکیلے نہ رہنے دیتے۔ گھر

میں، بازاروں میں، ورزش گاہ میں۔ وہ جہاں جاتا یہ
نوجوان اس کے ساتھ ہوتے۔

وہ خود تو یہ کہتا تھا کہ دیوتاؤں نے اسے دانش کی جستجو کا
حکم دیا ہے جبکہ اس کے شاگرد یہ دعویٰ کرتے تھے کہ سقراط
تمام انسانوں سے زیادہ دانا ہے۔

ان شاگردوں میں ایک کریٹن بھی تھا جو اس کا
نہایت پرجوش عقیدت مند تھا اور ہر وقت اس کے ساتھ رہتا
تھا۔ ایک مرتبہ وہ ڈلفی گیا جہاں اپالو کا مندر تھا۔ اس مندر
میں ایک پجارن بیٹھتی تھی۔ لوگ اس سے سوال کرتے تھے
اور وہ جواب دیتی تھی۔ یہی سمجھا جاتا تھا کہ اسے یہ جواب
اپالو دیوتا نے بتایا ہے۔ دن بھر میں ہر طرح کے سوالات
پوچھے جاتے تھے۔

اس پجارن کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ جہاں
مند رہے یہاں ایک خوفناک عفریت منڈلانے لگا تھا۔ اپالو
نے اسے مار ڈالا اور یہاں اپنی ایک پجارن بٹھا دی۔ لوگ
اس پجارن سے سوالات کا جواب پوچھنے آتے تھے۔

مند میں داخل ہونے سے پہلے کریٹن کو کچھ دیر
انتظار کرنا پڑا۔ جب اس کی باری آئی، اس نے نذر پیش
کی۔ سنگ مرمر کے دالانوں میں سے گزرتا ہوا اس
اندھیرے حصے میں پہنچا جہاں زمین کا متبرک پتھر رکھا تھا۔
کریٹن نے ایک کاغذ پر اپنا سوال لکھا ”کیا ایتھنز
میں کوئی آدمی سقراط سے زیادہ عقل مند ہے؟“ اس سوال کا
اسے جواب ملا ”کوئی شخص اس سے زیادہ عقل مند نہیں۔“

یہ جواب ہی ایسا تھا کہ کریٹن کو صبر نہ ہوا کہ وہاں کچھ
دیر اور ٹھہرے۔ وہ پہاڑوں سے چکر کاٹتے ہوئے راستوں
سے ایتھنز واپس آ گیا۔ ایتھنز آ کر جب اس نے لوگوں کو
اپالو کا جواب بتایا تو دو طرح کی آوازیں بلند ہوئیں۔ کچھ
لوگ کہتے تھے کہ دیوتا کی بات کو اہمیت دینی چاہیے۔ کچھ
لوگوں نے سقراط کی مخالفت میں پجارن ہی کو جھٹلادیا۔
پجارن کو رشوت بھی تو دی جاسکتی ہے۔ جواب کچھ ہوا اس نے
بتایا کچھ اور ہو۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے نظر آتے تھے کہ کریٹن
نے یہ جواب اپنی طرف سے بنالیا ہے۔ خود سقراط غرور سے
بچنے کے لیے یہ کہتا تھا کہ دیوتا نے میرا نام محض مثال کے
طور پر لیا ہے۔ میں چونکہ جاہل ہوں اور سمجھتا بھی ہوں کہ
جاہل ہوں۔ اس لیے ہاتھ غیبی نے دراصل یہ کہا کہ جو شخص
اپنے جہل سے واقف ہے وہی عقل مند ہے۔

تنہائی میں اس نے کریٹن سے کہا۔ ”دیوتا کہتا ہے

میرے ذمے کوئی کام لگایا جائے۔ حکم کی تعمیل کرنی ہوگی۔“
”یہ کام کیا ہو سکتا ہے؟“ کریٹن نے پوچھا۔

”صداقت کی جستجو کے سوا کیا کام ہو سکتا ہے۔“

سقراط کے دل میں غرور پیدا نہیں ہوا تھا لیکن یہ خیال
خود آ گیا تھا کہ دیوتا اسے پسند کرتے ہیں۔ اس قربت کا احساس
ہوتے ہی اس کی زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آ گئیں۔

ایتھنز میں ایک مرتبہ پھر جنگ کا ہگل بجا۔ فوجیں
شمال کی جانب بڑھیں اور پونڈیا کا محاصرہ کر لیا۔ سقراط بھی
اس معرکے میں شامل تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی جنگوں
میں شامل ہو کر اپنی بہادری کا لوہا منوا چکا تھا لیکن اس
محاصرے میں تو اس کی شان ہی کچھ اور تھی۔ اس کی بے خونی
یقین دلار ہی تھی کہ وہ عام انسانوں سے مختلف ہے۔ دیوتا
واقعی اس کے ساتھ ہیں۔ سخت سردی پڑ رہی تھی۔ لوگ اپنے
پیروں پر اون لیٹے کمروں کے اندر بیٹھے رہے۔ سقراط کو
لوگوں نے دیکھا کہ اپنا لبادہ اوڑھے ننگے پاؤں گھوم رہا
ہے۔ یہ کوئی عام آدمی تو کر نہیں سکتا تھا۔ پھر ایک ایسا واقعہ
پیش آیا کہ سب خوفزدہ ہو گئے۔ بعض تو ہم پرست تو اسے
دیوتا سمجھنے لگے۔

ایک دن شور مچ گیا کہ سقراط اپنے خیمے میں صبح سے
ایک ہی حالت میں کھڑا ہے اور اب دوپہر ہو گئی ہے۔ اس
کے خیمے کے سامنے مجتس سپاہیوں کی بھیڑ لگ گئی۔ سقراط
کے پاؤں زمین پر مضبوطی سے ٹکے ہوئے تھے اور اس کا
لبادہ کندھوں پر پڑا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ لیکن لگتا تھا کہ
بند آنکھوں سے بھی وہ کچھ دیکھ رہا ہے۔ سپاہیوں نے طرح
طرح کی حرکتیں کر کے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے
کی کوشش کی۔ بعض نے اس کا لبادہ پکڑ کر کھینچا۔ آوازیں
دے کر پکارا لیکن اس نے کسی کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔
انتظار بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ کچھ لوگوں نے یہ
کہنا شروع کر دیا کہ وہ کھڑے کھڑے سو گیا ہے۔ اس کے
جاگنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ وہ اگر سو گیا ہے تو گر کیوں نہیں
پڑتا۔ یہ سوال ایسا تھا کہ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔
بہت سے لوگ واپس چلے گئے لیکن کچھ لوگ چٹائیاں بچھا کر
وہیں سو گئے اور اس کے بیدار ہونے کا انتظار کرنے لگے۔
وہ ایک ساکت مجسمے کی طرح زمین کے سینے پر نصب تھا۔

رات گزر گئی۔ گرنے والی شبہم سے اس کا لبادہ گیلیا
ہو گیا۔ سورج نکلنے ہی اس کے جسم کو بھی حرکت ہوئی۔ وہ
خود بخود کھڑے کھڑے مشرق کی طرف گھوم گیا۔ اس نے

سورج کی طرف منہ کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔
اس کی یہ حرکت لوگوں کے لیے اور بھی تعجب خیز تھی
کیونکہ ایجنٹر کے لوگ سورج کی پرستش نہیں کرتے تھے اور
سقراط دعا کے لیے اپنے ہاتھ اٹھا رہا تھا۔
اس کی توجیہ اس نے بعد میں یوں کی تھی کہ مجھے جہل
کی تاریکی سے نفرت ہے، نیکی کے صاف اور روشن ادراک
سے محبت ہے اسی لیے سورج کی روشنی سے محبت ہے۔
اسی لیے بہت بعد میں اس کے ایک شاگرد افلاطون
نے نیکی کے تصور کو بیان کرنے کے لیے سورج کی علامت
استعمال کی تھی۔

☆☆☆

والدین کے مرنے کے بعد اس نے شادی کر لی تھی۔
اس کی بیوی زن نیچی لاکھ صابر ہو لیکن جب اس نے سنگ
تراشی کا پیشہ ترک کر دیا تو وہ سخت پریشان ہوئی۔ اس لیے
نہیں کہ اس کے گھر میں فوراً فاقے شروع ہو گئے تھے۔ وہ
جہیز میں بہت سا سامان ساتھ لائی تھی۔ سقراط کے والدین
نے بھی ترکے میں بہت سی رقم چھوڑی تھی۔ اسے تو یہ فکر تھی
کہ یہ رقم کب تک چلے گی جبکہ سقراط عام ہوش مندوں کی
طرح زندگی نہیں گزار رہا ہے۔ گھر میں جھگڑے شروع
ہو گئے۔ سقراط باقوتی ضرور تھا لیکن جھگڑا لڑنے تھا۔ اس نے
بیوی کو خوش رکھنے کے لیے آمدنی کا ذریعہ ڈھونڈنے کی
کوشش کی۔

اس کا دوست کرائیو زمیندار گھرانے کا فرد تھا۔ اس
کے باغات تھے۔ تجارت کرتا تھا۔ ایک روز وہ اسے ملا تو
سقراط نے اس کے سامنے اپنا مطلب رکھا۔
”دوست، میں سچائی کی تلاش میں ہوں۔ ایک سچائی
یہ بھی ہے کہ زندگی گزارنے کے لیے کچھ پیسوں کی ضرورت
ہوتی ہے۔“

”سقراط مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ تم خواب دیکھنا
چھوڑتے جا رہے ہو۔“
”یہ میری نہیں زن نیچی کی خواہش ہے۔ وہ بے
وقوف چاہتی ہے کہ میں دولت کماؤں۔“
”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ کچھ قرض درکار ہے یا
ملازمت۔“

”قرض دنیا دار لیتے ہیں، ملازمت کا مجھے حکم نہیں۔
میں تو یہ چاہتا ہوں مجھ سے کچھ رقم لے لو اور اسے تجارت میں
لگا دو۔ منافع زن نیچی کو ملتا رہے گا۔ پیسوں کی اسے ضرورت

ہے مجھے نہیں۔“

زن نیچی کو اب بھی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ وہ سوچتی تھی
کہ اگر اس کا شوہر دوسرے لوگوں کی طرح ہوتا۔ اس پیسے
سے خود تجارت کرتا تو زندگی زیادہ آرام سے گزرتی۔ کاش
اس کا شوہر دوسرے آدمیوں کی طرح ہوش مند ہوتا۔
سقراط کو خوشی تھی کہ اب وہ بے فکری سے زندگی
گزار سکے گا۔ اسے سوچنے کے لیے زیادہ وقت مل جایا
کرے گا۔ اس کے دوست دیکھ رہے تھے کہ سقراط نے
زندگی کا ڈھپ کچھ ایسا بنالیا ہے جیسے وہ خود کو کسی مقابلے کے
لیے تیار کر رہا ہو۔ اس کی خوراک اور نیند میں کمی آگئی، جیسے
کوئی دوڑنے والا اپنی زندگی کو اس طرح ترتیب دے رہا
ہو کہ کوئی چیز اس کے دوڑنے میں خلل نہ ہو۔ ایسا بھی نہیں تھا
کہ وہ کسی اولمپک میں حصہ لینے کی تیاری کر رہا ہو۔ اس لیے
کہ ورزش گاہ جاتا ضرور تھا لیکن وہ دوڑنے یا کشتی لڑنے کے
 بجائے باتوں میں مشغول رہتا۔

پھر اس کا یہ معمول ہو گیا کہ سورج نکلنے ہی گھر سے
نکل کھڑا ہوتا اور پھر تمام دن بازار یا ورزش گاہ میں باتیں
کرتا رہتا۔ ایک تبدیلی اور آئی تھی۔ اب اسے غصہ یا نکل
نہیں آتا تھا۔ کیسی ہی سچ بات ہو جائے وہ پرسکون رہتا تھا۔
وہ چلتا نہیں تھا یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی مقصد کی تکمیل کے
لیے رواں دواں ہے۔ اسے یہ شکایت ہمیشہ رہتی تھی کہ اس
کے ہمسائے وہ سب دیکھنے سے قاصر ہیں جو وہ دیکھ رہا
ہے۔ وہ ایک ایسے غار میں زندگی گزار رہے ہیں جہاں باہر
کی روشنی نہیں آتی۔ شہر میں اچھی باتیں ہوتی ضرور ہیں لیکن
ہمیشہ اچھی باتیں کیوں نہیں ہوتیں۔ لوگ نیکیاں کرتے ہیں
لیکن انہیں نیکیوں کا شعور نہیں۔ اسی لیے وہ دوسرے ہی لمحے
برائی بھی کر بیٹھتے ہیں۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے لوگ تلاش
کرتا تھا جن سے وہ سوال کر سکتا تھا۔

اس نے کبھی ایک لفظ بھی لکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔
وہ صرف باتیں کرتا تھا۔ یہی اس کے فلسفیانہ نظریات تھے
جسے دوسرے لوگ لکھ لیا کرتے تھے۔

اس کی دیکھا دیکھی کچھ اور لوگوں نے بھی سوال
کرنے کا طریقہ سیکھ لیا تھا مگر وہ صرف طریقہ سیکھ سکتے تھے
اس کے مقصد اور روح سے نا آشنا تھے۔ ان کے سوال لفظی
ہیر پھیر سے زیادہ کچھ نہیں تھے۔ ایک شعبہ گری تھی جو
جاری تھی، مثلاً ورزش گاہ میں سقراط نے ایک نوجوان کو
دوسرے سے کہتے ہوئے سنا، کیا میں ثابت کر دوں کہ تمہارا

باپ ایک کتا تھا۔

”تم کہتے ہو تمہارے پاس ایک کتا ہے۔“

”ہاں۔“

”اس کے بچے بھی ہوں گے۔“

”ہاں، ہیں۔“

”اور کتا ان کا باپ ہے۔“

”ہاں مجھے اس کا یقین ہے۔“

”اور کیا وہ تمہارا نہیں ہے؟“

”یقیناً ہے۔“

”بس ثابت ہوا کتا ایک باپ ہے اور وہ تمہارا ہے

اور اسی لیے وہ تمہارا باپ ہے۔“

نوجوان نے رخ مند نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

سقراط زرب لب تبسم کے سوا کیا کر سکتا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو دن
بھر میں ایسے دس تماشے دکھا سکتا تھا۔ سوال جواب سے
سقراط کا مقصد شعبہ بازی سے مختلف تھا۔ اسے زندگی کے
لیے ایک ٹھوس بنیاد کی تلاش تھی۔ اس کا خیال تو یہ تھا کہ جو
کچھ وہ لوگوں سے اپنے علم کے لیے پوچھتا تھا اسے وہ سکھانا
یا تعلیم دینا کیسے کہہ سکتا ہے۔ اس نے اپنے دروازے سب
کے لیے کھلے رکھے تھے۔ یہ بات محض محاورے کے لیے نہیں
تھی بلکہ وہ گھر کے دروازے بند کر کے کبھی سویا ہی نہیں۔ ہر
شخص اس کے پاس آ سکتا تھا۔ نوجوان، اسکول کے بچے،
شہری، پردیسی، غلام سب اس کے پاس آتے تھے۔

اس کے پاس آنے والوں میں بڑی تعداد نوجوان

لڑکوں کی تھی کیونکہ نئے لوگوں کو نئی باتیں سیکھنے کا زیادہ شوق

ہوتا ہے۔ بس یہی بات سقراط کے مخالفوں کے لیے بہانہ بن

گئی۔ انہوں نے مشہور کر دیا کہ وہ ان لڑکوں سے غلط تعلق

رکھے ہوئے ہے۔ سقراط پر فحاشی پھیلانے کا الزام لگنے لگا۔

بہت سے لوگوں نے کسی تحقیق کے بغیر اسے بدنام کرنا شروع

کر دیا جبکہ بات صرف اتنی تھی کہ یہ نوجوان بھی زندگی سے

اتنی ہی دلچسپی رکھتے تھے جتنی سقراط سے۔ ان نوجوانوں نے

اس کے باطنی حسن کو دیکھ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر وقت اس

کے ساتھ رہتے تھے۔ سقراط نے بھی ان میں ایک حسن اور
طاقت دیکھی تھی۔ اسی لیے سقراط اڑ کر کہا کرتا تھا۔
”جب لوگ ایک دوسرے کے حسن باطن کو دیکھ کر
دوستی کرتے ہیں تو حقیقی دوستی وجود میں آتی ہے۔“
”لوگوں کو اچھے گھوڑے، گتے اور پالی کے مرنے
دیکھ کر مسرت ہوتی ہے لیکن مجھے اچھے دوستوں سے مل کر

زیادہ مسرت ہوتی ہے۔ اگر مجھے کوئی اچھی چیز معلوم ہے تو
میں اپنے دوستوں کو بتا دیتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ کچھ
نیکیاں حاصل کر سکیں گے۔ میں سائنس دانوں کی طرح
سورج، چاند، ستاروں کی بات نہیں کرتا۔ انسانوں سے
انسانوں کی بات کرتا ہوں۔ میری جستجو ان اشیا کی تلاش ہے
جن کا تعلق انسانوں سے ہے۔“

☆☆☆

ایتھنیا کے مندر پارٹھنیا کی تعمیر میں دس برس
صرف ہو چکے تھے۔ سقراط سنگ تراشی کے پیشے کو خیر باد کہہ
چکا تھا لیکن کبھی کبھی دوستوں سے ملنے وہاں چلا جاتا تھا۔ اس
دن بھی وہ وہاں گیا ہوا تھا کہ بھیڑ میں ایک لڑکے کو چلتے
ہوئے دیکھا۔ وہ لڑکا اتنا خوبصورت تھا کہ اسے اپنی
خوبصورتی کا خود احساس تھا۔ وہ گوشہ چشم سے ادھر ادھر دیکھتا
جا رہا تھا جیسے دیکھنے والی آنکھوں سے اپنے حسن کی داد طلب
کر رہا ہو۔ سقراط سے وہ چھپا نہ رہ سکا۔ وہ اچانک اس کے
سامنے آیا اور اس کی طرف بغور دیکھنے لگا۔
لڑکا اسے اس طرح دیکھتے ہوئے بوکھلا گیا۔
”تمہیں معلوم بھی ہے میں کون ہوں۔ میں ایلیسی
بیادیز ہوں۔“

”اپنے نام کی طرح خوبصورت۔“

”اور تم سقراط ہو۔ سقراط فلسفی۔“

”ایک بد صورت لیکن خوب باطن۔“

”گزشتہ روز فارقلیس تمہارے متعلق باتیں کر رہا

تھا۔ ابھی وہ کچھ اور کہتا کہ اس نے پتھر اٹھایا اور ایک

بوڑھے کی طرف پھینچ کر مارا جو اس سے کچھ فاصلے پر پتھروں

کی سل کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ نشانہ خطا ہو گیا۔ بوڑھا پھر

چھپ گیا۔“

”یہ میرا غلام زوہبی رس ہے۔ فارقلیس نے اسے

میری نگرانی پر مامور کیا ہے اور میں یہ برداشت نہیں کرتا کہ

کوئی میری نگرانی کرے۔“ لڑکے نے کہا اور سقراط کو موقع

مل گیا کہ وہ اسے باتوں کے جال میں پھنسالے۔
”تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ تمہارا غلام ہے؟“
”بکمال ہے! مجھے نہیں معلوم ہوگا تو کہے معلوم
ہوگا۔“

”تم کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ تم بھی غلام نہیں ہو۔“
اس بات پر لڑکا بھڑک گیا اور ایک مرتبہ پھر اپنا تعارف
کرانے لگا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ

دہلی میں مسلمانوں کی ایک عظیم درسگاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے جس کی بنیاد مولانا محمد علی جوہر نے 1920ء میں رکھی تھی۔ جس زمانے میں اس درسگاہ کی بنیاد رکھی گئی ان دنوں انگریز حکومت کے خلاف عدم تعاون کی تحریک زوروں پر تھی۔ جس کے تحت ہر اس چیز، ہر اس ادارے اور ہر اس شخص سے تعلقات توڑ دیے گئے جس کا تعلق انگریزوں سے تھا۔ انگریزی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا گیا۔ انگریزوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے سماجی و معاشرتی تعلقات منقطع کر لیے گئے، حتیٰ کہ ایسے لوگوں کو قبرستانوں میں دفن کرنے سے منع کر دیا گیا، تعلیمی اداروں کے لیے حکومت کی گرانٹ (امداد) لینے سے انکار کر دیا گیا۔ بہت سے طالب علموں نے ایسے تعلیمی اداروں سے اپنے نام خارج کر والیے جنہیں حکومت چلاتی تھی یا جو حکومت کی امداد سے چلتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر تحریک خلافت کے قائد اعلیٰ تھے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ علیگزہ کالج بھی تحریک خلافت کے پروگرام پر عمل کرے۔

چنانچہ مولانا محمد علی جوہر علی گڑھ گئے اور بہت سے طلباء کو اپنا ہم خیال بنالیا۔ کالج کے منتظمین کا خیال تھا کہ جب تک کالج کے طلباء سرکاری ملازمت کے خواہاں ہیں حکومت سے عدم تعاون حماقت کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگرچہ مولانا کالج کو انگریزی اثر سے آزاد کرانے میں تو کامیاب نہ ہو سکے لیکن انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی علیحدہ بنیاد ڈال دی۔ جو 1925ء میں دہلی منتقل ہو گئی۔ یہاں حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری نے انہیں بہت مدد دی اور ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ کے حسن تدبیر اور انتظامی قابلیت سے جامعہ نے بہت زیادہ ترقی کی۔ مولانا عبید اللہ سندھی بھی کچھ عرصہ اس سے منسلک رہے ہیں۔ آج بھی یہ ادارہ اپنی مخصوص عمارت میں ادکھلا (قرول باغ) کے مقام پر بدستور قائم ہے۔

مرسلہ: انیس حیدر، العین (یواے ای)

وہ اس کے ساتھ شہر کے پھاٹک تک گئی تاکہ فوج کے کوچ کا نظارہ دیکھ سکے۔

اس جنگ کا زیادہ احوال نہیں معلوم لیکن سقراط ایک سال بعد واپس آیا۔ جنگ ابھی جاری تھی بلکہ بیس سال تک لڑی جاتی رہی۔

☆☆☆

افلاطون ایک بہت بڑے خاندان کا فرد تھا۔ نامور سولن..... اس کے اجداد میں شامل تھا۔ خاندانی روایات کے مطابق اس کا رجحان سیاست کی طرف تھا۔ محبت وطن قائد بننے کی تمنا تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مصوری اور شاعری بھی سیکھ رہا تھا کہ اس کی ملاقات سقراط سے ہو گئی۔

وہ بچپن سے سقراط کے بارے میں سنتا چلا آ رہا تھا اور پھر وہ سقراط کے حلقہ اثر میں اس طرح شامل ہو گیا کہ ایک کونے میں بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہتا تھا۔

ایسی بیادیز کے دور ہو جانے کے بعد سقراط کے لیے یہ بہت اہم تھا کہ اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والا افلاطون اس کے دائرہ اثر میں شامل ہو جائے لیکن یہ زمانہ اس کی مصیبتوں کا زمانہ بھی تھا۔

افلاطون نے شاعری اور مصوری کو ترک کر دیا اور ہر وقت سقراط کے ساتھ رہنے لگا۔ ایک مرتبہ پھر وہی باتیں بننے لگیں جو بیادیز کے وقت میں بنی تھیں۔

ایتھنز پر جنگ کا زمانہ مسلط تھا۔ یہ کسی کے لیے بھی آرام و سکون کا سال نہیں تھا۔ سقراط تو بہت ہی مشکل میں تھا۔ اس کی قلیل آمدنی اسے سہارا دینے کے لیے ناکافی تھی۔ اس نے اپنی رقم تجارت میں لگا دی تھی اور تجارت تقریباً ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ شہر پناہ گزینوں سے بھر گیا تھا جس کی وجہ سے اشیاء کی قلت پیدا ہو گئی تھی۔ اسپارٹا کا بحری بیڑا سمندر کی ناگ بندی کیے ہوئے تھا۔ غلے کا کوئی جہاز نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بازار بند ہو گئے تھے۔ ایسے میں آداب و اخلاق کا خیال کیسے رہ سکتا تھا۔ اس صورت حال نے سقراط کے کام کو اور بھی ضروری بنادیا تھا۔ جس کی لاشی اس کی بھینس پر عمل ہو رہا تھا اور سقراط اخلاقی قدروں کی تلقین کرتا پھر رہا تھا۔ وہ جہالت اور غلم کا تنہا مقابلہ کر رہا تھا۔ اس پورے عرصے میں افلاطون اس کے ساتھ تھا اور اس کے مکالمات کو قلم بند کرتا جا رہا تھا۔

اخلاقی قدریں اتنی پامال ہو گئی تھیں کہ ایوان میں نہایت بے حسی سے یہ تجویز منظور کر لی کہ بے بس جزیرے

دونوں ایتھنز واپس آ گئے ایسی بیادیز میدان سیاست میں داخل ہو گیا۔ یہاں سے دونوں میں دوری پیدا ہونے لگی۔ سقراط بھی کچھ دنوں کے لیے بیادیز کو اس لیے بھول گیا کہ انہی دنوں افلاطون شباب کی منزلوں میں قدم رکھ رہا تھا۔ اسپارٹا والوں سے جنگ شروع ہو چکی تھی۔ وہ ابھی ابھی بازار سے تبلیغ کا کام ختم کر کے گھر لوٹا تھا۔ زن بیٹی اس کا انتظار تو کر رہی تھی لیکن گھر میں بیٹھنے والی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا خبر لائے گا۔

”مجھے شام سے پہلے پہلے جنگ کے لیے روانہ ہونا ہے۔ اسپارٹا والوں سے جنگوں کا آغاز ہو گیا ہے۔ اب یہ دلاوری سے بعید ہے کہ میں نیکی کا درس دیتا رہوں۔ یہ کام تو محاذ پر رہ کر بھی کیا جاسکتا ہے۔“

”اب پھر مجھے اکیلے رہنا ہوگا۔“

”میں نے کرائٹو سے کہہ دیا ہے۔ وہ تمہارا خیال رکھے گا۔“

”اس سے تو بہتر تھا میں ایسے شخص سے شادی کر لیتی جو مصروفیات کا بہانہ کر کے میدان جنگ میں نہ جاتا۔“

”میں اب بھی نہ جاؤں لیکن میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے مفاد کے لیے وطن کا مفاد قربان کر دیتے ہیں۔“

”پھر مجھے بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے۔ میری توقست میں ہی یہ ہے۔“

”میں جنگ پر جا رہا ہوں۔ میرا سامان صندوق سے نکالو اور کم از کم تین دن کا کھانا میرے لیے تیار کر دو۔“

زن اپنی سقراط سے ہمیشہ لڑتی جھگڑتی رہتی تھی لیکن محبت بھی بہت کرتی تھی۔ وہ اس کا کوئی حکم ٹالنے کی جسارت نہیں کر سکتی تھی۔

وہ بھاگی ہوئی گئی اور صندوق سے برنز کا خود اور چار آئینہ لے کر آ گئی۔ پھر بیٹھک میں گئی اور دیوار سے تیزہ اور ڈھال اتار کر سقراط کے حوالے کر دیے۔

”ڈھال کو ذرا چمکا دو۔“

”ابھی مجھے آپ کا لبادہ بھی دھو کر صاف کرنا ہے۔“

وہ گئی اور ڈھال کو اچھی طرح چمکا دیا۔ نرانا لبادہ دھو کر سوکھنے کے لیے ڈال دیا اور کھانا تیار کرنے لگی۔ کھانا بنانے کے دوران ہی اس نے گھوڑے کے بالوں کا طرہ بنا کر ”خود“ میں جمادیا تھا۔

ایک کپڑے پر خشک مچھلیاں، زیتون، جو کی روٹیاں اور پیرو وغیرہ باندھ دیا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ میں ڈی آئینو میکے کا بیٹا ہوں۔ میری ماں فارقلیس کی بہن تھی۔ اور میں فارقلیس کے گھر ہی میں رہتا ہوں۔ میں غلام کیسے ہو سکتا ہوں۔ اور اگر تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ جو لوگ اپنی مرضی سے کام نہیں کر سکتے وہ غلام ہوتے ہیں تو سن لو۔ میں ہر کام اپنی مرضی سے کرتا ہوں۔ تم نے ابھی دیکھ لیا میرا جی چاہا اور میں نے زو بی رس کو پتھر پھینچ مارا۔ بعض اوقات تو میں سوچتا ہوں میں ایتھنز میں سب سے زیادہ آزاد آدمی ہوں۔“

اس تقریر نے سقراط پر ذرا بھی اثر نہیں کیا۔ اس نے ایک اور سوال کر دیا ”اگر میں فارقلیس سے جا کر کہوں کہ وہ تمہیں فلاخن پھینکنے والوں میں بھرتی کر لے کیونکہ تم پتھر پھینکنے کے شوقین ہو۔“

”میں پتھر پھینکنے کا شوقین نہیں۔ میں تو زو بی رس کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔“

”کس بات میں بہتر ہو جیسے ایک نانباکی دوسرے سے بہتر ہوتا ہے۔“

”ہاں مگر میں نانباکی نہیں ہوں۔ یہ مثال مجھے کیوں دے رہے ہیں۔“ کچھ توقف کے بعد بیادیز نے کہا۔

”میرا مطلب یہ تھا کہ بہ حیثیت انسان بہتر ہوں۔“

اب سقراط نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اس کے ذہب کا آدمی ہے۔

”ایسی بیادیز! ہم دونوں کو دوست بن جانا چاہیے۔ چلو دونوں مل کر اچھائی کی جستجو کرتے ہیں۔“

اس ایک ملاقات ہی میں ایسی بیادیز، سقراط کا دیوانہ ہو گیا۔ اب وہ رئیس زادہ سقراط کے آگے پیچھے کھومتا رہتا تھا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بیادیز کا دل اس سے جلد ہی بھر جائے گا لیکن ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔

ان کی گہری دوستی زبان زدِ خلأقی تھی لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کے درمیان معاملات کی کیا صورت ہے۔ جب دوستی بڑھی تو یہ الزام کھل کر لگایا جانے لگا کہ سقراط، ایسی بیادیز کو گمراہ کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ بھی اس کا وہی تعلق ہے جو دوسرے نوجوانوں کے ساتھ ہے۔

اس کی اور ایسی بیادیز کی دوستی ایسی تھی کہ بیادیز سقراط کے پیچھے پیچھے زنجیر بندھے کتے کی طرح چلتا رہتا تھا۔

ایتھنز میں جنگ کے بادل پھر منڈلانے لگے تھے۔ پونیڈیا کی مہم تھی جس میں ایسی بیادیز بھی شامل تھا اور سقراط بھی۔ یہ مہم ایک سال تک چلتی رہی۔ دونوں نے اپنی گہری دوستی کا ایک سال ایک ساتھ گزارا مہم ختم ہوئی تو

”میلوس“ کے تمام مردوں کو قتل کر دیا جائے اور عورتوں، بچوں کو غلام بنالیا جائے۔ جنگ کی یہ مصیبت کیا کم تھی کہ طاعون کی وبا پھوٹ پڑی۔ گری ہوئی اخلاقی اقدار کے حامل افراد نے بیمار اعزہ کی تیمارداری چھوڑ دی۔

سقراط نے جب اس بے حسی کے خلاف آواز بلند کی تو وہ تنہا رہ گیا۔ وہ لوگ جو معلم و مدبر ہونے کا دعویٰ کرتے تھے وہ یہ تعلیم دیتے پھر رہے تھے کہ راستی اور ناراستی کے پرانے قوانین گزشتہ زمانے میں کمزور انسانوں نے بنائے تھے۔ طاقتور آدمیوں کو ان کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔

سقراط کے خلاف مخالفتوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ وہ طاقتوروں پر نکتہ چینی کرتا پھر رہا تھا۔ ایک سازش کے تحت سقراط کے لیے یہ مشہور کیا جانے لگا کہ وہ دیوتاؤں کے وجود سے انکار کرتا ہے اور سوسائٹی کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کا پابند کرنا چاہتا ہے۔ اس کے ارد گرد نو جوان جمع ہیں جن کے وہ اخلاق بگاڑ رہا ہے اور انہیں مذہب سے متفر کر رہا ہے۔ اس سازش کے پیچھے چونکہ حکمران طبقے کے بہت سے افراد شامل تھے اس لیے بڑی تیزی سے اس کی کردار کشی کی جانے لگی۔

ایک طریقہ یہ تھا کہ اسے اس میں سقراط کو تھیل کا خبیث ترین کردار بنا کر پیش کیا گیا۔ اس تھیل میں دکھایا گیا کہ سقراط ایک نو جوان آدمی کو سکھار رہا ہے کہ وہ دیوتاؤں کے وجود سے انکار کرے۔ اپنے والدین پر اعتراض کرے اور ان سے بحث کرے۔

ایک طرف یہ کھیل لوگوں میں مقبول ہو رہا تھا دوسری طرف سقراط خطرے سے آگاہ کر رہا تھا۔

اس شہر کا کیا انجام ہوگا جسے بدی گروہوں میں بانٹ دے یا اس روح پر کیا بیٹے گی جس میں متضاد اور غیر مرتب عناصر کارفرما ہوں۔ یقین مانو کہ بدی کا نتیجہ طاقت نہیں بلکہ کمزوری ہے۔

☆☆☆

ہر سال ایجنٹر کی فوج گرمیوں میں میدان جنگ کو روانہ ہوتی تھی اور بحری بیڑے دور دراز مقامات کو جاتے تھے۔ یہ جنگ بیس برس سے لڑی جا رہی تھی۔ شاید یہ آخری معرکہ تھا کہ ایشیائے کوچک کے ساحل کے قریب بحری لڑائی لڑی گئی۔ ایجنٹر میں عام بھرتی کا اعلان ہو گیا۔ ہر وہ شخص جو کموار چلانا جانتا تھا یا اسلحہ اٹھا سکتا تھا اس جنگ کے لیے بھیج دیا گیا۔ سقراط

کی عمر ساٹھ سال ہو چکی تھی۔ اسے ایجنٹر میں نگہبانی کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ افلاطون بھی اس سے جدا ہو گیا۔ اسے بھی جنگ میں شریک ہونے کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔

ایجنٹر کی بد نصیبی تھی کہ اسے شکست ہوئی اور اس کے کم از کم بارہ جہاز ڈوب گئے۔ یہ خبر جب ایجنٹر پہنچی تو لوگوں نے جہاز ڈوبنے کا ڈرتے داران نو کمانداروں کو ٹھہرایا جو فوج کے ساتھ تھے۔ پانچ سو نمائندوں کی بڑی مجلس نے جو ایوان کے سامنے کارروائی پیش کرتی تھی، ان نو کمانداروں کو واپس بلایا تا کہ ان پر مقدمہ چلایا جائے۔

سقراط (دیوتاؤں کے کہنے کے مطابق) ابھی تک سیاست سے الگ رہا تھا لیکن وہ اتنی اہم شخصیت تھی کہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسے مجلس کا رکن منتخب کر لیا گیا۔

ان کمانداروں کو ایوان کے سامنے پیش کیا گیا جس نے الزام لگائے تھے وہ تھیرامینز نامی بحری کپتان تھا۔ سقراط بھانپ گیا تھا کہ تھیرامینز (Thera means) خود کو بچانے کے لیے کمانداروں پر الزام لگا رہا ہے۔ اس لیے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کمانداروں کی سزا کے خلاف ووٹ دے گا۔ اس کے باوجود بھی سزا ہو جائے لیکن اس کا ضمیر مطمئن رہے گا۔

پاکیزگی کی قدیم رسم ادا کرنے کے لیے دودھ پیتا خنزیر کا بچہ چاروں طرف پھرایا گیا۔ دعا پڑھی گئی اور ایوان میں قانون کی خلاف ورزی کرنے والے پر لعنت بھیجی گئی۔ تجویز پیش کی گئی کہ ایوان اپنی رائے کا فوراً اظہار کرے۔ ووٹ کے لیے دو منٹے رکھ دیے جائیں ایک سزا کے لیے اور ایک نجات کے لیے۔ اس ووٹ پر تمام کماندار یا تو بری کر دیے جائیں یا سب کو سزا دی جائے۔

”میں اس مسئلے پر ووٹ لینے کی مخالفت کروں گا۔ کیا تم میرا ساتھ دو گے۔“ سقراط نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔ ”کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔ کمانداروں کے ساتھ تم بھی مرو گے۔ خبردار ایسی حرکت ہرگز نہ کرنا۔“

”باقی لوگ بھی یہی چاہتے ہیں لیکن وہ خوف زدہ ہیں۔ یہ تجویز غیر آئینی ہے۔ ہمیں حلف کا پاس ہے ہمیں آئین کا احترام کرنا چاہیے۔“

سقراط نے کہا اور تجویز کی مخالفت کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا ساتھی بھی کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ اسے یا اس کے ساتھیوں کو نقصان پہنچتا راہیں نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا لیکن اس کی حمایت میں کوئی بھی

نہیں بولا۔ سقراط اکیلا رہ گیا۔ وہ چننا رہ گیا۔ ”میں نے قانون کی پابندی کا حلف اٹھایا ہے۔ میں قانون کی پابندی کروں گا۔“

اس کے احتجاج کے باوجود رائے شاری ہوئی اور کمانداروں کو موت کی سزا سنائی گئی۔

یہ معجزہ ہی تھا کہ سقراط زندہ واپس آ گیا۔ اس کی سزا اسے بعد میں چھٹی گئی تھی۔ تھیرامینز اس کی حرکت کو بھولا نہیں۔ ایجنٹر کے لوگوں کو بعد میں ندامت ہوئی کہ انہوں نے سقراط کو اکیلے کیوں چھوڑ دیا اور کمانداروں کو مرنے کیوں دیا لیکن اب تیرکمان سے نکل چکا تھا۔

☆☆☆

ایجنٹر کی مکمل شکست اور نئی سال تک مسلسل ہتھیار ڈالنے کے بعد جب لڑائی ختم ہوئی تو اسپارٹا کے کماندار نے تھیرامینز کو شہر میں آمریت قائم کرنے میں مدد دی۔ جمہوریت کی بساط لپیٹنا اور آمریت قائم کرنا آسان نہیں تھا لیکن اسپارٹا کو فتح مل چکی تھی اور اسپارٹا، تھیرامینز کی پشت پر تھا۔ تھیرامینز اور اس 29 ساتھی جو مل کر تھیں ہوئے تھے مجلس پر قابض ہو گئے۔ یہ عرف عام میں ”تیس“ کہلاتے تھے۔ یہ لوگ اسپارٹا کے دوست اور جمہوریت کے دشمن تھے۔ چھ سو

اسپارٹن سپاہیوں کا دستہ ان کے ساتھ تھا۔ تھیرامینز ابھی سقراط کو بھولا نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اب بھی اسی شہر میں ہے اور اب وہ جمہوریت کے حق میں راہ ہموار کرتا پھر رہا ہے۔ اگر اس کا قلع قمع نہیں کیا گیا تو بڑا فتنہ برپا کر سکتا ہے۔ پہلے تو ان ”تیس“ نے اسے اپنے دفتر میں طلب کیا۔ سقراط نے اپنی چادر کندھے پر ڈالی اور ان کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ لوگ نہایت نرمی سے پیش آئے لیکن مطالبہ بہت سخت تھا۔

”تم اپنی تعلیم بند کر دو۔“

”میں نیکی کی تعلیم دیتا ہوں۔“

”ہمارے پاس اتنی عقل نہیں کہ تمہاری گہری باتوں کو سمجھ سکیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم لوگوں کو تعلیم کے نام پر گمراہ کرنا بند کر دو۔“

”شاید میں ایسا نہ کر سکوں۔ مجھے دیوتاؤں کا یہی حکم ہے۔ اگر میں غلط ہوں تو دیوتا مجھ پر عذاب نازل کریں گے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

”اگر تم نے وعظ و تلقین بند نہیں کی تو دیوتاؤں سے پہلے ہم تم پر عذاب نازل کر دیں گے۔“

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

مسی کی گرما نہیں... جاسوسی کے جان فزا اشارے کی آئینیں

سرورق کی کہانیاں

● **بھلی کہانی** ناگہانی کسی بھی وقت لپیٹ میں لے سکتی ہے... ایک آفت کی نذر ہو جانے والے خاندان کا ماجرا مریم کے خان کا انداز بیان

● **دوسری کہانی** جن بیویوں پر تکیہ تھا ہی ہوا نے لگے... سلیم فاروقی کی خیر مرق

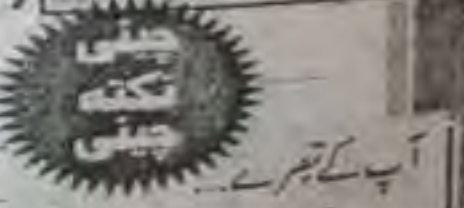
● **واپسی کا سفر** کوئی بھی خوش نصیبی اندھروں کو جالوں میں بدلنے میں ناکام رہتی ہے... زندگی کے پتے بھٹک جاتے ہیں... احمد اقبال کے قلم کی جولانیاں

● **گرداب** واقعات کے گرداب میں گرفتار لوگوں کا آغاز و انجام اسما قادری کا سلسلہ

● **للكار** محبت کی جگہ شمعیں اور انعام کے ہنر کے شعلے طاہر جاوید مغل کی نئی تحریر

مغرب کے نرالی انداز

مغرب کی تہذیب و تمدن کی عکاسی اور محبت کی نذر وہ ناقابل فراموش کہانیاں



آپ کے ہنر... مشعل... شکاری... اور نئی دلچسپ باتیں... کتنا میں

سقراط نے اپنی چادر چھٹکی اور وہاں سے اٹھ آیا۔ اسی شام لوگوں نے دیکھا سقراط ورزش گاہ میں ہے۔ اس کے گرد نو جوان جمع ہیں اور وہ ان سے مباحثہ کر رہا ہے۔ وہ اسی طرح بازاروں میں گھوم پھر کر بھیتیں کرتا رہا۔ اسی طرح اس کے گھر میں لوگ جمع ہوتے رہے۔

یہ خبریں ان ”تیس“ تک برابر پہنچ رہی تھیں۔ سقراط ان کے لیے خطرہ بننا جا رہا تھا۔ اب اس کے لیے کوئی اور جال تیار کرنا ضروری ہو گیا تھا۔

سقراط کو دوسرے چار آدمیوں کے ساتھ ”تیس“ کے سامنے پیش ہونے کا حکم دیا گیا۔ جب یہ لوگ وہاں پہنچ گئے تو ان سے کہا گیا کہ وہ ساحل پر جائیں، سمندر پار کریں اور سلامیز کے جزیرے میں پہنچ کر غدار لیان کو گرفتار کر کے مجلس کے سامنے مقدمے کے لیے پیش کریں۔

سقراط کو معلوم تھا کہ ”لیان“ اگر گرفتار ہوا تو قتل کر دیا جائے گا۔ اس نے یہ حکم سن تو لیا لیکن اس پر عمل نہیں کیا۔ چار آدمی تو حکم کے مطابق ساحل کی طرف چلے گئے اور وہ گھر چلا آیا۔

سقراط کو معلوم تھا کہ کچھ ہی دیر میں اسپارٹا کے سوار آئیں گے اور حکم عدولی کے جرم میں اسے گرفتار کر کے لے جائیں گے۔ گھنٹوں اس عالم میں گزر گئے کہ اس کے اور زن بچی کے کان دروازے پر لگے رہے۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ ہر مرتبہ بچ جاتا تھا۔ اس بار بھی اسے گرفتار کرنے کوئی نہیں آیا۔

وہ پھر مطمئن ہو گیا۔

اسپارٹا کے ”تیس“ اپنی الجھنوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ ان کے سپاہیوں کے مظالم کی وجہ سے لوگ ان سے نفرت کرنے لگے تھے۔ یہ مظالم اس وجہ سے بھی بڑھنے لگے تھے کہ ان کی تنخواہیں ادا نہیں ہو رہی تھیں۔ ان کے لیے اب ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا کہ وہ دولت مندوں کے گھروں میں گھسیں اور چھینا چھینی کا بازار گرم کریں۔ اس لوٹ مار کے ساتھ ساتھ سیاسی دشمنوں کی ہلاکتوں کا بازار بھی گرم کر دیا۔ دولت مند اس جرم میں قتل ہونے لگے کہ وہ سیاست دانوں کی مدد کرتے تھے۔

ان ”تیس“ میں بھی پھوٹ پڑنے لگی۔ تھیرامیز نے حیرت انگیز طور پر پھانسیوں کا سلسلہ روک دیا۔ اس کی اس جسارت پر اسے اپنے ہی لوگوں نے مار دیا لیکن بالآخر مظالم رنگ لائے اور کئی سال کی تشدد پرستی کے بعد جب ”تیس“

کمزور (جو اب دراصل 29 رہ گئے تھے) ہو گئے اور جمہوریت پسند جو اسپارٹا کے عروج کے زمانے میں جلا وطن کر دیے گئے تھے، لڑتے بھڑتے اپنے وطن لوٹ آئے۔ یہ واپسی اتنی آسانی سے نہیں ہوئی تھی۔ کو بہ کو جنگ ہوئی تھی۔

☆☆☆

سقراط اب 70 برس کا ہو چکا تھا اور یہ تین سو ننانوے قبل مسیح کا سال تھا) اس طویل عمر میں اس نے بہت سے نشیب و فراز دیکھے تھے۔ اسپارٹا سے خوفناک جنگ دیکھی تھی۔ ایتھنز کو ہتھیار ڈالتے دیکھا تھا۔ جمہوریت کی رخصتی اور آمریت کا دور دیکھ چکا تھا۔ ایسے مراحل دیکھے تھے جب اس کی جان جاتے جاتے رہ گئی تھی اور اب بحال شدہ جمہوریت کے پُر امن سالوں میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ امن و امان قائم ہوئے چار برس گزر گئے تھے۔ ایوانِ اعلیٰ نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

افلاطون، سقراط کا نیا دوست عمر کی اٹھارہ بہاریں دیکھ چکا تھا اور سنجیدگی سے سیاست اختیار کرنے پر غور کر رہا تھا۔ خوف اور اندیشے بھی ذہنوں کی غلام گردشوں میں ٹپکتے نظر آتے تھے۔ شہریوں نے گزری ہوئی باتوں کو بھول جانے کا حلف اٹھایا اور یہ عہد کیا کہ نکتہ چینی کی عادت کو ترک کر دیں گے۔

سقراط اس عہد کے حق میں نہیں تھا۔ ظاہری امن کے لیے لوگوں کی زبان بند کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ قانون کی پابندی کرتا تھا لیکن ایسے قانون کی نہیں۔ اس نے ”ج“ کی جستجو جاری رکھی۔ وہ اسی طرح اپنا کام کرتا رہا۔

”ج تمام لوگوں کی مشترکہ میراث ہے۔ میں بچ بولتا رہوں گا۔“

اسے یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ کتنی بڑی مصیبت سے دوچار ہونے والا ہے۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ اب تو قانون کی حکمرانی ہے۔ اس پر کوئی آفت نہیں آسکتی۔

اس کے دوست کراسو کو بھی شبہ نہیں ہوا لیکن جب شہر میں سرگوشیاں شروع ہوئیں تو اس کے کان کھڑے ہوئے، اس نے سقراط سے ذکر کیا۔

”کیا تم اس خبر کی تصدیق کر سکتے ہو کہ تمہارے خلاف کوئی مقدمہ دائر کیا گیا ہے اور عنقریب تمہیں عدالت میں طلب کیا جائے گا۔“

”میں بھی بس سن ہی رہا ہوں۔ ابھی مجھے عدالت میں طلب تو نہیں کیا گیا۔“

کراسو اس سے بات کر کے واپس آیا ہی تھا کہ شہر میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ سقراط کو عدالت نے طلب کر لیا ہے۔ یہ خبر غلط نہیں تھی۔ ایک شخص مائیلی تھو نے اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا تھا۔ سقراط پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ ان دیوتاؤں کو نہیں مانتا جن کا شہر معتقد ہے۔ وہ نئے دیوتاؤں پر ایمان لے آیا ہے اور نو جوانوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ ان نو جوانوں کے حوالے سے وہ عادات بد میں مبتلا ہے۔ مائیلی تھو نے عدالت سے استدعا کی تھی کہ سقراط پر مقدمہ چلایا جائے اور اسے موت کی سزا دی جائے۔ عدالت میں اس کی معاونت کے لیے دو آدمی بھی بنے گئے تھے۔ ایک لائی کوئی اور دوسرا مشہور سیاست داں انیٹوس۔

انیٹوس کے شامل ہو جانے کے بعد سقراط کی سزا یقینی ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ اچھا مقرر بھی تھا اور عوام میں اس کی شہرت محبت وطن کی تھی۔

سقراط کو عدالت میں یہ ثابت کرنا تھا کہ اس کی ساری زندگی پارسائی میں گزری ہے۔ نو جوان لڑکوں سے اس کا تعلق محض معلم کا رہا ہے۔ اس جیسے باتونی کے لیے یہ مشکل کام نہیں تھا۔ اسی لیے لوگ مختلف باتیں کر رہے تھے۔ لوگوں کو وہ مزاحیہ کھیل بھی یاد آ رہا تھا جو برسوں پہلے کھیلا گیا تھا۔ اس حقیقت میں بھی یہی الزامات دہرائے گئے تھے۔ وہ مزاحیہ تمثیل اب سنجیدہ کھیل بن چکا تھا۔

دن گزرا نہیں تھا کہ شہر باتوں سے بھر گیا۔ لوگ دکانوں کے آگے بچے تختوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ”بھئی ہم تو برسوں سے اسی بات کے منتظر تھے۔ آخر یہی ہونا تھا۔“

”انیٹوس جیسا محبت وطن بھی استغاثہ میں شامل ہے۔ الزامات میں کچھ تو صداقت ہوگی۔“

”ایلیسی بیادیز کا قصہ تمہیں یاد ہے؟“

”اسے کون بھول سکتا ہے۔“

”یہ بات تو یہ ہے کہ سقراط بہت خطرناک آدمی۔“

”ایسا ویسا۔ اگر یہ اسپارٹا میں ہوتا تو کب کا قتل کر دیا جاتا۔“

”سنا ہے انیٹوس کے لڑکے کو بھی سقراط نے بہکا یا تھا۔ اس پر انیٹوس کو غصہ آیا۔“

کچھ لوگوں کے دل میں اس کے لیے ہمدردی بھی تھی۔ ”وہ ستر برس کا بوڑھا ہے۔ اس کے بعد اس کی بیوی بے سہارا ہو جائے گی۔ بچے یتیم ہو جائیں گے۔ اگر وہ گناہگار ہے بھی تو درگزر کرنا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ

نرالی یادگار

جرمنی کی ایک مشہور جنگ 18 اکتوبر 1873ء میں ہوئی تھی اس کی یاد میں جرمنی میں ایک ایسا ہال تعمیر کیا گیا ہے جس میں تمام چیزیں اٹھارہ اٹھارہ ہیں۔ اس ہال میں 18 چالیاں، 18 بیڑھیاں، 18 فانوس اور 18 بجسے ہیں۔ اس جنگ میں 18 فوجی جرنیلوں کی حکمت عملی سے فتح حاصل ہوئی تھی۔ دشمن کے 18 اہم مقامات پر قبضہ کیا گیا تھا۔ اس ہال میں ان 18 مقامات کے نام بھی ایک بورڈ پر کندہ ہیں۔
مرسلہ: فیصل مقبول دین پوری خان پور کنورا

اس سے بات چیت کر کے اسے سمجھایا جائے۔“
”یہ بھی تو ہو سکتا ہے“ ایک اور شخص بولا۔ ”قدیم رسم کے مطابق اس کے بیوی بچوں کو ماتمی لباس پہنا کر عدالت میں لایا جائے۔ شاید عدالت اپنا فیصلہ بدل دے۔“
”ہو تو سکتا ہے لیکن سقراط کو تم جانتے ہو کیسا ضدی ہے۔ کبھی نہیں مانے گا۔ دیکھ لینا عدالت میں معافی بھی نہیں مانے گا۔“

”اور پھر وہ قدیم رسموں کو مانتا ہی کہاں ہے۔“
”بھئی یہ بات تو تمہیں ماننی پڑے گی کہ اس نے ایتھنز کے لوگوں میں بیداری کی نئی لہر پیدا کر دی ہے۔ دیکھنا اس کا فائدہ کبھی نہ کبھی ہوگا ضرور۔“

یہ باتیں صرف بازاروں میں نہیں ہو رہی تھیں۔ گھروں میں بھی چرچے تھے۔ انیٹوس کے گھر میں مقدمے کی تیاری ہو رہی تھی۔

”اس مقدمے میں اگر ذرا سی بھی غلطی ہوگئی تو سقراط ہیرو بن جائے گا۔ اگر سقراط نے جرح شروع کر دی تو تم اسے جانتے ہو وہ کس طرح معاملے کو الٹ کر رکھ دیتا ہے۔“

”جرح کے دوران اسے یہ یاد کرانا ہے کہ جمہوریت میں اکثریت کے فیصلے صادر ہوتے ہیں۔ اسے بھی اکثریت کے فیصلے کا پابند ہونا ہوگا۔ اور ہاں ایسی بیادیز کے واقعات کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اسے قانون بھگنی تک محدود رکھو۔“

جہاں تک سقراط کے دوستوں کا معاملہ ہے ان کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور اب کیا ہوگا۔ خوفزدہ تو سب تھے لیکن پُر امید تھے۔

ایتھنز میں اس سے پہلے کسی ایک شخص کے لیے اتنی باتیں کبھی نہیں ہوئی تھیں۔

سقراط کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ گھر

میں بند ہو گیا تھا۔ اسے تو لوگوں نے اس وقت دیکھا جب وہ ابتدائی پیشی کے بعد ورزش گاہ میں آیا۔ اس کے چہرے سے نہ تو کسی الجھن کا اظہار ہو رہا تھا اور نہ کوئی خوف تھا۔ وہ ہشاش بشاش، لوگوں سے باتیں کرتا پھر رہا تھا۔

کسی نے اس سے پوچھ لیا ”تم یہاں وقت گزار رہے ہو مقدمے کے لیے تقریر کب تیار کرو گے۔“
”میں تمام عمر اس تقریر کی تیاری تو کرتا رہا ہوں۔“
اس نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا اور پھر کسی اور مسئلے پر بات کرنے لگا۔

دوسرے دن مقدمے کی کارروائی ہوئی تھی۔ وہ گھر جا کر آرام سے سو گیا جیسے کل کچھ ہونے والا ہی نہیں۔

اس کا دوست کراٹھو۔ اس کا لڑکا کراٹھو یوس، افلاطون اور کئی دوست صبح ہوتے ہی اس کے گھر پہنچ گئے تاکہ اسے لے کر عدالت جائیں۔ عدالت کو معلوم تو ہو کہ اس کے ساتھ بھی کچھ لوگ ہیں۔ وہ سب شرمندہ سے نظر آرہے تھے کہ سقراط کا سامنا کس طرح کریں گے۔

سقراط پہلے سے بھی زیادہ چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ دوستوں کو دیکھتے ہی اس کا بد صورت چہرہ خوشی سے دکنے لگا۔ کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ تیار تو بیٹھا ہی تھا۔ چادر کندھے پر ڈالی اور دوستوں کے ساتھ گھر سے نکل آیا۔ بازار... میں کھڑے لوگوں میں سے بعض اسے دیکھ کر مسکرائے، بعض نے تاسف کا اظہار کیا۔

وہ دوستوں سے باتیں کرتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک خاموش ہو گیا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی ایسی آواز کو سننے کی کوشش کر رہا ہے جو اسے بہت دور سے آتی سنائی دے رہی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری اور اس کی باہرنگی ہوئی آنکھیں مزید باہر آ گئیں۔

ایتنسز کے پانچ سو ایک شہری جو بذریعہ قرعہ اندازی جیوری کے لیے منتخب ہوئے تھے عدالت میں پہنچ چکے تھے۔ صدر عدالت شاہ آرگن اپنے تخت پر بیٹھا تھا۔ عام لوگ بھی موجود تھے۔

افتتاحی دعا پڑھی گئی اور کارروائی کا آغاز ہو گیا۔ سب سے پہلے استغاثہ کے لوگوں نے سقراط پر الزام عائد کیے اور انہیں ثابت کرنے کے لیے دلائل دیے۔ سقراط ان کے ایک ایک لفظ پر غور کرتا رہا تھا چنانچہ جب نقیب نے اس کا نام پکارا تو وہ کسی ہجک کے بغیر آگے بڑھا۔
”ایتنسز کے لوگو! سقراط نے جیوری کو مخاطب

کرنے کے بجائے ایتنسز کے لوگوں سے خطاب کیا۔“ اس نے تو نہیں کہہ سکتا کہ جس وقت مجھ پر الزام لگانے والے تقریریں کر رہے تھے اس وقت تم کیا محسوس کر رہے تھے لیکن میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ ان کی تقریریں سن کر میں تو تقریباً یہ بھول گیا تھا کہ میں کس طرح کا آدمی ہوں۔ پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ سچ تو انہوں نے بالکل بولا ہی نہیں۔ میں اس کے علاوہ کیا کہہ سکتا ہوں کہ اگر مجھے کوئی تباہ کرے گا تو وہ مائیلی توں نہیں ہوگا۔ مجھے دنیا برباد کرے گی جس طرح اس دنیا نے بہت سے نیک آدمیوں کو برباد کیا ہے۔

ایتنسز کے لوگو! جو کام میں اس وقت انجام دے رہا ہوں اس پر دیوتا نے مجھے مامور کیا ہے۔ دیوتا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں فلسفے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دوں لہذا اگر میں موت کے ڈر سے اپنے مقام پر ڈٹا نہ رہوں تو میرا یہ فعل نہایت برا ہوگا۔“

سقراط اپنی کسی کوتاہی پر معذرت خواہ نہیں تھا۔ وہ اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔

جوں جوں اس کی تقریر آگے بڑھتی گئی مخالفت کی ایک لہری ابھرتی چلی گئی۔

”مجھ سے کہا جا رہا تھا کہ میں اپنے بیوی بچوں کو ماتمی لباس پہنا کر لاؤں تاکہ جیوری کے ارکان مجھ پر رحم کھائیں۔ تو ایتنسز والو! جیوری کے ارکان نے تو قانون کے مطابق فیصلے کرنے کا حلف اٹھایا ہے۔ میں انہیں یہ ترغیب کیوں دیتا کہ وہ قانون کے خلاف فیصلہ کریں۔ میری موت کی سزا میں تخفیف کر دیں۔

جس طرح آمریت کے دور میں بولنا خطرے سے خالی نہیں تھا اس طرح جمہوریت کے زمانے میں بھی ناممکن ہے کہ کوئی ایمانداری سے کام کرے اور زندہ بچ جائے۔ میں اسی تضاد کو دور کرنے کے لیے بولتا رہتا ہوں۔ اگر تم مجھے اس شرط پر معاف کر دو کہ میں اب خاموش رہوں گا تو میں اس شرط پر رہا ہونے سے انکار کروں گا۔“

اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس نے بڑی دلیری سے انیسٹوس کو براہ راست مخالف کر ڈالا۔

”انیسٹوس، تم مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اس لیے کہ برا آدمی اچھے آدمی کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“ پھر اس نے دعائیہ کلمات ادا کیے ”میری دعا ہے کہ دیوتا اور عدالت ایسا فیصلہ صادر کریں جس میں میری بھلائی ہو اور تم لوگوں کی بھی۔“

اس کی تقریر ختم ہوتے ہی کمرہ عدالت آوازوں سے گونجنے لگا۔ ہر شخص رائے زنی کر رہا تھا اور اندازے بیان کر رہا تھا کہ عدالت پر اس کی تقریر کے کیا اثرات ہوتے ہیں۔

نقیب نے رائے شماری کا اعلان کیا۔
مکے ایک طرف لگا دیے گئے۔ جیوری کے پانچ سو ایک ارکان ایک ایک کر کے ان مشکوں میں اپنا ووٹ ڈالتے رہے پھر یہ مکے میز پر رکھ دیے گئے اور کٹتی شروع ہو گئی۔ استغاثہ نے سزائے موت کی درخواست کی تھی۔ مجرم ثابت ہونے کی صورت میں وہ یہ درخواست کر سکتا تھا کہ موت کی سزا جلاوطنی سے بدل دی جائے۔

رائے شماری کے بعد وہ صرف تیس ووٹوں سے مجرم قرار پایا۔ فرق اتنا کم تھا کہ اس کی سزا جلاوطنی میں تبدیل کی جاسکتی تھی اور اس کی جان بچ جاتی۔ جیوری کے ارکان بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ یہ درخواست کرے لیکن اس نے یہ کہہ کر سب کو حیرت میں ڈال دیا۔

”میں اپنے شہر ایتنسز میں سچ نہیں بول سکتا اور اس کے پاداش میں یہاں کھڑا ہوں تو دوسری جگہ کے لوگ مجھے سچ کیسے بولنے دیں گے۔ اور خاموشی میں رہ نہیں سکتا کیونکہ دیوتا نے مجھے بولنے کا حکم دیا ہے۔“

وہ یہ کہہ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔
”مجھے تو اپنی سزا ملے گی لیکن تم کو بھی اپنی سزا بھگتنی ہوگی۔ موت میری سزا بدی تمہاری سزا۔“

چند منٹ بعد قید خانے کے حکام آئے اور اسے لے گئے۔ قاعدے کے مطابق اسے دوسرے دن زہر کا پیالہ پہنا تھا لیکن ایک اتفاقی حادثے نے اسے ایک مہینے کی زندگی بخش دی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ موت سست رفتار ہے۔

ایتنسز کے لوگ ہر سال موسم بہار میں جزیرہ ڈے لوس پر ایک جہاز اور سفارت بھیجتے تھے۔ روایات کے مطابق ایالود یوتا نے اس جزیرے پر جنم لیا تھا لہذا جہاز اور سفارت بھیج کر اس کا جنم دن منایا جاتا تھا۔ یہ قانون تھا کہ جب تک یہ جہاز باہر رہتا تھا کسی قیدی کو موت کی سزا نہیں دی جاسکتی تھی۔ ان دنوں یہ جہاز ڈے لوس گیا ہوا تھا۔ یہ جہاز واپس آ رہا تھا کہ مخالف ہواؤں نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

مزا پر عملدرآمد جہاز کی واپسی سے مشروط تھا۔ اس کے دوستوں کو موقع مل گیا کہ وہ کچھ عرصہ اور اس سے ملاقاتیں کر سکیں۔

سقراط کے ہر وقت چلتے ہوئے قدم بیڑیوں میں مقید

تھے۔ سورج کی روشنی سے دور اندھیرے میں بیٹھا تھا البتہ جیلر اس پر بہت مہربان تھا۔ اس لیے اس کے دوست اس سے آزادانہ مل رہے تھے۔ چند مخصوص دوست۔

موت آنے میں دیر تھی اور اسی دیر نے سقراط کے دوستوں کو سوچنے کا موقع دے دیا۔ سب نے مل کر یہ طے کیا کہ جیلر اور پہرا داروں کو رشوت دے کر سقراط کو اس کے خواہوں کے پاس ”تھیسلی“ بھیج دیا جائے۔

رقم کا بندوبست کرنا مشکل نہیں تھا۔ کراٹھو نے ایک ایسے آدمی کا بندوبست بھی کر لیا تھا جو خچروں کے ساتھ جاسکتا تھا۔ یہ سب تھا لیکن اصل مسئلہ سقراط کی رضا مندی کا تھا۔

شاید وہ موت سے بچنے پر تیار نہ ہو شاید تیار ہو جائے۔ اسی اثنا میں یہ خبر آ گئی کہ جہاز کل تک آجائے گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سقراط کو پرسوں مرنا ہوگا۔ وقت زیادہ نہیں تھا۔ جو کچھ کرنا تھا جلد کرنا تھا۔ سقراط سے بات کی جائے۔ کراٹھو سقراط کے بچپن کا دوست تھا۔ اسکول کے زمانے کا ساتھی تھا۔ یہ کام وہی کر سکتا تھا۔

صبح ہونے سے کچھ پیشتر کراٹھو، جیلر کی مہربانی سے سقراط کی کال کوٹھری میں پہنچ گیا۔ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھا تھا۔ کراٹھو نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔

سقراط نے نہایت اطمینان سے اس منصوبے کو سنا اور پھر اس کے ایک ایک نکتے کا جواب دیتا رہا۔

”زندہ رہنا اتنا اہم نہیں ہے جتنا صبح انداز سے زندہ رہنا۔ صبح انداز یہ ہے کہ بدی کا جواب بدی نہیں۔“

اس قسم کی باتیں تو وہ کرتا ہی رہتا تھا لیکن یہ کہہ کر اس نے بات ہی ختم کر دی۔

”کراٹھو، جب میں جوان ہوا اور قوانین کو سمجھنے کے قابل ہو گیا تو میں نے انہیں قبول کر لیا اور ان کا پابند رہا اور ان سے بھاگ کر کسی ایسے شہر میں جانے کی کوشش نہیں کی جس کے قوانین اس سے بہتر ہوتے۔ بتاؤ اب میں قوانین کیسے توڑ سکتا ہوں اور اگر ایسا کروں تو پھر آئندہ نیکی کی کس منہ سے کروں گا۔“

کراٹھو کے پاس اب کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ وہ سقراط کو جانتا تھا۔ سمجھتا تھا کہ اب اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اب یہ باتیں اپنے دوسرے دوستوں تک پہنچانی تھیں۔ انہیں بتانا تھا کہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔ اب موت کے دیوتا کو سقراط کے گرد منڈلاتے ہوئے دیکھو۔

شام تک جہاز آ گیا۔ موت اسی پر سوار ہو کر آئی تھی۔

پوری دنیا میں اپنی مثال قائم کرنے والے مجاہد کو خراج تحسین

وہ بیری کن کی طرح زمین سے بلندی پر پہنچا، فضا میں ایک چکر لگائے اور علامہ اقبال کے شعر کی عملی تشریح پیش کردی۔ پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا کسے کہتے ہیں یہ اپنے عمل سے دکھایا۔ صرف 7 منٹ میں محیر العقول کارنامہ انجام دے دیا۔ ورلڈ ریکارڈ قائم کر دیا۔ صرف یہی نہیں جب وطن نے اسے آواز دی اس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔

غازی

ابن کبیر

7 ستمبر، 1965ء

اُس کی رفتار نے بادلوں کو چھید ڈالا۔ آسمان اُس کی دھاڑ سے لرز اٹھا۔ وہ ہزاروں فٹ کی بلندی پر تھا کسی شاہین کی مانند۔ ایک ایسے دشمن کے مد مقابل جو اُس سے کئی گنا طاقتور تھا مگر اُس کے چہرے پر خوف کا شائبہ بھی نہیں تھا کیونکہ اُس کا عزم ہمالیہ سے بلند تھا اور اُس کے یقین کی جڑیں سمندر کی عمیق گہرائیوں میں تھیں۔

اچانک آسمان میں کچھ ہلچل ہوئی۔ وہ دشمن کے برق



پہنچو گے۔ وہ پھر کراٹھو سے مخاطب ہوا ”ہمت رکھو اور یہ کہو کہ یہ میرا جسم ہے جسے تم دفن کر رہے ہو اور اس کے ساتھ جو چاہو کرو اور جو مناسب سمجھو ادا کرو۔“

وہ بیٹھیں تک پہنچا تھا کہ زن نیچی اپنے بچوں اور دوسری عورتوں کے ساتھ پھر آگئی۔ کراٹھو وہاں سے ہٹ گیا۔ ان عورتوں سے باتیں کرتے ہوئے اسے شام ہوگئی۔ ابھی باتیں ہوئی رہی تھیں کہ جیلر موت کا پیغام لے کر آگیا۔

”معاف کیجئے گا۔ اب وقت آگیا ہے آپ کو زہر کا پیالہ پینا ہوگا۔“

یہ ایسا پیغام تھا کہ اس کے دوست نہ انکار کر سکتے تھے نہ اقرار۔ قانون کی پابندی تو کرنی ہی تھی۔ سقراط اپنے دوستوں کی ابھمن کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے پہل کی اور زہر لانے کو کہہ دیا۔

”میں نے یہ سنا ہے کہ مرد کو خاموشی سے مرنا چاہیے۔ جب میں زہر پی لوں تو اپنے اوپر قابو رکھنا اور صبر سے کام لینا۔ میں نے عورتوں کو اسی لیے باہر بھیج دیا کہ انہیں سمجھانا مشکل تھا۔“

دوستوں کے لیے یہ منظر ناقابل دید تھا۔ وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

ایک آدمی زہر کا پیالہ لے کر آگیا۔ سقراط نے نہایت جرات سے پیالہ ہاتھ میں لیا۔ اس کے ہاتھوں میں ذرا سی بھی لرزش نہیں تھی۔

کراٹھو نے ہمت کی اور دوبارہ کمرے میں آگیا۔ شاید سقراط کچھ کہنا چاہے۔ اس کا یہاں ہونا ضروری تھا۔

”میرا اس دنیا سے سفر سعادت کا سفر ہو۔ یہی میری دعا ہے۔“ اس نے دعا کی اور زہر کا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا۔

احکام کے مطابق وہ کچھ دیر ٹھٹھار رہا اور پھر کبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کبل سے منہ نکالا اور اس دنیا کے پہلے دوست سے آخری بات کی۔

”کراٹھو! ہم پر واجب ہے کہ ایک مرغ شفا کے دیوتا کے نام پر قربان کریں۔ کیا تم میری طرف سے یہ قربانی کر دو گے؟ دیکھو بھولنا مت۔“

اس نے کبل میں منہ ڈھانپ لیا۔

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں



ایک رات بیچ میں تھی پھر سقراط کو مرنے لگا۔

زن نیچی کورات میں، سی سقراط کے پاس بھیج دیا تھا کہ جو باتیں اسے اپنے شوہر سے کرنی ہوں کر لے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح کراٹھو اس سے ملنے پہنچ گیا۔ سقراط بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کی بیڑیاں کٹ چکی تھیں۔ زنجیروں کے نشان اس کی پنڈلیوں پر دیکھے جاسکتے تھے جن پر وہ آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر کر تکلیف دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زن نیچی اپنے سب سے چھوٹے بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ وہ رات بھر سقراط کے ساتھ رہی تھی اور روتی رہی تھی۔ اس وقت بھی رو رہی تھی۔

”یہ اگر یہاں بیٹھی رہی تو روتی ہی رہے گی۔ تم اسے اپنے کسی آدمی کے ساتھ گھر بھیج دو۔“

کراٹھو نے اپنے ساتھ آئے ہوئے آدمی کے ساتھ اس کی بیوی کو گھر بھیج دیا۔

کال کوٹھری میں خوفناک سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے کو سقراط نے توڑا۔ ”کراٹھو، میں نے بیدار ہونے سے پہلے ایک خواب دیکھا ہے۔ تم بھی سن لو۔ میرے خواب میں ایک عورت آئی تھی۔ مجھ سے کہہ رہی تھی آج تم اپنے گھر پہنچو گے۔ یہ تو مجھے معلوم ہے مجھے آج مار دیا جائے گا لیکن اہم بات گھر کی ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاید مرنے کے بعد مجھ سے اور تم سے دیوتا انصاف کریں گے اور ہماری روحیں پاک ہو جائیں گی۔“

اس کے بعد وہ ”موت“ پر گفتگو کرنے لگا۔ موت کے معنی کیا ہیں اور اس کے بعد کیا ہوگا۔ اس کا تاریخی جملہ یہ تھا۔

”موت میری یا کسی اور کی زندگی کے ختم ہونے سے عبارت نہیں۔“

کراٹھو کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے بڑے دکھ سے پوچھا۔

”ہم تمہارے لیے کیا کریں۔“

”کوئی نئی بات نہیں صرف اپنا خیال رکھو۔“

وہ شاید کراٹھو کی بات کا مفہوم نہیں سمجھا تھا۔ اس لیے کراٹھو نے وضاحت کی۔ ”ہم تمہیں کیسے دفن کریں۔“

”جس طرح تم چاہو لیکن سوال یہ ہے کہ مجھے پکڑ بھی پاؤ گے یا میں تمہاری گرفت سے نکل جاؤں گا۔“ اس نے یہ بات مزاحاً کہی تھی۔ اس لیے وہ ہنسنے لگا تھا پھر سنجیدہ ہو گیا۔ میں زہر پینے کے بعد تمہارے پاس نہیں رہوں گا میں ان لوگوں سے جا ملوں گا جن پر سعادت سایہ ملن ہے۔ اسی لیے تو خواب میں وہ عورت کہہ رہی تھی کہ آج تم اپنے گھر

کرتی تھیں۔

☆☆☆

منہی فوزیہ ہاتھ میں پیالہ لیے جھونپڑی سے باہر آئی۔
جھونپڑی کے دائیں جانب ایک درخت تھا، جس کی
چھاؤں میں ایک تخت بچھا تھا جس پر اُس کا باپ خاموش بیٹھا
خلاؤں میں گھور رہا تھا۔
تخت کے پاس ہی اُس کا بھائی فہیم بیٹھا مٹی کو نم کر کے
گھروندے بنا رہا تھا۔

وہ تخت کی جانب بڑھنے لگی۔ پیالہ آگے بڑھاتے
ہوئے اس نے دھیرے سے کہا۔ ”بابا پانی!“
آدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس یونہی بیٹھا رہا۔
اُس کا نام عبداللہ تھا۔ لوگ اُسے بزرگ تصور کرتے
تھے۔

فوزیہ ہاتھ میں پیالہ لیے کھڑی تھی، فہیم گھروندے بنا
رہا تھا اور عبداللہ خلاؤں میں گھور رہا تھا، اسی اثناء میں سامنے
سے ایک نوجوان گزر رہا جو دریا کی سمت سے آ رہا تھا اور اب
اُس کے قدم شہر کی سمت بڑھ رہے تھے۔

وہ محمود تھا۔ دریا سے لوٹتے ہوئے وہ عام طور سے یہی
راستے استعمال کیا کرتا تھا۔

درخت کے پاس سے گزرتے ہوئے اُس نے معمول
کے مطابق یہ آواز بلند سلام کیا۔ فہیم اور فوزیہ نے جواب دیا۔
نوجوان آگے بڑھ گیا۔ اس بات کا اندازہ کیے بغیر
کے دوروشن آنکھیں اس پر مگی ہیں۔

عبداللہ خلاؤں کے سفر سے لوٹ آیا تھا، اب اس کی
خاموش نظریں محمود کا تعاقب کرتی تھیں۔

”اوروں سے کتنا مختلف ہے یہ۔“ منہی فوزیہ نے
اپنے بھائی سے کہا۔

”ہاں۔ نہ جانے وہاں چٹان پر کھڑا کیا کرتا رہتا
ہے۔“ فہیم سر اٹھائے بغیر مٹی نم کرنے میں مصروف رہا۔

”وہ شاہین ہے...“ یہ غیر متوقع الفاظ عبداللہ کی زبان
سے ادا ہوئے اور وہ دونوں ششدر رہ گئے۔ یہ پہلا موقع تھا،
جب اُن کے باپ نے یوں براہ راست ان کی گفتگو میں حصہ
لیا ہو۔

”شاہین؟“ فہیم کچھ سمجھ نہیں سکا۔

”ہاں۔“ عبداللہ نے دھیرے سے کہا۔ ”اُسے پرواز
کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔“

کچھ دیر تک درخت کے چھاؤں میں خاموشی چھائی

رہی، جسے فہیم کی پُر جوش آواز نے توڑا۔ ”اگلی بار محمود بھائی
میں گے تو میں انہیں بتاؤں گا کہ میرے بابا تمہیں شاہین کہتے
ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ پھر گھروندے بنانے لگا، اس یقین کے
ساتھ کہ بابا اس بات کا جواب نہیں دے گا، کیونکہ ہمیشہ ایسا ہی
ہوتا آیا ہے، مگر وہ دن... مختلف تھا۔

اُسے اپنی پشت سے ایک میٹھی آواز سنائی دی۔

”اس کی ضرورت نہیں... وہ یہ بات جانتا ہے۔“

اُس کے قدم شہر کی جانب بڑھ رہے تھے، جس کی
فضاؤں میں کشیدگی ٹھہر گئی تھی ہندو مسلم کشیدگی اور اُس کی
جیب میں ایک چاقو تھا۔

☆☆☆

ہر منظر دھندلا گیا۔

مشرقی بنگال کے شہر نواکھالی سے فساد کی پہلی
چنگاری پھوٹی تھی جس نے کلکتہ میں قیامت ڈھادی۔
مسلمانوں کا ایسا قتل عام ہوا کہ تاریخ میں جس کی مثال نہیں
پھر وہ آگ بنگال سے نکل کر اڑیسہ میں پھیلی، صوبہ آسام کو
لپیٹ میں لیا اور پھر بہار کو لپیٹ میں لے لیا۔ ایسی مار کاٹ
مچی کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مونگیر، گیا، پٹنہ، سستی پور،
بہار شریف میں ہر طرف آگ ہی آگ نظر آنے لگی تھی۔
مسلمانوں کو گاجر مولیٰ کی طرح کاٹا جا رہا تھا۔ ظلم و بربریت
کا ایسا ننگا ناچ، ظلم کے ایسے مناظر دیکھ کر ہی تو عبدالرب
نشر غصے میں بول اٹھے تھے اور سردار ولہ بھائی ٹیل کی گال
پر طمانچہ رسید کر دیا تھا پٹنہ کے سبزی باغ میں۔

محمود کے رشتے دار بھی اس وقت سبزی باغ میں منعقد
اس جلسے میں موجود تھے۔ انہوں نے بہار شریف لوٹ کر
پوری روداد سنائی اور کہا ”لگتا ہے ولہ بھائی طمانچے کا بدلہ لینے
کے لیے فسادات کو بڑھاوا دے گا پھر بھی محمود کا خاندان مطمئن
تھا اور محمود کی آنکھوں میں نی تیر رہی تھی۔ وہاں، اُس کے
ارد گرد کئی افراد تھے۔ ماں باپ، بہن بھائی، رشتے دار، جن کی
زبان سے ادا ہونے والے الفاظ جذبات کی شدت سے لرز
رہے تھے، مگر وہ اُن کی بات سمجھنے سے قاصر تھا۔ کیونکہ وہ بھیگ
چکا تھا، پوری طرح۔ مسرت کے اُس کی لطیف احساس سے جو
بارش کی طرح مسلسل برس رہا تھا۔

وہ اگست کی ایک خوش گوار صبح تھی جو جشن منانے کے
لیے سازگار تھی۔ کروڑوں مسلمانوں کا خواب سچ ہو چکا تھا۔
پاکستان کا قیام عمل میں آچکا تھا۔

آنے والے برسوں میں محمود نے کئی بار خوشی کی انتہائی کیفیت کا تجربہ کیا مگر جس حسین احساس سے وہ 14 اگست 1947ء والے روز دو چار ہوا، اُس کا موازنہ مشکل ہے۔

قیام پاکستان کے وقت جس مسرت سے محمود اور اس کے اہل خانہ گزرے، الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ بہار میں فسادات کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی تھی مگر حالات بدستور کشیدہ تھے اور حالات کی کشیدگی نے ہی اُس کے اہل خانہ کے لیے زمین بجک کر دی۔ مشرق کی سمت رخت سفر باندھنے کا حتمی فیصلہ کیا گیا، جہاں خوابوں کی جنت تھی... جہاں پاکستان تھا۔

محمود کے لیے یہ سفر ایک اہل حقیقت تھا۔ شاید دل کے کسی گوشے میں اپنا گھر، اپنا محلہ چھوڑنے کا غم ہو، مگر جوں جوں ایک آزاد ریاست کی جانب قدم بڑھتے گئے، غموں کی ہر دیوار ڈھتی گئی۔ وہ لوگ ڈھا کا پہنچے پھر مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان آ گئے۔

☆☆☆

سمندر کنارے آباد وہ شہر کی زمانے میں ماہی گیروں کی بستی ہوا کرتا تھا، مگر اب اسے لاکھوں انسانوں کی پرورش کرنی تھی۔ یہی قدرت کا فیصلہ تھا۔ محمود اپنے عظیم قائد کے آبائی وطن میں تھا، جس کی مٹی سے سوندری سوندری خوشبو آتی تھی۔

اُس زمانے میں کراچی اتنا گنجان نہیں تھا۔ بہت کشادگی تھی یہاں۔ اسی وجہ سے ہندوستان سے لائے پئے آنے والوں نے اسے اپنا مسکن بنا لیا۔ بنگلوں اور کوشیوں میں رہنے والے اب جمبوئریوں میں مقیم تھے۔ وہ جن کے دسترخوان سے سیکڑوں کا پیٹ بھرا کرتا تھا، اب روکھی سوکھی کھا کر دن کاٹ رہے تھے، مگر ان حالات میں بھی وہ خوش تھے۔ کیونکہ اپنا دلیس تھا جس کی ہر شے چاہے وہ خستہ حال ہو، اور ہر کیفیت، چاہے وہ عسرت ہی کیوں نہ ہو، اچھی لگتی ہے۔

گو وقت لگا، مگر محمود کا خاندان نئے ماحول میں ڈھل ہی گیا۔ اس کے والد سرکاری ملازم تھے۔ اور ہر سرکاری ملازم کی طرح وہ بھی تبادلوں کی زد میں رہتے۔ اور پھر ایسا ہی ایک تبادلہ اس نوجوان کو اُس سر زمین تک لے گیا جو ناریل کی خوشبو سے مہکا کرتی، جس کی فضاؤں میں پٹ سن کی سنہری کرنیں بکھری رہتیں، جہاں کے باسی مچھلی اور چاول بڑی رغبت سے کھایا کرتے تھے۔

یہ مشرقی پاکستان کا مرکزی شہر ڈھا کا تھا، جہاں کی

زندگی میں در آنے والی جدت میں بھی اُس زمین کے حسین ثقافتی رنگ دکھتے تھے۔

وہاں ایسا بہت کچھ تھا جو محمود کی توجہ بہ آسانی اپنی جانب مبذول کروا سکتا تھا، مگر اُسے تو فقط ایک بلند چٹان پر کار بھی جس کے پہلو سے دریا بہتا ہو، جہاں کھڑے ہو کر وہ اپنے خیال کو پرواز کے لیے آزاد چھوڑ سکے۔

اور اُس نے چند ہی روز میں ایسا ایک مقام ڈھونڈ نکالا۔ یوں خوابوں کی پرورش کا سلسلہ جہاں سے نوا تھا، وہیں سے جڑ گیا۔

جوں جوں وہ بڑا ہوتا جا رہا تھا، فوج میں شمولیت کی خواہش بھی شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ چاقو اب بھی اُس کے پاس تھا اور وہ باقاعدگی سے مشق کیا کرتا تھا۔ خود کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے کسرت بھی کرتا۔ کیونکہ دشمن کا حال موجود تھا... جنگ کا بگل بجنے میں کچھ ہی برس رہ گئے تھے۔

☆☆☆

وہ ایک پڑھے لکھے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ تعلیم کو اس کے خاندان میں کلیدی حیثیت حاصل تھی۔

گھر کے ماحول کے طفیل کتابوں سے اس کی دوستی ہوئی، جن کے ساتھ اس کا فارغ وقت بیتا۔ ہم نصابی کتب کے ساتھ نصابی کتابوں سے بھی اچھا رشتہ رہا۔

ہجرت کے باعث کچھ عرصے تعلیمی سلسلہ منقطع ضرور رہا، مگر ڈھا کا کا رخ کرنے کے بعد یہ پھر بحال ہو گیا۔

نیو گورنمنٹ ہائی اسکول کا شمار ڈھا کا کے بڑے تعلیمی اداروں میں ہوتا تھا۔ محمود کے والد نے اُسی درس گاہ کا انتخاب کیا۔

اُس نے نہ صرف تمام امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کیے، بلکہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش رہا۔ خصوصاً اسپورٹس میں اس کی کارکردگی توجہ کا مرکز رہی۔

اُسی زمانے میں محمود نے عشق کا تجربہ کیا۔ مگر یہ عشق اپنے جیسے کسی انسان سے نہیں تھا۔ قطعی نہیں۔ اسے تو فطرت کے اُس حسین تر منظر سے محبت ہو گئی تھی جسے ہم برسات کہتے ہیں۔

جب کبھی ساون رُت آتی، اُس کے من میں جل ترنگ سا بچنے لگتا۔ وہ گھر سے نکل جاتا۔ میلوں پیدل چلتا۔ اور اس دوران فقط کپڑے ہی نہیں بھیکتے، دل بھی خوشی کی بارش میں بھیک جاتا۔

موسم بدلتے رہے۔ وقت گزرتا رہا۔

محمود اب میٹرک کر چکا تھا۔ باپ کی خواہش تھی کہ بیٹا سی ایس بی افسر بنے۔ اسی خواہش کے تحت ڈھا کا کے بہترین تعلیمی ادارے کا انتخاب کیا گیا، جہاں اُسے سائنس کے مضمون سے لگنا تھا۔

اساتذہ قابل تھے، فروغ علم ان کا اکلوتا مقصد تھا... ساتھی طالب علموں کی آنکھوں میں ذہانت دکتی تھی، حصول علم ان کی شدید ترین خواہش تھی، الغرض پڑھنے کے لیے وہ مقام بہترین تھا مگر... کسی شے کی کمی تھی۔

وہ بے کل سا رہتا۔ ایک اداسی ہمہ وقت اُس پر طاری رہتی۔

گھروں والوں کا خیال تھا کہ اس کا سبب پڑھائی کا دباؤ ہے، مگر ایسا نہیں تھا۔

دراصل وہ اپنی منزل کی مخالف سمت سفر کر رہا تھا۔ جس راہ پر وہ چل رہا تھا، وہ پاک فوج کی طرف نہیں جاتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے وہ چپ چاپ رہنے لگا... دراصل وہ منتظر تھا، اپنی دعاؤں کی قبولیت کا۔

ابھی فرسٹ ایئر کا سیشن اختتام سے چند ماہ دور تھا کہ وہ خوش قسمت لمحہ آن پہنچا جس کا وہ برسوں سے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بچپن سے منتظر تھا۔

پاک فضائیہ کو جوان درکار تھے... اور محمود اُس موڑ پر آن پہنچا تھا جہاں سے اُس کی زندگی کا حقیقی معنوں میں آغاز ہونے والا تھا۔

ہاں، گھر والوں کو اعتراض تھا، خصوصاً والد کو۔ ”ارے بھئی، یہ بھی کوئی بات ہوئی... ہم نے تمہارے لیے کتنے سنے دیکھے تھے۔“

یہ اور اس نوع کے کئی جملے اُسے سننے کو ملے۔

بڑوں نے سمجھایا۔ ”سرکاری افسر نہیں بننا چاہتے، تو وکالت کی جانب آ جاؤ۔ بڑا اسکوپ ہے اس پیشے میں۔“

”انجینئرنگ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ آج کل یورپ میں انجینئروں کی بڑی مانگ ہے... نہیں... تو کیا ڈاکٹر بننا چاہتے ہو؟“

محمود چپ چاپ سنتا رہا۔ وہ اپنے گھر والوں کے جذبات کی قدر کرتا تھا، مگر وہ اپنا فیصلہ بدل نہیں سکتا تھا... یہ اس کے بس میں تھا ہی نہیں۔ یہ تو قدرت کا فیصلہ تھا۔

اُس نے پاک فوج میں اپلائی کر دیا... پرواز کا وقت آن پہنچا تھا۔

☆☆☆

آنکھوں کے سامنے وسیع آسمان تھا جس کا کوئی کنارہ نہیں تھا۔ اور یہی آسمان اُس کا مسکن تھا۔ یہیں اُسے بسیرا کرنا تھا۔

وہ ایک جنگی طیارے میں سوار تھا، جو ہوا کو چیرتے ہوئے لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھ رہا تھا۔

وہ ایک جادوئی پل تھا۔ سر پر نیلگوں چھت تھی اور نیچے ایک طویل پہاڑی سلسلہ، جسے اس نے برق رفتاری سے عبور کیا اور اب وہ ریگستان پر پرواز کر رہا تھا جس سے چند میل دور اس کی بیس تھی۔

اس کی پہلی پرواز تمام ہونے والی تھی، اور اسے اس کا قلق تھا، مگر یہ خوشی بھی تھی کہ جلد ہی اُسے پھر پرواز کا موقع ملے گا۔ وہ پھر مسرت کے ناقابل بیان تجربے سے گزرے گا۔

طیارہ اتر چکا تھا۔ کچھ دیر بعد محمود زمین پر کھڑا تھا۔ مگر حقیقتاً وہ زمین پر نہیں تھا... تا حال آسمانوں میں تھا، جو اُس کے خوابوں کی مانند انتہائی وسیع تھا۔

ٹھیک اُس لمحے، جب پہلی پرواز کی خوشی سے لبریز اس نوجوان کے قدم زمین سے ٹکرائے، میلوں دور، گھنے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھے ایک بوڑھے شخص نے آنکھیں کھولیں، جن میں تذبذب تھا۔

اُس نے ہاتھ کی اوٹ بنا کر دریا کی سمت دیکھا۔

وہاں ایک چٹان تھی، جس کے پہلو سے دریا بہتا تھا۔ ”یہ غازی... یہ تیرے پڑا سرار بندے!“ بوڑھے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اُس کا نام عبداللہ تھا... لوگ اسے بزرگ تصور کرتے تھے!

☆☆☆

2 اکتوبر 1953ء... ایک ایسی تاریخ جسے وہ تادم مرگ یاد رکھنے والا تھا، کیونکہ اسی روز اُس نے پاک فضائیہ میں کمیشن حاصل کیا۔

ایئر فورس اُس کا عشق تھا۔ یہ رومانس ہی اس کی کل زندگی تھا اور یہاں رقابت کا اندیشہ نہیں تھا۔

ایک برس قبل اس نے پاک فضائیہ میں شمولیت اختیار کی تھی۔ ترقی کی مراحل طے کرنے میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ ہواؤں کی چیرتے ہوئے دشمن پر جھپٹنے کی قابلیت تو اس میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ پھر اُس کے سیکھے کی رفتار بھی حیرت انگیز تھی۔ یوں وہ برق رفتاری سے ایک کے بعد ایک مرحلے طے کرتا گیا۔

سینئر افسران نے جلد اُس کی قابلیت کا اندازہ لگا لیا۔ وہ اُن کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ پاک فضائیہ کے طریق کے مطابق اس نے کئی کورس کیے۔ فائٹر کورس، فائٹر لیڈر کورس، پی اے ایف اسٹاف کالج کورس۔ اور ہر بار امتیازی نمبر حاصل کیے۔ قابلیت اور صلاحیت کے پیش نظر اُسے بیرون ملک منعقد ہونے والے ٹریننگ کورسز کے لیے بھی منتخب کیا گیا۔ اُس نے امریکا سے اور نیشنل ٹریننگ کورس کیا اور برطانیہ کے رائل ڈیفنس اسٹڈیز کورس میں حصہ لیا۔ اور جہاں بھی گیا، اپنی صلاحیتوں کی گہری چھاپ چھوڑی۔ خصوصاً امریکی ماہرین تو اُس کی قابلیت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے اس نوجوان کا کاندھا تھپتھپایا۔ شان دار الفاظ میں اس کی قابلیت کو سراہا۔ مگر محمود نے ستائی کلمات کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔

جذیبہ حب الوطنی اور اپنے فن میں بے پناہ مہارت کی وجہ سے ساتھی افسران بھی اُس کا بہت احترام کرتے تھے۔ اُس کی درویشی، دنیاوی خواہشات سے بے نیازی اکثر موضوع بحث رہتی۔ نئے آنے والوں کو اُس کی مثال دی جاتی۔ اُسے رول ماڈل کے طور پر پیش کیا جاتا۔ اور وہ واقعی قابل تقلید تھا۔ اُسے گاڑی اور بجٹ کی خواہش نہیں تھی۔ وہ شہرت اور دولت کی آرزو سے بے پروا تھا۔

☆☆☆

وہ 1960ء کی ایک خوش گوار دوپہر تھی، جب کراچی میں تعینات محمود کی ایک نوجوان افسر امتیاز احمد بھٹی سے ملاقات ہوئی۔

بھٹی ایک پُر جوش نوجوان تھا۔ سینئرز نے خصوصی ہدایت کی تھی کہ کراچی پہنچنے کے بعد وہ ایم ایم عالم سے ضرور ملاقات کرے۔ یہی سبب ہے کہ میں پر رپورٹ کرنے کے بعد وہ محمود کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اور تلاش کے اختتام پر وہ ایک ایسے شخص کے روبرو کھڑا تھا جس کی آنکھوں میں ہلاکی چمک تھا، جس کا ماتھا کشادہ تھا، باریک مونچھیں تھیں، اور ہونٹوں پر ہلکی سے مسکراہٹ منجمد تھی۔

”سر، مجھے آپ کی رہنمائی درکار ہوگی۔“ بھٹی کے لہجے میں محبت اور مرعوبیت، دونوں ہی احساسات تھے۔ ”بالکل نوجوان۔“ محمود نے ایک سینئر کی طرح کہا۔ ”میں ہمد وقت دستیاب ہوں۔“ جلد ہی بھٹی اور محمود میں دوستی ہو گئی۔ مگر بے تکلفی میں

بھی احترام کا احساس غالب رہا۔ بھٹی کو اپنے سینئر کی نئی عادات نے متاثر کیا مگر ایک عادت کی وجہ سے وہ تھوڑا پریشان رہتا۔ تیس پروردی پہننے کی شرط نہیں تھی مگر محمود ہمیشہ وردی میں نظر آتا۔ ایک دن اُس نے اس کا سبب پوچھ ہی لیا۔ سوال نے محمود کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ اسے بچپن کے وہ دن یاد آئے، جب وہ فوجیوں کے ماتند مشق کیا کرتا تھا اور لوگ اس سے اس عمل کا سبب دریافت کیا کرتے۔ پھر وہ لمحہ حال میں لوٹ آیا۔ سامنے ایک پُر جوش فلائٹ آفیسر کھڑا تھا، جو جواب کا منتظر تھا۔ اس نے دیر سے کہا۔ ”کیونکہ ہمیں کسی بھی وقت کال کیا جاسکتا ہے۔“ اُس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ ہر مقابلے کے لیے تیار ہے۔

☆☆☆

کچھ حادثات اچانک رونما ہوتے ہیں اور انسان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دیتے ہیں۔ اُسے بھی ایک حادثے سے گزرنا پڑا، جس نے اُس کی زندگی پر انٹ نفوش چھوڑے۔ اس کے شفیق والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس خبر نے اُسے دل گرفتہ کر دیا، مگر وہ زیادہ دیر دُکھی رہنے کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ دس بہن بھائیوں کی ذمہ داری تھی اس پر، جنہیں وہ بے پناہ چاہتا تھا۔ بڑے ہونے کے باعث خاندان کی ذمہ داری اب اس کے کندھوں پر تھی، جسے نبھانے کے لیے اس نے اپنی زندگی تیا گنے کا فیصلہ کر لیا۔

گھر والوں نے محمود کا ایک جگہ رشتہ طے کر دیا تھا۔ منگنی بھی ہو گئی تھی، مگر والد کے جہان فانی سے کوچ کرنے کے بعد محمود نے سوچا۔ ”میرے لیے کون زیادہ اہم ہے۔ موجودہ خاندان یا وہ خاندان جو ابھی وجود ہی نہیں رکھتا؟“ دل نے موجودہ خاندان کے حق میں فیصلہ صادر کیا۔ اُس نے نہ صرف منگنی توڑ دی بلکہ ایک حیرت انگیز اعلان بھی کر دیا جسے سن کر دوست احباب ششدر رہ گئے۔

”کیا ساری زندگی کنوارے رہو گے؟“ انہوں نے سوال کیا۔ ”تنہائی بڑا عذاب ہے۔“ ”میں تنہا کہاں ہوں۔“ وہ مسکرایا۔ ”تم لوگوں ہو ناں۔ پھر میرے بہن بھائی ہیں۔ یہ ملک ہے۔ اور سب سے بڑھ کر ایئر فورس ہے۔“

ہاں، ایئر فورس... اس کا عشق، جس میں کسی آمیزش کا امکان نہیں تھا!

☆☆☆

☆ اگست 1965ء ریاست بہار، ہندوستان: بوڑھا تخت پر لیٹا تھا۔ چہرے سے نقاہت عیاں تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور سانس ڈھنکی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ارد گرد کئی لوگ کھڑے تھے، جن کی آنکھوں میں عقیدت بھی تھی اور دُکھ بھی۔ وہ جانتے تھے کہ اُس کے جانے کا وقت آن پہنچا ہے۔ ساتھ ہی اُن کے دلوں میں جنگ کے اندیشے بھی لپکتے تھے۔ حالات انتہائی کشیدہ تھے۔ تصادم کے بادل فضاؤں پر تیرتے تھے۔ بوڑھے نے ہنسی لی۔ ارد گرد کھڑے لوگوں کے چہرے پر اندیشے کے سائے لرز گئے۔ چند ساعت خاموشی چھائی رہی۔ پھر اچانک... بوڑھے نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کا بیٹا تیزی سے آگے بڑھا۔ ”بابا... لیٹے رہیں آپ۔“ اُس نے اپنے باپ کو تھامتے ہوئے کہا۔ بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سیدھا بیٹھ گیا اور سرکتے ہوئے درخت کے تنے کی طرف بڑھنے لگا۔ لوگ دم سادھے کھڑے تھے۔ اچانک اُن کے ذہنوں میں ایک خیال کوندا۔ ”کیا ہم وقت خاموش رہنے والا یہ نیک شخص آج کچھ اُن کہا، کہنے والا ہے؟“ اس پر اسرار خیال کے ساتھ ہی جنگ کا خوف ذہن سے اتر گیا۔

تنے سے ٹپک لگا کر بوڑھا اپنی سانس درست کرنے لگا۔ سب ہمد تن گوش تھے۔ اُن کے ذہن تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ ”کیا وہ کچھ کہنے کو ہے؟ کوئی انکشاف؟ کوئی حاکمیت؟“

نہیں۔ وہ کچھ کہنے کا خواہش مند نہیں۔ بالکل چپ تھا۔ اور اس کی نظریں دریا جانے والے راستے پر تھیں، جہاں ایک چٹان پر خواب نمودا پاتے تھے۔ اس نے گہری سانس لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ خاندان کے آخری بزرگ نے اسے دعائیں دے کر آخری سانس تیا گ دی۔ جنگ آن پہنچی تھی!

☆☆☆

حملہ آور طاقت کے نشے میں نچوم رہے تھے۔ اُن کے

ذہنوں پر غرور کا آسیب سوار تھا۔ نفرت سوچنے بجھنے کی صلاحیتوں پر غالب آگئی تھی۔ تکبر نے انہیں اندھا کر دیا تھا۔ وہ ناشتے میں لاہور کے ”پائے“ کھانے کی آرزو رکھتے تھے۔ اور اس بابت اتنے پُر یقین تھے کہ کف اڑاتے ہوئے شالیمار باغ میں چائے پینے کا اعلان بھی کر دیا۔ اور اُن کے یقین کے کئی اسباب تھے۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے... جدید اسلحہ سے لیس تھے... پوری تیاری کیے بیٹھے تھے۔

”ہم راتوں رات پاکستان پر قبضہ کر لیں گے۔“ ایک خفیہ میٹنگ کے دوران بھارتی آرمی چیف نے متکبرانہ لہجے میں کہا۔

”سر، ہمارا پرائم ٹارگیٹ کیا ہے؟“ ایئر فورس کے ایک افسر نے سوال کیا۔ ”لاہور... اور تمہارے لیے... سرگودھا۔“ اُس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔

سرگودھا دفاعی نقطہ نگاہ سے پاکستان کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔ وہاں پاکستان ایئر فورس کی مرکزی بیس تھی، جس پر حملہ کر کے بھارت اپنی برتری ثابت کرنا چاہتا تھا۔

”ہم چھ چھ جہازوں کی فارمیشن میں اٹیک کریں گے۔ چار جہاز حملے کے لیے استعمال ہوں گے، دو انہیں کور کریں گے۔“ حملے سے ایک رات قبل بھارتی ایئر فورس کے چیف نے اپنے ماتحت کو ہدایات جاری کیں۔

”میرے خیال میں یہ سب بہت آسان ثابت ہوگا۔“ ماتحت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اُن کے برائے جنگی جہاز ہماری گرد بھی نہیں پاسکیں گے۔ سمجھیں کہ جشن کی تیاریاں مکمل ہیں۔“

وہ غلط تھے... انہیں قطعی اندازہ نہیں تھا کہ پاک فوج کے پاس ایک مہلک ہتھیار ہے جو پلوں میں انہیں ملیا میٹ کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔

اُس ہتھیار کا نام محمد محمود عالم تھا!

☆☆☆

☆ 7 ستمبر، سرگودھا ایئر بیس: جس وقت سائرن چنگھاڑا، بھٹی اپنے جہاز میں بیٹھا احکامات کا انتظار کر رہا تھا۔

جنگ چھڑ گئی تھی۔ بھارت پہلا فضائی حملہ کر چکا تھا اور اُس وقت پاک فضائیہ کے جاں باز آسمان میں دشمن کے

خلاف برسر پیکار تھے۔ بھٹی بھی اُن میں شامل ہونا چاہتا تھا، شہادت کا جذبہ اس کے سینے میں جوش مارتا تھا کہ سائرن کی آواز اُس کی سماعتوں سے ٹکرائی جو یہ پیغام دے رہی تھی کہ وہ جہاز سے نکل کر خندق میں چلا جائے۔

بھٹی ایک ماہر ایتھلیٹ کی طرح جہاز سے باہر آیا۔ ایسے میں اُس کی نظریں وے پر کھڑے ایک جہاز پر پڑی جس کا پائلٹ باہر آنے کے بجائے کاک پٹ میں بیٹھا آسمان کی سمت دیکھ رہا تھا۔

وہ 11 اسکواڈرن کا کمانڈر محمود تھا۔ جو کچھ ہی دیر میں تنہا فضائی جنگ کا نقشہ بدلنے والا تھا۔

بھٹی نے اپنے سینئر کی توجہ سائرن کی جانب متوجہ کروائی۔ محمود نے کوئی جواب نہیں دیا، چند ساعت خاموش رہا، پھر اُس نے ایک سوال داغ دیا۔ ”ابھی جو حملہ ہوا ہے، تمہارے خیال میں اس میں کون کون سے جہاز استعمال ہوئے ہیں؟“

بھٹی نے اپنے اندازے کے مطابق جواب دیا۔ محمود نے چند لمحوں کا توقف کیا۔ اس کی نظریں آسمان پر مچی رہیں، جہاں چند گھنٹوں بعد ایک محیر العقول واقعہ رونما ہونے کو تھا۔ بھارتی ایئر فورس ہنر طیارے استعمال کر رہی تھی، جو جدید ٹیکنالوجی سے لیس اور انتہائی تیز رفتار تھے۔

جس وقت بھارت نے پہلا حملہ کیا، سرگودھا میں موجود پاکستان ایئر فورس کا ایک اور جاں باز محمد عارف اقبال ایف 104 میں بیٹھا احکامات کا انتظار کر رہا تھا۔

دشمن سے نمٹنے کے لیے اُس کے ساتھی اڑان بھر چکے تھے اور اب وہ اپنی باری کا منتظر تھا۔ وہ یقین کی طاقت سے لیس تھا۔ ایسا یقین، جس کی قوت سے پہاڑ بھی اپنی جگہ چھوڑ دے۔ اسی اثناء میں اسے اطلاع ملی کہ دشمن کا حملہ بری طرح ناکام ہو گیا ہے اور پاکستانی سوراووں نے دشمن کے چار طیارے مار گرائے ہیں۔

اپنے پہلے وار میں ناکامی سے دشمن تمللا اٹھا اور فوراً ہی اگلے حملے کی تیاری میں جٹ گیا۔

دوسری جانب بھٹی اور اقبال جیسے سرفروش بھی تیار تھے۔ اُن کے ارادے بلند تھے اور وہ دشمن کے غرور کو خاک میں ملانے کا حتمی ارادہ کیے بیٹھے تھے۔

پہلے اور دوسرے حملے کے درمیانی وقفے میں محمود بالکل خاموش رہا۔ اس نے اپنے ارادوں کا اظہار نہیں کیا۔ اور یہ متوقع تھا، اُس کے ارادوں کی بلندی الفاظ میں کہاں ساسکتی

تھی۔

دوپہر کے قریب الارم پھر دہاڑا۔ دشمن حملہ کر چکا تھا۔ بھٹی اپنے طیارے میں جا بیٹھا۔ اس اثناء میں اس کی نظر محمود پر پڑی، جو ہر وقار انداز میں اپنے جہاز کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کی چال میں ابدیت تھی۔

محمود نے ایک چھتے کی طرح جست لگائی اور طیارے میں سوار ہو گیا۔ وہ دن، جس کا وہ گزشتہ تیس برس سے منتظر تھا، آں پہنچا تھا۔

☆☆☆

محمود اور بھٹی کے طیاروں نے ایک ساتھ اڑان بھری۔ اُن کا رخ کڑا نہ کے پہاڑوں کی سمت تھا۔

حملے کی اطلاع ملنے ہی اقبال بھی اپنے چار ساتھیوں کے ساتھ بن بلائے مہمانوں کی ”خاطر داری“ کے لیے شمال کی سمت اڑان بھر چکا تھا۔

طریق کے مطابق فضا میں موجود پاک فضائیہ کے طیارے ایک دوسرے سے رابطے میں تھے۔

اقبال کو علم تھا کہ اسکواڈرن لیڈر ایم ایم عالم اپنے ونگ کے ساتھ جنوب مشرقی حصے میں دشمن کی خبر لینے کے لیے تیار ہے، جب کہ فلائٹ لیفٹیننٹ بھٹی مزید مشرق میں، لگ بھگ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر موجود ہے۔

شمال کی سمت بڑھتے ہوئے اچانک اقبال کی نظر دشمن کے چار جہازوں پر پڑی جو جنوب مشرق کی سمت جا رہے تھے۔ اس نے فوراً اپنے ساتھیوں کو آگاہ کیا اور اپنا رخ دشمن کے جہازوں کی جانب موڑ دیا۔

اُس وقت تک بھٹی اور محمود کڑا نہ کے پہاڑوں پر پہنچ چکے تھے، جہاں دشمن کا ایک جہاز بھٹی کی ریش میں آ گیا۔ اُس نے فوراً نشان باندھا۔ وہ فائر کرنے ہی لگا تھا کہ یکدم اُس کی نظر پاک فضائیہ کے ایک جہاز پر پڑی، جو عین دشمن کے نیچے تھا۔

وہ محمود کا جہاز تھا۔ بھٹی نے احتیاط کے پیش نظر فائر کرنے کا ارادہ بدل دیا، مگر دشمن کو بھاگنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ محمود کے نشانے پر آچکا تھا۔

پاک فضائیہ کے طیارے نے شعلے اگلے، جنہوں نے دشمن کے طیارے کو چھلنی کر دیا۔ کچھ ہی لمحوں میں بھارتی ہنر سے آگ کی لپٹیں اٹھنے لگیں اور وہ آواز کی رفتار سے زمین کی سمت گرنے لگا۔

جب محمود کا طیارہ لالیاں کے مقام پر پہنچا، تو اُس کا

سامنا دشمن کے چھ طیاروں سے ہوا، جو تیزی سے سرگودھا کی سمت بڑھ رہے تھے۔

پاک فضائیہ کے جاں باز سہر طیاروں پر سوار تھے۔ دشمن کے ہنر طیاروں کی رفتار اُن سے زیادہ تھی اور اُن کے نزدیک پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ سہر طیارہ اپنا ہیروئی فیول ٹینک گرا کر ڈائیو کرے۔

اس اثناء میں اقبال بھی اپنا طیارہ لے کر اُس مقام پر پہنچ گیا، جسے قدرت ایک تاریخی واقعے کے لیے منتخب کر چکی تھی۔

اور جو کچھ اس نے دیکھا، برسوں بعد ان الفاظ میں بیان کیا: ”بھٹی نے اپنے فیول ٹینک گرانے کی کوشش کی... مگر ایک فیول ٹینک نہیں گرسکا... اب دشمن تک رسائی فقط ایم ایم عالم کے لیے ممکن تھی...“

اقبال ایف 104 میں سوار تھا، جو غوطہ لگا کر بھارتی طیاروں تک پہنچ سکتا تھا۔ اُس نے خود کو تیار کیا، مگر اسی لمحے... اس کے کان میں ایک سرگوشی ہوئی۔ ”ٹھہر جاؤ!“

اقبال ٹھہر گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگر دشمن کا کوئی جہاز ایم ایم عالم کے حملے سے بچ نکلا، تو وہ اسے نشانہ بنائے گا۔ وہ غلط تھا، محمود کے حملے کا توڑ اس روز کسی کے پاس نہیں تھا۔

جنگ کے بعد اقبال نے اس واقعے کو یوں بیان کیا۔ ”میں بالکل چوکس تھا۔ دشمن پر نظر رکھتے ہوئے میں عالم کے پیچھے رہا... مگر عالم کی مہارت اور جذبے کے پیش نظر میرے دل میں یہ خدشہ موجود تھا کہ وہ مجھے موقع نہیں دے گا۔“

یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔ کیونکہ وہ دن محمود سے منسوب تھا۔

اختیار احمد بھٹی نے برسوں بعد ان جاوولی لمحات میں جنم لینے والے احساس کو ان الفاظ میں سمویا ”عالم نے اپنا جہاز اُن کے پیچھے لگا دیا... اُن پر ہلہ بول دیا... اور میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔“

☆☆☆

اُس کی عقلمانی نظریں دشمن پر مچی تھیں۔ سینے میں شیر سا دل تھا۔ اور زبان پر کلمہ طیبہ۔

سامنے دشمن کے چار طیارے تھے۔ اُس نے اپنی گنوں کا رخ دائیں جانب موڑا۔ اسی اثناء میں اُس کی تیز نظریں نے آسمان کے انتہائی دائیں حصے میں کچھ ہلچل دیکھی۔ وہ ایک بھارتی طیارہ تھا، جو اپنے نصیب میں بدبختی لکھوا کر آیا تھا۔

یہ لمحوں کا معاملہ تھا۔ اُس نے اپنی کل توجہ اس طیارہ پر مرکوز کی۔ نشانہ باندھا۔ اگلے ہی لمحے اُس کی مشین گنیں شعلے اگلنے لگی تھیں۔

گو دشمن کا طیارہ کچھ دور تھا، فاصلہ زیادہ تھا، مگر نشانے باز کوئی عام انسان نہیں تھا، وہ قدرت کا منتخب کردہ سپاہی تھا۔ اُس کی مشین گن شعلے اگل رہی تھی اور آگ کا بڑا سا گولہ زمین کی سمت جا رہا تھا۔

دشمن کا پہلا جہاز تباہ ہو چکا تھا۔

محمود کے پیچھے پیچھے آنے والا ونگ کمانڈر اقبال واضح دیکھ سکتا تھا کہ اُس کا نڈر ساتھی اب دوسرا ہنر گرانے کو ہے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ آسمان میں گولیوں کی بوچھاڑ کا شور لڑا۔ چند ہی لمحوں میں ایک اور بھارتی طیارہ شعلوں میں گھر چکا تھا۔

مختصر سے وقت میں، فقط چند سیکنڈز میں دشمن اپنے دو طیاروں سے محروم ہو گیا اور اب سرا سیمگی کا شکار تھا۔ دیگر بھارتی طیاروں نے اپنی رفتار تیز کر دی، وہ جلد از جلد محمود کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتے تھے، مگر تباہی ان کی قسمت میں لکھی جا چکی تھی۔

ایک بار پھر محمود کی گنوں نے شعلے اگلے۔ گولیوں کی بوچھاڑ نے تیسرا طیارہ چھید ڈالا، جو تیزی سے زمین کی سمت بڑھنے لگا۔

اب پاکستانی جاں باز دو بھارتی طیاروں کے تعاقب میں تھا۔ اور اس کے ساتھی آنکھوں میں تحیر لیے اُس کے پیچھے آ رہے تھے۔ قدرت نے انہیں اس واقعے کی گواہی کے لیے جن لیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں مزید دو طیارے شعلوں میں لینے پاکستان کی فضائی حدود کا رخ کرنے کے فیصلے پر ماتم کر رہے تھے۔

محمود عالم، قدرت کا سپاہی، ایک منٹ سے بھی کم وقت میں پانچ طیارے تباہ کر چکا تھا۔

اس ناقابل یقین منظر کے گواہ بننے والے ونگ کمانڈر محمد عارف اقبال نے اُس سہ پہر جہاں تحیر کو اپنی رگوں میں دوڑتا محسوس کیا، وہیں ایک جنگجو والی مایوسی کا خفیف سا تجربہ بھی کیا، جسے بعد میں اُس نے یوں بیان کیا۔ ”آہ... عالم نے میرے لیے کچھ نہیں چھوڑا تھا... اگر دشمن کا کوئی طیارہ اس کے حملے سے بچ جاتا، تو میری گنوں کو بھی آگ اگلنے کا موقع مل جاتا۔“

جب محمود اپنا طیارہ لیے بیس پر لوٹا، وہاں اُس کے

ٹریسا مدر

1997-1998ء

عیسائی مبلغ جو سکوبچی (مقدونیا) میں پیدا ہوئیں۔ ان کا اصل نام ایگنس گانکشا بوجا کیسو (Agnes Gonxha Bejaxhiu) ہے۔ 18 سال کی عمر میں وہ راہبہ بن گئیں۔ بیس سال تک ملازمت کرنے کے بعد کلکتہ میں مفلوک الحال لوگوں کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے نہ صرف بھارت میں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی حادثات میں لوگوں کی جانیں بچانے کا کام کیا۔ انہیں ان کی خدمات کے صلے میں 1971ء میں پوپ جان ایوارڈ سے نوازا گیا۔ فلاح و بہبود کے کاموں کے سلسلے میں متعدد بار پاکستان کا دورہ کیا۔ پیرائہ سالی میں 1998ء میں انتقال کیا۔

مرسلہ: راحیلہ اشرف، کراچی

سوویت یونین کے مغرور حکمرانوں نے گرم پانیوں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اپنے پڑوسی پر چڑھائی کی تھی۔ پاکستانیوں نے اپنے افغان بھائیوں کے ساتھ کھڑے ہونے کا اصولی فیصلہ کیا۔ اور جذبہ جہاد سے سرشار نوجوان افغانستان کا رخ کرنے لگے۔

محمود ایک جنگجو تھا۔ اور جنگ چھڑ چکی تھی۔ میدان میں اترنے کی خواہش اُس میں دھک رہی تھی، لیکن راہ میں چند رکاوٹیں حائل تھیں۔ وہ ریاستی مشینری کا حصہ تھا، جسے مشین کے دیگر پرزوں کے ساتھ ہی حرکت کرنی تھی۔

82ء میں اُس نے پاک فوج کو خبر باد کہہ دیا اور اس کے قدم افغانستان کی سخت سرزمین کی سمت بڑھنے لگے جہاں وہ ایک ناقابل یقین جنگ لڑنے والا تھا۔

محمود نے، جسے اب ساری دنیا ایم ایم عالم کے نام سے پکارنے لگی تھی، کن محاذوں پر سوویت یونین کی فوج کا مقابلہ کیا؟ کتنے دشمنوں کو جہنم رسید کیا؟ کتنے ٹینک تباہ کیے؟ اس بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتی۔ اور شہرت کو حقیر جاننے والے اس شخص نے بھی اپنے کارناموں کا تفصیلی ذکر کبھی پسند نہیں کیا۔ ہمیشہ خود کو ایک ادنیٰ سپاہی کے طور پر پیش کیا۔ مگر افغان جہاد کی بابت ملنے والی غیر مصدقہ اطلاعات ایک تحیر انگیز کہانی سناتی ہیں، جس میں سے ایک کے مطابق

فضائی ہیڈ کوارٹر میں بہ طور اسٹنٹ چیف آف ایئر اسٹاف بھی فرائض سرانجام دیے۔ حکومت شام کی درخواست پر پانچ سال شامی ایئر فورس کی تربیت کی ذمہ داری بھی نبھائی۔ یوں تو بچپن ہی سے دین کی جانب رجحان تھا، مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ رجحان بڑھنے لگا۔ وہ صوم و صلوة کی پابندی کرنے لگا۔ صبح قرآن پاک کی تلاوت کرنا معمول بنا لیا۔ دینی کتب اُس کے مطالعے میں رہنے لگیں۔ علمائے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان سرگرمیوں کے طفیل اسلام کی آفاقیت حقیقی معنوں میں اُس پر آشکار ہوئی۔ اور اس کا دل ایمان کے نور سے منور ہو گیا۔

اور جب شہادت کی خواہش، جو جگ کے صورت اُس کے پاکیزہ دل کی زمین میں ہمیشہ سے موجود تھی، دھیرے دھیرے پودے کی شکل اختیار کرنے لگی۔

اور وہ شہادت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ دستیاب معلومات کے مطابق اس مجاہد نے مقبوضہ کشمیر میں بھارتی فوج سے جنگی معرکے بھی لڑے۔ اور ہر محاذ پر دشمن کے دانت کھٹے کیے۔

اور پھر یہی حسین خواہش اُسے اجنبی زمینوں کی سمت لے گئی۔

☆☆☆

”اللہ اکبر!“

سنگناخ چٹانوں کے درمیان، جتنی ہوئی زمین پر مصلا بچھائے وہ اپنے رب کے حضور دست بستہ کھڑا تھا۔

سلام پھیرنے کے بعد اُس نے اپنے ساتھیوں کی سمت دیکھا، جن کی آنکھوں میں یقین کے شعلے لپکتے تھے۔

گو وہ اجنبی تھے، ان کا رہن کہن الگ تھا، ایک ایسی زبان بولتے تھے، جس سے وہ ناواقف تھا، لیکن اس کے باوجود وہ اُن سے جڑا ہوا تھا۔ جذبہ جہاد نے انہیں ایک دوسرے سے باندھ رکھا تھا۔

یہ جنگ کا میدان تھا۔ اور وہ ایک ایسے دشمن کے خلاف برسرِ پیکار تھا، جو عالمی طاقت کا درجہ رکھتا تھا، مگر اُسے اپنی فتح کا کامل یقین تھا۔ کیونکہ اُس کی روح میں خیر کی قوت سانس لیتی تھی، جب کہ اُس کے دشمن کے بدن میں شر کے شعلے دھکتے تھے۔

محمود افغانستان میں تھا، جہاں سوویت یونین کی لاوین فوج کے خلاف جہاد جاری تھا۔ اس جنگ کا حصہ بننے کی خواہش اس کے دل میں اسی روز سے چل رہی تھی، جب

تیز دھار احساس اس کے وجود کو چھلنی کر رہا تھا۔ انتقام کی خواہش اس کے اندرون میں سلگ رہی تھی، جس سے ایک مکروہ سازش نے جنم لیا۔

71ء کے اواخر میں پھر پاکستان کی فضائی حدود میں سائرن بجنے لگے۔ پھر جاں بازوں نے اڑان بھری۔

نہ جانے کس دشمن نے یہ خبر پھیلا دی کہ بنگالی ہونے کی وجہ سے 71ء کی جنگ میں محمود کو جہاز اڑانے کی اجازت نہیں ملی۔ (حالانکہ وہ بنگالی نہیں بہاری ہے۔ اردو والے) حقیقت تو یہ ہے کہ 65ء کی جنگ کے اس ہیرو نے نہ صرف خود اڑان بھری، بلکہ آپریشن کی کمان بھی کی۔

مگر اس بارتناج مختلف رہے۔ محبت وطن پاکستانیوں کو گہرے صدمے سے گزرنا پڑا۔ دشمن کی مکروہ... چالوں اور اپنوں کی غفلت کے باعث پاکستان کا ایک بازو اُس سے الگ ہو گیا۔

سقوط ڈھاکا محمود کے لیے ایک کرب ناک دن تھا، جس نے اُسے برسوں بے کل رکھا۔ اُس کے بچپن اور لڑکپن کی حسین یادیں ڈھاکا کی بارشوں سے وابستہ تھیں، جن میں وہ گھنٹوں بیٹھا کرتا تھا، مگر اب ان یادوں میں دکھ کی آمیزش ہو گئی تھی۔ ڈھاکا اس سے چھن گیا تھا۔

گو مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کے قالب میں ڈھالنے کے بعد اس کے لیے اجنبی ہو گیا تھا، مگر ڈھاکا والے اُسے نہیں بھولے تھے۔ بھلا اُس جیسے جرات مند کو بھی کوئی بھول سکتا ہے۔ اُسے ایک عجیب پیش کش ہوئی۔ بنگلہ دیشی فوج کا کمانڈر انچیف بننے کی پیش کش۔

محمود کا رد عمل بڑی حد تک متوقع تھا۔ اُس نے سوچنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ پیش کش ٹھکراتے ہوئے اُس نے دونوک الفاظ میں کہا۔ ”میں اول و آخر پاکستانی ہوں۔ بنگلہ دیشی فوج کا کمانڈر انچیف بننے کے بجائے پاکستان کا ادنیٰ سپاہی کہلانے پر فخر محسوس کرتا ہوں۔“ آہ... وہ واقعی یکتا تھا۔

☆☆☆

محمود کا پیشہ ورانہ سفر جاری رہا۔

کئی کلیدی عہدے اس کے حصے میں آئے۔ کئی حیثیتوں میں اُس نے پاک فوج میں خدمات انجام دیں۔ اس مجاہد نے فائٹر لیڈر اسکول میں ایئر کنٹری اینڈ فیکٹیکل انسٹرکٹر اور تین اسکوارڈنز کے کمانڈنگ آفیسر کا منصب سنبھالنے کے علاوہ ڈائریکٹر آف آپریشنز ریسیرچ اور

کارنامے کی خبر پھیل چکی تھی۔ ہر شخص کی زبان پر بس اسی کا نام تھا۔ اور کیوں نہ ہو، وہ پلوں میں شجاعت کی ایک ناقابل یقین داستان رقم کر چکا تھا۔

ہر چہرہ مسرت سے دمک رہا تھا۔ ہر کوئی اُسے مبارک باد دے رہا تھا۔

ایسے میں ایک ساتھی نے اُسے مخاطب کیا۔ ”نا قابل یقین۔ کیا آپ جانتے ہیں، یہ ایک عالمی ریکارڈ ہے۔“ محمود مسکرا کر رہ گیا۔ اُسے عالمی ریکارڈ کی پروا ہی کہاں تھی۔ ستائش کا خواہش مند نہیں تھا وہ۔ اُسے تو بس اپنے ملک کے دفاع کی آرزو تھی، جو آج پوری ہوئی۔

ایسے میں ایئر بیس کی مسجد سے موزن کی آواز بلند ہوئی۔ محمود مسجد کی سمت بڑھنے لگا، اُس ہستی کے سامنے سر جھکانے کے لیے، جس نے اُسے پرواز کی قوت عطا کی تھی۔

☆☆☆

دشمن پسپا ہو چکا تھا۔ پاکستان کے طول و عرض میں مسرت ہمک رہی تھی۔

اور تب پاک فضائیہ نے اپنے اعداد و شمار مرتب کیے، جنہوں نے ایک حیرت انگیز کہانی بیان کی۔

دستیاب معلومات کے مطابق 6 ستمبر والے روز، جب بھارت نے پہلا حملہ کیا، محمود نے جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے سپر طیارے سے بھارتی فضائیہ کے دو طیاروں کو مار گرایا، جب کہ تین کو زبردست نقصان پہنچایا۔ 7 ستمبر کی سہ پہر تو وہ کسی اور ہی رنگ میں تھا۔ کسی کا سایہ تھا اُس کے سر پر۔ فقط چند سیکنڈز میں پانچ بھارتی ہنٹر گرا کر اُس نے فضائی جنگوں کی تاریخ میں ایسا ریکارڈ قائم کیا، جو ناقابل یقین تھا۔ مجموعی طور پر اُس پاکستانی مجاہد نے نو طیارے مار گرائے۔

17 دنوں پر محیط اس جنگ میں پاک فوج کے سرفروشن نے 110 بھارتی طیارے تباہ کیے، اس کے برعکس پاکستان کو فقط 19 طیاروں کا نقصان برداشت کرنا پڑا۔

دشمن کا غرور خاک میں ملانے کی اس لازوال داستان نے بین الاقوامی توجہ حاصل کی۔ بیرونی دنیا میں پاک فضائیہ کے سوراؤں، خصوصاً محمود کا کارنامہ اگلے کئی دنوں تک موضوع بحث بنا رہا۔

ستارہ جرات اس مجاہد کے حصے میں آیا اور فضائی معرکوں کی دنیا میں اُسے ”طلل ڈرین“ کہہ کر پکارا جانے لگا۔

☆☆☆

زخم خوردہ دشمن کے سینے میں لاوا پک رہا تھا۔ شکست کا

اُس نے غاروں میں بیٹھ کر، جو سوویت طیاروں کا خاص نشانہ تھے، ایسی حیران کن دفاعی حکمت عملی وضع کی، جس نے دشمن کی چالوں کو الٹ دیا۔ اور سوویت فوج کو کئی محاذوں پر منہ کی کھائی پڑی۔

ایک کہانی کے مطابق نو جوان افغانیوں میں جذبہ جہاد جگانے میں بھی اس مجاہد نے کلیدی کردار ادا کیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں، افغانی سرداروں کو اپنے اختلافات بھلا کر دشمن کے خلاف متحد کرنے کے لیے محمود نے گولیوں کی بوچھاڑ میں، دھماکوں اور بارودی سرنگوں کے درمیان ایک دشوار گزار سفر طے کیا، جس کے دوران کئی بار اس کی دھم سے مڈبھیڑ ہوئی، مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ پورا افغانستان سوویت یونین کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔

کچھ ذرائع تو اس بات کی بھی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ نامساعد موسمی صعوبتوں کو برداشت کرنے والے محمود ہی کا عزم تھا، جس کے طفیل سوویت یونین کا افغانستان فتح کرنے کا خواب ٹکڑوں کی طرح بکھر گیا۔

ان خبروں کی تصدیق نہیں ہو سکتی، مگر یہ طے ہے کہ اس مرد مومن نے اُس جنگ میں حصہ لیا اور زخموں کی پروا کیے بغیر کئی محاذوں پر حیران کن کارنامے انجام دیے۔

درحقیقت یہ شہادت کی مقدس خواہش تھی، جس نے اُسے ہر خوف سے بیگانہ کر دیا۔ ایک ناقابل یقین جنگ لڑنے کے لیے قائل کیا، جس کا انجام سوویت یونین کی شکست و ریخت پر ہوا۔

☆☆☆

افغان جنگ کے بعد محمود گوشہ نشین ہو گیا۔

وہ جنگ میں ملنے والے زخموں سے تو ابھر آیا، مگر ان کے اثرات باقی رہے۔ پھر بچوں بچوں عمر بڑھتی گئی، امراض کا حملہ بھی شدید ہوتا گیا۔ خصوصاً دسے کے مرض نے اسے خاصا پریشان رکھا۔

اُس زمانے میں دینی فرائض کی ادائیگی سے بچنے والا وقت وہ مطالعے میں صرف کیا کرتا۔ یوں تو کتابوں سے رشتہ پرانا تھا، مگر گوشہ نشینی کے بعد اس رشتے نے عشق کی شکل اختیار کر لی۔ ہر نوع کی کتابیں اس کے مطالعے میں رہنے لگیں۔ ہر اتوار وہ مقامی کتب خانوں پر گھنٹوں صرف کرتا۔ بیش تر کتب فروش اُسے جانتے تھے۔ کوئی اچھی کتاب آتی، تو خود اسے منظر کر دیتے۔

چکالہ ایئر میں راولپنڈی میں اس کی رہائش تھی،

جہاں اس کے پاس دو کمرے تھے، جو اُسے اپنی ضرورت سے زیادہ معلوم ہوتے۔ سوا ایک کمرے کو کتابوں سے بھرنا شروع کر دیا۔ جو کوئی اُسے ملنے آتا، اسے تحفے میں ایک کتاب ضرور دیتا۔

یوں تو وہ ایک خاموش طبع انسان تھا۔ زیادہ گھٹنا ملنا اُسے پسند نہیں تھا، لیکن اگر کوئی عقیدت مند ملاقات کی خواہش لیے چلے آتا، تو وہ انکار نہیں کرتا۔ بہت محبت سے پیش آتا۔ چائے سے تواضع کرتا۔ خصوصاً نو جوانوں سے مل کر وہ بہت خوش ہوتا۔ انہیں نصیحتیں کرتا۔ اُسے نو جوان میں پاکستان کا مستقبل نظر آتا تھا، مگر وہ اس بات پر دھی ہو جاتا تھا کہ اُس کے زمانے کے برعکس اب پاکستانی نو جوان فوج میں کیریئر بنانے میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے۔

اگرچہ وہ میڈیا میں آنا پسند نہیں کرتا تھا، شہرت سے کتراتا تھا، مگر جب بھی تمبر کا مہینا آتا، ملک کے طول و عرض میں اس کے کارنامے موضوع بحث بن جاتے۔ حکومتی پروگراموں میں، ٹی وی شوز میں اُسے مدعو کیا جاتا۔ اہل خانہ کے علاوہ پرانے ساتھی بھی ملنے چلے آتے۔ اچھے دنوں کی باتیں ہوتیں۔

ناگفتہ بہ ملکی حالات کے باوجود وہ کبھی مایوس نہیں ہوا۔ حب الوطنی کا جذبہ آخری وقت تک اس کے سینے میں موجزن رہا۔ اگر کبھی کوئی شخص اس کے سامنے پاکستان کے خلاف کوئی بات کرتا، تو وہ اسے ڈانٹ دیتا۔

اُسے یقین تھا کہ اگر قائد اعظم محمد علی جناح جیسی صالح قیادت میسر ہو، تو پاکستان کے لیے بحرانوں سے باہر آنا قطعی مشکل نہیں۔ مشرقی پاکستان کی جدائی کا اُسے ہمیشہ قلق رہا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا: ”اگر بنگلہ دیش، پاکستان کا حصہ رہتا تو یہ اسٹریٹجک لوکیشن بہت بڑا سرمایہ ہوتی۔“

ایک ناقابل یقین زندگی گزارنے والا یہ مجاہد طویل علالت کے بعد 18 مارچ 2013ء کو جہان فانی سے کوچ کر گیا۔

پی اے ایف میں مسرور کراچی اُس کی آخری آرام گاہ ٹھہری، جہاں 78 سالہ ایم ایم عالم کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا۔

گو وہ چلا گیا، مگر اُس کی یاد باقی ہے جو پاکستانیوں کے لیے سرمائے کا درجہ رکھتی ہے۔ اب تو لاہور کے علاقے گلبرگ کی وہ سڑک بھی تاریخی اہمیت حاصل کر گئی ہے جو اس مجاہد کے نام سے منسوب ہے۔

⊖

اس دن میں اخبار کے لیے فیر تیار کر رہا تھا کہ اللہ ڈیو آگیا۔ اس نے مجھے لکھتے ہوئے دیکھ کر کہا ”سامیں آپ تو سارے جہان کی خبر لکھتے ہو۔ یہ بتاؤ آپ اپنے سندھ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”بہت کچھ جانتا ہوں۔“ میں نے ٹالنے والے انداز میں جواب دیا۔

”آپ شاید یہ نہیں جانتے کہ اپنے اس سندھ میں ایک گوٹھ ایسا بھی ہے جو دنیا بھر میں عجوبہ ہے۔“

”اس گوٹھ میں ایسی کیا بات ہے کہ اسے تم عجوبہ کہہ رہے ہو؟“

”جب آپ اس گوٹھ کو دیکھو گے تو آپ بھی یہی کہو گے۔“

”یہ گوٹھ ہے کہاں؟“

”اس گوٹھ کا نام ہے... شاید دنیا بھر میں ایسا کوئی گوٹھ نہ ہو۔“ اس نے تجسس جگا دینے والے انداز میں کہا۔

”آخر ایسی کیا بات ہے... کھل کر بتاؤ۔“ میں نے قلم کو بند کرتے ہوئے سوال کیا۔

”اس گاؤں پر بددعا ہے... ایک مجذوب کی کڑی بددعا ہے۔“

”کیسی بددعا؟“ میں نے قلم کو کاغذ پر رکھتے ہوئے کہا۔ اب مجھے بھی تجسس ہونے لگا تھا۔

⊖

”تین چار صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے لیکن اس بددعا کا اثر کم ہو کر نہیں دیا۔... ایک بار آپ وہاں کا ٹور لگا لو پھر آپ کہو گے کہ اللہ ڈیو واقعی یہ گاؤں عجوبہ ہے۔“

”میں تمہارے ساتھ جاؤں اور وہاں پہنچ کر پتا چلے

”میں تمہارے ساتھ جاؤں اور وہاں پہنچ کر پتا چلے

”میں تمہارے ساتھ جاؤں اور وہاں پہنچ کر پتا چلے

”میں تمہارے ساتھ جاؤں اور وہاں پہنچ کر پتا چلے

”میں تمہارے ساتھ جاؤں اور وہاں پہنچ کر پتا چلے

”میں تمہارے ساتھ جاؤں اور وہاں پہنچ کر پتا چلے

”میں تمہارے ساتھ جاؤں اور وہاں پہنچ کر پتا چلے

”میں تمہارے ساتھ جاؤں اور وہاں پہنچ کر پتا چلے

”میں تمہارے ساتھ جاؤں اور وہاں پہنچ کر پتا چلے

”میں تمہارے ساتھ جاؤں اور وہاں پہنچ کر پتا چلے

”میں تمہارے ساتھ جاؤں اور وہاں پہنچ کر پتا چلے

”میں تمہارے ساتھ جاؤں اور وہاں پہنچ کر پتا چلے

”میں تمہارے ساتھ جاؤں اور وہاں پہنچ کر پتا چلے



سندھ کے ضلع شکارپور کے ایک گاؤں کا تذکرہ

زین مہدی

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

دوانگلیوں والے

کہ وہ ایک عام سا گاؤں ہے۔۔۔۔۔ تو؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں سائیں یہ میرا دعویٰ ہے کہ اس جیسا گاؤں پورے پاکستان میں نہیں ہے۔ پاکستان کیا پورے ایشیا میں نہیں ہے۔ ایسا عجوبہ ہے وہ گاؤں۔ اس گاؤں کا ہر آدمی اپنے آپ میں عجوبہ ہے۔“

اللہ ڈینو نے سسپنس پیدا کر دیا تھا۔ میں اس کے بارے میں جانتا تھا کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ مذاق کرنے کی بھی اس کی عادت نہیں ہے، وہ سنجیدہ طبیعت کا آدمی ہے۔ جب وہ زور دے رہا ہے تو ایک بار جا کر دیکھ لینے میں حرج کیا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے اس سے کہا۔ ”بات یہ ہے کہ شکار پور کوئی یہاں پر تو ہے نہیں۔ وہاں جانے کے لیے چھٹی لینی ہوگی اور چھٹی لینے کے لیے وجہ بتانی ہوگی۔ اگر تم مجھے مطمئن کر دو تو میں چھٹی کی درخواست دے دیتا ہوں۔“

”سائیں آپ چلو تو سہی۔۔۔ میرا دعویٰ ہے کہ جب آپ وہاں کی خبر لا کر دو گے تو سب حیرت میں پڑ جائیں گے۔“

”کچھ تو اشارہ دو۔“

اگر پہلے بتا دیا تو سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ وہاں پہنچ کر آپ کو احساس ہو جائے گا کہ آپ نے غلط نہیں کیا۔ ایک بہت بڑی خبر آپ نے تلاش کر لی ہے۔ ایسی خبر جو پورے پاکستان میں دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ ہو سکتا ہے اس خبر پر غیر ملکی تنظیمیں بھی دوڑی چلی آئیں۔“

اللہ ڈینو اس کوٹھ کے بارے میں تفصیل بتانے پر تیار نہیں تھا۔ صرف تجسس پیدا کیے جا رہا تھا اور میں اس کے سحر میں جکڑتا جا رہا تھا۔

اگلے دن اتوار تھا۔ اتوار کی چھٹی میں گھر میں سو کر گزارتا تھا۔ اس بار سوچا کہ اس چھٹی کو قربان کر دوں۔ ہفتے کی رات روانہ ہوں تو صبح کا ناشتا وہاں پہنچ کر کر سکتا ہوں۔ اگر کوئی خاص بات نہ بھی ہوئی تو آؤنگنگ ہی صحیح، یہی سوچ کر میں نے ہامی بھری اور دفتر سے گاڑی مانگ لی۔ دفتر والوں کو بتایا کہ ایک خاص خبر کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے نیک نامی عطا کر رکھی ہے۔ اس لیے کسی نے سوال نہیں کیا اور دفتر کی گاڑی مع ڈرائیور مل گئی۔

کراچی سے چلا تو موسم معتدل تھا مگر اندرون سندھ میں داخل ہوتے ہی موسم نے مزاج پوچھنا شروع کر دیا۔ دھوپ کی تپش، گرمی کا موسم۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم کسی آتش فشاں کے دہانے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ گرمی

بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ سکھر تک گرمی کا احساس کچھ کم رہا مگر جب سکھر سے ہم آگے بڑھے تو گرمی بھی بڑھنے لگی تھی۔ سکھر سے ہمیں تقریباً پینتالیس کلومیٹر اندر جانا تھا۔ شکار پور کی تحصیل لکھی غلام شاہ پہنچنا تھا پھر وہاں سے ہمیں گوٹھ محمودہ منصور۔ گوٹھ محمودہ منصور کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ یہ تقریباً سات آٹھ سو گھروں پر مشتمل گوٹھ ہے اور اس گوٹھ کا ہر شخص خود میں عجوبہ ہے۔ اسی عجوبے کو دیکھنے کے لیے ہم کراچی سے اتنی دور آئے تھے۔

گوٹھ محمودہ منصور کی طرف جانے کے لیے دو راستے بتائے گئے تھے۔ مگر ہم نے ان میں سے آسان راستہ چنا تھا۔ یہ راستہ شہر چک اور رستم سے ہو کر جاتا تھا۔ لوگوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ علاقے سیکوری کے لحاظ سے بہت مخدوش ہیں اغوا اور ڈکیتی عام ہے۔ معمولی معمولی رقم کے لیے ڈاکو زمینداروں کو اغوا کرتے ہیں۔ دس بیس ہزار تاوان کے لیے وہ کسی کو بھی، کہیں سے بھی اغوا کر لیتے ہیں۔ اسی خطرے کے پیش نظر لوگ اس علاقے میں آنے سے کتراتے ہیں۔ لیکن ہم مجبور تھے کیا کرتے اس گوٹھ کی جذبیت ہمیں کھینچ رہی تھی اس لیے خطرہ تو مول لینا ہی تھا اور ہم سب اسی راستے کی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔

راستے میں کچھ پولیس چوکیاں بھی نظر آئیں۔ لیکن اتنے بڑے علاقے کے لیے وہ چوکیاں اونٹ کے منہ میں زیرہ والی بات تھی۔ سپاہیوں کے پاس سائیکل کے سوا کوئی دوسری سواری بھی نظر نہیں آئی تھی۔ ہم سب اللہ کے بھروسے آگے بڑھتے رہے۔ ہر قسم کے خطروں کو ہم نے ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ اگر زندگی باقی ہے تو کوئی ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا، بس اسی خیال نے تقویت بخشی تھی اور ہم ڈاکوؤں کا خوف بھلا چکے تھے۔

آہستہ آہستہ ہم اپنی منزل سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ وہ گوٹھ اب زیادہ دور نہیں تھا مگر ڈاکوؤں کا خوف بھی تھا کہ کہیں گاؤں نزدیک آنے سے پہلے ہی ڈاکو نزدیک نہ آجائیں۔ کیونکہ یہ علاقہ صدیوں تک جنگ و جدل کا مرکز رہا ہے۔

کہتے ہیں کہ منصور قبائل کا یہ گوٹھ ٹالپر حکمرانوں سے بھی پہلے سے آباد ہے۔ جنگ ہالانی سے بھی قبل یہاں لوگ رہتے تھے۔ ٹالپر قبیلہ نسلا بلوچ ہے۔ شہداد ٹالپر کی یہ اولادیں ہیں۔ شہداد ٹالپر دراصل کلہوڑا فوج میں ایک دستے کا سردار تھا۔ اس کی زیرکمان بلوچ قبائل کا بہت بڑا دستہ تھا۔ وہ بہادری

میں بھی بہت آگے تھا۔ اس نے کلہوڑوں کو کمزور ہوتے دیکھ کر اٹھایا تو کلہوڑوں نے ٹالپر کے کئی سرداروں کو قتل کر دیا۔ باقی بچ جانے والے سرداروں نے کلہوڑا حکمرانوں کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ اس وقت ٹالپر قبیلے کی سربراہی میر فتح علی خان کر رہے تھے۔ انہوں نے راجہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے ٹالپروں کو جمع کیا اور ایک بڑی قوت بن گئے۔ اور 1783 میں جنگ ہالانی روٹما ہوئی۔ اس جنگ میں ٹالپر کا پلا بھاری رہا اور انہوں نے کلہوڑوں کو شکست دے دی۔ یہ بات کلہوڑوں کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ وہ فریاد لے کر تیور شاہ کے پاس کا بل پہنچ گئے۔ تیور شاہ نے ٹالپر کی قوت کا اندازہ لگا لیا تھا اس لیے اس نے سندھ کو ان دونوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ لیکن کلہوڑوں کو یہ بات پسند نہ آئی۔ اس سلسلے میں کلہوڑوں نے تمام سرداروں کو جس مقام پر جمع کیا تھا وہ پتھر کے قریب ہی تھا۔ گویا یہ علاقہ صدیوں سے اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اب اسی علاقے میں ہم جا رہے تھے۔ اسی دھرتی پر جہاں بھی بہادروں کے قدم پڑے تھے اور بزدل بگلوڑوں کے قدم بھی۔ ہمارے قدم بھی اسی راستے پر پڑ رہے تھے کہ ہمارے رہبر نے اشارے سے دیکھایا کہ وہ ہے گوٹھ جہاں ہمیں جانا ہے۔ میں نے اس طرف دیکھا وہ علاقہ عام سا غریب زدہ گاؤں جیسا تھا۔ گاڑی بچکو لے کھاتی، وائیں بائیں بھولتی ہوئی اسی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔

ہم جس وقت گاؤں میں داخل ہوئے تو گاڑی کی آواز پر بچے دوڑتے ہوئے آنے لگے۔ ان کے لیے یہ گاڑی انوکھی چیز نہیں تھی۔ اس پاس کے بہت سے گاؤں میں گاڑیاں ہیں لیکن اس گاؤں میں کسی گاڑی کا آنا یہ ایک عجیب بات تھی اسی لیے وہ سب تجسس سے مجبور ہو کر گھروں سے نکل نکل کر آ رہے تھے۔ کچھ بزرگ بھی باہر نکل آئے۔ اللہ ڈینو نے گوٹھ کے کنارے جمع ہو جانے والوں میں سے ایک ضعیف سے آدمی سے مصافحہ کیا پھر اس شخص سے ہمارا تعارف کرایا۔ ایک گھر سے چار پانی۔۔۔ لا کر نیم کے پیڑ تلے بچھا دی گئی۔ ہم سب اس پر بیٹھ گئے۔ اب باتوں کا سلسلہ چلا۔ میں نے ان صاحب سے سوال کیا کہ ان کا نام کیا ہے؟

”ناصر۔“ بڑے میاں نے اپنا نام بتایا۔ میں نے ان کے پیروں کی طرف نظر ڈالی، ان پیروں میں صرف دو دو انگلیاں تھیں۔۔۔۔۔ ہاتھ میں بھی دو دو انگلیاں۔ صرف ان کی ہی نہیں وہاں کھڑے ہر شخص کے ہاتھ پیروں میں دو دو انگلیاں تھیں۔ بچوں کے ہاتھ پیروں میں

بھی اسی طرح دو دو تین تین انگلیاں تھیں۔ واقعی اللہ ڈینو نے صحیح کہا تھا کہ یہ ایک عجیب و غریب گاؤں ہے۔ مجھے رائڈ میگز یاد آنے لگا۔ اس کا ایک ناول تھا اندھوں کے دیس میں۔ وہاں کا ہر فرد و بشر اندھا تھا۔ یہی یہاں نظر آرہا تھا۔ ناول میں اندھوں نے مرکزی کردار کو بھی اندھا کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیا یہ لوگ بھی میری دو انگلیاں کاٹ کر اپنے جیسا بنا لیں گے؟ اس خیال کے آتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے اپنے اس پاس کھڑے لوگوں پر نظر ڈالی پھر پوچھا ”ناصر صاحب یہ بتائیں کہ اس گاؤں میں کوئی ایسا بھی ہے جس کے ہاتھ پاؤں میں پوری انگلیاں ہوں؟“

ناصر کے جھریوں بھرے چہرے پر ڈھیر ساری بہار اور خزاں کی چھاپ صاف نظر آرہی تھی۔ سفید ڈاڑھی، سر کے بال بھی برف جیسے، کمزور بینائی کے لیے مونے عدسے کا چشمہ۔ میرے سوال پر اس کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیں لہرز اٹھی۔ اس نے بھر آئی آنکھوں کو صاف کرنے کے لیے چشمہ اتارا اور تھیلی کی پشت سے آنسو ڈال۔۔۔ کو صاف کیا پھر غمزہ لہجے میں بولا ”سائیں میری عمر بیاسی سال ہے۔ اپنی پوری زندگی اسی گوٹھ میں گزاری ہے۔ اس بیاسی سالہ زندگی میں میں نے اس گوٹھ میں ایک بھی بندہ ایسا نہیں دیکھا جس کی پانچ انگلیاں ہوں۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے تب سے اب تک جتنے بھی بچے اس گاؤں میں پیدا ہوئے سب کے ہاتھ پاؤں میں دو دو یا تین تین ہی انگلیاں دیکھیں، میرے باپ دادا کے زمانے میں بھی ایسے ہی بچے پیدا ہوتے تھے۔“

”کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ۔۔۔۔۔“ میرا جملہ ابھی مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ بول اٹھا:

”سائیں، میں یہ پہلے ہی بتا دوں کہ ڈاکڑ جو کہتے ہیں وہ غلط ہے۔۔۔ یہ جین کی غلطی نہیں ہے۔ اگر جیننگ پر وٹلم ہوتا تو اسے درست کر لیا جاتا۔“

میں نے اس کی طرف ایک نظر ڈالی پھر کہا ”آپ تو انگلش کے الفاظ صحیح ادا کر لیتے ہیں۔ پھر آپ کی اردو بھی بہت اچھی ہے۔۔۔ ذرا بھی نہیں لگتا کہ آپ کراچی سے دور ایک گوٹھ کے رہنے والے ہیں۔“

”ہا ہا ہا۔۔۔ بھائی جان میں اردو بھی پڑھ لیتا ہوں پھر کافی عرصہ کراچی میں بھی رہ کر آیا ہوں۔“ ناصر نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”میں نے کوشش کی تھی مگر کامیابی نہیں ملی، مجھے اسکول میں ایڈمیشن نہیں ملا۔ تھوڑی بہت تعلیم جو حاصل کی وہ حیدرآباد کے ایک صاحب کی بدولت۔ اخبار کتابیں پڑھ لیتا ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”اصل میں ہم لوگ بددعا کے اسیر ہیں... لوگ خوف کھاتے ہیں کہ کہیں ہماری بددعا کا اثر ان پر بھی نہ پڑ جائے۔ اس لیے ہم سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں... لوگ اپنے بچوں کو ہمارے بچوں سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں... وہ لوگ جو یہاں سے باہر چلے جاتے ہیں وہ تعلیم حاصل کر لیتے ہیں..... جیسے میں نے حاصل کی... خیر میں بتا رہا تھا کہ یہ جنگ پرویلیم نہیں ہے۔ بددعا ہے بددعا۔“

”یہ ابھی کی بات نہیں ہے۔“ ناصر نے دورِ افق پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں زمانے بھر کا درد سمٹ آیا تھا۔ ”تقریباً ساڑھے تین سو یا چار سو سال قبل اس گاؤں میں ایک فقیر آیا تھا۔ اسی مرشد کی بددعا کا اثر ہے یہ۔“

”وہ کون تھا؟ کیا نام تھا اس کا؟“ میں نے پوچھا۔

شاہ مراد نے جواب دیا ”اللہ سائیں کی سرکار بہت بڑی ہے۔ جدھر منہ اٹھا چل دیا۔ کہاں کا سوال نہیں... پس چلتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ سائیں کھانے کو بھی دیتا رہتا ہے جیسے ابھی نہتے بھیج دیا۔“

70 مابنامہ سرگزشت

اگلے سال جب اس عورت کے گھر بیٹا پیدا ہوا تو اس کی بھی تین انگلیاں تھیں۔ یہ دیکھ کر وہ لوگ بہت گھبرائے اور شاہ سرا کی تلاش میں نکل پڑے۔ کئی گوٹھوں میں پتا کیا مگر کہیں سے کوئی خبر نہ ملی۔ کئی مہینے کے بعد اس کا پتا چلا کہ وہ تو دس مہینے پہلے ہی مر چکا ہے۔ عورت جا کر اس کی قبر پر بہت روئی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ بددعا نے اس کا گھر دیکھ لیا تھا۔ ایک کے بعد ایک اس کے سات بیٹے ہوئے اور سب کے سب اسی طرح کے تھے۔ یعنی تین انگلیوں والے۔ ہم سب اسی خاندان کے ہیں۔ ہمارے خاندان پر بددعا کا اثر ہے، یہ بات مشہور ہوئی تو سب ہم سے دور رہنے لگے۔ جن کا تعلق ہمارے خاندان سے نہ تھا وہ دوسرے علاقوں میں منتقل ہوتے چلے گئے۔ پورا گوٹھ خالی ہو گیا۔ اب اس گوٹھ میں صرف ہمارا خاندان رہتا ہے اور ہم سب، کیا عورت کیا مرد سب دو دو تین تین انگلیوں والے ہیں۔“

اگر اس فقیر نے بددعا دی تو اس عورت کو دی تھی اس کا
 ٹراں عورت کے ساتھ ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ اب تک اس کا
 ٹر کیسے قائم ہے۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جسے میں اٹھاتا تو ان
 سے بیچ جواب کی توقع نہیں تھی اس لیے میں خاموش رہ گیا
 وروہاں جمع ہوئے بچوں کو دیکھنے لگا جو حیرت و خوشی بھرے
 نڈاز میں مجھے دیکھ رہے تھے۔ یہ سب کے سب عجیب و غریب
 حذوری بھری زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ سوچ کر میرا دل
 نچنچہ ہو گیا۔

”ایک منٹ کے لیے اپنا موبائل دو گئے۔“ میں نے سوال کیا۔

میں نے موبائل کو لے کر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ بلیک
بیری کا چائنا ماڈل تھا۔ اس موبائل پر میسج ٹائپ کرنے میں مجھے
وقت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے بشن چھوٹے ہوتے ہیں۔ مگر وہ
نوجوان نہایت تیزی سے میسج ٹائپ کر رہا تھا۔

”مزدوری۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا اور سر جھٹکا لیا۔ شاید اس کی حیثیت پر ضرب لگی تھی۔ یقیناً اس کی سوچ کچھ اور تھی۔ وہ کچھ اور بننا چاہتا ہوگا مگر بن نہ پایا۔

”کراچی میں اردو ہی بولتا تھا..... سبزی کا ٹھیلہ لگاتا تھا؟
 گا کہوں سے اردو میں بات کرنا پڑتا تھا اس لیے اردو صاف
 بولنے لگا.... کچھ دن بعد پھر چلا جاؤں گا۔“
 ”کیا گھر والوں سے ملنے آئے ہو؟“

”نہیں جی... میں تو کشائی کے لیے آیا ہوں.... دراصل ہمارے کھیتوں میں آس پاس کے مزدور کام نہیں کرتے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر وہ ہمارے ساتھ میل ملاقات رکھیں گے تو وہ بھی بددعا کے اثر میں آجائیں گے۔ اسی لیے جو جہاں بھی رہے کشائی کے وقت گھر آ جاتا ہے تاکہ رشتے داروں کی مدد کر سکے۔“

فارسی کے شاعر مولانا جامی کی متعدد تصانیف ہیں جن کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ مولانا کتنے مختلف علوم پر حادی تھے۔ آپ کو زبان و اسلوب پر پوری دسترس حاصل تھی آپ کی زیادہ تصانیف نثر میں ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آپ کی شہرت شعری تخلیقات کی بناء پر ہوئی۔ نظم میں آپ کی تخلیقات ایک تودہ سات مثنویاں ہیں جو مثنوی ہفت اورنگ کے نام سے موسوم ہیں۔

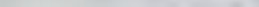
9 7 4 1ء) 2- واسطیۃ العہد
(894ھ- 1489ء) 3- خاتمۃ الحیات
895ھ- 1490ء) اور مثنویوں میں جو ہفت
اور نگ کے نام سے مشہور ہے۔ شامل

ہیں۔ 1- مثنوی سلسلۃ الذهب 873ھ
- 2- مثنوی سلمان
والبسال (885ھ- 1480ء)۔ 3- مثنوی تحفۃ
الاحرار (886ھ- 1481ء)۔ مثنوی سبحة

الایراد (887ھ - 1482ء - 5) - مثنوی
یوسف وزلیخا (888ھ - 1483ء) - مثنوی لیلی
مجنوں (889ھ - 1484ء) - 7 - مثنوی خرد نامہ
سکندری (890ھ - 1485ء) - نثر میں آب کی

تصانیف 1- تفسیر- 2- شرح فصوص الحکم- 3- رسالہ فی الوجود- 4- رسالہ لالہ الا اللہ- 5- شواہد النبوة- 6- اہمۃ اللغات- 7- شرح رباعیات- 8- رسالہ تحقیق مذہب صوفی و متکلم

و حکیم - 9 - رسالہ مناسک حج - 10 - مناقب - 11 - نفحات الانس، خواجہ عبداللہ انصاری وغیرہ بہت مشہور ہیں۔
مرسلہ: اظہر جاوید، بہاولپور



مہم ساز

مریم کے خان

اس نے ایک انوکھا تجربہ کیا تھا، صدیوں قبل امریکا آنے والوں نے جس راستے کا انتخاب کیا تھا وہ انتہائی دشوار گزار تھا۔ ایسے وقت میں ان لوگوں نے پیدل سمندر پار کیا تھا جب سمندر سردی کے باعث منجمد تھا۔ اس ترقی یافتہ دور میں اس نے ان مصائب کے ادراک کی خاطر وہی اور ویسا ہی انداز سفر اپنایا۔ اس کے پاس دولت تھی۔ اس نے اپنے ساتھ جانے کے لیے ایک گروہ ترتیب دے لیا جس میں ہر طرح کی خواتین اور بچے تھے۔

ایک مہم جو کے انوکھے سفر کی روداد

میکس جوزف دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک لگتا تھا۔ لیکن میرے خیال میں اس کے دماغ کا کوئی پرزہ کھسکا ہوا تھا۔ آئے دن بیٹھے بٹھائے اس کے ذہن میں کوئی خیال آتا تھا اور وہ اس پر عمل درآمد کرنے میں جت جاتا تھا۔ بیس سال کی عمر میں اسے خیال آیا کہ اسے نہر پانامہ ایک بادیانی کشتی میں عبور کرنی چاہیے۔ اس وقت ہم دونوں تازہ تازہ کالج سے فارغ ہوئے تھے اور خیالی پلاؤ بنا رہے تھے کیونکہ یونیورسٹی میں داخلے کھانے میں ابھی کئی مہینے باقی تھے۔ میں بھی



کرایے گئے کہ پھر مزہ کر خبر نہ لی..... پھر کراچی سے کچھ لوگ آئے۔ ان کے ساتھ گورے بھی تھے۔ ان لوگوں نے پورے گوٹھ کی فلم بنائی پھر وہ فلم ایک غیر ملکی چینل پر دکھائی گئی۔ پوری موسمی چلی تھی مگر ہم لوگوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچا اور نہ کسی حکومتی اہلکار نے رابطہ کیا۔ کچھ دنوں بعد پھر ایک NGO والے آئے۔ سب سے فارم بھروایا، سب کی تصویریں اتروائیں پھر ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

”لگتا ہے وہ لوگ فراڈ ہوں گے۔“

”اس دنیا میں فرڈیوں کی کیا کمی ہے... ایک بار شکار پور کے کچھ بااثر لوگ آئے کہ ہم آپ لوگوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں.... آپ نوجوانوں کو ہمارے ساتھ بھیج دیں، ہم ان کی زندگی بنادیں گے.... ہم نے ان کی باتوں پر یقین کر لیا اور اس گاؤں کے بہت سارے نوجوانوں کو ان کے ساتھ بھیج دیا۔“

”کہاں؟“

”وہ لوگ بچوں کو ایران لے گئے اور وہاں ان سے بھک منگوانے لگے۔ جو انکار کرتا اس پر تشدد کرتے۔ بڑی مشکل سے وہ سب واپس آئے۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ لوگ منظم انداز میں یہ کام کرتے ہیں۔ حج کے موقع پر معذور افراد کو مکہ مدینہ لے جاتے ہیں اور محرم کے ایام میں کربلا، کویت اور ترکی بھی لے جاتے ہیں۔“

”اس سلسلے میں آپ لوگوں نے حکومت سے رابطہ نہیں کیا، ایسے لوگوں کو تو سزا دلانا چاہیے جو وطن کا نام بدنام کرنے کے لیے غیر ممالک میں بھیک منگواتے ہیں۔“

”سائیں آپ بھی کس دنیا کی بات کرتے ہیں۔ یہ بات ہر چھوٹے بڑے کو معلوم ہے کہ لاڑکانہ اور اس کے اطراف میں ایسے کئی گروہ کام کر رہے ہیں جو معصوم، بھولے بھالے لوگوں کو اپنی طرف سے حج پر لے جاتے ہیں اور ان لوگوں کے سامان میں بہر دین رکھ دیتے ہیں، اگر پکڑے گئے تو معصوم لوگ پکڑے گئے۔ گروہ کے کارندے محفوظ رہتے ہیں۔ سعودیہ کی جیلوں میں کئی ہزار ایسے قیدی بے قصور سزا بھگت رہے ہیں۔ جب ایسے خطرناک گروہ پر حکومت نے ہاتھ نہیں ڈالا تو پھر بھیک مانگنے والوں کے خلاف ایکشن کون لے گا۔“

ان لوگوں کی تصویریں کھینچ کر میں بھی لوٹ آیا اس لیے کہ میں ان کے لیے کیا کر سکتا تھا؟ یہ کام تو ہماری حکومت کا ہے۔ ان معذور افراد کے کسی کام نہ آسکا اس کا دکھ ہے۔

اس کی بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ جہالت کیسے کیسے گل کھلاتی ہے۔ میں نے ناصر کی طرف مڑ کر پوچھا ”یہاں جمع ہوئے بچوں میں لڑکیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ کیا عورتوں کو بھی یہ بیماری ہے؟“

”جی ہاں... عورت ہو یا مرد... اس گاؤں کے ہر فرد پر اس بددعا کا اثر ہے اس لیے عورت مرد سب کی دودھ تین تین انگلیاں ہوتی ہیں۔“

ناصر کسی بھی طور پر ڈی این اے کی اس خرابی کو بیماری ماننے پر تیار نہیں تھا اور میں کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ DNA میں اگر کوئی خرابی آجائے تو وہ خرابی پشت در پشت چلتی ہے۔ اسی لیے عقل مند کراس ریلیشن میں شادیاں کرتے ہیں۔ کیونکہ جو بیماری خاندان میں کسی ایک کو ہوگی وہ اولاد میں بھی آسکتی ہے لیکن اگر کراس ریلیشن ہو تو امکان کم ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سیدھی سی ہے RNA میں پہلے تبدیلی آتی ہے۔ اگر وہ درست نہ ہو تو DNA میں پہنچ کر ثبت ہو جاتی ہے۔ انسان کی رنگت کیسی ہوگی۔ اس کے بال کیسے ہوں گے۔ اس کی آنکھیں، آنکھوں کی رنگت، اس کا شپ یہ سب DNA میں ثبت ہوتا ہے جسے RNA پورا کرتا ہے کہ کس اعضا میں کتنے خلیے استعمال ہونا ہیں اس کی پیش بندی RNA کرتا ہے۔ مگر وہ تو اسے بددعا کا اثر قرار دینے پر مہر تھے۔ حالانکہ بزرگان دین خود پر ہونے والے ظلم پر بھی خاموش رہتے ہیں۔ اللہ والے بھی کبھی کسی کو بددعا دیتے ہیں؟ بددعا کا ذکر تاریخ کی کئی کتابوں میں ہے۔ حضرت لوط کے قصے میں بھی ہے اور حضرت معین الدین چشتی کے تذکرے میں بھی مگر ایسی بددعا جس کا اثر پشت در پشت چلے پہلی بار سنا تھا۔ مگر لب کشائی کا حوصلہ نہ تھا۔ یہ کہنے کی ہمت نہ تھی کہ وہ ایک جھوٹ کو سجھ رہے ہیں۔ ان کو قائل کرنا ممکن نہ تھا کہ ان کو سمجھاتا کون اس لیے میں نے باتوں کا رخ بدل دیا ”یہ بتائیں... حکومت کی طرف سے آپ لوگوں کے لیے کیا کیا مراعات حاصل ہے؟“

”پاکستان آزاد ہوئے اتنے برس بیت گئے اب تک تو کسی نے خبر نہ لی مراعات کہاں سے ملے گی۔ جنرل ضیا الحق کے دور میں ایک افسر کو ہم پر رحم آگیا تھا اور اس نے حکومت سے اپیل کی کہ ہمیں امداد دی جائے اور زکوٰۃ فنڈ سے ماہانہ ڈیڑھ سو روپے ملنے لگا لیکن وہ بھی کچھ عرصہ تک پھر وہ بھی بند ہو گیا۔ ہاں ایک دو NGO نے مدد کا وعدہ کیا مگر ان کی کارگزاری صرف تصویر اتارنے تک رہی۔ وہ لوگ تصویر اتار

میکس کا ہم عمر تھا اور مجھے عملی زندگی کا زیادہ تجربہ نہیں تھا اس لیے یہ خیال مجھے بھی مناسب لگا تھا۔ میکس کا باپ میکس سینٹر امریکی ریاست مونتانا کا ایک دولت مند تاجر تھا۔ پوری ریاست میں اس کے چھین اسٹور پھیلے ہوئے تھے اور وہ سالانہ کئی ملین ڈالر کا نفع کماتا تھا۔ میکس اس کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے اسے رقم کی کوئی کمی نہیں تھی۔

میکس نے منصوبہ بنایا اس کے لیے اپنے باپ سے رقم طلب کی اور ہم دونوں پانامہ پہنچ گئے۔ وہاں ہم پر جو گزری اس کا احوال میں نے ایک ایسے رسالے میں لکھ بھیجا جو لوگوں کی زندگی کے سچے اور انوکھے واقعات شائع کرتا تھا۔ اس تحریر سے میرے لکھنے کے کیریئر کا آغاز ہوا اور بعد میں میں نے تحریر کو اپنا ذریعہ روزگار بنالیا۔ میں نے فلشن لکھنے کی کوشش کی لیکن جلد مجھے انداز ہو گیا کہ مجھ میں اس کی صلاحیت نہیں ہے اس لیے میں نے یہ کوشش ترک کر دی اور صرف سچے موضوعات کو زیر قلم لانے لگا۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ پانامہ پولیس نے ہمیں گرفتار کر لیا کیونکہ ہم نے ایک مصروف ترین تجارتی نہر میں بلا اجازت بادیانی کشتی چلانے کی کوشش کی تھی۔ اس سے ہماری اور دوسروں کی زندگیاں خطرے میں پڑ گئی تھیں۔ بعد میں میکس سینٹر نے بذات خود پانامہ پہنچ کر ہماری ضمانت دی تو ہمیں رہائی نصیب ہوئی تھی۔

اس کے بعد بھی میکس اس قسم کے انوکھے تجربات کرتا رہا۔ جب وہ تیس برس کا ہوا تو میکس سینٹر شدید اسٹروک کا شکار ہو کر بستر پر لیٹ گیا اور مجبوراً میکس کو اس کی جگہ کاروبار سنبھالنا پڑا۔ کاروبار کے معاملے میں اس کی سمجھ بوجھ اپنے باپ سے کم نہیں تھی بلکہ اس نے کچھ نئی چیزیں متعارف کرائیں جس سے اس کے اسٹورز کی سیل بڑھ گئی۔ مگر ہم جوئی کے معاملے میں اس کا خیال کم نہیں ہوا تھا۔ نہر پانامہ کی ناکام مہم کے دو سال بعد اس نے صرف میرے ساتھ آسٹریلیا کا عظیم صحرا عبور کرنے کا منصوبہ بنایا اور میں نے یہ سن کر انکار کر دیا کہ اس سفر میں صرف دو اونٹ معمولی سامان کے ہمراہ ہمارے ساتھ ہوتے۔ یوں یہ مہم بھی ناکام رہی۔

البتہ پچیس برس کی عمر میں جب میکس نے دریائے کانگو میں کشتی رانی کا منصوبہ بنایا تو میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گیا کیونکہ کشتی رانی مجھے بھی بہت پسند ہے۔ یہ مہم بعد میں نہایت خطرناک ثابت ہوئی تھی اور کئی بار ہم مرتے مرتے بچے تھے۔ ایک موقع پر ایک دیو قامت مگر مجھ سے کچھ بڑا کر دریا کی گہرائی میں لیے جا رہا تھا لیکن میکس نے

نہایت جرأت سے اس پر چپو سے وار کیا اور وہ بڑا چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ بہر حال یہ مہم کامیابی سے ختم ہوئی اور ہم بحر اوقیانوس کے ساحل پر دریائے کانگو کے ڈیلٹا تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ افریقہ سے واپسی میں اپنا کیریئر بنانے میں لگ گیا اور کئی سال تک میں نے میکس کی جانب سے مہم جوئی کی ہر پیش کش مسترد کر دی۔ پھر میری ملاقات جولیا سے ہوئی اور ہم نے شادی کر لی۔ اس دوران میں میکس نے دو شادیاں کیں اور دونوں ناکام رہیں اس کے بعد اس نے گرل فرینڈز تو کئی تبدیل کیں لیکن شادی سے توبہ کر لی۔

آخری بار میں دو سال پہلے اس کے ساتھ انٹارکٹیکا گیا تھا۔ یہ مہم سے زیادہ سائنسی تجربہ تھا کیونکہ میکس نے کبھی پڑھ لیا تھا کہ آج سے دس بارہ ہزار سال پہلے انٹارکٹیکا پر برف نہیں تھی بلکہ اس کا موسم گرم تھا اور یہاں مجھے جنگلات پائے جاتے تھے اس لیے وہ اپنے ساتھ کچھ سائنس دان لے کر گیا اور اس کی ٹیم نے دو مہینے وہاں رگ کرکھائی کی تھی۔ جیسے ہوئے گلیشیر میں کئی کلومیٹر گہرا سوراخ کر کے اندر سے بہت پرانی برف، مٹی اور دوسرے نمونے نکالے گئے اور ان کا تجزیہ کرنے کے لیے امریکا لایا گیا۔ میں بہ طور صحافی اس مہم میں ساتھ تھا۔ میرا کام صرف رپورٹنگ تھا اس لیے مجھے زیادہ مزہ نہیں آیا۔ گزشتہ کئی سال سے میں ایک رسالے سے منسلک تھا اور اس کے لیے مضامین لکھ رہا تھا۔ میرا کام دفتری نوعیت کا نہیں تھا اس لیے میں گھر پر ہی کام کرتا تھا۔ رسالے کا دفتر اسپرنگ فیلڈ میں تھا اس لیے میں نے یہاں گھر لے لیا۔ اس وقت بھی میں اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا لکھنے میں مصروف تھا کہ سیل فون کی بیل بجی۔ میں کام کے اوقات میں کال ریسیو نہیں کرتا ہوں لیکن اسکرین پر میکس کی تصویر آ رہی تھی۔

”ہیس....“ میں نے کال ریسیو کی۔

”کیں۔“ میکس کی خوشگوار آواز آئی۔ ”میرے

دوست تم آنے والے اتوار کی رات کیا کر رہے ہو؟“

”جب اتوار آئے تو دیکھوں گا، ابھی سے کیسے بتا سکتا ہوں۔“

”لیکن میں بتا سکتا ہوں تم میرے ساتھ میرے گھر

ڈنکر رہے ہو۔“

”میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے....“ میں نے اسے

بتانا چاہا مگر اس نے میری بات سنی نہیں۔

”میں نے ٹکٹ کو ریئر کر دیا ہے کچھ دیر میں تمہیں مل جائے گا۔“ باقی باتیں تمہارے آنے پر ہوں گی....“ جولیا کو میری طرف سے پیار کرنا.... اوکے پائے۔“

میکس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ یہ کسی مہم سے قبل مجھ سے بات کرنے اور مجھے اس مہم میں شامل ہونے کے لیے قائل کرنے کا مخصوص انداز تھا۔ وہ اسی طرح بغیر پوچھے ملاقات کا دن طے کر کے مجھے ٹکٹ بھیج دیتا تھا۔ اگر معاملہ دوستی کا نہ ہوتا تو میں انکار بھی کر سکتا تھا لیکن میکس کو انکار کرنا میرے بس سے باہر تھا۔ کچھ دیر بعد جولیا نے کوریئر سے ٹکٹ والا لفافہ لے کر اسے میری اسٹڈی کے دروازے کے نیچے سے اندر سرکا دیا۔ جب میں کام کر رہا ہوتا تھا تو وہ مجھے صرف ہنگامی حالات میں ڈسٹرب کرتی تھی۔ ورنہ میری ڈاک بھی اس طرح مجھ تک پہنچا دیتی تھی۔ لیج کے موقع پر میں نے اسے میکس کے بلاؤے کے بارے میں بتایا۔

ضرور اس کے دماغ میں پھر کوئی کیزا کلب لایا ہو گا۔ لیکن کین تم کسی بھی معاملے میں ہامی بھرتے ہوئے یہ سوچ لینا کہ اب تم چالیس سال کے شادی شدہ اور دو بچوں کے باپ ہو۔“ جولیا نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ میکس کو پسند کرتی تھی لیکن اس کی مہم جوئی کے خط سے اسے شدید اختلاف تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میکس اپنی ہر مہم میں مجھے شامل کرنا لازمی سمجھتا تھا۔ اس نے کئی مہمات اس لیے ترک کر دی تھیں کہ میں نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔

”تم فکر مت کرو مجھے بھی معلوم ہے کہ میں اب شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہوں۔“

”تم اپنی عمر کی بات نظر انداز کر رہے ہو۔“ جولیا نے یاد دلایا۔ ”دیکھو تم نے عرصے سے جم کارخ نہیں کیا، بیٹھے میں صرف ایک ایک دو بار آدھے گھنٹے کے لیے جاہنگ کرتے ہو۔ اپنی صحت کا تمہیں خود اندازہ ہے۔“

وہ درست کہہ رہی تھی میری صحت کسی مہم جوئی کے قائل نہیں تھی کم سے کم اس وقت تو نہیں تھی۔ میرا قد پانچ فٹ سات انچ اور وزن تقریباً ستر کلو گرام تھا۔ زیادہ بیٹھنے سے میری تونڈ نکل آئی تھی۔ اگرچہ لباس میں یہ بہت نمایاں نہیں ہوتی تھی مگر جب میں لباس اتارتا تو صاف نظر آتی۔ اگلے اتوار سے پہلے میں نے کچھ ضروری کام نمٹائے ورنہ رسالے کا ایڈیٹر بہت شور مچاتا۔ اسے آنے والے چھ

رسالوں کی فکر پہلے سے لگ جاتی تھی اور وہ اپنی میز پر بیٹھ کر لکھنے والوں کا دماغ کھاتا تھا۔ کئی بار تنگ آ کر میں نے اس سے کہا بھی تھا۔ ”ایڈم مجھے لکھنے دو گے تو میں کچھ لکھوں گا۔“ بڑی مشکل سے میں نے جولیا کو منایا اور میکس کے اسٹیٹ کی طرف چل دیا۔

ہیلینا کے انرپورٹ پر میکس خود مجھے لینے آیا تھا۔ اس کا گھر ایک بہت بڑی اسٹیٹ کی صورت میں شہر سے آدھے گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا۔ یہ بہت خوب صورت اور برفضا مقام تھا۔ آس پاس دور تک نہ کوئی آبادی تھی اور نہ کوئی صنعتی علاقہ، اس لیے یہاں ہوا میں ایسی تازگی تھی جیسے دنیا ابھی ابھی وجود میں آئی ہو۔ میکس سینٹر نے اسی وجہ سے یہاں اپنا گھر بنایا تھا۔ اس کا دو سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ وہ طویل عرصے بیڈ پر پڑا رہا اور میکس کو کاروبار کے سلسلے میں مشورے دیتا رہا تھا۔ باپ کے مرنے سے میکس بہت عرصے دکھی رہا تھا۔ اسے سنبھلنے میں کئی مہینے لگ گئے تھے۔ وہ مجھ سے گرم جوئی سے ملا اور میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

”ہے کین.... تم بہت ڈھیلے ہو گئے ہو خود کو مضبوط کرو لڑکے ہمیں ایک بہت مشکل مہم درپیش ہے۔“

رات کھانے کے بعد جب ہم آتش دان کے سامنے بیٹھے روس کی بہترین واڈ کا سے لطف اندوز ہو رہے تھے تب میکس نے مجھے اپنا ارادہ بتایا۔ یہ سن کر مجھے اچھوٹے لگتے رہ گیا تھا کہ میکس ایک ٹیم لے کر آہٹائے بیرنگ کو پیدل عبور کرنے کا سوچ چکا ہے۔ اصل بات اس وقت بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کیونکہ تیسرے جام کے بعد جب میری حالت کسی قدر بہتر ہوئی تو میکس نے بتایا کہ وہ تقریباً ایک درجن افراد کے ساتھ آہٹائے بیرنگ پار کرنا چاہتا ہے۔ جن میں چار سے چھ عورتیں اور چھ سے آٹھ مرد ہوتے۔ ان میں سے دو پندرہ سال سے کم، چار افراد تیس سال سے کم، چار افراد پچاس سال سے کم اور دو پچاس سے اوپر ہوں گے۔ یہ سب پیدل ہوں گے اور سامان کے لیے گتوں والی سیلج ہوگی۔ میں نے سنتے ہی یہ مہم مسترد کر دی۔

”میکس تم جانتے ہو آہٹائے بیرنگ اکتوبر میں جا کر

جمتی ہے اور اس سے پہلے اسے پار نہیں کیا جاسکتا ہے۔“

”تم فکر مت کرو ہم اسے مئی کے آغاز میں پار کریں گے

جب یہ اچھی طرح جمی ہوگی۔“ میکس نے گویا مجھے تسلی دی۔

”تم جانتے ہو اس وقت وہاں درجہ حرارت کیا ہوتا

ہے؟“

”مجھے معلوم ہے۔“ میکس اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔ ”ابھی تم نے اصل پلان تو سنا نہیں ہے۔“

”کوئی اصل پلان بھی ہے، کیا تم بیرنگ کو منجند سمندر کے نیچے رہ کر عبور کرنا چاہتے ہو؟“

”نہیں عبور تو اسے سطح پر رہ کر کرنا ہے لیکن اس طرح جیسے آج سے کوئی دس ہزار سال پہلے انسانوں نے اسے عبور کیا تھا یعنی پیدل، اس دور کے لحاظ سے دستیاب وسائل کے ساتھ اور اسی طرح جیسے مردوں عورتوں اور بچوں نے اسے عبور کیا تھا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ پاگل پن ہے۔ تم جانتے ہو آبنائے بیرنگ نوے کلومیٹر طویل ہے اور اس کی منجند سطح کا درجہ حرارت منفی پچاس تک ہو جاتا ہے جو آرکٹک سرکل پر جمی برف سے بھی زیادہ ہے۔ اس سردی کو اپنے پیروں تک پہنچنے سے روکنا بہت مشکل کام ہے۔ کوئی میٹرل اس سردی کو نہیں روک سکتا۔“

”اس کے باوجود کچھ لوگوں نے اسی منجند برف پر چل کر بیرنگ کر اس کی تھی اور وہ بھی آج سے کوئی دس ہزار سال پہلے۔“ میکس نے نہایت یقین سے کہا جیسے بیرنگ کے پار جانے والوں کی رہنمائی اسی نے کی تھی۔

”یہ ایک مفروضہ ہے جو ماہرین نے قائم کیا ہے، اب تک اس کی صداقت کا کوئی حتمی ثبوت نہیں ملا ہے۔“

”اس کا حتمی ثبوت حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ کچھ لوگ اسی طرح آبنائے کو پار کریں جیسے دس ہزار سال پہلے انسانوں نے کی تھی۔“

”میکس وہ دس ہزار سال پہلے کے انسان تھے۔ خطرات کا سامنا ان کی مجبوری تھی اور وہ اس موسم اور ماحول کے عادی تھے۔ اب تم شہروں میں رہنے والے عام انسانوں سے توقع کرتے ہو کہ وہ اسی طرح خطرات کا سامنا کرتے ہوئے بیرنگ عبور کریں گے تو میرا خیال ہے تم غلط فہمی کا شکار ہو۔“

میکس پر میری بات کا کوئی اثر نہیں ہوا اس نے سکون سے کہا۔ ”تم دیکھو گے میں یہ کر کے دکھاؤں گا اور میں نے آدھی سے زیادہ ٹیم جمع کر لی ہے۔“

”اصل کام ٹیم جمع کرنا نہیں بلکہ اس ٹیم کو لے کر بیرنگ کر اس کرنا ہے۔ کیا تمہیں یقین ہے تم نے جن لوگوں کا انتخاب کیا وہ اس آزمائش پر پورے اتریں گے؟“

میکس نے سر ہلایا۔ ”نوے فیصد یقین ہے، میں اس

مہم کے لیے ایک سال سے کام کر رہا ہوں۔ میں نے تقریباً تمام تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔ جن چھ افراد کا انتخاب کیا ہے وہ سب جسمانی لحاظ سے اس مہم کو سر کرنے کے قابل ہیں۔ جلد باقی چار افراد کا انتخاب بھی ہو جائے گا۔ اس میں ایک جوان حاملہ خاتون بھی شامل ہوگی۔“

میں دنگ رہ گیا تھا۔ ”حاملہ خاتون....“

میکس نے سر ہلایا۔ ”میں نے یہ مفروضہ قائم کیا ہے کہ دس ہزار سال پہلے سفر کرنے والوں میں ایک حاملہ عورت بھی تھی جس نے امریکی سرزمین پر پہلے انسان کو جنم دیا ہوگا۔“

”میکس یہ پاگل پن ہے، کوئی عورت تیار نہیں ہوگی اس حالت میں جب خواتین بستر سے اترنا پسند نہیں کرتی ہیں تو تم توقع کر رہے ہو کہ کوئی عورت بیرنگ کی منجند سطح پر سفر کرے گی اور اسے پار بھی کر لے گی۔“

وہ مسکرایا اور پھر اس نے اٹھ کر ایک چھوٹی سی فائل میرے حوالے کی۔ ”اس میں ان تمام خواتین کی درخواست ہے جو اس مہم میں میرے ساتھ جانا چاہتی ہیں اور ان کی تعداد سات ہے لیکن میں نے ابھی تک فائل نہیں کیا ہے کہ ان میں سے کون ہمارے ساتھ جائے گی۔“

میں ایک بار پھر دنگ رہ گیا تھا۔ ”اور پندرہ سال سے کم عمر بچے....؟“

”ایک ممبر جان مارش نے پیش کش کی ہے کہ وہ اپنے ایک بیٹے کو ساتھ لے جاسکتا ہے، اس کی عمر چودہ سال ہے اور اسے مہم جوئی کا تجربہ بھی ہے، جان مارش خود پیشہ ور مہم جو ہے۔“

”تم ان لوگوں کو ادا ہو کر رہے ہو؟“

میکس نے شانے اچکائے۔ ”ظاہر ہے کوئی اپنے شوق سے اس مشکل سفر پر جانے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔“

”یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”میں ادا ہو کر رہتا ہوں۔“ اس نے اصرار کیا۔ ”تم غلط میں کوئی فیصلہ مت کرو، پہلے میری تیاری دیکھو اور اس کے بعد کوئی فیصلہ کرو، ابھی تمہارے پاس چھ مہینے کا وقت ہے۔“

یہ نومبر 2010 تھا۔ میکس کا ارادہ اگلے سال مئی کے آغاز میں مہم لے جانے کا تھا۔ اس نے سب سے پہلے ماہرین کی ایک ٹیم بٹھائی جس نے اس مہم کی ممکنہ تیاری میں اس کی مدد کی۔ انہوں نے میکس کو بتایا کہ دس ہزار سال پہلے لوگ کیا ذرائع استعمال کرتے تھے اور ان کو کس قسم کے حالات و خطرات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ میکس نے ساری

دنیا سے وہ سامان منگوانا شروع کیا جو اس مہم کے لیے درکار تھا۔ ہر فانی ریچھ اور ریڈیٹر کی کھالوں سے بنے لباس اور جوتے، فریل کی کھال سے بنے ہوئے دستانے، ہاتھی سیل کی کھال سے بنے ہوئے خیمے اور اسی طرح کا سامان جو اس وقت لوگ استعمال کرتے تھے اور اب وہ عام دستیاب نہیں تھا۔ میکس کو یہ سارا سامان بہت مہنگا پڑا تھا۔ لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح یہ سامان جمع کر لیا۔ یہ سب خام حالت میں تھا۔ اب اس سے لباس اور دوسری چیزیں تیار کرانی تھیں۔

سائبریا میں پائے جانے والے مخصوص درختوں سے لکڑی حاصل کی گئی جس سے کچ کے تختے اور دوسری چیزیں تیار کی جانی تھیں۔ قدیم باشندے دھاتوں کے استعمال سے ناواقف تھے، وہ ہر چیز لکڑی، پتھر، ہڈی، مٹی یا کھال سے بناتے تھے۔ وہ پتھر اور دریاؤں سے نکلنے والی چکنی مٹی کی مدد سے برتن بناتے تھے۔ کھالوں میں بال اور ریٹے بھر کر انہیں بستر کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ وہ سمندری حیوانات اور ریڈیٹر سے خوراک حاصل کرتے تھے۔ وہ کھالوں سے خیمے بنا کر رہتے تھے۔ وہ ہنری نہیں کھاتے تھے اور نہ ہی انہیں پھلوں کا پتا تھا۔ ان کی زندگی کا دار و مدار شکار سے حاصل ہونے والے گوشت پر ہوتا تھا۔ جانوروں میں وہ ریڈیٹر کے بعد کتے پالتے تھے۔ ان سے حفاظت اور کچھ کھانے کا کام لیتے تھے۔

یہ سارے حالات مفروضات ہیں، درحقیقت ماہرین ان لوگوں کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں جنہوں نے کسی زمانے میں آبنائے بیرنگ پار کی تھی۔ اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ واقعی انسان آبنائے بیرنگ پار کر کے امریکا پہنچے تھے۔ کیونکہ کچھ ماہرین اس کے برعکس یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان اصل میں یورپ کے راستے پہلے گرین لینڈ آیا اور پھر یہاں کے سخت موسمی حالات دیکھتے ہوئے وہ آگے شمالی امریکا چلا گیا۔ ان ماہرین کا کہنا ہے کہ دس ہزار سال پہلے سمندروں کی سطح آج کے مقابلے میں کئی سو فٹ نیچے تھی اس لیے سوائے چند مقامات کو چھوڑ کر سمندر کہیں سے بھی اتنا گہرا نہیں تھا۔ یورپ کی زمین موجودہ حد سے خاصی آگے تھی اور موسم اتنا خراب نہیں تھا۔

اس زمانے میں لوگ چھوٹی کشتیوں کی مدد سے بحری جہاز سے ہوتے گرین لینڈ اور پھر موجودہ کینیڈا تک پہنچ گئے تھے۔ اس کے بعد وہ یورپ، شمالی اور جنوبی امریکا

میں پھیلنے چلے گئے۔ لیکن یہ ماہرین اس بات کی وضاحت کرنے سے قاصر ہیں کہ اگر امریکا پہنچنے والے اولین باشندے یورپی تھے تو ریڈیٹر انسانوں کا تعلق ایشیائی گروپ سے کیوں بنتا ہے۔ ان کی رنگت اور خدوخال وسط ایشیائی ہیں۔ دوسرے یورپ کے انتہائی شمال مغرب میں انسان آج سے پانچ ہزار سال پہلے پہنچا تھا۔ اس سے پہلے وہاں جدید انسان کے آثار نہیں ملتے ہیں۔ جبکہ شمالی امریکا میں جدید انسان کے آثار سات ہزار سال پہلے تک ملتے ہیں جنوبی امریکا میں بھی انتہائی جنوبی سرے تک انسان آج سے تین ہزار سال پہلے پہنچ گیا تھا۔

اسپرنگ فیلڈ واپس آنے کے بعد میں اپنے کام نمٹانے کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر بھی ریسرچ کرتا رہا تھا۔ جولیا کو معلوم ہوا کہ میکس کیا منصوبہ بنا رہا ہے تو اس نے بھی اسے ناممکن قرار دیا تھا اور پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ”مجھے امید ہے تم اس حماقت میں شامل نہیں ہو گے۔“

میں نے واضح جواب دینے سے گریز کیا۔ ”میکس نے مجھے پیش کش کی ہے لیکن میں نے اسے ابھی تک جواب نہیں دیا ہے۔“

”یعنی تمہارے خیال میں یہ مہم ٹھیک بھی ہو سکتی ہے۔“

”قبل از وقت کیا کہا جاسکتا ہے.... میکس اپنی ٹیم تقریباً منتخب کر چکا ہے۔“

”دولت کے بل بوتے پر۔“ اس نے طنز کیا۔ ”اس دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو دولت کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈالنے کو تیار ہو جائیں۔“

”تم جانتی ہو میں ایسا نہیں ہوں۔“ میں نے قہر سے کہا۔ ”میں ہر فیصلہ میرٹ پر کرنے کا عادی ہوں۔“

”اس معاملے میں کیا میرٹ بنتی ہے۔“

”دیکھو ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔ یہ حقیقت تھی کہ میں نے اس بارے میں سوچا نہیں تھا لیکن جولیا سے بات کرنے کے بعد یہ چیز میرے ذہن پر سوار ہو گئی۔ سرما گزر گیا۔ اسپرنگ فیلڈ میں مارچ کا مہینا برف پکھلنے اور بہار کی آمد کا ہوتا ہے۔ مونٹانا میں بہار مئی میں آتی ہے۔ جبکہ آبنائے بیرنگ کی جمی برف جون میں جا کر تین مہینے کے لیے پکھلتی تھی۔ اکتوبر میں دوبارہ آنے والے نومبیںوں کے لیے جم جاتی تھی۔ میکس اس منجند برف پر چل کر ایک مہم کو بیرنگ کے پار لے جانا چاہتا

تھا۔ وہ تیار یوں میں مصروف تھا اور ہم کے لیے سامان تیار کروا رہا تھا۔ مارچ کے آخر میں اس کی کال آئی۔
”کین ہماری ٹیم فائل ہو گئی ہے۔۔۔ صرف ایک آدمی کی جگہ خالی ہے۔“

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ آدمی میں ہوں۔ ”میکس میں نے اس بارے میں سوچا نہیں ہے اور اب ہم کے جانے میں صرف ایک مہینہ گزرا گیا ہے۔ میں جسمانی لحاظ سے بالکل تیار نہیں ہوں۔“

”ایک مہینہ کم نہیں ہوتا ہے۔ تم چاہو تو میرے ساتھ چل سکتے ہو، ہم ایک مہینہ ساہیر یا میں اس مہم کی تیاری کریں گے اور خود کو موسم کا عادی بنا سکیں گے۔“
میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔

☆☆☆

وائی کنگ طیارہ یا کوئلک کے ائر پورٹ پر اترا تو ہر طرف برف تھی اور نہایت سرد ہوا چل رہی تھی۔ یہ چھوٹا مسافر بردار طیارہ تھا، ہم کا سامان پہلے ہی یہاں آچکا تھا۔ ائر پورٹ پر ہمارے استقبال کے لیے میکس کا مقامی نمائندہ بورس میک اور روسی حکومت کا پروٹوکول افسر یوری میگروف موجود تھے۔ یا کوئلک ساہیر یا کے مغربی وسط میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ کسی زمانے میں یہ شہر بھی روسی حکومت کے معوتین کا قید خانہ ہوتا تھا مگر اب یہاں ساہیر یا کی کانوں اور جنگلوں میں کام کرنے والے لوگ آباد ہیں۔ شہر بہت بڑا نہیں ہے۔ طیارے سے اتر کر ہم جس بس میں سوار ہوئے تھے وہ مشکل سے دس منٹ چلی تو شہر ختم ہو گیا اور اب ہم ایک برقی سڑک پر سفر کر رہے تھے۔ ہم کا تربیتی کیمپ یا کوئلک سے بیس کلومیٹر شمال میں تھا۔ یہاں چھوٹے درختوں والے جنگل تھے۔ سال میں سات مہینے یہ علاقہ برف تلے دفن رہتا تھا اور مشکل سے پانچ مہینے ملتے تھے جب یہاں سبزہ پھلتا پھولتا تھا۔ سخت موسمی حالات کی وجہ سے کاشت کاری بڑے نام تھی۔ کہیں کہیں لوگوں نے گرین ہاؤس بنائے تھے جن میں سبزیاں اور پھل اگاتے تھے۔

میکس نے مجھے راضی کر لیا تھا کہ میں تربیتی کیمپ میں شرکت کروں اور اس کے بعد اگر میں واپس بھی جانا چاہوں تو اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ہم دونوں، بورس اور یوری کے علاوہ بس میں دس افراد مزید تھے۔ ان میں جان مارش اور اس کا چودہ سالہ بیٹا کیل مارش تھا۔ جان پچاس سال سے اوپر کا صحت مند شخص تھا۔ دوسرا بوڑھا جو اس مہم کے لیے

منتخب ہوا وہ پچپن سال کا نارویجن میٹ کروں تھا۔ اسے برف زدہ علاقوں میں مہم جوئی کا اچھا تجربہ تھا۔ میکس کے ایک دوست کی پندرہ سالہ بیٹی فارین اسمتھ دوسرا بچہ تھی۔ عمر سے قطع نظر وہ نہایت ذہین اور سمجھدار لڑکی تھی۔ اسے بھی پہلے مہم جوئی کا تجربہ تھا۔ ایک نوجوان اطالوی جوڑا بھی اس مہم میں شامل تھا۔ عورت بیٹریٹ عرف بیٹی اور اس کا شوہر میرک کارلو اس مہم کا حصہ تھے۔ بیٹی چار مہینے کے حمل سے تھی۔ دو سہیلیاں الزبتھ جرمین اور مارٹھا یوس بھی شامل تھیں۔ ان کا تعلق کینیڈا سے تھا۔ ہم کے دو جوان آدمی میکس فوئل کا تعلق روس سے تھا لیکن وہ جرمن نژاد تھا، جب کہ بیٹی جوئس چین کا باشندہ تھا لیکن وہ کوریامیں آباد تھا۔

میکس نے ان تمام افراد کا انتخاب خاصے طویل اور کڑے پروسیس کے بعد کیا تھا۔ وہ ان سے خود ملا تھا اور جب وہ بالکل مطمئن ہو گیا تب اس نے اپنی ٹیم تشکیل دی تھی۔ اس نے بہت تحقیق اور تفتیش کے بعد سامان تیار کر لیا تھا۔ لیکن لوگوں اور سامان کی آزمائش کے لیے ایک مہینہ مجھے نا کافی لگ رہا تھا۔ کیونکہ یہ بہت مشکل کام تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس سے پہلے کسی نے پیدل آبنائے بیرنگ کو کراس نہیں کیا تھا۔ سولہویں صدی سے اکیسویں صدی تک کوئی ایک درجن سے زیادہ مہمات میں انسانوں نے ہر طرح سے اس آبنائے کو عبور کیا تھا۔ انہوں نے کشتی، بحری جہاز، پیدل، سیکوں کی مدد سے اور مجید برف پر مشینی ٹرانسپورٹ کی مدد سے بھی آبنائے کو عبور کیا تھا۔ حتیٰ کہ بیروں میں سختے باندھ کر کشتی کے پیچھے رسی کی مدد سے ”سرف“ کرتے ہوئے بھی ایک ٹیم نے آبنائے بیرنگ پار کی تھی۔ اس وقت سمندر کی برف پگھل چکی تھی لیکن جس طرح میکس عبور کرنا چاہتا تھا اس طرح سے آج تک کسی نے آبنائے بیرنگ کو پار کرنے کا سوچا بھی نہیں تھا۔

ہمارا تربیتی کیمپ ایک چھوٹے سے مجید دریا کے ساتھ تھا۔ اس کی سطح پر برف جمی تھی اور اس کے نیچے پانی بہہ رہا تھا۔ ہم حیران رہ گئے جب ہم نے دیکھا کہ تربیتی کیمپ کھالوں سے بنے ہوئے خیموں پر مشتمل ہے اور وہاں لکڑی کی سلجھیں کھڑی تھیں جن کے ساتھ کوئی دو درجن رشین نسل کے چھوٹے لیکن طاقتور کتے تھے جو بہت سرد علاقوں میں بار برداری کے کام آتے ہیں۔ ہم بس سے باہر آئے تو کتوں کے شور کے ساتھ سنسنائی ہوانے ہمارا استقبال کیا تھا۔ ہمارا ذاتی سامان بہت کم تھا کیونکہ ہمیں کیمپ میں اسی طرح رہنا

تھا جسے اس علاقے کے قدیم باشندے یہاں رہتے تھے۔ میکس نے نیچے اترنے پر ہم سب سے کہا۔ ”تم لوگوں کے پاس ایک دن ہے۔۔۔ کل سے تمہیں اپنی ہر چیز ترک کر کے اس طرح رہنا ہوگا جیسے یہاں کے قدیم باشندے رہتے تھے۔“

”یعنی ہمیں اسکیو بننا پڑے گا۔“ جان نے کہا۔
”تقریباً۔“ میکس نے تسلیم کیا۔ ”ہماری مہم اسی وقت کامیاب تصور کی جائے گی جب ہم بالکل اسی طرح بیرنگ کراس کریں جیسے قدیم باشندوں نے کی ہوگی۔“

ہم کا سارا سامان ان چھ عدد خیموں میں تھا۔ یہ خیمے اتنے بڑے تھے کہ ہر خیمے میں صرف دو افراد سما سکتے تھے۔ سامان بہت محدود تھا۔ ہر فرد کے لیے ایک لباس تھا۔ البتہ جوتوں کے اضافی جوڑے تھے۔ یہ جوتے ریڈیز اور ہاتھی سیل کی کھال سے تیار کیے گئے تھے۔ ہاتھی سیل کی موٹی کھال سے اس کے تلے بنے تھے جو کافی پچاس ڈگری سنٹی گریڈ کے درجہ حرارت میں بھی پیروں کو محفوظ رکھتے۔ اسی طرح بہت گرم فرم اور قطبی ریچھ کی کھال سے بنے لباس تھے۔ میکس نے کسی طریقے سے یہ کھال حاصل کر لی تھی کیونکہ قطبی ریچھ کا شکار اور اس کے جسم کے کسی حصے کا استعمال ممنوع ہے۔ فریل کی کھال سے اس لباس کے ہڈ بنے تھے اور اسے پچھ سیل کی آنتوں کا دھانکا بنا کر اس سے سیا گیا تھا۔ یہ ساری سلائی بھی ہاتھ سے کی گئی تھی۔ جوتے، دستانے اور باقی چیزیں بھی ہاتھ سے بنائی گئی تھیں۔ بے شک جدید انسانوں نے ان چیزوں کو تیار کیا تھا لیکن طریقہ وہی تھا جو قدیم انسانوں کا تھا۔

گہنی بات ہے، کیمپ میں پہنچ کر بھی مجھے یہ مہم ایک پاگل پن لگ رہی تھی اور جب میں اپنے خیمے میں داخل ہوا تو مجھے لگا کہ میں بھی اس پاگل پن کا ایک حصہ بن گیا ہوں۔ خوراک کے طور پر ہمارے پاس سیل اور ریڈیز کا گوشت تھا۔ سیل کا گوشت خاصا بدبودار تھا لیکن اسے کھانا مجبوری تھی۔ کیونکہ یہاں کی قیامت خیز سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے اس میں دافرتوانائی موجود تھی۔ اس کے مقابلے میں ریڈیز کا گوشت خوش ذائقہ لیکن کم حرارے والا تھا۔ حرارت اور روشنی کے لیے ہمارے پاس سیل کی چربی خاصی مقدار میں موجود تھی۔ اس چربی کو لکڑیوں پر مل کر مشعل بنائی جاتی اور اس سے روشنی کی جالی۔ چربی جلا کر ہی کھانا تیار کیا جاتا۔

اس مہم کے لیے سب ذہنی طور پر تیار تھے۔ اس کے

باوجود جب ہم کیمپ میں داخل ہوئے تو سب ہی فکر مند نظر آنے لگے۔ وہ ایک ایسی دنیا میں داخل ہونے والے تھے جس کے بارے میں انہوں نے صرف سنا تھا۔ عملی طور پر اسے برتا نہیں تھا۔ آج اس طرح کی زندگی وہ لوگ بھی نہیں گزارتے ہیں جو سرد ترین خطوں میں آباد ہیں۔ کینیڈا اور اسکیٹنڈے نیوین ممالک میں آباد قدیم باشندے بھی اب جدید دنیا کی سہولتیں استعمال کرنے لگے ہیں۔ این جی اوز اور حکومتیں ان کی مدد کرتی ہیں اور ان کو ان کے علاقے میں ہی تمام چیزیں مہیا کی جاتی ہیں۔ ان کے بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور امکان ہے چند نسلوں بعد وہ ان علاقوں کو چھوڑ کر شہروں کی طرف چلے جائیں گے۔ مگر اس وقت ہم الٹا دس ہزار سال قدیم طرز زندگی کی طرف آرہے تھے۔

اگلے دن ہم نے اپنی نئی زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ہر فرد نے اپنی ہر چیز جو وہ ساتھ لایا تھا اتار کر اور نکال کر بس میں رکھے بیگز میں ڈال دی۔ ہم نے کھالوں سے بنے لباس اور جوتے پہن لیے۔ اس روز ہم نے سیل کے گوشت سے ناشا کیا۔ چائے، کافی اور جدید دنیا کی دوسری اشیاء ہمارے لیے ممنوع ہو گئی تھیں۔ ہم یہاں صرف ایک ہی جیسی خوراک کھا سکتے تھے اور صرف پانی پی سکتے تھے۔ سیل کا گوشت اتنا بھاری ثابت ہوا تھا کہ تقریباً سب کے پیٹ گڑبڑ کر گئے تھے۔ ہمیں دوایاں استعمال نہیں کرنی تھیں اس لیے صرف احتیاط کرنے لگے۔ میکس کا کہنا تھا کہ پیٹ کی خرابی کا واحد علاج احتیاط تھی۔ ہم نے پانی بوائے کر لیا اور اس کے بعد چوبیس گھنٹے بہت احتیاط سے کھایا تھا۔ اس کے باوجود ہمیں اس خوراک کا عادی ہونے میں ایک ہفتہ لگ گیا تھا۔ سیل کا گوشت صرف کھانے کے لحاظ سے سخت نہیں بلکہ ہضم کرنے کے لحاظ سے بھی سخت تھا۔ ہمارے شہری معدوں کو شروع میں بہت مشکل پیش آئی تھی۔

ہمیں بنیادی طور پر جن کاموں کی تربیت حاصل کرنا تھی اس میں سب سے پہلے اپنے لباس اور پہننے والی چیزوں کا استعمال تھا۔ ہمارے لباس کا وزن تقریباً بیس کلو گرام تھا جبکہ ہم دو کلو گرام وزنی لباس کے عادی تھے۔ اتنا وزنی لباس سنبھالنا اور پھر دوسرے کام کرنا ہی بہت مشکل تھا۔ اس خطے میں استعمال ہونے والے جدید میٹریل سے بنے لباس بھی دس کلو گرام سے زیادہ وزنی نہیں ہوتے ہیں۔ اگرچہ کوشش کی گئی تھی کہ یہ ہمارے جسموں کے لحاظ سے ہوں لیکن ہاتھ سے سلائی کی وجہ سے کچھ نہ کچھ فرق آیا تھا اور ہمیں اس فرق

کا عادی ہونے میں وقت لگا تھا۔ اگر لباس میں کوئی خرابی ہوتی تو ہمیں اسے ہڈی سے بنی سوئی اور فری آنتوں سے بنے دھاگے کی مدد سے ٹھیک کرنا پڑتا۔ تقریباً سب کو اپنا لباس کچھ نہ کچھ ٹھیک کرنا پڑا تھا۔

دوسرا مرحلہ سادہ خوراک کا عادی ہونا تھا۔ یہاں گوشت بھوننے یا تلنے کی منجاش نہیں تھی۔ پانی میں گوشت چڑھا کر اور اسے اچھی طرح ابال کر استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ ابلا ہوا گوشت صرف نمک کے ساتھ استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ اس خطے کے باشندے سمندر سے نمک حاصل کرنے کا فن جانتے تھے۔ وہ ممکنہ طور پر مچھلی بھی شکار کرتے تھے لیکن یہاں نہ تو مچھلیاں تھیں اور نہ ہمارے پاس انہیں پکڑنے کا سامان تھا۔ پھر ہم کے دوران ہمیں مچھلیاں پکڑنے کا موقع کہاں ملتا؟ اس لیے مچھلی کو اپنی خوراک سے الگ کر دیا تھا۔ اس پر سب نے میکس سے احتجاج کیا۔

”جب یہ سیل اور ریڈیو ہم نے پالے یا شکار نہیں کیے تو مچھلی لینے میں کیا حرج ہے۔“ الزبتھ نے کہا۔

”حرج یہ ہے کہ اس خطے میں جو مچھلیاں پائی جاتی ہیں وہ کہیں دستیاب نہیں ہوتی ہیں۔ قدیم باشندے انہیں دریاؤں اور سمندر سے پکڑ لیتے تھے۔ ہمیں دوسری مچھلی مل سکتی ہے۔“

”اسے لینے میں کیا حرج ہے؟“ فارین نے کہا۔

”اسے لینے میں یہ حرج ہے کہ قدیم باشندے یہ مچھلی نہیں کھاتے تھے اور میں اس مہم کو اسی انداز میں ہیرنگ کے پار لے جانا چاہتا ہوں جیسے قدیم باشندے گئے تھے۔“

کچھ لوگ اس بات پر دل سے راضی نہیں تھے لیکن وہ میکس کی بات ماننے پر مجبور تھے کیونکہ وہ انہیں بھاری معاوضہ ادا کر رہا تھا۔ یہ اس کی ذاتی مہم تھی، اگر کوئی اس کے بنائے ہوئے اصولوں کو نہیں مانتا تو اس مہم میں اس کی شمولیت کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ پہلے ہی دن ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ دس ہزار سال پہلے انسان کس قدر سادہ زندگی گزارتا تھا۔ اس کے پاس کرنے کے لیے بس چند ایک ہی کام تھے۔ اس کی چند ترجیحات تھیں۔ اول زندہ رہنا، دوم خوراک حاصل کرنا اور تیسرے اپنی نسل بڑھانا۔ اس کی تمام تنگ و دو ان تین چیزوں کے گرد گھومتی تھی۔ اگرچہ ہماری ترجیحات ان سے مختلف تھیں۔ ہمیں یہاں زندہ رہنا تھا اور ہیرنگ کو یاد کرنا تھا لیکن ٹھیک اسی ماحول میں رہ کر جس میں پرانے باشندے رہتے تھے۔ ہمیں خود کو محفوظ رکھتے ہوئے

مہم کو کامیاب بنانا تھا لیکن کوئی ایسا خطرہ مول نہیں لینا تھا جو جان لیوا ہوتا۔

مہم میں شامل چھ مردوں کو وہ تمام کام کرنے تھے جو جسمانی لحاظ سے سخت تھے۔ جیسے کتوں کی دیکھ بھال، سفر کا سامان تیار کرنا، خیمے لگانا اور اکھاڑنا اور راستہ تلاش کرنا۔ عورتوں کے ذمے کھانا بنانا تھا۔ انہوں نے چند دن میں قدیم برتنوں اور اوزاروں کی مدد سے کھانا بنانا سیکھ لیا تھا۔ وہ ہڈیوں اور پیپ کے خول سے بنے اوزار اور چاقو وغیرہ استعمال کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ کام مشکل ضرور تھا لیکن ناممکن نہیں تھا کیونکہ ان کے پاس وقت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ہم روز تین سے چار گھنٹے سفر میں گزارتے تھے۔ یہ سفر ہم پیدل طے کرتے تھے۔ ہر تیسرے دن خیمے اکھاڑ کر سلیجوں پر پیک کرنے اور کتوں کے ساتھ سفر کرنے کی مشق کرتے تھے۔ یہ سفر بھی تین سے چار گھنٹوں پر مشتمل ہوتا تھا اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ برف پر سفر کرنے کے دوران کیا مشکلات پیش آسکتی ہیں اور ان سے کس طرح نمٹا جاسکتا ہے۔

شروع میں کتوں کو سنبھالنے میں دشواری پیش آئی تھی۔ وہ ہم سے مانوس نہیں تھے۔ وہ بوز سے مانوس تھے لیکن رفتہ رفتہ وہ ہم سے بھی مانوس ہوتے چلے گئے۔ کتے، بیجی، ہیکٹر، کیل اور میرک سنبھالتے تھے۔ جان، میکس اور میں سلیجوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ خیمے لگانا اور اکھاڑنا سب کی ذمے داری تھی۔ ہمارے پاس لکڑی سے بنی چار سلیج تھیں جن میں سے ہر ایک پر سوکھو گرام وزن لا دیا جاسکتا تھا۔ ہر سلیج کو چھ کتے کھینچتے تھے۔ دو درجن کتوں کو سنبھالنا اور ان کی دیکھ بھال آسان کام نہیں تھا لیکن ہم رفتہ رفتہ اس کے عادی ہوتے چلے گئے۔ دراصل کام بہت کم تھے اور ہم جلد انہیں سیکھ گئے اور مہارت سے کرنے بھی لگے تھے۔ تمباکو، شراب، جائے اور کافی جیسی عیشیں چھوڑنے میں ہمیں کچھ دشواری ہوئی مگر جلد ہم ان سے بھی چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ اس تربیتی کیمپ میں ابتدائی طبیعت خرابی کے بعد ہم سب کی صحت بہتر ہوئی تھی۔

بیٹرٹ عرف بی بی ہمارے لیے سب سے اہم فرد تھی کیونکہ وہ ماں بننے جا رہی تھی۔ اس لیے اسے ہر ممکن سہولت فراہم کی جاتی تھی۔ اس سے سب سے ہلکا کام لیا جاتا تھا اور سفر کے دوران اسے زیادہ تر سلیج پر بیٹھنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ مگر اس کا کام کرنا بھی ضروری تھا اس لیے ہم اسے ایسے کام دیتے تھے جو اس کے لیے مشکل نہ ہوں۔ میں نے

میکس سے کہا۔ ”کیا کسی سلیج کی حاملہ خاتون کو لے جانا ضروری تھا اگر اسے طبی مدد کی ضرورت پڑ گئی تو..... تمہاری مہم بہر حال اس عورت اور اس کے ہونے والے بچے سے زیادہ اہم نہیں ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میکس نے سر ہلایا۔ ”لیکن میں نے تمہیں بتایا نہیں ہے، روس کے ساحل پر جہاں سے ہم اپنی مہم کا آغاز کریں گے، ایک امدادی ٹیم موجود رہے گی۔ ان کے پاس برف پر چلنے والی گاڑیاں اور ایک ہیلی کاپٹر ہے۔ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں ہیلی کاپٹر پندرہ منٹ میں ہمارے پاس پہنچ جائے گا۔“

یہ سن کر میں نے اطمینان محسوس کیا۔ جب میں یہاں آیا تو میں نے فیصلہ نہیں کیا تھا کہ مجھے اس مہم میں شامل ہونا ہے یا نہیں۔ مگر دوسرے ہفتے میں نے فیصلہ کر لیا۔ میں میکس کے ساتھ اس مہم کا حصہ بننے جا رہا تھا۔ جب میں نے میکس کو مطلع کیا تو وہ خوش ہو گیا۔ ”مجھے یقین تھا تم ضرور میرے ساتھ چلو گے۔“

”اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آج تک تم نے جتنی بھی مہمات ترتیب دیں ان میں سب سے اچھی یہی ہے۔“

ترتیبی کیمپ میں ہمیں بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کئی حادثات پیش آئے، خود میں ایک بار سلیج سے گر گیا اور میرے گھٹنے پر چوٹ آئی تھی۔ دو دن مجھ سے ٹھیک سے چلا نہیں گیا تھا اور اب بھی جب میں کبھی اس پاؤں پر زور دیتا تو میرے گھٹنے میں چمکی سی آہٹ تھی۔ مگر یہ تکلیف ناقابل برداشت نہیں تھی۔ اس ایک مہینے میں ہمارے درمیان اچھی ذہنی ہم آہنگی ہو گئی تھی اور اب ہم ایک قبیلہ بن گئے تھے۔ اس میں ہر فرد کو اپنی ذمے داریوں کا علم تھا اور سب مل جل کر سارے کام نمٹاتے تھے۔

☆☆☆

ایک مئی کو ہم یولین چوکونکا، میں تھے جو روس کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ اور گاؤں ہے۔ اس کی آبادی مشکل سے ایک ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ اس بندرگاہ سے کسی زمانے میں امریکا اور روس کے درمیان علاقائی تجارت ہوتی تھی لیکن اب یہاں صرف مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں اور برف پر پھرنے والے جانوروں کا شکار کر کے ان کا گوشت اور کھالیں برآمد کی جاتی ہیں۔ یولین چوکونکا کی ساری آبادی چیمیروں اور شکاریوں پر مشتمل ہے۔ اگرچہ یہ روس کی زمین پر انسانوں کی آخری آبادی ہے لیکن وہ ساحل یہاں سے کوئی

دس میل دور تھا جہاں سے ہمیں اپنی مہم کا آغاز کرنا تھا۔ ہمارا امدادی کیمپ یولین چوکونکا میں قائم کیا گیا تھا۔ ہمیں برف سے منجمد سمندر پر کوئی نوے کلومیٹر کا سفر کرنا تھا۔ یہ سفر آسان نہیں تھا کیونکہ برف میں جگہ جگہ ٹیلے بن جاتے ہیں۔ زیر سمندر گزرنے والی سرد پانی کی آبی رو برف کو نیچے سے چھینکتی ہے اور اس کے اوپر مزید برف جم جاتی ہے۔ اس سے برف میں دراڑیں آتی ہیں اور ان پر برف جم جاتی ہے جو اگر برف کمزور ہو تو گزرنے والا سمندر میں گر سکتا ہے۔ اس طرح ٹیلے راستے کو دشوار بناتے تھے۔

”ہمیں روزانہ پانچ میل کا سفر کرنا ہے اس طرح ہم بارہویں دن امریکی ساحل پر اتر جائیں گے۔“

”کیا اتنے سامان کے ساتھ ہم روزانہ پانچ میل کا سفر کر سکیں گے؟“ کیل نے پوچھا وہ بہت ہوشیار لڑکا تھا اور اس کی معلومات کسی طرح بڑوں سے کم نہیں تھی۔

”ہم کوشش کر سکتے ہیں۔“ میکس نے کہا۔

”ہمارے پاس انسانوں اور کتوں کے لیے صرف بارہ دن کی خوراک ہے۔“ میٹ نے کہا۔ اس کی انگریزی گزارے لائق تھی۔ ”اگر ہم اس سے زیادہ دن تک چلی گئی؟“

”تب ہمیں خوراک میں راشننگ کرنا پڑے گی۔“ میکس نے کہا۔

ہم کل ڈھائی سو کلو گرام خوراک کے ساتھ روانہ ہو رہے تھے۔ فی فرد اور فی کتا آدھا کلو گرام کھانا روز تھا۔ یعنی روز تقریباً تین کلو گرام خوراک استعمال کی جاتی اور اس طرح سے ڈھائی سو کلو گرام خوراک بارہ دن چل سکتی تھی۔ اگر ہم کوئی دوسری طرح کی خوراک استعمال کرتے تو وہ وزن میں بہت زیادہ ہو جاتی لیکن سیل اور ریڈیو کے گوشت میں بہت زیادہ غذائیت ہوتی ہے اس لیے ان کا آدھا کلو گرام بھی کافی ہوتا۔ خوراک بڑھانے کے لیے سلیج کی تعداد بڑھانی پڑتی اور پھر ان کو کھینچنے کے لیے مزید کتوں کی ضرورت پڑتی۔ مزید کتوں کا مطلب تھا مزید خوراک۔

دو سلیجوں پر مکمل وزن لا دیا گیا تھا لیکن دو سلیجوں پر منجاش سے کم وزن تھا اور اس پر ایک وقت میں ایک فرد بیٹھ سکتا تھا یعنی دو سلیجوں پر دو افراد بیٹھ سکتے تھے۔ گوشت چاروں سلیجوں پر برابر رکھا گیا تھا۔ باقی خیمے، برتن اور دوسرا سامان دو سلیجوں پر تھا جبکہ دو پر گوشت کے ساتھ ایک ایک فرد بھی بیٹھ سکتا تھا۔ یہ سارا سامان مل ملا کر فی سلیج سو

کلوگرام سے اور ہو گیا تھا۔ مگر ہر روز میں گلوگرام وزن کم ہوتا جاتا اور کچھ ہلکی ہو جاتی۔ ایک کچھ بیٹی کے لیے مخصوص تھی کیونکہ اس کے لیے سب نے منفرد فیصلہ کیا تھا کہ وہ پیدل نہیں چلے گی وہ سارا سفر بیٹھ کر طے کرے گی۔ یہ اچھی بات تھی کہ دوسری خواتین بھی ہمیں اور اس کا شوہر بھی ساتھ تھا اس لیے ہر مرحلے پر اسے مدد حاصل تھی۔ ہر کچھ کے گتوں کو دو افراد قابو میں رکھ رہے تھے کیونکہ یہ کتے بہت جوشیلے اور چلبلی فطرت رکھتے تھے۔ اپنی تیز رفتاری کی وجہ سے یہ کسی حادثے کا سبب بھی بن سکتے تھے۔ تین تین کتوں کی دو قطاریں ایک کچھ کو کھینچتی تھیں۔ انہیں قابو میں رکھنا اور درست راستے سے لے جانا ہمارا کام تھا۔

دو مئی کی صبح ہم آبنائے بیرنگ کے روسی ساحل پر تھے۔ یہ مشرق کی طرف عظیم روس کا آخری کنارہ تھا۔ سرد جنگ کے دور میں یہ دنیا کا حساس ترین خطہ تھا اور دونوں طرف سے فوجیں اور میزائل آبنائے کے اطراف میں لگا دیے گئے تھے۔ اس وقت ماہرین کا کہنا تھا کہ اگر تیسری عالمی جنگ ہوئی تو اس کا آغاز بیرنگ سے ہو گا۔ دونوں ملکوں اور بربر اعظمیوں کے درمیان کم سے کم فاصلہ بھی پچاس میل کا ہے اور درمیان میں بیرنگ کا سمندر ہے۔ لیکن یہ پچاس میل چوڑی آبنائے صرف سمندر پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں دو عدد جزیرے بھی ہیں۔ روس کی طرف سے پہلا جزیرہ بگ ڈامنڈ ہے یعنی بڑا ہیرا۔ لیوٹرے ہیرے کی صورت کا یہ جزیرہ سارے سال برف سے ڈھکا رہتا ہے اس لیے ہیرے کی طرح جگمگاتا ہے۔ مقامی لوگ اسے ایما قلیق کہتے تھے۔ صوتی تاثر سے یہ ترک لفظ لگتا ہے۔ روسی قبضے سے پہلے پورا سائبیریا ترک خاتوں کے قبضے میں تھا۔ اگر کسی زمانے میں اس جزیرے پر کوئی آبادی تھی تو سوویت یونین کے دور میں اسے کہیں اور منتقل کر دیا گیا تھا۔ اب یہ جزیرہ ویران ہے۔ سرد جنگ کے دور میں اس پر روسی فوج کی صرف ایک چوکی ہوتی تھی اور یہاں ہتھیار نہیں رکھے جاتے تھے۔ مشکل سے چند مربع کلومیٹر کا یہ جزیرہ آبنائے کے عین وسط میں ہے۔

بگ ڈامنڈ سے تین کلومیٹر دور جنوب مشرق میں ایک اور چھوٹا جزیرہ ہے۔ اسے لفل ڈامنڈ کہتے ہیں اس کا مقامی نام اینا لیت ہے۔ یہ جزیرہ امریکا کے قبضے میں ہے۔ اس پر تقریباً پونے دو سو افراد کی آبادی ہے۔ لیکن یہ سارے امریکی جوان مرد ہیں جو گرمیوں کے تین مہینوں میں جب

بیرنگ کی برف پگھل جاتی ہے۔ شمالی سمندروں میں وہیل کا شکار کرتے ہیں۔ سربا کے دوران یہاں کی آبادی ہجرت کر جاتی ہے اور یہاں کوئی خاندان آباد نہیں ہے۔ سارے لوگ باہر سے آئے ہیں۔ سرد جنگ میں یہاں امریکی فوج بھی تھی لیکن اب صرف ایک چھوٹی سی چوکی ہے جس میں دو تین گارڈز ہوتے ہیں۔ اس کے بعد امریکی ریاست الاسکا تک سمندر ہی ہے۔

روسی زمین نسبتاً شمال میں ہے اس لیے ہمیں الاسکا تک جانے کے لیے ذرا تر چھا جنوب مشرق کی سمت سفر کرنا تھا۔ مئی کے مہینے میں شمال کے اس حصے میں دن تقریباً اٹھارہ گھنٹے کا ہو جاتا ہے۔ ان دنوں سورج صرف چھ گھنٹے کے لیے غروب ہوتا ہے اور مکمل تاریکی مشکل سے چار گھنٹے کے لیے چھائی ہے جس میں آسمان پر تارے نظر آتے ہیں۔ سورج رات نو بجے غروب ہو کر صبح تین بجے دوبارہ طلوع ہو جاتا ہے۔ جب ہم روانہ ہونے لگے تو صبح کے چھ بج رہے تھے اور آسمان صاف تھا اس لیے سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ موسم خوشگوار تھا۔ شمال کی طرف سے برف بستا ہوا چل رہی تھی اور درجہ حرارت منفی بارہ ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔ جس برف پر ہم چل رہے تھے اس کا درجہ حرارت منفی تیس ڈگری سینٹی گریڈ تھا لیکن آگے چل کر اس کا درجہ حرارت منفی چالیس ڈگری سینٹی گریڈ سے گر جاتا۔ اس وقت ہمیں اپنے پیروں کو بچانا ہوتا۔ ریڈیز اور ہاتھی سیل کی کھال سے بنے جوتے نہایت گرم ہوتے ہیں مگر سردی کی شدت بھی بہت زیادہ تھی ہمیں فراسٹ بائٹ سے بچنا تھا۔

اکتوبر میں جب آبنائے جہنا شروع ہوتی ہے تو اس کی برف بار بار ٹوٹتی ہے اور اس وقت اس پر سفر کرنا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ نومبر میں جا کر یہ برف پختہ ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی سرما نہایت شدید ہو جاتا ہے درجہ حرارت منفی تیس ڈگری سے گر جاتا ہے۔ شمال سے مسلسل تندو تیز ہوا چلتی ہے اور تقریباً ہر روز برفانی طوفان آتے ہیں۔ یہ کیفیت اپریل کے وسط تک برقرار رہتی ہے اور اگر سرما طویل ہو تو یہ کیفیت مئی کے آغاز تک بھی رہتی ہے ایسے میں آبنائے پر سفر کرنا نہایت مشکل کام ہوتا ہے۔ مئی کے آخر تک برف پگھل کر ٹکڑوں میں بٹنے لگتی ہے اور ایسے میں اس پر سفر ایک بار پھر ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لیے سفر کا بہترین وقت مئی کا آغاز ہے۔ پندرہ مئی کے بعد برف ناقابل اعتبار ہو جاتی ہے۔

گرمیہ ایک مہینے سے ہم جس قسم کی زندگی گزار رہے تھے اس سے خود کو بچ بچ سائبیریا کا کوئی قدیم قبیلہ محسوس کرنے لگے تھے۔ ہمارے پاس جدید دنیا کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ہم بال نہیں بنا سکتے تھے۔ نہا نہیں سکتے تھے حد یہ کہ منہ بھی نہیں دھو سکتے تھے۔ سن بلاک کریم نہ ہونے کی وجہ سے ہم خود کو سورج کی شعاعوں سے بچانے کے لیے چربی استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ سردی نے کاٹ کاٹ کر ہمارے ہاتھ پیروں کا برا حال کر دیا تھا اور ہم اس کا علاج گرم چربی سے کرتے تھے۔ ہمارا رنگ سانولا سرخ ہو گیا تھا اور چہرے عجیب سے ہو گئے تھے۔ بیٹی اور مار تھا کے چہرے پردار سے آگئے تھے اور وہ ان کے لیے پریشان تھیں۔

شروع میں سیل کے گوشت کی بو سے ہمیں متلی ہوتی تھی اور اسے بے مشکل ہی حلق سے اتارتے تھے۔ اس طرح جب چربی جلتی تو اس کی بدبو سے دماغ خراب ہو جاتا تھا مگر کیمپ کے دوران ہی رفتہ رفتہ ہم ان کے عادی ہوتے چلے گئے۔ اب یہ حال تھا کہ ہم بلا تکلف سیل کے گوشت کے ادھ گئے ٹکڑے دانٹوں سے نوج کر کھاتے تھے اور کھانے کے بعد ہاتھوں کی چکنائی اپنے کپڑوں سے صاف کر لیتے تھے۔ کپڑے سے مراد کھال پر اگے بال تھے۔ جب ہم باہر نکلتے تو سردی سے یہ چکنائی جم جاتی اور ہم بہ آسانی اسے کھال سے جھاڑ دیتے۔ رفتہ رفتہ ہمیں علم ہو رہا تھا کہ مقامی باشندے کس طرح زندگی گزارتے تھے اور کس مسئلے سے وہ کس طرح نمٹتے تھے۔ نیز وہ اتنی زیادہ چربی والی خوراک کیوں کھاتے تھے۔

جب ہم یہاں آئے تو ہمیں سردی بہت زیادہ لگتی تھی مگر وقت کے ساتھ ساتھ ہم اس کے عادی ہو گئے۔ اب ہمیں سردی تو لگتی تھی لیکن یہ ہمارے کاموں میں حارج نہیں ہوتی تھی۔ شروع میں راتوں کو گرم کھالوں میں بھی ہمیں نیند مشکل سے آتی تھی اور بعد میں ہم صرف لباس میں بھی سو جاتے تھے۔ یہ لازمی طور پر خوراک کا اثر تھا جس نے ہمیں اتنی سردی برداشت کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔ اب ہمیں فراسٹ بائٹ بھی کم ہوتا تھا اور گرم چربی کے لیپ سے یہ جلد ٹھیک بھی ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ ہم اس مشکل لباس کے عادی ہو گئے تھے۔ شہری علتوں نے چند دن پریشان کیا اس کے بعد ہم بھول گئے کہ ہم چائے، کافی، تمباکو اور شراب کے عادی تھے۔ مشکل طرز زندگی کے باوجود سب کی صحت اچھی ہوئی تھی۔

خود میری صحت پر بہت اچھا اثر پڑا تھا۔ میں ایک ڈھیلے اور کسی قدر اور ویٹ جسم کا مالک تھا لیکن کیمپ کی پُر مشقت زندگی میں ایک مہینے کے اندر میرا پیٹ اندر چلا گیا، بازوؤں اور ٹانگوں کے پٹھے بن گئے تھے اور تمام فالٹو چربی چھٹ گئی تھی۔ میرا وزن پانچ کلوگرام کم ہو گیا تھا۔ میں تمباکو اور کافی کا عادی تھا اور اس وجہ سے اسٹینما کم تھا۔ یہ دونوں چیزیں چھٹیں تو میرا اسٹینما خود بہ خود بہتر ہو گیا تھا۔ اصل مہم سے پہلے میں فٹ ہو گیا تھا۔ بس پاؤں کی تکلیف کسی قدر تھی وہ بھی کبھی کبھی ہوتی تھی۔ کیمپ کا وقت بہت اچھا گزرا تھا اس لیے سب پر امید تھی کہ ہم بہ آسانی آبنائے پار کر لیں گے اور ایک نئی تاریخ رقم کریں گے۔ میں اور میکس بھی پُر امید اور پُر جوش تھے کیونکہ اس سے پہلے یہ کام کوئی نہیں کر سکا تھا۔

سفر کا آغاز بھی بہت اچھا تھا۔ ساحل کے ساتھ ساتھ برف ہموار اور کسی قدر نرم تھی اس پر سفر کرنا آسان تھا مگر چند گھنٹے بعد جب ہم نجد سمندر پر پہنچے تو پہلی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ برف کے سخت اور آلو کے سائز کے ٹکڑے تھے جو سطح بریوں بکھرے ہوئے تھے کہ ان سے پاؤں بچا کر چلنا ممکن نہیں تھا اور ان پر پاؤں رکھو تو یہ رولر اسکیت کی طرح لڑھکتے لگتے تھے اور ان پر چلنے والے کے گرنے کا خطرہ تھا۔ ہم سب فکر مند ہو گئے کیونکہ چوٹ لگنے کا مطلب ایک جلنے والا کم ہو جاتا۔ سلیجوں پر صرف ایک فرد کی گنجائش تھی۔ ہم انہیں پیر سے سرکاتے ہوئے چلتے ہیں۔ جان نے تجویز پیش کی جس کی مخالفت اس کے بیٹے نے کی۔

”اس طرح ہم فٹ بال کھیتے رہیں گے اور شام تک سب کے جوتے ختم ہو چکے ہوں گے۔“ گیل نے خبردار کیا۔

”اس طرح سفر کی رفتار بھی ست ہو جائے گی۔“ ہیکٹر نے تائید کی۔

”تب کیا کیا جائے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم انہیں اسٹک کی مدد سے ہٹا کر چلتے ہیں۔“ نیبی بولا۔ مگر یہ تجویز بھی قابل عمل نہیں تھی کیونکہ ہمارے پاس چند ایک فالٹو ٹکڑیاں تھیں جو ہم نے سلیجوں کی ممکنہ مرمت کے لیے رکھی تھیں۔ دوسرے مسئلہ اس سے بھی حل نہیں ہوتا۔ ہر آدمی اس طرح آگس ہاکی کھیلتا ہوا چلتا تو سارے دن میں سفر کے بعد ہم شاید دو میل بھی آگے نہیں جاسکتے تھے۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ہمیں چوبیس میں سے دس گھنٹے سفر کرنا تھا۔ پانچ گھنٹے سفر کے بعد دو گھنٹے کا آرام ہوتا

اور دوسرے پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم بارہ گھنٹے آرام کرتے۔ سفر سارا روشنی میں کیا جاتا تھا کہ کوئی خطرہ ہماری نظروں سے اوجھل نہ رہے۔ خاصی دیر مغز ماری کے بعد کوئی تجویز سمجھ میں نہیں آئی تھی مچاچانک مارتھانے ہاتھ بلند کیا۔

”میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔ ایک سلیج آگے چلے اور اس کے نیچے لکڑیاں اس طرح لگائیں کہ وہ برف کے ٹکڑوں کو ہٹا کر صاف راستہ بنا دیں۔ ایک آدمی اس سلیج پر بیٹھ کر کتوں کو قابو کرے اور باقی سلیج اور لوگ اس بننے والے راستے پر چلیں۔“

”یہ تجویز قابل عمل ہے۔“ میکس نے غور کرتے ہوئے کہا۔ ”بے شک رفتار ست ہو جائے گی لیکن کسی کے گرنے اور زخمی ہونے کا خطرہ نہیں رہے گا۔“

”رفتار بھی خاص کم نہیں ہوگی۔“ بیٹی نے کہا۔ ”کتے اس قسم کی برف پر چلنے کے عادی ہوتے ہیں اور ان کے سلیپ ہونے کا خطرہ بھی نہیں ہوتا ہے۔“

ایک سلیج جس پر آدمی کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اس کے آگے ایک لکڑی اس طرح لگائی گئی کہ وہ برف کے ٹکڑوں کو ایک طرف پھینکتی جائے اور راستہ بناتی جائے۔ جب سلیج چلی تو ٹکڑے صاف ہونے سے ہموار راستہ بن گیا جس پر باقی قافلہ آرام سے سفر کرنے لگا۔ آرام سے یوں کہ سلیج کی رفتار خاصی ست تھی اور کتے بہت زور لگا کر اسے آگے کھینچ رہے تھے۔ لکڑی کے آگے برف جمع ہو رہی تھی اس کا وزن بھی آ رہا تھا آنے والے دو گھنٹے میں ہم نے مشکل سے ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا۔ اس دن ہم اسی قسم کی برف پر سفر کرتے رہے اور شام تک ہم نے صرف تین میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔ یہ مقررہ فاصلے سے دو میل کم تھا۔ اس کے باوجود سب تھکن محسوس کر رہے تھے۔ سفر کے پہلے دن نے ہماری خوش فہمیوں کا بڑی حد تک خاتمہ کر دیا تھا۔ اب ہمیں اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ مہم آسان نہیں تھی۔ پہلے دن ہمیں اتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا آگے نہ جانے اور کتنی مشکلات کھڑی تھیں جن سے پہلے ہمارا واسطہ نہیں پڑا تھا۔

سرمایہ میں آبنائے بیرنگ پر تقریباً تیس فٹ موٹی برف کی تہ جم جاتی ہے۔ مٹی میں جب یہ پگھلنا شروع ہوتی ہے تو رفتہ رفتہ اس کی موٹائی چھ فٹ تک رہ جاتی ہے اور اس کے بعد یہ ٹکڑوں کی صورت میں ٹوٹنا شروع کر دیتی ہے۔ ایسا عام طور سے مٹی کے آخر میں ہوتا ہے۔ اس وقت تک چلی تہ نوٹنے اور اوپر مزید برف گرنے سے یہ سارا میدان

ناہموار ہو جاتا ہے۔ ہم نے اب تک جتنا سفر کیا تھا وہ ایک ایسے برف کے میدان پر تھا جس پر چار سے آٹھ فٹ اونچے برف کے ٹیلے بنے ہوئے تھے اور ہمیں ان کے درمیان سے راستہ بنا کر گزرتا پڑا تھا۔ بعض مقامات پر ٹیلے اتنے آس پاس تھے کہ ہمیں عملاً ان پر سے گزرتا پڑا تھا۔ سلیجوں کے ساتھ یہ نہایت دشوار کام ثابت ہوا تھا۔ ہمیں یہ احتیاط بھی کرنا پڑی تھی کہ کوئی سلیج الٹ نہ جائے۔

اس رات سونے سے پہلے ٹیم کے تمام اراکین کی میٹنگ ہوئی جس میں اس بات پر غور کیا گیا کہ اگر ہماری رفتار ست ہوئی تو ہمیں خوراک کے معاملے میں کیا کرنا چاہیے۔ میکس، میرا، جان اور میٹ کا خیال تھا کہ ہمیں اسی خوراک کی راشننگ کر کے اس میں گزارہ کرنا چاہیے جبکہ ... باقی لوگوں کا خیال تھا کہ اس صورت میں ہمیں مزید خوراک منگوانی چاہیے۔ میکس اس خیال کا سخت مخالف تھا اس نے کہا۔ ”دیکھو ہمارا مقصد ان خانہ بدوشوں کی طرح سفر کرنا ہے جنہوں نے کبھی آبنائے کو پار کیا ہوگا اور وہ امریکا پہنچے تھے۔ مجھے یقین ہے وہ اس سے بھی کم خوراک اور ذرائع کے ساتھ روانہ ہوئے ہوں گے۔“

”ان کی مجبوری تھی لیکن ہماری کوئی مجبوری نہیں ہے۔“ الزبتھ بولی۔

”جب ہم خوراک منگوا سکتے ہیں تو ہمیں بلاوجہ خود کو بھوکا رکھ کر سفر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ مارتھانے بھی کہا۔ ”آج کے دن سے لگ رہا ہے کہ اس سفر میں اندازے سے زیادہ دن لگیں گے۔“

”ٹھیک ہے ہم خوراک منگوا سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن ایک بات تم لوگ بھول رہے ہو ہمیں لازمی اپنی طے شدہ مدت میں آبنائے پار کرنی ہے ورنہ برف پگھلنے لگے گی اور ہمارا سفر مزید دشوار ہو جائے گا۔“

”پندرہ مئی کے بعد آبنائے کی برف کسی وقت بھی پگھل سکتی ہے۔“ میکس نے میری تائید کی۔ ”اس لیے سوال اضافی خوراک کا نہیں بلکہ مقررہ مدت میں آبنائے پار کرنے کا ہے۔“

”ٹھیک ہے ہم مقررہ مدت میں پار کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔“ میرک نے کہا۔ ”لیکن اس کے لیے ہمیں روزانہ بارہ گھنٹے سفر کرنا پڑے گا۔“

”شاید یہی کرنا پڑے۔“ میکس نے سر ہلایا۔

”اس صورت میں بیٹی کو مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ اتنی زیادہ مشقت نہیں کر سکتی۔۔۔۔“ میرک نے اعتراض کیا۔

”ہم بیٹی کو سلیج پر بٹھا کر سفر کر رہے ہیں۔“

”اس کے باوجود اس کے لیے یہ سفر بہت مشکل ہے۔“ میرک کو غصہ آ گیا تھا۔ ”کیا تمہیں اس کی حالت کا پتا نہیں ہے۔“

”مجھے اس کی حالت کا پتا ہے۔“ میکس حمل سے بولا۔ ”جہاں یہ روز دس گھنٹے سفر کر رہی ہے وہاں دو گھنٹے اضافی سفر کر سکتی ہے۔ ہم اس پر سے تمام کاموں کی ذمہ داری اٹھا لیتے ہیں یہ صرف آرام کرے گی۔“

میرک خاموش ہو گیا صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس کے لیے دل سے راضی نہیں ہے۔ بیٹی کے تاثرات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ مارتھانہ اور الزبتھ کے ساتھ ہیکٹر بھی سفر کا دورانیہ بدھانے کے قائل نہیں تھے۔ جب کہ میکس سمیت پانچ افراد اس کے حامی تھے۔ فارین اور بیٹی غیر جانبدار تھے۔ میکس نے سربراہ کی حیثیت سے فیصلہ سنا دیا کہ اگلے روز سے ہم بارہ گھنٹے سفر کریں گے۔ دوسرے اضافی خوراک کا فیصلہ اس وقت تک نہیں کیا جائے جب تک اس کی ضرورت ناگزیر نہ ہو جائے۔ میرک نے اٹھ کر اپنے خیمے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ”اگر بیٹی کی طبیعت خراب ہوئی تو ہماری طرف سے مہم کا خاتمہ یہیں ہو جائے گا۔“

”ایک یا دو افراد کے جانے سے مہم ختم نہیں ہوگی۔“ میکس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”جب خانہ بدوشوں نے آبنائے پر سفر کیا ہوگا تو یقیناً ان کے کچھ ساتھی بھی ان سے پیچھے گئے ہوں گے۔“

میکس کا مطلب واضح تھا، کچھ خانہ بدوش اس سفر کے دوران اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہوں گے۔ ٹیم میں پہلے دن اختلاف رونما ہو گئے تھے اور ابھی تو سفر کا آغاز تھا۔ اتفاق سے میں اور میکس ایک ہی خیمے میں تھے، میں نے اس سے پوچھا۔ ”اگر میرک اور بیٹی نے جانے کا فیصلہ کیا تو کیا تم انہیں ادا کیلی کر دے گے؟“

”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میرا سب سے ایک ہی معاہدہ ہے میں فیصد رقم میں نے مہم سے پہلے ادا کی ہے۔ باقی ستر فیصد مہم کے بعد ادا کی جاتی۔“

میکس ایک آدمی کو ایک لاکھ امریکی ڈالر کا خطیر معاوضہ دے رہا تھا اور اسی وجہ سے اسے مہم پر جانے کے لیے لوگ مل گئے۔ مگر وہ ایک لاکھ ڈالر کے عوض بھی مطمئن

نہیں تھے حالانکہ انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس مہم کے دوران کیا مشکلات پیش آ سکتی ہیں اور انہیں بہت سارے جانے انجانے خطروں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیمپ کی حد تک سب خوش تھے کیونکہ وہاں سفر کی ریپر سل ہوئی تھی اور اس میں ہمیں کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی تھی لیکن اصل سفر کا آغاز ہوتے ہی مشکلات سامنے آنے لگی تھیں اور اسی لحاظ سے ٹیم کے ارکان بد دل ہو رہے تھے۔ خاص طور سے میرک اور بیٹی کو اپنے ہونے والے بچے کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ حالانکہ انہیں یہ فکر اس مہم کے لیے ہائی بھرنے سے پہلے کرنی چاہیے تھی۔

اگلے دن سفر کی وہی دشواری برقرار رہی تھی۔ میٹ برفانی علاقے کا رہنے والا تھا اور اسے پہلے بھی منجمد دریاؤں اور سمندروں پر سفر کرنے کا تجربہ تھا اس نے بتایا کہ اس قسم کی برف اصل میں طوفانوں سے وجود میں آتی ہے جب تیز ہوائیں زمین پر گرنے والے برف کے گالوں کو رول کر کے انہیں سخت بنا کر یہ روپ دے دیتی ہیں۔ مسلسل لڑھکنے کی وجہ سے یہ ٹکڑے گول اور سخت ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ دریایا سمندر کی سطح جب منجمد ہوتی ہے تو وہ زمین کی برف کی نسبت بہت سخت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے برف کے یہ آزاد ٹکڑے اس سے چپکتے نہیں ہیں اور سطح پر ان کا ڈھیر بن جاتا ہے۔

اس مشکل کی وجہ سے ہماری رفتار بہت کم تھی۔ کتے جو راستہ صاف کرنے والی سلیج کھینچتے تھے وہ جلد تھک جاتے تھے اور تقریباً ہر گھنٹے بعد کتے تبدیل کرنا پڑتے تھے۔ اس تبدیلی میں مزید وقت لگتا تھا۔ اگلے روز تمام تر کوشش کے باوجود اور بارہ گھنٹے تک سفر کرتے رہنے کے بعد بھی ہم تین میل سے زیادہ کا سفر نہیں کر سکے تھے۔ یہ کارکردگی مایوس کن تھی۔ اس رفتار سے ہم کہیں بیس دن میں جا کر آبنائے پار کرتے اور اس وقت تک گرمی سے برف پگھلنا شروع ہو جاتی اور ہم شاید کہیں پھنس کر رہ جاتے۔ دوسرے ہمارے پاس خوراک ختم ہو جاتی۔ بارہ دن کی خوراک کو راشننگ کر کے پندرہ دن تک چلایا جاسکتا تھا، بیس دن تک یہ کسی صورت نہیں چل سکتی تھی اور اگر ہم خوراک کم کرتے تو کمزور ہو جاتے اس صورت میں سفر کرنا محال ہو جاتا۔

جب تیسرے دن بھی یہی صورت حال رہی تو میکس کو راشننگ کا ناگوار فیصلہ کرنا پڑا تھا۔ اب ہر فرد کو روزانہ چار سو گرام خوراک مل رہی تھی۔ اگرچہ یہ خالص اور بہت زیادہ حرارے والے گوشت پر مشتمل خوراک تھی عام حالات

میں کسی فرد کی ایک دن کی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی تھی لیکن ہم جس مہم پر تھے یہ خوراک نا کافی ہو جاتی۔ نہایت سرد موسم میں روزانہ بارہ گھنٹے سفر کرنے سے جسم معمول سے کہیں زیادہ خوراک طلب کرتا ہے۔ درحقیقت ہم... نارمل خوراک لے رہے تھے اس کے باوجود ہمیں ہر وقت بھوک لگی رہتی تھی۔ نصف ممبران نے اس کی پر احتجاج کیا تھا۔ پانچ راشننگ کے حامی تھے اور ایک غیر جانبدار تھا لیکن میکس انچارج تھا اور پہلے ہی طے ہو گیا تھا کہ کسی اختلافی صورت میں اس کا فیصلہ جتنی ہو گا۔ اب فارین بھی میکس کی مخالف ہو گئی تھی اس نے کہا۔

”کم خوراک ہمیں کمزور کر دے گی اور ہمارے لیے سفر کرنا مزید کٹھن ہو جائے گا۔“

”ہمیں کم سے کم تجربہ تو کرنا چاہیے۔“ میکس نے کہا۔ ”ابھی کچھ بھی نہیں ہوا ہے اور ہم پہلے سے اندیشوں سے مر رہے ہیں۔ ممکن ہے چند دن بعد ہمیں اتنے اچھے حالات ملیں کہ ہم مقررہ فاصلے سے زیادہ طے کر لیں اور موجودہ دست روی کی تلافی ہو جائے۔“

میکس کی اس بات نے انہیں خاموش کر دیا تھا۔ مگر ان کے خدشات ختم نہیں ہوئے تھے۔ مجھے انہیں ہونے لگا۔ بے چارے میکس نے کئی ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کی اور اسے جو ساتھی ملے وہ اتنے کم ہمت نکلے تھے۔ حالانکہ ان کے لیے ناکامی موت نہیں تھی۔ جیسے پہلی بار آئناے پیرنگ پار کرنے والے انسانوں کے لیے ناکامی کا مطلب سوائے موت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اگر ہم ناکام ہوتے تو پھر بھی زندہ رہتے صرف مہم ناکام ہوتی اور میکس ناکام ہوتا۔

دو دن مزید ہم لڑھکتے برف کے ٹکڑوں کو صاف کر کے آگے بڑھتے رہے۔ اس دوران میں ہمارے پاس تمام اضافی لکڑیاں گھس چکی تھیں اور کتے لاغر ہو گئے تھے انہیں محنت زیادہ کرنی پڑ رہی تھی اور کھانے کو کم ملتا تھا۔ جب کہ اس دوران میں ہم نے مشکل سے پندرہ میل کا فاصلہ طے کیا تھا اور ابھی ہمیں اڑتیس میل کا فاصلہ مزید طے کرنا تھا اور اس کے لیے ہمارے پاس زیادہ دن نہیں رہ گئے تھے۔ صورت حال نہایت مایوس کن تھی۔ چھٹے دن برف کے ٹکڑے ختم ہو گئے لیکن ایک نئی رکاوٹ سامنے آئی۔ برف پر متوازی دراڑیں موجود تھیں۔ شاید سرمایہ بہت زیادہ برف باری کے بوجھ سے برف کی تہ دباؤ آنے سے جگہ جگہ سے توڑ گئی تھی اور یہ دراڑیں اسی کی نشانی تھیں۔

یہ دراڑیں برف پر کسی کھلے زخم کی طرح موجود تھیں۔ اگرچہ ان کی چوڑائی ایک میٹر سے زیادہ نہیں تھی اور گہرائی بھی اتنی ہی تھی۔ پیدل ہم انہیں آرام سے پھلانگ رہے تھے لیکن سٹیج اور کتوں کے ساتھ انہیں پار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ جب ایسی کوئی دراڑ سامنے آتی تو ہم اس کے متوازی چلتے اور جہاں یہ ختم ہوتی تھی تو وہاں سے آگے بڑھتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ ابھی ہم ایک دراڑ عبور کرتے تو چند قدم کے بعد دوسری دراڑ موجود ہوتی تھی۔ ان دراڑوں کی وجہ سے ہم ایک سیدھ کے بجائے زگ زگ کی صورت میں سفر کر رہے تھے۔ ہموار سٹیج کی وجہ سے اب ہم دن میں دس میل سے زیادہ سفر کر رہے تھے لیکن درحقیقت ہم سارے دن میں وہی تین چار میل آگے بڑھ رہے تھے۔ زگ زگ کی وجہ سے یہ سفر ضائع ہو رہا تھا۔

دسویں دن جب ہم نے مہم کا جائزہ لیا تو نہایت مایوس کن صورت حال سامنے آئی تھی۔ ہم نے دس دن میں صرف بیس میل کا سفر طے کیا اور یہ کل سفر کے ساٹھ فیصد سے بھی کم تھا۔ بارہ مئی کا یہ دن اچھا خاصا گرم تھا اور ہمیں اپنے بھاری لباس چھوڑ رہے تھے لیکن مصیبت یہ تھی کہ ان کے سوا ہمارے پاس اور دوسرے لباس نہیں تھے۔ خوراک کی کمی سے تقریباً سب کمزور ہو رہے تھے۔ میکس نے بیٹی کو اس کی مخصوص حالت کی وجہ سے راشننگ سے مستثنیٰ قرار دیا تھا لیکن سب سے زیادہ وہی نڈھال ہو رہی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا اس کے چہرے پر کئی دن سے تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میرک بھی فکر مند تھا۔ مجھے ان دونوں پر ترس آنے لگا تھا۔ وہ رقم کے لالچ میں ایک ایسے چکر میں پھنس گئے تھے جس سے باہر نکلنا ان کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ دس دن میں ہم اپنی خوراک کا اتنی فیصد استعمال کر چکے تھے۔ اب ہمارے پاس مشکل سے پچاس کلو گرام خوراک باقی رہ گئی تھی۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد ہمارے درمیان میٹنگ ہوئی تو میکس نے کہا۔ ”ہمیں خوراک میں مزید کمی کرنا ہوگی۔“ ”مزید کمی... وہ کیوں... یہ نہیں ہو سکتا۔“ احتجاجی آوازیں بلند ہوئیں۔ فارین غصے میں آ گئی۔ ”اگر ایسا ہوا تو میں یہ مہم نہیں چھوڑ کر واپس چلی جاؤں گی۔“ ”تم چاہو تو جا سکتی ہو۔“ میکس نے سکون سے کہا۔ ”صرف تم ہی نہیں بلکہ جو جانا چاہتا ہے وہ جا سکتا ہے۔“ ”ٹھیک ہے ہمارے لیے چور منگوا دو ہم یہاں سے

چلے جائیں۔“ ہیکٹر نے کہا۔

میکس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”چو پر کسی ایمر جنسی کے لیے مخصوص ہے اسے یوں نہیں بلایا جا سکتا۔“

یہ حقیقت بھی امدادی کمپ اور ہیلی کاپٹر روسی حکومت کے ہنگامی امداد کے لیے تھے اور وہ معاہدے کے مطابق کسی ایمر جنسی کی صورت میں آتے۔ یہ سن گوان لوگوں کا جوش و خروش ذرا ٹھنڈا ہوا تھا کہ اگر وہ مہم سے الگ ہوئے تو اس صورت میں انہیں پیدل ہی جانا پڑے گا اور وہ اب بھی پیدل چل رہے تھے۔ ہنگامی حالات میں کال کے لیے واحد ریڈیو میکس کے پاس تھا اور وہی اسے استعمال کر سکتا تھا۔ اکثر تو میکس کے مخالف ہو چکے تھے، خود میں سوچ رہا تھا کہ مقررہ دو دن تو چھوڑ دینے والے ایک ہفتے میں بھی یہ مہم سر ہوتی نظر نہیں آرہی تھی اور پندرہ مئی کے بعد لازمی برف پگھلنا شروع ہو جاتی اور اس کے بعد ہماری مہم بچ بچ خطرے میں پڑ جاتی۔ تیرہ مئی کی اس صبح موسم بہت گرم تھا۔ میرک نے کہا۔ ”بیٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اسے درد ہو رہا ہے۔“ ”اگر بیٹی سمجھتی ہے کہ اسے واپس جانا چاہیے تو میں ہیلی کاپٹر کے لیے کال کر سکتا ہوں۔“ میکس نے جواب دیا۔ سب کی نظریں بیٹی پر مرکوز ہو گئیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ فوراً ہیلی کاپٹر بلوانے کو کہے گی۔ مگر وہ چپ رہی پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”میرا خیال ہے میں ابھی سفر کر سکتی ہوں۔“ ”شباباش۔“ میکس نے بے ساختہ اس کا شانہ تھپکا۔ ”تم ایک بہادر خاتون ہو، مجھے یقین ہے تمہارا یہ بچہ تم پر فخر کرے گا۔“

میٹنگ کے بعد سب بے دلی سے تیار ہوئے اور آگے روانہ ہوئے۔ کتے جو عام طور سے سفر کے وقت بُر جوش ہو جاتے تھے اس وقت خاموشی سے سر جھکائے سٹیج کھینچ رہے تھے۔ ابھی ہم نے سفر شروع کیا تھا کہ ایک عجیب سا واقعہ پیش آیا۔ اچانک سفید برف پر سے ایک عظیم الجثہ سایہ گزرا۔ سب نے چونک کر آسمان کی طرف دیکھا۔ خیال تھا کہ اوپر سے کوئی چیز گزری ہے لیکن آسمان بالکل صاف تھا وہاں کچھ نہیں تھا۔ مگر سایہ سب نے دیکھا تھا اس میں شبہ کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے میکس کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا پکڑ رہے کیا پیرنگ کے علاقے میں بھوت بھی رہتے ہیں؟“

میں نے مذاق میں کہا تھا لیکن فارین اور الزبتھ کا رنگ سفید پڑ گیا۔ فارین کا نفی آواز میں بولی۔ ”پلیز ایسی

باتیں مت کرو۔“

اسی لمحے سایہ دوبارہ گزرا۔ ہم سب ہی اچھل پڑے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ برف پر یہ کس کا سایہ بن رہا ہے جب کہ آسمان بالکل صاف ہے۔ پھر سب سے پہلے میٹ سمجھا اس نے چلا کر کہا۔ ”وہیل... برف کے نیچے وہیل ہیں۔“ برف کے نیچے سے وہیل کا کوئی جھنڈ گزر رہا تھا۔ جب کوئی وہیل گزرتی تو برف پر سایہ سا بنتا اور ہم سمجھتے کہ اوپر سے کوئی چیز گزری ہے جب کہ برف کے نیچے وہیل موجود تھیں۔ میکس اور سب ہی فکر مند ہو گئے۔ اس موسم میں وہیل اس طرف نہیں آتی ہیں کیونکہ ان کو سانس لینے کے لیے سمندر کے باہر آنا پڑتا ہے اور یہاں تو ہر طرف برف تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ ”یہاں سے نکلو... گرمی کی وجہ سے برف کی تہ کمزور پڑ گئی ہے اور وہیل شاید سانس لینے کے لیے اس جگہ آئی ہیں۔“

میرک کا چہرہ زرد ہو گیا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ وہیل یہاں برف توڑ دیں گی؟“

اس سے پہلے میں میرک کے سوال کا کوئی جواب دیتا اچانک برف تلے سے دھمک ہوئی اور ہم سب ہی اچھل پڑے تھے۔ برف کی تہ یوں ہلی جیسے زلزلے سے زمین ہلتی ہے۔ میکس چلایا۔ ”بھاگو... وہیل برف توڑ رہی ہیں۔“

ہم سب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے تھے۔ کتے بھی خطرہ محسوس کرتے ہوئے پوری رفتار سے سٹیج کھینچ رہے تھے۔ بیٹی سٹیج پر بیٹھی تھی باقی خواتین بھی دوسری سٹیجوں میں بیٹھ گئیں کیونکہ اب ان پر وزن نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا مرد پیدل بھاگ رہے تھے۔ اچانک ہمارے عقب سے ایک ہیبت ناک آواز کے ساتھ برف کا ایک ٹکڑا اوپر اٹھا۔ وہیلوں نے اپنی بے پناہ قوت سے برف کے اس کٹی فٹ موٹے ٹکڑے کو آسانی سے توڑ دیا تھا۔ اس پہلے سوراخ کے بعد وہ جگہ جگہ سوراخ کرنے لگی تھیں۔ وہیلوں کا یہ جھنڈ خاصا بڑا تھا اور یقیناً اسے سانس لینے کے لیے بہت بڑی جگہ درکار تھی۔ وہیل ہماری دشمن نہیں تھیں۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتی تھیں کہ جس برف کو وہ توڑ رہی تھیں اس کے اوپر ایک درجن انسان اور دو درجن کتے ہیں۔ مگر ان کی وجہ سے ہم سب کی زندگیاں خطرے میں پڑ گئی تھیں۔

جان بچانے کے لیے سب بھاگ رہے تھے اور کسی کو دوسرے کا ہوش نہیں تھا۔ عقب میں وہیل برف توڑ رہی تھیں اور ان کی خوفناک آوازیں ہمارے پیروں کو پر لگا رہی

تھیں۔ میں بھی اپنے گھٹنے کا درد بھول کر بھاگا جا رہا تھا۔ میں تقریباً سب سے پیچھے تھا کہ اچانک مجھ سے صرف دس گز پیچھے برف پھٹی اور ایک بہت بڑی ویل کا سر اس میں سے نکلا تھا۔ برف بلی تو میرے قدم ڈگمگائے اور میں زمین پر جا گرا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور پھر ساکت رہ گیا۔ اتنے قریب سے دنیا کے اس بڑے جاندار کو دیکھنا سنسنی خیز تجربہ تھا جو میں مرتے دم تک نہیں بھول سکوں گا۔ ویل کا منہ کھلا ہوا تھا لیکن وہ سانس منہ سے نہیں اپنے سر میں موجود سوراخ سے لیتی ہے۔ شاید بہت دیر تک سمندر تلے رہنے کے بعد وہ کھلی ہوا کا مزہ لے رہی تھی۔ اس کی بہت بڑی آنکھ میری طرف تھی اور اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں خوف اور تحیر کی کیفیت میں اتنا کھو گیا کہ اٹھ کر بھاگ بھی نہیں سکا تھا۔

ویل کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے عجیب سی گڑگڑاتی آواز نکالی اور بہت آہستگی سے تقریباً سلو موشن میں اپنا سر واپس سمندر میں لے گئی، تب مجھے ہوش آیا اور میں اٹھ کر بھاگا۔ اس وقت مجھے یہ بھی پتا چلا کہ میرے جو ساتھی آگے نکل گئے تھے وہ چلا چلا کر مجھے بھاگنے کو کہہ رہے تھے۔ جب میں ساکت پڑا تھا تو میکس تمام خطرات بالائے طاق رکھ کر میری طرف بھاگا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی ویل واپس سمندر میں چلی گئی اور میں کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ ویلیں اب بھی برف توڑ رہی تھیں اور ہم ان سے زیادہ سے زیادہ دور جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بالآخر ہم نے محسوس کیا کہ ہم خطرے کی حد سے نکل آئے ہیں تو ہم برف پر گر گئے اور ہانپنے لگے، اس سارے سفر کے دوران ہم نے اتنی تیز رفتاری کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ہم سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

”یہ... کیا تھا؟“ بالآخر الزبتھ چلائی۔

”تم نے بتایا تھا کہ برف مٹی کے آخر میں پھلتی ہیں۔“ مارٹا بھی میکس پر برس پڑی تھی۔

”ایک منٹ۔“ مینٹ نے کہا۔ ”میرا خیال ہے میں اس کی وضاحت کر سکتا ہوں۔ یہاں آبنائے بیرنگ سے سرد پانی کا ایک دھارا گزرتا ہے۔ یہ دھارا تقریباً وسط سے گزرتا ہے۔ اپنی رفتار کی وجہ سے یہاں جننے والی برف کو چھیلتا ہے اس لیے آبنائے کے وسط میں برف کی تہ ہلکی ہوتی ہے، یہ نسبت اس کے کناروں کے۔“

سفر کے آغاز میں ہم نے طے کر لیا تھا کہ روسی اور امریکی جزیروں سے پرے ہو کر گزرتا ہے۔ یعنی ہم سارا سفر نجد سمندر پر کریں گے۔ لعل ڈائنڈ سے آگے نکل آئے کا مطلب تھا کہ اب ہم امریکی ساحل سے زیادہ دور نہیں رہے تھے۔ میکس کے پاس صرف ایک ہاتھ سے بنایا ہوا نقشہ تھا اور ہم اس کی مدد سے یہ سفر کر رہے تھے۔ یہ جان کر کہ ہم اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں ہیں اور پھر اس عجیب واقعے میں سب کے فوج نکلنے کے بعد اہل قافلہ کی حالت میں تبدیلی آئی تھی۔ ان کی بے دلی اور سستی غائب ہو گئی۔ سب پُر جوش اور پُر امید نظر آنے لگے کہ وہ بالآخر آبنائے کو اس کر جائیں گے۔ سب کے چہروں پر مسکراہٹ نظر آنے لگی۔ حتیٰ کہ بیٹی بھی ہنسنے بولنے لگی۔ وہیلوں سے بچنے کے لیے ہم جو اندھا دھند بھاگے تو دس منٹ سے بھی کم وقت میں ایک کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ طے کر چکے تھے۔ اس مہم کے دوران ہم نے ایک بھی کلومیٹر اتنی تیزی سے طے نہیں کیا تھا۔ یہاں میدان کی قدر ڈھلان نما اور سیدھا تھا۔ میکس اور مینٹ نے میدان کا جائزہ لیا اور پھر طے ہوا کہ سلجوں پر تیز رفتاری سے سفر کیا جائے۔ ہر سٹیج پر دو افراد بیٹھ سکتے تھے اور چار افراد کو پیدل بھاگنا پڑتا۔ ہر تیس منٹ بعد بھاگنے والوں کو سٹیج پر جگہ ملتی اور ان کی جگہ چار دوسرے افراد آنے والے تیس منٹ کے لیے پیدل سفر کرتے۔

یہ سفر کا سب سے اچھا دن ثابت ہوا تھا۔ ڈھلان کی وجہ سے کتوں کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑ رہی تھی۔ شام تک ہم کوئی دس میل کا سفر طے کر چکے تھے۔ جب ہم نے پڑاؤ ڈالا تو سب ہی خوش تھے۔ ایک واقعہ پھر اس میں فوج نکلا اور اس کے بعد غیر متوقع طور پر اتنا تیز سفر طے کرنا۔ اس نے سب کو پُر جوش کر دیا تھا۔ اگرچہ آج ہم اپنے مقررہ وقت سے ایک دن اوپر جا چکے تھے اور اب بھی کم سے کم گیارہ میل کا سفر باقی تھا۔ آگے نامعلوم ہمیں سفر کرنے کے لیے کیا راستہ ملے۔ ہم یہ توقع نہیں کر سکتے تھے کہ آگے بھی اتنا ہموار میدان ملے گا۔ رات کے کھانے کے بعد ہم سب خوش اور پُر امید تھے۔ میرک نے کہا۔

”اگر کل بھی ہمیں اسی طرح سفر کا موقع ملا تو ہم شاید کل ہی الاسکا پہنچ جائیں۔“

اس کا امکان ہے کہ ہم پرسوں تک الاسکا پہنچ جائیں۔“ اس رات کھانے کے بعد ہمارے پاس کل پندرہ کلو گرام کی خوراک بچی تھی۔ انسانوں کے لیے مخصوص خوراک دس کلو گرام تھی اور کتوں کے لیے مخصوص خوراک پانچ کلو گرام تھی۔ ہم یہ خوراک کوشش کر کے دو دن استعمال کر سکتے تھے لیکن کتوں کے لیے یہ خوراک صرف ایک دن کی تھی۔ اس لیے ہم نے انہیں اگلی صبح سارا گوشت دے دیا تاکہ وہ سفر کے لیے تازہ دم رہیں۔ ناشتے کے بعد ہم سفر پر روانہ ہوئے۔ آج پندرہ مئی تھی یعنی ہمارے سفر کا پندرہواں دن۔ گرمی واضح طور پر محسوس کی جاسکتی تھی اور بعض جگہوں سے گزرتے ہوئے ہمیں لگتا تھا جیسے پانی پر سفر کر رہے ہیں۔ برف کی تہ ہماری توقع سے زیادہ تیزی سے پگھل رہی تھی لیکن اس گرمی کا ہمیں یہ فائدہ بھی ہوا تھا کہ برف کی رکاوٹیں پگھل گئی تھیں اور اب ہموار برف کا کسی قدر نرم پڑ جانے والا میدان تھا۔ اس روز ہم ڈھلان پر نہیں تھے بلکہ کسی قدر چڑھاٹی تھی اس لیے کتوں کو کچھ کھینچنے کے لیے محنت کرنا پڑ رہی تھی۔ اس دن بھی ہم اسی طرح سفر کر رہے تھے نصف پیدل چل رہے تھے اور نصف سٹیج پر تھے صرف بیٹی مستقل سٹیج پر بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی اس کے چہرے پر تکلیف نظر آتی تھی۔ مگر وہ بہادری سے تکلیف برداشت کر رہی تھی۔ چھ گھنٹے سفر کے بعد ہم آرام کے لیے روکے۔ کتے بھوک سے بے تاب ہو رہے تھے لیکن انہیں دینے کے لیے اب ہمارے پاس کچھ نہیں تھا۔ بلکہ ہماری اپنی خوراک بھی بس ختم ہونے والی تھی۔ اگر ہم بہت کفایت شعاری سے کام لیتے تو کل کا ناشتا کر سکتے تھے۔ اس دن ہم نے کل چھ میل کا فاصلہ طے کیا تھا جو گزشتہ روز سے کم تھا لیکن مجموعی طور پر یوں بہتر تھا کہ اب ہم اپنی منزل سے پانچ میل دور رہ گئے تھے اور امید تھی کہ کل یہ فاصلہ بھی طے ہو جاتا اگر کوئی غیر متوقع مشکل پیش نہ آتی۔

کل فضا میں کھانا صرف بننا تھا پھر ہم خیموں میں جا کر کھانا کھاتے تھے۔ کیونکہ کھانا تھوڑی دیر میں ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ میکس میرے ساتھ تھا جب میں اپنا کھانا لے کر خیمے میں آیا تو میکس نہیں آیا تھا وہ کچھ دیر بعد آیا میں نے اس سے کھانے کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس نے کھانا کھا لیا تھا۔ اس رات بہت دیر سے نیند آئی۔ مارے بھوک کے ہیٹھ میں گڑگڑاہٹ ہو رہی تھی۔ میکس کا بھی یہی حال تھا، وہ کروٹیں بدل رہا تھا۔ ایک ارب پتی جس نے کبھی بھوک کا تجربہ نہیں کیا تھا اس وقت بھوک سے بے حال تھا اور یہ

بھوک خود اس کی اختیار کی ہوئی تھی۔ خوراک منگوانا اس کے اختیار میں تھا لیکن وہ اس مہم کو اسی انداز میں مکمل کرنا چاہتا تھا جیسے آج سے دس ہزار سال پہلے لوگوں نے آبنائے بیرنگ کو پار کیا تھا۔

صبح میں نے دیکھا میکس کا چہرہ سُتا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں اندر کو دھنس رہی تھیں۔ وہ رئیس زادہ تھا اس لیے خوراک کی کمی اس پر زیادہ ہی اثر کر رہی تھی۔ سب ہی کمزوری محسوس کر رہے تھے۔ ناشتے میں ہم نے اپنی آخری خوراک استعمال کی اور آگے روانہ ہو گئے۔ کتے بھوک سے نقاہت کا شکار تھے اور ان کے انداز میں پہلے جیسی چستی نہیں تھی، وہ بہ مشکل ہی سلجوں کو کھینچ رہے تھے۔ سفر کا آخری مرحلہ خوراک کی کمی سے مشکل ہو رہا تھا۔ چند گھنٹوں بعد کتوں نے سر ڈال دیے اور سلجوں کو کھینچنے سے انکار کر دیا۔ وہ شاید خالی سلجوں کو کھینچ لیتے لیکن اتنے لوگوں کے ساتھ سلجوں کو کھینچنا ان کے لیے ممکن نہیں رہا تھا اس لیے اب ہر سٹیج پر دو کے بجائے ایک فرد آگیا۔ یوں کتوں نے بادل نا خواستہ ہی لیکن اپنا کام شروع کیا۔ باقی سب پیدل چل رہے تھے۔

ہماری حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ میری ٹانگ کا درد جاگ اٹھا تھا اور قدم اٹھانا دشوار ہو رہا تھا۔ باقی سب بھی گرتے پڑتے چل رہے تھے لیکن حیرت انگیز طور پر پھر کسی نے میکس سے شکوہ نہیں کیا کہ وہ خوراک کیوں نہیں منگوارہا ہے۔ سب سمجھ چکے تھے کہ ہم کے اس آخری حصے میں وہ اگر اضافی خوراک طلب کریں گے تو یہ ایک طرح سے مہم کی ناکامی کے مترادف ہوگا۔ اس لیے سب ہمت سے کام لے رہے تھے اور کسی نہ کسی طرح خود کو تھکاتے رہے تھے۔ دوپہر کو ہم روکے تو جو جہاں تھا وہیں لیٹ گیا۔ کسی نے کتوں کو کھولنے کی کوشش نہیں کی تھی وہ بھی اپنی جگہ لیٹ گئے تھے۔ جھٹکن اور کمزوری سے سب کا برا حال تھا۔ میکس میرے پاس لیٹا تھا اور منہ کھولے لیے لیے سانس لے رہا تھا۔ میں نے اچانک کہا۔

”اگر آج رات ہم الاسکا نہیں پہنچ سکے تو ہمیں خوراک منگوانی پڑے گی۔“

میکس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں ہمیں ایسے ہی الاسکا پہنچنا ہے۔“

”تم سب کی حالت نہیں دیکھ رہے ہو، بیٹی ماں بننے والی ہے اور تم خود اپنی حالت دیکھو۔“

وہ کچھ دیر گہرے سانس لیتا رہا پھر آہستہ سے

فلمی افسانہ

علی سلطان آفانی کی ناولس

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتیاں کی یاد
تجائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ابہے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم و ادب،
صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روز اول کی طرح تازہ
دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا فلم
کبھی ٹھکن کا شکار نظر آئے۔ آفانی صاحب ہمارے ایسے ہی جوان فکر و بلند
حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں جبلت
کے نشان اُس کی پیشانی پر ثبت کر دیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے
وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے
اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دہد شہد اور میل ملاقات کا یہ
سلسلہ خاصا محفلوں کی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے
وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اُس عہد کا
نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان دراز ستار سرگزشت

21515

آئیے آج کچھ اپنی یعنی ہماری اور آپ کی زندگی
کے روزمرہ معمولات کی باتیں کرتے ہیں۔ گھروں میں پالتو
جانور پالنا ہمیشہ سے انسانوں کو مرغوب رہا ہے۔ ان میں
پرندے، چمندے، درندے ہر قسم کی مخلوق شامل ہے۔ آخر
انسان اپنے بال بچوں کے ہوتے ہوئے پالتو جانور پالنا
کیوں ضروری سمجھتا ہے۔
غالباً یہ سلسلہ کتے پالنے سے شروع ہوا ہے کیونکہ
زمانہ قدیم میں اپنے مویشیوں اور خود اپنی حفاظت کے لیے

سر جھکائے ہوئے تھے۔ جب ہم رکے اس دوران میں ہوا کا
رخ بدلا تو کتے چونک گئے اور اچانک انہوں نے مل کر بھونکن
شروع کر دیا۔ میکس نے اضطراب سے کہا۔ ”شاید انہیں
کوئی بول رہی ہے۔“

سب چل پڑے۔ آزاد کتے آگے بھاگ رہے تھے
لیکن ساتھ ہی وہ ہماری طرف بھی دیکھ رہے تھے جب
نظروں سے اوجھل ہونے لگتے تو رک کر ہمارا انتظار کرتے
تھے۔ جب ہم ان کے قریب پہنچ جاتے تو وہ دوبارہ بھاگنے
لگتے۔ سلیج والے کتے بھی جوش دکھا رہے تھے۔ انہیں قابو
میں رکھنا پڑ رہا تھا ورنہ وہ بیٹی سمیت سلیج لے کر بھاگ
جاتے۔ ہمارے اندر بھی یہ سوچ کر جان آگئی تھی کہ ہم لاسا
کے کسی ساحل کے پاس پہنچ گئے تھے۔ میری نظر آسمان پر گئی
تو وہاں پرندے اڑ رہے تھے اس کا مطلب تھا کہ ہم واقعی
ساحل کے پاس آگئے تھے۔ پرندوں کے بعد ہمیں ساحل کی
نشان دینی کرنے والے سرخ رنگ کے کھبے دکھائی دیے
جن پر امریکی پرچم لہرا رہا تھا۔ ساحل پر پہنچ کر ہم مارے خوشی
کے ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے۔

میکس نے کال کی اور میں منٹ بعد امریکی کوسٹ گارڈ
کا بڑا ہیلی کاپٹر ہمیں لینے وہاں آگیا تھا۔ کتوں کو وہیں چھوڑ دیا
گیا انہیں بعد میں واپس روس پہنچا دیا جاتا اور ہم کوسٹ گارڈ
کے اسٹیشن منتقل کر دیے گئے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ بالآخر
ہم کامیاب رہے تھے۔ اس مہم کے دوران بارہا ایسے مواقع
آئے جب ہم نے خود کو ناکام سمجھ لیا تھا خاص طور سے جب
میکس نے معاملہ بیٹی پر چھوڑا تھا تو ہماری مہم وہیں ختم ہو جاتی
اگر بیٹی ہیلی کاپٹر منگوانے کا کہہ دیتی۔ لیکن اس نے انکار کر
کے مہم کو بچا لیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے انکار
کیوں کیا تھا جب کہ شروع میں ان دونوں میاں بیوی کا
روتہ مخالفانہ تھا۔ موقع پا کر یہی سوال میں نے بیٹی سے کیا تو
اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”تم یا کوئی نہیں جانتا میکس
نے میرے لیے کتنا ایثار کیا ہے وہ اپنی خوراک میں سے
مجھے دیتا رہا تھا تا کہ میری خوراک کی ضروریات پوری
رہیں اب جب اس نے سب مجھ پر چھوڑ دیا تھا تو میں اسے
کیسے مایوس کرتی.... وہ سچ ایک عظیم انسان ہے۔“
میں اس سے متفق تھا میکس واقعی ایک عظیم انسان
ہے۔ اس نے ایک خواب دیکھا اور اپنی ہمت اور حوصلے
سے اس کی تعبیر بھی حاصل کر لی۔

بول۔ ”سنو ہم کامیابی کے پاس آگئے ہیں اس موقع پر....“
”میکس اگر آج ہم اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکے تو
ہمیں خوراک طلب کرنی ہوگی۔“ میں نے فیصلہ کن لہجہ میں
کہا اور اس کے پاس سے اٹھ گیا اس وقت مجھے غصہ آ گیا تھا
کہ وہ صرف اپنی مہم کامیاب کرنے کے لیے باقی سب کو
افیت میں ڈال رہا تھا۔ دو گھنٹے کے آرام کے بعد ہم روانہ
ہوئے، آرام سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ بلکہ وقت گزرنے
کے ساتھ ساتھ کمزوری بڑھ رہی تھی۔ صرف ایک خیال ہمیں
جیسے تیسے سفر کرنے پر مجبور کر رہا تھا کہ منزل اب زیادہ دور
نہیں ہے، ہم لاسا کے ساحل سے شاید تین میل دور تھے یا
اس سے بھی کم فاصلہ باقی رہ گیا تھا۔ لیکن یہ معمولی سا فاصلہ
جو ایک زمانے میں جاگت کرتے ہوئے صرف آدھے گھنٹے
میں طے کر لیتا تھا اب بہت مشکل اور طویل لگ رہا تھا۔

میکس سب سے آگے والی سلیج کے ساتھ چل رہا تھا
جس پر بیٹی دراز تھی۔ اس سے اب بیٹھا بھی نہیں جا رہا
تھا۔ ہمارے پیروں تلے برف پگھل رہی تھی اور جب ہم زور
سے قدم رکھتے تو پانی کا چھپکا ہوا چھٹکا دیتا تھا۔ یہ چھپکا
ہمیں یاد دلاتا تھا کہ ہم پگھلتی برف پر سفر کر رہے ہیں اور کسی
لمحے بھی منجمد برف کا یہ میدان سمندر پر تیرتے برف کے
ٹکڑوں میں بدل سکتا تھا۔ یہ خوف بھی ہمیں قدم اٹھانے پر
مجبور کر رہا تھا ورنہ میری اپنی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ مجھے
ذرا بھی آسرا ہوتا تو میں وہیں لیٹ جاتا۔ کئی گھنٹوں کے سفر
کے بعد سب کی حالت زیادہ ہی خراب ہو گئی تھی۔ اچانک
فارین نیچے لیٹ گئی اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی۔
”میں آگے نہیں جاسکتی.... میں نہیں مر جاؤں گی۔“
سب اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اسے تسلی اور حوصلہ
دینے لگے۔ مار تھانے اسے گلے سے لگایا۔ ”بس تھوڑا
فاصلہ اور ہے تم ہمت کرو۔“

”ایسا کرو تم سلیج پر آ جاؤ۔“ بیٹی بولی۔ ”میں پیدل
چلوں گی۔“

آرام کے بعد روانگی اختیار کرتے ہوئے ہم نے دو
تین سلیجیں چھوڑ دی تھیں اور صرف ایک سلیج میں طاقتور کتوں
کو باندھ کر باقی کمزور ہو جانے والے کتوں کو آزاد چھوڑ دیا
تھا۔ اس واحد سلیج پر بیٹی تھی۔ فارین اٹھ گئی اس نے بیٹی سے
کہا۔ ”نہیں سلیج پر تم سفر کرو گی۔“

بیٹی کا حوصلہ دیکھ کر شاید فارین کو شرمندگی ہوئی تھی اور
وہ دوبارہ سفر کے لیے تیار ہو گئی۔ کتے اب تک خاموش اور



انسانوں کو "چوکیدار" کی ضرورت تھی۔ اس معاملے میں کتا بہت مستعد اور کارآمد جانور ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ درجنوں بلکہ سیکڑوں بکریوں، بھینٹوں، گائیوں یہاں تک کہ گھوڑوں تک کو صرف ایک کتا کس طرح اپنے قابو میں کر لیتا ہے اور اسے گھیر گھار کر گلے میں لے آتا ہے، بے چارہ انسان جو بہت ہوشیار اور چالاک مخلوق ہے موشیوں کی افراتفری پر اس طرح قابو نہیں پاسکتا جس طرح کتا ڈھیر سارے دوڑتے بھاگتے جانوروں کو گھیر گھار کر قابو میں کر کے اپنے مالک کے پاس لے آتا ہے۔

کتا بہت حساس جانور ہے۔ یہ خطرے کی بودور ہی سے سونگھ لیتا ہے اور بھونک کر اپنے مالک کو مطلع کر دیتا ہے کہ غیر لوگ یا مشکوک افراد رات کے اندھیرے میں، دبے پاؤں اس کے پڑاؤ یا بستی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس زمانے میں چوکیدار یا سیکورٹی گارڈز تو ہوتے نہیں تھے لہذا ان کے فرائض بھی کتا ہی سرانجام دیا کرتا تھا۔ رات بھر ایک لائین لے کر گاؤں اور محلوں میں "جاگتے رہو" کی آوازیں بلند کرنے والا چوکیدار بھی زمانہ قدیم میں نہیں ہوتا تھا اس لیے ان کی فتنے داری بھی کتا ہی سرانجام دیتا تھا۔ جیسے ہی علاقے کے آس پاس کوئی غیر آدمی یا جانور آنے کی کوشش کرتا تھا، کتا مسلسل بھونک بھونک کر سب کو خبردار کر دیتا تھا۔

بہت سے لوگ رات کے وقت کتوں کے بھونکنے پر بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں، انہیں یہ شکایت ہوتی ہے کہ کتا اگر ایک بار بھونکنا شروع کر دے تو پھر چپ ہونے کا نام نہیں لیتا۔ اللہ تعالیٰ نے کتوں کا گلا بھی مخصوص طور پر بنایا ہے۔ وہ گھنٹوں مسلسل بھونک سکتا ہے مگر نہ اس کا گلا خراب ہوتا ہے نہ اس کی آواز ٹپکتی ہے۔ انسانوں اور حیوانوں میں مسلسل ایک ہی آواز سے بھونکنے کی خصوصیت صرف کتوں میں ہی پائی جاتی ہے، اس بارے میں کئی مقولے بھی مشہور ہیں۔ ایک یہ ہے کہ بھونکنے والا کتا کاٹا نہیں۔ مگر پطرس بخاری مرحوم نے اس کہادت سے بھلنے کے بجائے لکھا تھا کہ کون جانے کہ کتا کب بھونکنا بند کر دے اور کاٹنا شروع کر دے؟ ظاہر ہے کہ بھونکنے والا کتا کاٹنے کے لیے اسی وقت تیار ہو سکتا ہے جب وہ بھونکنا بند کر دے۔ کتے کی نفسیات کے ماہر بھی یہ نہیں بتا سکتے کہ کتا کس وقت بھونکنا بند کرے گا اور کاٹنا شروع کر دے گا۔ اس لیے ان باتوں سے دھوکا کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کتا بھونکے یا کاٹے دونوں صورتوں میں وہ خطرناک اور ناقابل اعتبار ہوتا ہے۔

کتوں کو قدرت نے ایک اور خوبی بھی عطا کی ہے۔ یہ ہے کہ (خصوصاً) رات کے وقت جب ایک کتا بھونکنا شروع کرتا ہے تو گرد و نواح کے کتے بھی بھونکنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ سب کتے جہاں بھی ہوں، جس حال میں بھی ہوں اپنے ہم جنسوں کی آواز میں آواز ملانا ضروری سمجھتے ہیں۔ جہاں بھی ہوں، جس حال میں بھی ہوں، سے مراد یہ ہے کہ رات کے وقت کچھ کتوں کو تو ان کے مالک کھلا چھوڑ دیے ہیں۔ وہ سڑکوں پر گھوم کر سائیکل چلانے والوں اور پیدل چلنے والوں سے "چھیڑ خانی" ضرور کرتے ہیں۔ کچھ مالک اپنے کتوں کو اپنے گھروں کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلنے دیتے اس لیے وہ اپنے گھر کے اندر ہی سے بھونکتے رہتے ہیں۔ ایسے بھی مالک ہوتے ہیں جو اپنے خونخوار قسم کے کتوں کو مفاد عامہ کے تحت رات کو بھی زنجیر سے باندھ کر رکھتے ہیں۔

زنجیروں میں بندھے ہوئے یہ کتے اپنی جگہ آزاد ہونے کے لیے زور لگاتے اور بھونکتے رہتے ہیں مگر یہ ضروری ہے کہ وہ بھونکنے میں شامل ہو کر اپنی برادری کے ساتھ اتحاد و اتفاق کا مظاہرہ کریں۔

ذکر یہ تھا کہ غالباً حضرت انسان نے اپنی اور اپنے مال مویشی کی حفاظت کے لیے کتے پالنے کا رواج شروع کیا ہوگا۔ جب انسانوں نے شہروں میں رہنا شروع کیا تو پھر بھی حفاظت کے لیے انہیں کتوں کی ضرورت پڑی۔ کتا ایک انتہائی وفادار، تابعدار اور حکم کی تعمیل کرنے والا جانور ہے۔ اس کو کپڑے یا تنخواہ کی حاجت نہیں ہوتی۔ اس کو روٹی یا بوٹی کا ایک ٹکڑا کھلا کر بھی اپنی غلامی پر رضامند کیا جاسکتا ہے۔ اس سے زیادہ نہ تو رہنے کی جگہ یا گھر چاہتا ہے اور نہ ہی کپڑا۔ اگر مالک سخت سردی، گرمی اور بارش میں اس کو گھر سے باہر بھی چھوڑ دے تو کتے کی وفاداری میں فرق نہیں آتا۔ وہ مالک کی اس بدسلوکی یا بے حسی پر ناراض نہیں ہوتا۔ ہر حال میں اپنے فرائض ادا کرتا رہتا ہے۔ کتوں کی اس عادت کو کچھ لوگ "غلامانہ" ذہنیت بھی کہتے ہیں اور اسی بناء پر کتے پالنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتے تھے۔

1- کتا ایک ناپاک جانور ہے۔ بچپن سے ہم نے آئے ہیں کہ جس گھر میں کتا ہو وہاں فرشتے نہیں آتے۔ شاید اسی لیے ماڈرن مغرب پرست لوگوں کے سوا دوسرے لوگ کتوں کو اپنے رہائشی کمروں سے دور ہی رکھتے ہیں۔

2- کتا غلامی کی حد تک وفادار ہوتا ہے۔ کتے پالنے والے رفتہ رفتہ اس سے متاثر ہو کر غلامانہ ذہنیت اختیار کر لیتے ہیں۔

3- کتا بلاوجہ بھونکتا اور شور مچاتا رہتا ہے جس کی وجہ سے گھر والے اور پڑوسی سو نہیں سکتے۔

4- خونخوار ترین کتے کو بھی اگر گوشت کی ایک بوٹی یا بڑی ڈال دی جائے تو وہ اسی کا وفادار ہو جاتا ہے اور ازراہ محبت دم ہلانے لگتا ہے۔ کتوں کی اس سرشت سے واقف ہونے والے چور یہی ترکیب استعمال کرتے ہیں۔ بعض ڈاکو تو کتوں کو زہر آلود گوشت کھلا کر گھر کا صفایا کر دیتے ہیں۔ ایسے ناقابل اعتبار اور لالچی جانور کو پالنے کا کیا فائدہ؟

اس کے برعکس "سگ دوست" لوگوں کی تعداد بھی دنیا میں کم نہیں ہے۔ آج کے ترقی یافتہ جدید دور میں کتوں کی ضرورت اور اہمیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

آج کل مغربی ممالک میں کتے پالنا ایک لازمی ضرورت بن چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کی طرز زندگی کے مطابق ہر شخص الگ اور تنہا رہتا ہے۔

اولاد بھی والدین کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ وہاں ملازم رکھنے کا رواج تو ہے نہیں چونکہ ملازم کے اخراجات صرف رئیس لوگ ہی برداشت کر سکتے ہیں اس لیے دونوں بوڑھے میاں بیوی ہی کو اپنے سارے کام کرنے پڑتے ہیں۔ اگر ان میں سے بھی کوئی ایک دنیا سے رخصت ہو جائے تو پھر بڑے میاں یا بیوی کو گھر میں بالکل تنہا رہنا پڑتا ہے، یہاں تک کہ کوئی بات چیت کرنے والا بھی نہیں ہوتا اور وہ باتیں کرنے کے لیے ترس جاتے ہیں۔ یورپ اور امریکا میں خواتین یا گھر والے بھی کام کرتے ہیں اس لیے ہمارے ہاں کی طرح پاس پڑوس کی عورتیں بھی بات چیت کرنے کو میسر نہیں ہوتیں۔ اس تنہائی کو ان کا پالتو وفادار کتا ہی دور کرتا ہے، وہ ہر وقت ان کے پاس رہتا ہے۔ اگر وہ گھر سے باہر کسی کام سے جائیں تو کتا ہی ان کا ساتھی ہوتا ہے۔ یہ کتا رات کو ان ہی کے پاس سوتا ہے جس کی وجہ سے وہ بچوں یا نواسا نواسی اور پوتا پوتی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ یہ بوڑھے لوگ وقت گزاری کے لیے یا تو ٹی وی دیکھتے ہیں یا پھر اپنے کتے سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح ان کا دل بھل جاتا ہے اور تنہائی کا احساس کم ہو جاتا ہے۔

ایک بار ہم انگلستان گئے تو محلہ ہانسلو میں ایک دوست سے ملے بھی گئے، ہم نے دیکھا کہ ان کے گھر کے ساتھ

والے گھر کے لان میں ایک بڑی بی کھڑی سڑک پر آنے جانے والوں کا تماشا دیکھ رہی ہیں۔ پاس ہی کتا لان میں ان کے پاس بیٹھا ہے۔ انہوں نے ہمیں دیکھا نظریں ملیں تو وہ مسکرائیں اور بڑی اپنائیت سے "ہیلو" کہا۔ ہم نے بھی جواب میں مسکرا کر ہیلو کہہ دیا اور دوست کے ساتھ ان کے گھر میں چلے گئے۔ ہماری بچی نادیا کی عمر اس وقت پانچ ساڑھے پانچ سال ہوگی۔ وہ اپنے کھیلوں میں مصروف ہوگئی کچھ دیر بعد دیکھا کہ نادیا غائب ہے۔ ڈھونڈنے پر پتا چلا کہ وہ پڑوس میں بڑی بی کے پاس گئی ہے اور ان سے باتیں کر رہی ہے۔ بڑی بی نے اس کی بسکٹوں اور چاکلیٹ سے تواضع کی اور دریافت کرتی رہیں کہ تم کہاں سے آئی ہو۔ کون سی جماعت میں پڑھتی ہو۔ ماں باپ کیا کرتے ہیں وغیرہ۔

واپسی کے وقت نادیا کو بلایا تو وہ ڈھیر سارے چاکلیٹ لے کر آئی۔ پوچھنے پر بتایا کہ آئی نے دیئے ہیں۔ رخصت ہو کر باہر نکلے تو بڑی بی اپنے لان کی باڑھ کے پاس کھڑی تھیں۔ نادیا کو انہوں نے گرجوٹی سے رخصت کیا اور کہا کہ آپ کی بچی بہت پیاری ہے۔ اگر دوبارہ ادھر آئیں تو اس کو میرے پاس ضرور بھیج دیں۔ ہم تو چلے آئے، بڑی بی اپنے کتے کے ساتھ وہیں کھڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھتی رہیں۔ ہمارے دوست نے بتایا کہ بے چاری اکیلی ہیں۔ شوہر مر چکے ہیں۔ بچے بھی کبھار خط لکھ دیا کرتے ہیں۔ سارے دن اسی طرح اپنے لان کی باڑھ کے پاس کھڑی منتظر رہتی ہیں کہ کوئی آئے اور ان سے بھی بات کرے۔ یا پھر اپنے کتے کے ساتھ بازار چلی جاتی ہیں۔

ایسے بڑے بوڑھے اپنے پالتو کتوں کو بہت سے کام بھی سکھا دیتے ہیں۔ مثلاً باہر سے اخبار اٹھا کر لانا، گھر میں چیزیں اٹھا دینا۔ کوئی گھنٹی بجائے تو دروازے کے پاس جا کر دیکھنا اور اگر کوئی واقف کار ہو تو مالک یا مالک کو بھونک کر اطلاع دینا کہ چلیے، آپ کی ملاقات آئی ہے۔

جدید ترقی یافتہ دور میں بھی کتے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ کتوں کی سونگھنے کی حس بہت طاقتور ہوتی ہے۔ پولیس میں انہیں باقاعدہ ملازم رکھا جاتا ہے اور مجرموں کا کھوج لگانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ کتا سونگھ کر پہچان جاتا ہے کہ کسی گھر میں چوری کے لیے یہی شخص آیا تھا۔ منشیات کی چیکنگ میں جدید ترین مشینیں بعض اوقات ناکام ہو جاتی ہیں مگر کتا کسٹم والوں کو سونگھ کر بتا دیتا ہے کہ اس سامان میں نشہ آور اشیاء ہیں۔ کتے فوج میں بھی تربیت حاصل کرنے کے

بعد بہت اہم خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ فوج کے کھوجی کتے دشمن کی آمد کی اطلاع دے دیتے ہیں۔ وہ چھپے ہوئے جاسوسوں کو سونگھ کر تلاش کر لیتے ہیں۔ کتے میدان جنگ میں گولہ باری کے دوران میں بھی ایک مورچے سے پیغام لے کر دوسرے مورچے تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس کوشش میں وہ مارے بھی جاتے ہیں مگر مالک کا حکم نہیں ٹالتے۔

گھروں کے پالتو جانوروں میں عموماً کتے اور بلیاں ہی پالی جاتی ہیں۔ فیشن ایبل اور مغرب زدہ لوگ تو ہمارے ملک میں بھی کتوں کو اپنے ساتھ بٹھا کر اپنے ہاتھ سے کھانے کی چیزیں کھلاتے ہیں اور ہاتھ دھونا اور پاک کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ ان کے گھروں میں کتے ان کے بچوں کی طرح آزادی سے ہر کمرے اور باورچی خانے میں گھومتے پھرتے ہیں جو کہ ایک ممنوع اور ناپسندیدہ عمل ہے۔ ایک بار ہم ایک معروف ادیب کے گھر گئے۔ ان کی بیگم بھی فن کارہ ہیں۔ دیکھا کہ ڈرائنگ روم کے قیمتی صوفے پر ان کا چھوٹے سائز کا خوبصورت کتا سو رہا ہے۔ ہم بھی اسی صوفے پر بیٹھ گئے کیونکہ میزبان نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ کتن اٹھا کر اپنے پاس رکھنا چاہا تو دیکھا کہ انتہائی قیمتی کیشن اور صوفے کا ایک حصہ کتے کی پوٹی سے ناپاک ہو گیا ہے۔ ہم تو فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

میزبان نے اس کو زیادہ اہمیت نہیں دی، کہا ”آپ اطمینان سے بیٹھیں یہ دھل جائے گا۔“

ہم نے کہا۔ ”یہ جگہ غلیظ ہوگئی ہے۔ بدبو بھی آرہی ہے۔“ وہ ہنسنے لگے۔ ”چلے تو ہم لاؤنج میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ ٹی سو رہا ہے اس کو سونے دیں۔ اس کی نیند خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

مغرب کی طرح سنگ پرستی، اب ہمارے اونچے انگریزی داں طبقے میں بھی عام ہوگئی ہے۔ کتے ایک زمانے میں ہم نے بھی پالے ہیں اور بہت پیار سے پالے ہیں مگر ان لاڈلے کتوں کو بھی کمروں کے اندر آنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ کھانا انہیں ان کی مخصوص جگہ پر اور مخصوص برتنوں میں ہی دیا جاتا تھا۔ البتہ باہر لان میں ان کے ساتھ کھیلنے رہتے تھے۔

اس کے بعد ہاتھ دھو کر پاک کر لیا کرتے تھے۔ مگر کتا ایک محبت کرنے والا جانور ہے۔ وہ کھیل کھیل میں آپ کے اوپر بھی چڑھ جاتا ہے۔ ہیر اور ہاتھ چاٹنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ یہ اس کی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ جب ہم نے

باقاعدگی سے نماز پڑھنی شروع کی تو کتے پالنے چھوڑ دیے کیونکہ وہ محبت میں لپٹتا ہے، چومتا چامٹتا ہے۔ اس طرح کپڑے بھی ناپاک ہو جاتے ہیں۔

اس سے پہلے ہمارے گھر میں مختلف قسم کے پالتو جانور پالے گئے جن کا مختصر تذکرہ ہوگا۔ لیکن سب سے پہلے ہم نے کتے کے نعم البدل کے طور پر خرگوش پالے خرگوش بہت خوبصورت ہوتے ہیں اور ان کے بچے تو اسے پیارے ہوتے ہیں جیسے خوبصورت جاندار کھلونے۔ خرگوشوں کو کتے بلیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے کمروں سے باہر نہیں نکالا جاتا تھا۔ سب سے پہلے جو خوبصورت خرگوش پالا اس کا نام ”پی جو“ رکھا گیا۔ خرگوش کو آپ سدھانیں سکتے۔ وہ ایک آزادی پسند مخلوق ہے۔ آپ اس کو پکاریں تو ضروری نہیں کہ وہ آپ کے پاس آجائے۔ وہ کوئی زبان اور کوئی اشارہ نہیں سمجھتا لیکن جب آپ اس کو پکڑ لیں تو وہ مجبوراً آپ کی گود میں بیٹھ جاتا ہے مگر موقع ملنے ہی فرار ہو جاتا ہے۔

پی جو بہت خوبصورت خرگوش تھا مگر چپ چپ اور انتہائی سنجیدہ رہتا تھا۔ اماں نے بتایا کہ بھئی یہ اکیلا آدم زادوں کے جھرمٹ میں گھبراتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی کوئی سانھی ہونا چاہیے۔

ہم ایک اور خرگوش لے آئے جو اتفاق سے خرگوشی تھی یعنی مادہ۔ اس کا نام ”کی جو“ رکھا گیا ”کی جو“ کے آتے ہی ”پی جو“ کی دلچسپیاں اور کھیل تماشے بڑھ گئے۔ اب وہ دونوں ہر کمرے میں کھیلنے پھرتے تھے، ہمارے پاس بھی آجاتے تھے اور ہماری گود میں بھی بیٹھ جاتے تھے۔ ہم اور سب گھر والوں کے لیے ایک دلچسپ مشغلہ تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ دونوں سارے گھر میں گھومتے اور ہر کمرے میں پیشاب کر دیتے تھے جس کی بدبو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ فینائل اور خوشبو وغیرہ سے یہ بدبودور کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ہم لوگ کوشش کرتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لان میں بیٹھیں۔ اس دوران میں خرگوشوں کے چار بچے ہو چکے تھے، یہ نرم روئی کے رنگین گولوں کی طرح تھے۔ جب لان میں ادھر ادھر بھاگتے تو بہت اچھا لگتا تھا۔

جب کچھ دن بعد بچوں کی تعداد میں چار اور بچوں کا اضافہ ہوا تو ہم سب گھبرا گئے۔ اماں نے بتایا کہ خرگوش بہت زیادہ اور بہت جلدی جلدی بچے دیتے ہیں۔ اماں کی بات بالکل صحیح ثابت ہوئی چونکہ دو ماہ بعد ہمارا گھر خرگوشوں

اور ان کے بچوں سے بھر گیا۔ ہمارے گھر آنے والے خرگوش لینے کی فرمائش کرتے تو ہم فوراً ایک خرگوش ان کو تحفے میں دے دیا کرتے۔ اس طرح ہم نے رفتہ رفتہ ”پی جو“ کے سوا سبھی خرگوش لوگوں میں تقسیم کر دیئے۔

اس سے پہلے ایک واقعہ یہ ہوا کہ اسی زمانے میں ہم نے ایک بہت خوبصورت اور دیوقامت اسٹیشن کتا بھی پال رکھا تھا۔ وہ دن کے وقت عموماً بندھا رہتا تھا کہ کوٹھی سے باہر نہ نکل جائے اور لوگ اسے دیکھ کر خوفزدہ نہ ہوں۔ اس کا نام ”چنٹی“ رکھا گیا تھا۔ ایک دن جب اس کو بچ دیا جا رہا تھا وہ زنجیر سمیت بھاگ کر باہر لان میں آ گیا۔ سارے خرگوش اسے دیکھ کر ڈر گئے اور کوٹھی کے اندر چلے گئے۔ صرف ایک بچہ باقی رہ گیا جو گھاس میں چھپ گیا۔ چنٹی کی نظر پڑی تو وہ اس کی حفاظت کے خیال سے اس کے پاس گیا اور اس ننھے بچے کو اپنے منہ میں اٹھا کر ہم لوگوں کے پاس لا کر بہت احتیاط کے ساتھ منہ سے نکال کر رکھ دیا۔ ہم سب چنٹی کی فرض شناسی دیکھ کر بہت خوش ہوئے لیکن خرگوش کا بچہ مارے خوف کے مرچکا تھا۔ خرگوش بہت نازک دل ہوتا ہے اور ڈر پوک بھی۔ اس وجہ سے بھی ہم نے ”پی جو“ کے سوا تمام خرگوشوں کو تقسیم کر دیا۔ ”پی جو“ سے ہم سب گھر والوں کو بہت محبت تھی۔ وہ تو تنہائی کی وجہ سے اداس رہتا تھا مگر ہم سب خوش تھے۔

ایک دن پی جو ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا دیکھ کر باہر لان میں نکل گیا اور پھر سڑک پر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد پڑوس کے ایک بچے نے آکر بتایا کہ ہمارے خرگوش کو ایک کار نے چل دی ہے۔ باہر سڑک پر پی جو کی خون آلودہ لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہ مرچکا تھا۔ ہم میں سے کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کی لاش کو اٹھاتا۔ اتفاق سے اس وقت مالی موجود تھا۔ اس نے پی جو کو اٹھا کر غسل دیا اور لان میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے اس کو دفن کر دیا۔ ہم سبھی ملکیں تھے اور دیر تک روتے رہے۔ اس روز ہم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ سارے گھر والے پی جو کی موت پر سوگ منا رہے تھے۔ اس کے بغیر ہمیں گھر اور ہر کمرہ خالی خالی اور سنسان نظر آتا تھا۔ لیکن مہر تو آتی جاتا ہے، ہمیں بھی صبر آ گیا۔

ایک سلسلے میں اپنے کتے ”چنٹی“ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ”چنٹی“ کے بارے میں مختلف اوقات میں لکھا جا چکا ہے۔ جب ہم نے اس کو کسی جاننے والے سے تحفے کے طور پر لیا تو اس کی عمر صرف بیس پچیس روز تھی۔ اس کو فیڈر

(بوتل) کے ذریعہ دودھ پلا کر پالا گیا۔ یہ بہت ہی خوبصورت اور قدآور اسٹیشن نسل کا کتا تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے وہ بڑا ہوتا گیا۔ اس کے قد کاٹھ میں اضافہ ہوتا رہا۔ پانچ چھ ماہ کی عمر میں وہ ایک سال کی عمر کے کتے کے سائز کا ہو گیا تھا۔ ہمارے جاننے والے جو بلا وجہ اس سے ڈرتے تھے کہتے تھے کہ بھائی۔ آپ نے کتا پالا ہے یا گدھا؟ یہ تو بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس کے قد کو روکنے کی ترکیب کرو۔

”چنٹی“ دراصل بھینس کا دودھ پی کر پلا تھا اس لیے وہ بھینس کے سوا ہر جاندار مخلوق پر بھونکتا اور اس کو ڈرانا اپنا حق سمجھتا تھا۔ ہمارا پرانا دودھ والا جب بھی دودھ دینے کے لیے آتا تو چنٹی اس پر بے حد ناراض ہوتا۔ غصے کا اظہار کرتا۔ بھونکتا اور اپنی زنجیر تڑانے کی کوشش کرتا تھا حالانکہ باقی سب پرانے ملازمین سے ”چنٹی“ مانوس تھا۔

اماں کہا کرتی تھیں کہ تم نے اس کو ملاوٹ شدہ دودھ پلایا ہے اس لیے یہ تم سے ناراض رہتا ہے۔ شاید اماں کی یہ بات سچ ہی تھی چونکہ کوٹھی میں بار بار آنے والے یا وہاں کام کرنے والے لوگوں سے ”چنٹی“ کی دوستی تھی اور وہ بھی ان پر ناراض نہیں ہوا۔

اس وقت ہم نماز تو پڑھتے تھے مگر گنڈے دن، چنٹی کو ہم سے اتنی محبت تھی کہ اگر وہ کھلا ہوتا تھا تو رات کو جس وقت ہم ایک فرلانگ کے فاصلے پر بس سے اترتے تھے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا اور اچھل کود کرنے لگتا۔ رات گئے اس کو آواز بھی کر دیا جاتا تھا۔ لہذا وہ ہمارے استقبال کے لیے کوٹھی سے باہر کھڑا دم ہلاتا نظر آتا تھا۔ ہم کو دیکھتے ہی وہ دم ہلاتے ہوئے ہماری طرف لپکتا۔ ہم سیلف ڈیفنس کی کوشش کرتے مگر وہ دونوں ہاتھ ہمارے کاندھوں پر رکھ کر محبت سے آوازیں نکالتا۔ اس کی کوشش تو یہی ہوتی تھی کہ ہمارا منہ چاٹ لے مگر اس کی یہ کوشش ہم نے کبھی کامیاب نہیں ہونے دی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے وزن سے ہم بمشکل خود کو سنبھالتے تھے اور کئی بار تو گر بھی جاتے تھے مگر رات گئے کوئی دیکھنے اور مذاق اڑانے والا نہیں ہوتا تھا اس لیے عزت محفوظ رہتی تھی۔

اس کے بعد کوٹھی کے اندر برآمدے میں داخل ہونے تک ”چنٹی“ اظہار محبت کرتا ہوا ہمارے ساتھ ساتھ چلتا اور محبت بھری آوازیں نکالتا رہتا تھا۔ کبھی ٹانگوں میں گھس کر ہمیں گرانے یا روکنے کی کوشش کرتا تو کبھی واری صدفے



چار پائی کے نیچے چاہتا بیٹھ جاتا۔ اماں کو بھی اس کے چار پائی کے نیچے بیٹھنے پر اعتراض نہیں تھا لیکن زیادہ دیر تک وہ یہ برداشت نہیں کرتی تھیں اور اس کو ڈانٹ کر کہتیں ”چنکی“۔ بس اب میری چار پائی کے نیچے سے جاؤ تاکہ فرشتے مجھ سے دور نہ رہیں۔

اماں کو فرشتوں کی ہمیشہ فکر رہتی تھی اسی لیے وہ گھر میں کتے پالنے کی سخت مخالف تھیں لیکن ہم سب کے اصرار بلکہ ضد کے آگے مجبور تھیں۔ چنکی دراصل ہم سے بھی زیادہ ہمارے بچھے بھائی نعمان بھائی سے مانوس تھا۔ وہ اس کو تھکپتے اور پیار تو نہیں کرتے لیکن اس کی خدمت بہت کرتے تھے۔ اس کو کھانا دینا، دودھ دینا، اسے نہلانا اور شام کو اسے زنجیر سے باندھ کر باہر سڑک پر نہلانے کے لیے لے جانا ان کے فرائض میں داخل تھا۔ نعمان بھائی جب اس کو نہلانے کے لیے کوٹھی سے باہر لے جاتے تو اس کے بعد ”چنکی“ کی مرضی چلتی تھی۔ وہ جس طرف جاتا نعمان بھائی اس کی زنجیر تھا۔ ہوائے اسی طرف چل پڑتے۔ اگر وہ کسی کو ڈرانے یا دوسرے کتے پر حملہ کرنے کی کوششیں کرتا تو نعمان بھائی کوشش کے باوجود اس کو روک نہیں سکتے تھے چونکہ ”چنکی“ بہت زیادہ طاقتور تھا۔ ادھر نعمان بھی اسے روکنے کے لیے زور لگاتے ادھر ”چنکی“ دوسری طرف جانے کے لیے زور لگاتا، کمزور اور دھان پان سے نعمان بھائی بھلا چنکی کو کیسے روک سکتے تھے اس لیے وہ اس کے ساتھ کھینچے کھینچے چلے جاتے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ چنکی کو نہیں ٹھہرا رہے، چنکی ان کو ٹھہرا رہا ہے۔ ہم نے بھی ایک دو بار چنکی کو نہلانے کی کوشش کی مگر دراصل وہی ہم کو ٹھہراتا رہا۔ ہمارے زور لگانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ ہمیں زبردستی جس طرف چاہے لے جاتا تھا۔ ہمارے پڑوسی یہ منظر دیکھ کر ہنستے اور ہمارا مذاق اڑاتے تھے۔ نہ جانے چنکی کو کیسے پتا چل جاتا تھا کہ وہ لوگ ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں۔ وہ ناراض ہو کر ان پر خوفناک انداز میں بھونکتا اور ان پر حملہ کرنے کی کوشش کرتا تو چند لمحوں میں ہی میدان صاف ہو جاتا تھا۔

چنکی کسی دوسرے کتے کو دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چھوٹے سائز کے کتے تو اس کو دیکھتے ہی مودبانہ انداز میں اپنی وفاداری کا اظہار کرتے اور دم ہلاتے رہتے۔ وہ ڈر کے مارے بھاگتے بھی نہیں تھے۔ جس جگہ ہوتے وہیں بیٹھ کر دم ہلانے لگتے تھے۔ چنکی ان کی تابعداری سے بہت خوش ہوتا تھا۔ ان کے پاس جا کر انہیں سوگھتا اور پھر

جانے کی کوشش میں ہمیں روکنے کی کوشش کرتا تھا۔ ہم اس کو اپنے لباس اور جسم سے دور رکھتے تھے لیکن کوٹھی کے برآمدے میں سیر میز پر بیٹھ کر پانچ دس منٹ اس کو تھپکتا اور چمکارتا ضروری ہوتا تھا۔ چنکی کو کمروں کے اندر جانے کی اجازت نہیں تھی اور وہ اس پابندی کی مکمل پاسداری کرتا تھا۔ البتہ رات گئے جب ہم اوپر کی منزل پر اپنے کمرے میں سونے کے لیے جاتے تھے تو چنکی دروازے کے پاس آکر پیار بھری آوازیں نکالتا تھا جن سے متاثر ہو کر ہم دروازہ کھول دیا کرتے تھے، چنکی اس وقت تک کافی پرسکون ہو جاتا تھا۔ وہ کمرے میں گھومتا پھرتا۔ ہر چیز کو سوگھتا اور پھر فرش پر ہمارے بستر کے پاس بیٹھ جاتا۔ ہم رات گئے تک لیمپ کی روشنی میں پڑھتے رہتے تھے اور چنکی اس دوران میں آتا جاتا رہتا تھا۔ ہم اوپر کے میز سے کاغذ کی گیند بنا کر نیچے پھینکتے تو چنکی فوراً اس کے پیچھے نیچے چلا جاتا تھا اور گیند لے کر پھر واپس آ جاتا تھا۔ کچھ دیر یہ ٹھیل جاری رہتا تھا جس کے بعد ہم اور چنکی دونوں اکتا جاتے تھے۔ ہم کہتے ”چنکی، نیچے جاؤ، لان میں اور سڑک پر جا کر حفاظت کرو۔“ ”گڈ نائٹ“ رات کے وقت سڑک پر سائیکل سواروں اور پیدل راہ گیروں کو ڈرانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ یہ اس کی تفریح تھی مقصد نقصان پہنچانا نہیں تھا۔

چنکی نیچے چلا جاتا تھا۔ ہمارے کمرے کو جانے والی میزھیاں صحن کے اندر سے اوپر جاتی تھیں اس لیے دوسرے گھر والے ہم دونوں کی ان مصروفیات سے ناواقف رہتے تھے لیکن اتنا سب جانتے تھے کہ ”چنکی“ اوپر ہمارے کمرے کے اندر بھی آ جاتا ہے۔ اس کمرے کے سوا ”چنکی“ نے بھی گھر کے کسی دوسرے کمرے کے اندر قدم تک نہیں رکھا۔ برآمدے میں آنے پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ ”چنکی“ وہیں بیٹھا دم ہلاتا اور ہر ایک کو مخاطب کر کے اظہار محبت کرتا رہتا تھا۔ ہمارے سوا کوئی اور اس کو تھپکتا اور پیار بھی نہیں کرتا تھا اس لیے اس کی تمام تر محبت ہمارے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھی۔

گرمی کے موسم میں صحن میں سرشام چھڑکاؤ کر دیا جاتا۔ چار پائیاں بچھ جاتیں جن پر سفید چادریں اور سفید غلافوں والے تنکے رکھ دیے جاتے تھے۔ چکھے لگ جاتے تھے۔ شام کے بعد سب لوگ (ہمارے سوا) اس صحن میں سوتے تھے۔ چنکی کے لیے گرمی کا موسم اس لیے بہت دلکش تھا کہ وہ رات کو ہر چار پائی کے گرد چکر لگاتا رہتا تھا۔ جس

تھپکا اور پیار سے سہلایا۔ چنکی نے ایک بار آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ایسا لگا جیسے وہ ہم سب کی محبت اور دیکھ بھال کا شکر یہ ادا کر رہا ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ سب لوگ دیر تک روتے رہے۔ ہم تو دس بارہ دن تک اسی غم میں تڑھال رہے۔ رفتہ رفتہ صرف چنکی کی باتیں یہ گئیں۔ چنکی چلا گیا، مگر اس کی یاد آج بھی دل میں ہے۔ چنکی بہت خوبصورت اور کھلڈراکتا تھا۔ اس کے بے شمار واقعات ہیں۔ اس جیسا شاندار، وجیہ اور خوبصورت کتا ہم نے نہیں دیکھا۔ اس کی وجاہت، طاقت اور خوبصورتی ہی اس کی موت کا سبب بن گئی۔ اگر وہ ایک عام اسیشن کتا ہوتا تو دوسرے کتے اس سے حسد نہ کرتے اور نہ ہی اس کے خلاف متحدہ محاذ بناتے۔

ہم نے اس کے بعد کتے پالنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ باقاعدگی سے نماز پڑھنی شروع کر دی تھی اس لیے پاکی اور ناپاکی کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اماں کا چند سال بعد انتقال ہو گیا تھا مگر بچپن سے انہوں نے جو نصیحتیں کی تھیں وہ آج بھی ہمیں خصوصاً پاکی اور ناپاکی کے بارے میں ان کی ہدایات یاد ہیں۔ بچپن ہی سے ہوش سنبھالنے کے بعد اماں نے ہمیں تربیت دینی شروع کر دی تھی جس کی بنیاد گناہ اور ثواب پر ہوتی تھی۔

”دیکھو بیٹا، بلاوجہ نلکے کا پانی نہ بہایا کرو۔ یہ گناہ ہوتا

نیازی سے آگے بڑھ جاتا۔ بڑے سائز کے کتے کو دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو کر آمادہ جنگ ہو جاتا تھا۔ چنکی سے بڑے سائز کا کتا تو ہم نے کبھی دیکھا نہیں مگر دوسرے قد آور کتے تو دیکھے تھے۔ اگر مقابل کتا اکیلا ہوتا تو فوراً اطاعت کا اظہار کر کے دم ہلانا شروع کر دیتا تھا لیکن اگر تین چار کتے اکٹھے ہو جاتے تو وہ فساد پر آمادہ ہو جاتے تھے اور سب مل کر اس پر حملہ آور ہو جاتے تھے۔ ان کی خونخوار آوازوں سے اتنا زیادہ شور مچتا تھا کہ پاس پڑوس کے لوگ بھی بیدار ہو جاتے۔ ہمارے گھر سے فوراً کوئی ایک موٹا سا ڈنڈا لے کر باہر نکلتا اور حملہ آور کتوں کو بھگا دیتا تھا۔ کبھی کبھی اس جنگ میں چنکی زخمی بھی ہو جاتا تھا اور بالآخر یہی ڈنڈا فساد اس کی موت کا سبب بنا۔ ایک بار وہ اتنا زیادہ زخمی ہو گیا کہ علاج کے باوجود صحت مند نہ ہو سکا۔ زخموں میں انفیکشن ہونے کے باعث اس کی تکلیف اور بیماری بڑھتی رہی یہاں تک کہ اس نے گھر سے باہر نکلتا بھی چھوڑ دیا۔ چپ چاپ بڑا رہتا تھا۔ اس زمانے میں اماں بھی فرشتوں کی آمد و رفت کو بھول کر چنکی پر ترس کھانے لگی تھیں۔ بہت علاج معالجہ کرایا، انجکشن لگوائے مگر چنکی کی حالت نہ سدھر سکی اور اسی تکلیف کی وجہ سے ایک دن وہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس روز ہمارے گھر میں سوگ کا سماں تھا، سب چنکی کے آس پاس اکٹھے تھے۔ ہم نے اس کو

ہے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ دنیا میں کتنے بہت سے لوگ ہیں جو پانی کی ایک ایک بوند کے لیے ترستے ہیں، اس لیے ہمیں چاہیے کہ بانی ضائع نہ کریں۔“

”فضول خرچی اللہ کو پسند نہیں ہے۔ جب بھی کمرے یا غسل خانے سے باہر جاؤ تو روشنی بجھا دینی چاہیے۔ جب ضرورت ہو پھر جلا لو۔ ہمیں دوسرے لوگوں کے لیے بجلی بچانی چاہیے۔“

حالانکہ اس زمانے میں لوڈ شیڈنگ کا تصور تک نہ تھا۔ آج لوڈ شیڈنگ کے زمانے میں بھی بہت سے لوگ خوا خواہ بجلی ضائع کرنے سے باز نہیں آتے، خوش قسمتی سے ہمارے گھر میں سوئی گیس ہمیشہ آتی رہی جبکہ پڑوسیوں کو بھی شکایت رہی کہ ان کے گھر میں گیس بہت کم اور تھوڑی دیر کے لیے آتی ہے۔ اس بار لاہور میں بہت زیادہ سردی پڑی۔ ہم نے بھی ضرورت کے وقت گیس کا بیٹر استعمال کیا مگر جب کمر گرم ہو جاتا تو بیٹر بند کر دیتے۔

ہمارے نواسہ نواسی کہتے۔ ”پاپا، بیٹر بند نہ کرایے۔ ہمیں اچھا لگتا ہے۔“

”دیکھو بیٹا۔ بے شمار لوگ ہیں جنہیں کمی کی وجہ سے گیس ملتی ہی نہیں ہے یا بہت کم ملتی ہے، اگر ہم گیس بچائیں گے تو یہ گیس دوسروں کے کام آجائے گی۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں پاپا، بلا وجہ گیس ضائع کرنا بھی تو گناہ ہے۔“

ہمارے کانوں میں اماں کی آواز گونجنے لگتی۔ اللہ جنت نصیب کرے۔ ان کی بتائی ہوئی باتیں ہم نے اپنی بچیوں کو سکھائیں جنہوں نے یہ اپنے بچوں کو سکھائیں۔ اس طرح صدقہ جاریہ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

جی تو چاہتا تھا کہ کوئی پالتو جانور پالیں مگر سوچ کر رو جاتے تھے۔ ایک بار کوشی کے ایک حصے میں انیکسی کی تعمیر ہو رہی تھی۔ ریت، سینٹ، ملہا اور اینٹیں پڑی رہتی تھیں۔ ہماری کوشی کا گیٹ دن رات چوہ پٹ کھلا رہتا تھا۔ اس زمانے میں ماڈل ٹاؤن میں چوریوں کا تصور تک نہیں تھا۔ لوگ اپنے گھروں کو مقفل کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

کاریں لاک کیے بغیر کوشیوں کے اندر اور باہر سڑک پر کھڑی رہتی تھیں۔ کسی قسم کا خطرہ نہیں ہوتا تھا۔ ایک بار غالباً 1982ء میں ہم ٹرین کے ڈریلے فیصل آباد گئے تو ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ہی ایک سڑک پر اپنی کار لاک کر کے کھڑی کر دی اور ٹرین میں بیٹھ کر فیصل آباد چلے گئے۔

تین دن بعد واپس آئے تو کار اسی جگہ کھڑی ہوئی تھی۔ صرف یہ ہوا تھا کہ زیادہ ٹریفک کی وجہ سے وہ خاک و حول میں اٹی ہوئی تھی۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ اب تو دنیا ہی بدل گئی ہے۔ تالے لگانے کے باوجود کاریں چوری ہو جاتی ہیں گھروں کے اندر بھی نہ جان محفوظ ہے نہ مال۔ کسی سڑک پر چند منٹوں تک بغیر ڈرائیور کے کار کھڑی کر دیں تو پولیس کی گاڑیاں اسے گھیر کر کھڑی ہو جاتی ہیں کہ کہیں یہ کسی دہشت گرد کی کارستانی تو نہیں ہے جو کار کے اندر بم رکھ کر چلا گیا ہے۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دنیا میں کتنے انقلابات آئے اور کیسی کیسی تبدیلیاں ہو گئیں۔ لاہور شہر کا تو حلیہ ہی بدل گیا ہے۔ جن علاقوں، بازاروں، سڑکوں پر ساری زندگی گزاری ہے اب وہ جگہیں پہچانی نہیں جاتیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کس شہر میں اور کہاں آ گئے ہیں؟ اور کہاں جا رہے ہیں؟

ایک روز بچوں میں بہت زیادہ جوش و خروش دیکھ کر اس کا سبب جاننے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ بلے کے ڈھیر پر ایک کتاب کتیا بیٹھی ہوئی ہے۔ ہم بھی فوراً موقع پر پہنچے۔ یہ دراصل کتیا تھی اور اپنے آس پاس اکٹھے ہونے والے بچوں کو دیکھ کر بہت محبت سے دم ہلا رہی تھی، اس کا رنگ براؤن تھا مگر سفید وجہوں نے اس کو بہت خوبصورت بنا دیا تھا۔ بالوں کا رواں لمبا اور گھٹنا تھا۔ دم بھی بہت موٹی تھی۔ سب سے زیادہ خوبصورت اس کا چہرہ تھا۔ یہ چھوٹے سائز کی روکی نسل کی کتیا تھی۔ کسی اچھے گھرانے میں پلنے والی نظر آتی تھی۔ اس کا چہرہ چھوٹا سا اور مخروطی تھا۔ آنکھوں کا رنگ ہلکا گلابی تھا۔ مختصر یہ کہ یہ بہت خوبصورت کتیا تھی جو دیکھنے میں ایک مھلونا لگتی تھی۔

بچوں کا اصرار تھا کہ اس کو پال لیا جائے۔ ہم نے کہا کہ یہ کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھنے والی نظر آتی ہے۔ شاید راستہ بھول کر یہاں چلی آئی ہے۔ کسی دوسرے کے پالتو جانور کو ہم کیسے پال سکتے ہیں؟

بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ فی الحال اس کو رکھ لیا جائے۔ اگر کوئی اس کی تلاش میں آئے تو اس کے حوالے کر دیا جائے لیکن اتفاق سے کبھی کوئی اس کا دعویٰ نہیں آیا۔ اس طرح وہ ہماری پالتو کتیا ہو گئی۔ دوسرا مرحلہ اس کے نام کا انتخاب تھا۔ اس زمانے میں ہالی ووڈ کا ایک مزاحیہ پروگرام ”لوسی“ ٹیلی وی پر دکھایا جاتا تھا۔ اس کی ہیروئین کا نام ”لوسی“ تھا۔ اس نام پر سب کو اتفاق تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسی زمانے میں ”لوسی“ نام کی ایک ذہین کتیا کا پروگرام بھی

بچوں کو بے حد پسند تھا۔ اس طرح لوسی کو ہم نے اپنا لیا۔ اماں وفات پا چکی تھیں مگر ان کی ہدایات پر مکمل عمل کیا گیا اور لوسی کو گھر کے کمروں کے اندر آنے بلکہ گھر کے صحن میں آنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔ زیادہ سے زیادہ وہ برآمدے میں آ سکتی تھی۔ برآمدے میں ایک دروازہ تو ہمارے بیڈ روم کا تھا اور دوسرا ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا۔ لوسی کے لیے بڑے بڑے سرسبز لان کافی تھے۔ وہ سارے دن لانوں میں بھاگتی دوڑتی رہتی تھی۔

لوسی کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ہمارے اوپر چڑھ کر اظہار محبت کرے مگر ہم نے اس کو یہ موقع نہیں دیا۔ کبھی بہت لاڈ آتا تو لان میں اس کا سر تھپک دیتے اور نرم بالوں پر ہاتھ پھیر کر اس کو خوش کر دیتے تھے۔ اس کے بعد فوراً صابن سے ہاتھ دھو لیا کرتے تھے۔ بچوں کو بھی ہدایت تھی کہ لوسی کو اپنے لباس سے دور رکھیں اور اس کو پیار کرنے کے بعد صابن سے ہاتھ دھو لیا کریں۔

لوسی کو بہت جلد احساس ہو گیا تھا کہ اس کی حدود کیا ہیں۔ اس نے بھی ان حدود کو عبور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ برآمدے کے کھٹنے فرش پر دروازے کے سامنے بیٹھ کر وہ پیار بھری آواز میں نکالتی اور کھسکتی ہوئی دروازے کے بالکل نزدیک آ جاتی تو اس کو ڈانٹ پڑ جاتی تھی۔ وہ وہیں رک کر دم ہلاتی رہتی تھی، اس کی خواہش اور کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ زیادہ تر انسانوں کے درمیان ہی رہے۔

لوسی کو بچوں نے سرکس کے جانوروں کی طرح تربیت دینے کی کوشش بھی کی مگر وہ کوئی کر تہ نہ سیکھ سکی۔ البتہ کچھ دیر کے لیے چہرہ اٹھا کر پچھلے دو پیروں پر کھڑی ہو جاتی تھی اور جب دیکھنے والے تالیاں بجاتے تو وہ بھی خوش ہو کر بھونکتی تھی۔

گیند پھینک کر اس کو اٹھا کر لاتا بھی لوسی کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ ہم نے یہ بھی کوشش کی کہ وہ سیراغرسانی کا گریکھ لے۔ اس کو کسی بچے کی فیص سونگھائی جاتی اور پھر سب بچے ایک ایک کر کے اس کے سامنے سے گزرتے۔ جس بچے کی فیص وہ سونگھتی تھی جب وہ سامنے آتا تو لوسی فوراً دوڑ کر اس کے پاس پہنچ جاتی اور اس پر چڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔ لوسی جب کوئی اچھا کام کرتی تھی تو اس کو انعام کے طور پر بسکٹ کھلائے جاتے تھے۔ لوسی کو برآمدے میں سے اخبارات، اٹھا کر لانے کی بھی تربیت دی گئی مگر لینی نے اس کی سخت

ٹنگسٹن

740 واں عنصر، نقطہ پگھلاؤ 3410 سینٹی

گرید، ایک خاکستری رنگ کی بہت سخت دھات۔ یہ ولفرمیٹ، شیلٹ (Scheelite) اور ہویرٹائٹ معدنیات کے ساتھ پائی جاتی ہے، اسے فولاد میں ملا یا جاتا ہے تاکہ وہ بہت زیادہ مضبوط بن جائے۔ یہ کانٹے والے اوزاروں اور بجلی کے تقفوں میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے نمکیات رنگ و روغن اور چڑا رنگنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اسے سب سے پہلے 1781ء میں سویڈن کے سائنس دان کارل شیلے نے شیلٹ کے خام میں سے پہچانا تھا۔ اسے 1783ء میں ہسپانوی کیمیا دان ڈیل ہو یار (1755-1833) اور اس کے بھائی یوان جوز (1754-1796) نے علیحدہ کیا تھا۔

مرسلہ: زاہد خان، ٹیکسلا

مخالفت کی۔ ان کا کہنا تھا کہ جب وہ اخبار اٹھاتی ہے تو اس کے منہ کا لعاب بھی اخبار پر لگ جاتا ہے اور اخبار ناپاک ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ کام اس سے نہ کرایا جائے۔ رفتہ رفتہ لوسی ہم سب کی ڈرائنگ ہو گئی۔ لینی اس کے کھانے پینے کا بہت خیال رکھتی تھیں اور اس کو بھاگتے دوڑتے اور اچھلتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھیں۔ شام کو جب ہم دونوں ٹہلنے کے لیے باہر سڑک پر جاتے تو لوسی ہمارے ساتھ ساتھ چلتی تھی مگر ایک مخصوص حد سے آگے نہیں بڑھتی تھی، یہ اس کا معمول تھا۔

ہمارے سامنے والی کوشی میں ایک السیشن کتا تھا۔ وہ بالکل بے ضرر تھا۔ یہاں تک کہ بھونکنے میں بھی بہت سست تھا۔ رات کو اسے کھول دیا جاتا تھا اور وہ خاموشی سے سڑک پر گھومتا پھرتا تھا۔ وہ اس قدر بے ضرر تھا کہ شاید چور بھی آجائے تو اس کو دیکھ کر دم ہلا کر ”ویل کم“ کرتا لیکن اس کی نوبت نہیں آئی، لیکن لوسی کے ساتھ اس کی بہت دوستی تھی، وہ دونوں آپس میں کھیلتے رہتے تھے۔ پڑوسیوں کے کتے کا نام ٹائیگر تھا لیکن اس میں ٹائیگر والی کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ اگر شیروں کو معلوم ہو جاتا کہ ایسے بے ضرر کتے کا نام ٹائیگر ہے تو شاید وہ یا تو ٹائیگر کا نام بدلوادیتے یا خود اپنا نام بدل لیتے۔

لوسی کی ایک دلچسپ عادت یہ تھی کہ اگر کبھی ہڈی اس



ہوتا رہا۔ وہ گھر کی پہلی اور دوسری منزل پر چھلانگیں لگاتا اور دوڑتا پھرتا تھا۔ کتوں کے مقابلے میں اس میں وفاداری کا بھی کوئی نام و نشان نہ تھا۔ نہ تو وہ بلانے پر آتا اور نہ ہی کسی بات سے منع کرنے پر باز آتا۔ بس جو اس کے جی میں آتی کرتا رہتا۔ اس کو محبت کا اظہار کرنے یا کراہنے کے لیے بھی ہم لوگوں کے پاس آنے کی عادت نہیں تھی۔ اگر کوئی اس کو پیار بھی کرنا چاہتا اور اس کی مرضی نہ ہوتی تو وہ ان سنی کر کے دوسری طرف نکل جاتا تھا مگر چیکو کی وجہ سے گھر میں بہت رونق ہو گئی تھی۔ بچوں کی طرح ہر وقت اس پر نظر رکھی جاتی اور اس کی شرارتوں کا حال ایک دوسرے کو سنایا جاتا۔ یوں تو وہ بلانے پر بھی پاس نہ آتا تھا لیکن اگر کوئی نماز پڑھتے ہوئے سجدے میں جائے تو وہ کود کر اس کے سر پر سوار ہو جاتا تھا۔ نماز پڑھتے ہوئے شہادت کی انگلی اٹھاؤ تو وہ انگلی پر چھلانگ لگا دیتا تھا۔ سجدے میں جانے والوں کو بہت ہوشیار رہنا پڑتا تھا چونکہ انگلی کے حرکت میں آتے ہی چیکو انگلی پر حملہ کر دیتا تھا۔ اس کی خوراک تو مناسب تھی مگر وہ صرف اپنی پسند کی چیزیں ہی کھاتا تھا۔ اس نے خود تو کبھی اپنی پسندیدہ غذا کے بارے میں نہیں بتایا تھا اس لیے مختلف اشیاء گھر کے ہر حصے میں اس کے لیے مختلف طشتریوں اور پیالیوں میں رکھ دی جاتی تھیں۔ لاؤنج میں ایک دودھ کا پیالہ رکھا ہوا ہے۔ ایک اور پیالے میں دودھ اور ٹیل روٹی کے ٹکڑے ہیں۔ ایک پیالے میں بوٹی اور توس کا آمیزہ رکھا ہے۔ ایک طشتری میں کچھ دور کے فاصلے پر چکن کی بوٹی رکھی ہوئی ہے۔ اس طرح چیکو صاحب کے لیے چھ سات مختلف

لیں۔ ٹائیگر کو ایک کپڑے کی تھیلی میں لپیٹ کر لایا گیا تھا جوں ہی اس کو تھیلی سے باہر نکالا گیا اس نے سارے گھر میں بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ وہ ایک انتہائی شوخ و شریر اور کھلڈرا تھا۔ ہر وقت چھلانگیں لگاتا رہتا تھا۔ اس کو یہ احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کسی اور گھر میں آ گیا ہے۔ اس کی عادت تھی کہ جو بھی چیز حرکت کرتی نظر آتی اس پر جھپٹ پڑتا تھا۔ اس کو بوٹی ٹرینڈ کر دیا گیا تھا۔ ہم نے دوسری منزل پر ایک غسل خانے کو اس کا ہاتھ روم بنادیا اور اس کو عادت ڈالی کہ جب ضرورت محسوس ہو وہ اوپر والے غسل خانے میں جا کر اسے ٹائیکٹ کے طور پر استعمال کرے۔ طارق میر، ان کی تنظیم طلعت، بیٹے زیاد اور بیٹی افزا سے ٹائیگر کی جدائی کا منظر شدید جذباتی قسم کا تھا مگر اس کو لندن لے جانا ممکن نہ تھا اس لیے پچھتم نم اس کو لاہور میں ہمارے حوالے کر دیا گیا۔ طارق میر کے جانے کے بعد ٹائیگر کی اچھل کود اور شرارتوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ ان میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”ٹائیگر“ نام ہمارے خیال میں ایک بلبے کے لیے مناسب نہ تھا اس لیے اس کے لیے دوسرا نام سوچا گیا۔ ہماری تجویز پر بلبے کا نام ”چیکو“ منتخب کر لیا گیا۔ چند دن کے بعد چیکو بھی اپنے نام سے مانوس ہو گیا، یہ اور بات ہے کہ بلیوں کی عادت کے مطابق وہ کبھی پکارنے کی پروا نہیں کرتا تھا۔ صرف دونوں کان کھڑے کر کے اپنا نام سنتا مگر اسی جگہ بیٹھا رہتا تھا۔

عمر کے ساتھ ساتھ چیکو کی شرارتوں میں بھی اضافہ

آئی۔ ہم واپس آئے تو معلوم ہوا کہ لوسی ابھی تک گھر واپس نہیں آئی ہے۔ اس کو بہت تلاش کیا پڑوسیوں سے دریافت کیا لیکن کوئی پتا نہیں چلا۔ رات گئے تک لپٹی اور ہم کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکتے رہے کہ شاید لوسی واپس آ جائے۔ دو تین دن تک اس کا انتظار کرتے رہے۔ نگاہیں اس کو تلاش کرتی رہیں مگر وہ لوٹ کر واپس نہ آئی یہاں تک کہ ہم اس کی واپسی سے ناامید ہو گئے مگر پھر بھی کئی ہفتے تک اس کے منتظر رہے۔

لوسی کی گمشدگی کے بعد ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اب کوئی پالتو جانور نہیں رکھیں گے مگر قسمت کے لکھے کو کون بدل سکتا ہے۔ ہمارے بھانجے طارق میر نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ لندن سے واپس پاکستان آ کر لاہور میں قیام کریں گے۔ یہ 1967ء کا ذکر ہے۔ طارق نے پہلے ماڈل ٹاؤن میں اور اس کے بعد چھاؤنی میں ایک کوشی کرائے پر حاصل کی اور وہاں رہائش پذیر ہو گئے۔ طارق کے بڑے بیٹے زیاد کی عمر ہماری بڑی بیٹی نادیہ کے برابر تھی۔ بیٹی افشا کی عمر یاد سے قریب تھی اس لیے یہ بچے مل جل کر کھیلتے رہتے تھے۔ جب ہم لندن جاتے تو طارق میر کے پاس ہی قیام کرتے تھے۔ کئی بار ہم فلم یونٹ کے ساتھ بھی گئے مگر طارق میر نے ہمیں یونٹ کے ساتھ نہ ٹھہرنے دیا، اس طرح یہ بچے ابتدا ہی سے ایک دوسرے کے دوست اور ہم جولی تھے۔ طارق اپنے کاروبار کے سلسلے میں لندن جاتے رہتے تھے اور زندگی میں ایک سلیقہ اور ٹھہراؤ آ گیا تھا کہ قدرت نے ایک بار پھر سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔ اس زمانے میں انگلستان میں پراپرٹی کا کاروبار بہت خراب ہو گیا اور طارق میر کو اپنی فیملی کے ساتھ مجبوراً واپس لندن جانا پڑا۔

ہمارے لیے بلکہ ہمارے سارے خاندان کے لیے یہ ایک گہرا صدمہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ طارق اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن گئے تو پھر وہیں آباد ہو گئے تھے مگر پھر وطن کی محبت نے انہیں واپس پاکستان آنے پر اکسایا۔ انہوں نے اپنا سامان سمیٹا اور واپس جانے کی تیاری کر لی۔ ایک دن وہ ہمارے گھر آئے تو ایک بلی کا بچہ بھی ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے بتایا کہ یہ بچہ خود ہی ہمارے گھر آ گیا تھا جسے بچوں نے گھر میں رکھ لیا۔ اس کا نام ”ٹائیگر“ رکھا گیا تھا۔ جب وہ ہمارے گھر آیا تو بمشکل ڈیڑھ دو ماہ کی عمر ہوئی۔ طارق اینڈ فیملی کا کہنا تھا کہ بلی کے اس بچے کو ہم رہ

کے ہاتھ آ جاتی تو وہ دیر تک اس ہڈی کو چباتی رہتی تھی اور پھر حفاظت کے لیے بچوں سے ملبا کھو کر اس کو دفن کر دیتی تھی۔ اس پاس کے درختوں پر بیٹھے ہوئے کوے شاید اسی تاک میں رہتے تھے۔ جیسے ہی وہ ہڈی کو دفن کر کے پیچھے ہٹی تھی کو آ کر اس کو اٹھا کر لے جاتا تھا۔ لوسی کوے کو پکڑنے کے لیے بہت اچھلتی اور چھلانگیں لگاتی مگر کوے تک رسائی نہیں ہوتی تھی، کوؤں کی اس نامعقول حرکت کے باعث وہ تمام پرندوں کی دشمن ہو گئی تھی۔ لان میں مختلف قسم کے پرندے آتے رہتے تھے۔ لوسی انتقاماً ان سب کے اوپر لپکتی تھی اور وہ اڑ جاتے تھے۔ ان پرندوں میں کچھ پرندے بہت خوبصورت اور نازک بھی ہوتے تھے جنہیں دیکھ کر اللہ کی قدرت یاد آ جاتی تھی۔ لپٹی کے ساتھ ہم ان رنگ برنگے پرندوں کو دیکھ کر بہت لطف اندوز ہوتے تھے مگر لوسی کی وجہ سے اب پرندے ہمارے لان میں آ کر نہیں بیٹھتے تھے۔ نہ کوئل، نہ ہد ہد، نہ فاختہ، نہ کیوتر اور نہ ہی دوسرے رنگ برنگے پرندے۔

ہم نے لوسی کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ دیکھو لوسی، تمہاری ہڈی تو کوے لے کر جاتے ہیں، تم دوسرے تمام پرندوں کی دشمن کیوں بن گئی ہو؟ مگر یہ بات لوسی نہ سمجھ سکی۔

لوسی کی آمد کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ادارہ بلیوں نے ہماری کوشی میں آنا اور آپس میں لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیا تھا۔ جوں ہی لوسی کو بلی نظر آتی وہ اس پر بھونکتی ہوئی جھپٹتی تھی۔ بلی دیوار پر یا درخت پر چڑھ جاتی تھی اور لوسی اچھل اچھل کر بھونکتی رہ جاتی تھی۔ وہ کافی دیر تک اپنی نازک آواز میں بھونکتی رہتی اور بلی اوپر چڑھی اطمینان سے بیٹھی یا سوتی رہتی تھی۔ ایک فائدہ یہ ہوا تھا کہ بلیوں نے اکٹھا ہونا اور آپس میں لڑنا جھگڑنا ترک کر دیا تھا۔

لوسی ایک اعتبار سے ہمارے گھر کا ایک رکن بن گئی تھی۔ اس کی وجہ سے چنگی کی طرح نہ تو کبھی کوئی شکایت ملی اور نہ کوئی اس سے خوفزدہ ہوا۔ وہ ایک خوبصورت کتیا تھی اس لیے ہم اس کی حفاظت بھی کرتے تھے کہ کہیں کوئی اسے اٹھا کر نہ لے جائے اس لیے اس کو کوشی کے باہر نکلنے نہیں دیا جاتا تھا۔ ایک شام ہم کار میں کسی جگہ جانے کے لیے گھر سے نکلے تو لوسی حسب عادت ہمیں رخصت کرنے کے لیے ساتھ ساتھ دوڑتی ہوئی گئی مگر اس روز اس نے اپنی مقررہ حد کو عبور کر لیا۔ ہم نے اس کو واپس جانے کی بہت ہدایت کی لیکن وہ باہر والی سڑک تک ہماری کار کے ساتھ بھاگتی ہوئی چلی

کھانوں کے خوان بکھرے نظر آتے تھے جب اس کا جی چاہتا کسی چیز کو کھا لیتا اور جمائیاں لیتے ہوئے بڑے صوفے پر لیٹ کر سو جاتا۔ جب وہ صوفے پر آرام یا سوراہا ہوتا تو سب اسے پیار کرتے اور اس کی سر اور گردن کو سہلاتے۔ بلیوں کے سر اور گردن کو سہلایا جائے تو انہیں بہت اچھا لگتا ہے اور وہ غنودگی کے عالم میں یا فرط محبت میں غرغری آواز نکال کر لیتے رہتے۔ اب چیکو بڑا بھی ہو گیا تھا اور صحت مند بھی۔ اس کے جسم کے بالوں کی رنگت ہلکی براؤن اور سفید تھی۔ قد و قامت میں وہ عام بلیوں سے بڑا تھا۔ جب وہ پیار سے ہم پر چھلانگ لگاتا تو اس کے وزن سے ہم لڑکھڑا جاتے تھے۔ چیکو محبت کا بھوکا بھی نہیں تھا کہ ہر وقت سر اور گردن سہلاتا رہے۔ جب تک جی چاہتا غرغری آوازیں نکالتا رہتا اور جب چاہتا روکنے اور چکرانے کے باوجود اٹھ کر چلا جاتا اور کسی اور صوفے یا بستر پر جا کر لیٹ جاتا۔

بلیوں کے بارے میں یہ سمجھ لیں کہ وہ کسی کام کے نہیں ہوتے، اگر آپ چاہیں کہ وہ کتے کی طرح بیٹھ کر حفاظت کریں یا آپ کے پکارتے ہی دم ہلاتے ہوئے آپ کے پاس آ کر محبت کے مارے صدقے واری ہونے لگیں تو یہ غلط فہمی ہے۔ بلی کو آپ محبت سے، غصے سے، چکار کر پکارتے رہیں مگر وہ ان سنی کر دیتے ہیں جیسے کہ آپ کی آواز ان کے کانوں میں نہیں جارہی۔ بلی سے کسی حکم کی تعمیل کرانا قطعی ناممکن ہے۔ جب چیکو دو تین مہینے کا ہوا تو ہمیں خیال آیا کہ اس کو گیندا اٹھا کر لانا سکھائیں۔ ردی کاغذوں سے ایک گیند بنا کر چھینکی کہ یہ گیند لاکر ہمیں دو مگر اس نے ایک نہ سنی، گیند سے کھیلنا رہا پھر بیچوں اور دانٹوں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور پھر منہ اٹھا کر دوسری طرف چلا گیا۔ ہم نے بہت برا پکارا مگر وہ جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھ کر سو گیا۔ کیا مجال جو ہماری بات مان لے۔ اگر آپ چاہیں کہ بلی یا بلی گھر کے برآمدے میں پڑا ہوا اخبار آپ کے حکم پر اٹھا کر لادے گا تو یہ بھی آپ کی خوش فہمی یا غلط فہمی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بلی اپنے دانٹوں سے اخبار اٹھا کر لائیں سکتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ بلی اور بلیاں آزاد اور مختار ہوتے ہیں۔ اخبار اٹھا کر لانا تو کیا وہ کوئی اور کام بھی نہیں کر سکتے یا کرنا ہی نہیں چاہتے۔ بلی اور بلیوں سے زیادہ نافرمان جانور شاید ہی دنیا میں کوئی اور ہوتا ہو۔ کہنا ماننا اور حکم کی تعمیل کرنا تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں۔ ہم تو اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بلیاں صرف دو ہی کام کرتے ہیں۔ سونا یا آوارہ گردی کرنا۔ اس کے سوا انہیں کسی اور چیز

سے سروکار نہیں ہے۔ چیکو عموماً دن بھر گھر کے اندر سو رہتا تھا۔ شام کو اس کی سیر و تفریح اور آوارہ گردی کا وقت ہوتا تھا۔ وہ سو کر اٹھتا، چند جمائیاں لیتا اور باہر جانے والے دروازے کے پاس جا کر آنے جانے والوں سے ”میاؤں“ کر کے کہتا کہ دروازہ کھولو۔ مجھے جانا ہے۔ آپ لاکھ جا رہے ہیں کہ وہ اس وقت باہر نہ جائے مگر وہ ضد کا پکا تھا۔ شاید بلی بلیاں ایسے ہی ہوتے ہیں، دروازہ نہ کھلا۔ چاہتا تو اسی جگہ بیٹھ جاتا اور بڑی منت بھری نظروں سے پاس سے گزرنے والوں کو دیکھ کر ”میاؤں“ ”میاؤں“ کی آوازیں نکالتا رہتا یہاں تک کہ اس کے لیے باہر جانے والا دروازہ کھول دیا جاتا اور وہ دروازہ کھولنے والے کی طرف دیکھ کر بغیر اور شکر یہ ادا کیے بغیر نکل کر باہر چلا جاتا۔

سردی کے موسم میں چیکو کی ہماری چھوٹی بیٹی پارو کے ساتھ خاصی ٹکرا رہی تھی۔ چیکو کی عادت تھی کہ وہ بیٹر کے بالکل نزدیک ہاتھ پیر پھیل کر لیٹ جاتا اور سو جاتا۔ پارو بھی بیٹر کے قریب آ بیٹھنے کی عادت تھی۔ ان دونوں بیٹروں سے جو کوئی بھی بیٹر کے عین سامنے پہلے جگہ حاصل کر لیتا، پھر اپنی جگہ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ اگر پارو بیٹر میں بیٹھی ہے تو چیکو اس پاس منڈلاتا رہتا تھا کہ یہ کسی وقت اٹھے اور میں اس جگہ پر قبضہ کروں۔ یہی کوشش پارو کی ہوتی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ چیکو یا تو بیٹر کے بالکل نزدیک کھس کر لیٹا رہتا یا پھر وہاں سے اٹھ کر شدید سردی میں دروازہ کھلوا کر سیدھا باہر لان میں جا کر اس سے بھیگی ہوئی گھاس پر لیٹ جاتا، یعنی کو فکر رہتی تھی کہ بیٹر کے سامنے سے نکل کر ایک دم باہر سخت سردی میں لان کی بھیگی ہوئی ٹھنڈی گھاس پر لیٹنے سے چیکو بیمار نہ ہو جائے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔ گھر کے اندر چیکو کے سونے کی پسندیدہ جگہ یا لاونچ میں بچھا ہوا بڑا صوفہ تھا یا پھر ہمارے بیڈروم کا بستر۔ چیکو جب چاہتا رات کے وقت ہمارے بیڈ پر آ جاتا اور لوگوں پر سے گزرتا ہوا پیروں کے نزدیک لحاف میں ایک جگہ بنا کر وہاں سو جاتا تھا۔ ہم نے کئی بار کوشش کی کہ لحاف کے اندر ہمارے پاس بھی آ کر لیٹے مگر لحاف کے اندر لیٹنا اس کو گوارہ نہ تھا۔

لاؤنچ کے صوفے کو تو وہ اپنی ذاتی جاگیر سمجھتا تھا۔ ایک بار ہماری بڑی بہن ہمارے گھر میں قیام کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ ایک دن وہ چیکو والے صوفے پر بیٹھ گئیں، چیکو آیا اور اس نے آپا بیگم کو اپنی جگہ بیٹھا ہوا دیکھا تو صوفے

کے آس پاس ہی منڈلاتا رہا۔ کچھ دیر بعد آپا بیگم جیسے ہی صوفے سے اٹھیں چیکو کو ذکر صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ ہنسنے لگیں۔ دیکھو اس کی چالاکی، میرے اٹھتے ہی میری جگہ پر قبضہ کر لیا۔

ہم نے انہیں بتایا کہ دراصل یہ اسی کی پسندیدہ جگہ ہے۔ آپ نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ ”اچھا۔ تو اسی لیے یہ اس صوفے کے آس پاس ہی منڈلاتا رہا تھا۔“

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے چیکو کا ٹوائٹلٹ اوپر کی منزل پر چیکو کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ٹوائٹلٹ جانے کو نہ لٹا رہے مگر جب یہ ناقابل برداشت ہو جاتا تھا تو چیکو نہایت تیزی سے صوفے، میز کرسیاں اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر کی طرف بھاگتا تھا۔ لکٹی کہتی تھیں کہ اس کی یہ عادت چھوٹے بچوں جیسی ہے۔ وہ بھی ٹوائٹلٹ جانے کو نہ لٹتے رہتے ہیں اور جب معاملہ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے تو غسل خانے کی طرف بھاگتے ہیں۔

شروع میں چیکو کاغذات اور اخبارات وغیرہ کا دشمن رہا۔ جیسے ہی اخبار دیکھا اس کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس کو کنگڑے ٹکڑے کر کے ہی دم لیتا تھا۔ ہم جس وقت اپنے کمرے میں لکھنے کے لیے کٹن کی ٹیک لگا کر قالین پر بیٹھتے اور چاروں طرف لکھے ہوئے کاغذات پھیل جاتے تھے۔ چیکو کی جیسے ہی نظر پڑتی وہ ان کاغذوں سے کھیلنا شروع کر دیتا۔ ہم اس کو ڈانٹتے مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے ہم بکھرے ہوئے کاغذات سنبھالتے مگر چیکو کے ڈانٹ اور پنچے لگنے کی وجہ سے ان کا حلیہ بگڑ جاتا تھا۔ چیکو پر ڈانٹ ڈپٹ کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا اس لیے ہم اس کو پیار سے سمجھانے کی کوشش کرتے کہ دیکھو چیکو، یہ کاغذات ہمارے کام کے ہیں انہیں خراب نہ کیا کرو مگر چیکو نے کبھی کسی کی بات پر کان دھرا ہوا تو ہماری بات ماننا۔ البتہ وقت گزرنے کے ساتھ کاغذوں سے کھیلنے کی عادت کچھ کم ہو گئی بلکہ چھوٹ ہی گئی۔ جب ہم اپنے کمرے میں بیٹھ کر لکھتے اور گھر میں اکیلے ہوتے تو چیکو ہمارے پاس آ کر قالین پر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ ہماری تنہائی کا ساتھی تھا۔ شاید اس کو بھی احساس ہو جاتا تھا کہ ہم گھر میں بالکل تنہا ہیں اور خاموشی چاہتے ہیں۔ وہ قالین پر خاموش بیٹھا رہتا اور وہیں سو جاتا۔ گھر میں ہمیں اکیلا دیکھ کر وہ ہمیں تنہائی کے احساس سے بچانے کے لیے ہمارے آس پاس ہی کھومتا رہتا تھا یا پھر بیٹھا رہتا تھا۔

ہمیں یہ بہت اچھا لگتا تھا کہ کمرے میں اور گھر میں ہم تنہا نہیں ہیں اور کوئی ہماری توجہ پانے والا بھی نہیں ہے۔ جب تک گھر والے واپس نہیں آ جاتے تھے چیکو ہماری تنہائی دور کرنے کے لیے ہمارے پاس ہی بیٹھا رہتا تھا۔ اگر کسی وقت لکٹی گھر میں اکیلی ہوتی تھیں تو چیکو ان کا بھی خیال رکھتا تھا۔ وہ جس کمرے میں یا باورچی خانے میں جاتی تھیں چیکو ان کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ وہ ہم لوگوں کی تنہائی کا ساتھی تھا۔ بچیاں کہتی تھیں کہ یہ آپ لوگوں کو کمپنی دیتا ہے۔ چیکو جیسے من موچی بلی کو بھی یہ احساس تھا کہ تنہا شخص کو کسی کے ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یا پھر وہ خود اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے ایسا کرتا تھا؟ مگر یہ درست نہیں ہے۔ کیونکہ وہ کسی اور کمرے میں یا گھر سے باہر بھی جا سکتا تھا۔ کسی اور کمرے میں جا کر سو سکتا تھا۔ یقیناً اس کو ہماری تنہائی کا احساس تھا۔

ہمارے ایک دوست نے بتایا تھا کہ بھائی، اگر تمہیں وفادار اور فرماں بردار پالتو جانور پالنا ہے تو کتا پالو۔ بلی یا بلیاں اپنی مرضی کے مختار ہوتے ہیں۔ کہا ماننا تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں اور نہ ہی سزا دی جائے تو وہ اس کی پروا کرتے ہیں۔ ان کی بات کی سچائی کا اندازہ اس وقت ہوا جب شدید سردی کے موسم میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور چیکو کی خواہش تھی کہ اس کو باہر جانے دیا جائے۔ ہمیں یہ فکر تھی کہ بارش میں بھیکے گا اور شدید سردی میں باہر گھومے گا تو کہیں بیمار نہ ہو جائے مگر چیکو مستقل دروازے کے پاس بیٹھا میاؤں میاؤں کرتا رہا، آخر تنگ آ کر ہم نے دروازہ کھول دیا اور کہا کہ اب جا رہے ہو تو تمہیں اندر آنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ رات کا وقت تھا۔ چیکو باہر نکل گیا ڈیڑھ دو گھنٹے بعد باہر سے اس کی میاؤں کی آواز آئی۔ اب وہ اندر آنا چاہتا تھا۔

ہم نے دروازے کے پاس جا کر غصے سے کہا ”اس وقت تم نے ہمارا کہا نہیں مانا تھا۔ باہر گئے ہو تو اب باہر ہی رہو۔“ ایک دو بار چیکو ”میاؤں“ سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

لکٹی کو ترس آ گیا۔ انہوں نے کہا ”باہر بہت سردی ہے۔ اس بے چارے کو کب تک سزا دیں گے۔“

ہم نے دروازہ کھول دیا۔ باہر دیکھا تو چیکو کا پتا بھی نہیں تھا۔ اگر وہ اس کی جگہ کتا ہوتا تو رات بھر وہیں دروازے پر بیٹھا رہتا تا کہ مالک کو منالے۔ مگر بلیوں کو مالک کے غصے کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ ان کی کوئی بات

نستے ہی نہیں ہیں تو ان کی پروا کیا کریں گے۔
ہم نے کسی انگریزی میگزین میں یہ مختصر مضمون پڑھا تھا۔ اس کا عنوان تھا۔ ”دس وجوہات جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتے بلیوں سے بہتر کیوں ہوتے ہیں؟“

- 1۔ کتوں کو بلا وجہ ہی انسان کا بہترین دوست نہیں کہا جاتا۔ وہ وفادار ہوتے ہیں اور کسی حالت میں بھی آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔

- 2۔ کیا آپ سوچ سکتے ہیں کہ کوئی بلا موشیوں کی حفاظت کے لیے پہاڑیوں میں دوڑتا پھرے گا۔ کتے اپنے مالک کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ وہ نمک حلال ہوتے ہیں جبکہ بلیوں کو مالک کی وفاداری یا نمک کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔
- 3۔ چوروں اور نقب زنوں سے آپ کے گھر کو کون بچا سکتا ہے۔ بلایا کتا؟

- 4۔ جب آپ ٹہلنے جاتے ہیں تو کتا ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ بلا بھی آپ کے ساتھ ساتھ ٹہلنے نہیں جاتا۔ جب آپ اپنے کتے کو سڑک پر ٹھلاتے ہیں تو دوسرے لوگ جو اپنے کتوں کو ٹھلانے کے لیے نکلتے ہیں آپ کو مسکرا کر ہیلو کہتے ہیں اور آپ کے کتے کے بارے میں رائے زنی ضرور کرتے ہیں۔ اس طرح آپ کو میل ملاپ اور دوست بنانے کا موقع ملتا ہے۔ اگر آپ بلا پالیں گے تو یہ موقع نہیں مل سکتا۔

- 5۔ کتا خیالی چور کے خلاف ساری رات بھونک سکتا ہے جبکہ بلا آپ کی حفاظت کے لیے ایک بار بھی ”میاؤں“ نہیں کرے گا۔

- 6۔ اگر آپ تنہا خاتون ہیں اور آپ کی عمر 35 سال سے زیادہ نہیں ہے تو کتا آپ کے محافظ کا فرض بھی ادا کرتا ہے۔ کیا بلا آپ کی حفاظت کر سکتا ہے؟

- 7۔ کتا سیرے آپ کا اخبار اٹھا کر آپ کو لا دیتا ہے مگر بلا ہزار بار کہنے کے باوجود اخبار کے قریب تک نہیں جاتا۔
- 8۔ کتا اپنے ناپسندیدہ مالک کو سڑک عبور کرنے میں مدد دیتا ہے۔ کیا بلا یہ فرض ادا کر سکتا ہے؟

- 9۔ کتا کبھی آپ کو مردہ چوہے کا تھنہ پیش نہیں کرتا۔ بلا جب چوہے کا شکار کرتا ہے تو بڑے فخریہ انداز میں مردہ چوہا آپ کے سامنے لا کر ڈال دیتا ہے کہ دیکھو میرا کارنامہ؟

- 10۔ آپ نے نام اور جیری کا کارٹون تو دیکھا ہوگا اور یہ دیکھ کر آپ کو بلیوں کی حماقت کا احساس ضرور ہوتا ہوگا کہ ایک چوہا ہمیشہ اس کو نیچا دکھاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بلی اور بلا چالاک اور ہوشیار نہیں ہوتے۔ اس کا سبب ہمارے خیال میں تو یہ ہے کہ بے حدست اور آرام طلب ہوتے ہیں۔ سوچنے کے لیے دماغ پر زور ڈالنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔

لیکن ہمیں بلیاں بہت اچھی لگتی ہیں، چکیو تو انکار سے ہمارے پاس آگیا تھا لیکن سچ تو یہ ہے کہ ”چکی“ کے مرنے کے بعد کوئی پالتو جانور پالنے کے خواہش مند تھے، ہمارے ہاں عموماً پرندے، کتے، اور بلیاں پالنے کا رواج ہے۔ پرندوں میں تو تا (طوطا) سب سے زیادہ مقبول پرندہ ہے۔ طوطا چونکہ بولنے والا بھی ہوتا ہے اس لیے زیادہ تر لوگ تو تا ہی پالتے ہیں۔ دنیا کے دوسرے ملکوں میں تو لوگ سانپ، بگھو، اژدھا، مگڑی وغیرہ بھی بہت شوق سے پالتے ہیں لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ مغربی ملکوں میں پسندیدہ ترین پالتو جانور کتا اور بلی ہی ہوتے ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا کے علاقے میں اس قسم کے پالتو تو کیا آوارہ جانور بھی سڑکوں پر گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں 1978ء میں ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں فلپائن گئے۔ دارالحکومت منیلا میں گھومتے پھرے لیکن سڑکوں پر نہ کوئی کتا نظر آیا اور نہ بلی، بہت حیرت ہوئی اس لیے کہ ہمارے ملک میں تو سیکڑوں آوارہ کتے اور بلیاں ہر جگہ نظر آ جاتی ہیں۔

ہم نے ایک دن ہوٹل کے منجر سے پوچھا۔ ”منجر کارلوں۔ ہم دنیا کے مختلف ملکوں میں گئے ہیں جہاں پالتو کتے بلیاں عموماً نظر آ جاتے ہیں۔ بعض ملکوں میں آوارہ کتے اور بلیاں بھی نظر آ جاتی ہیں لیکن آپ کے ملک میں نہ ہم نے بلیاں دیکھیں اور نہ ہی کوئی کتا ٹھلٹا ہوا نظر آیا۔ کیا اس کا کوئی خاص سبب ہے؟“

وہ مسکرا کر بولا۔ ”چند دن رہیں گے تو آپ کو خود بخود معلوم ہو جائے گا۔“ واقعی کچھ دن بعد ہمیں اس کا سبب معلوم ہو گیا۔ منیلا کے لوگ کتے اور بلیاں بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ اسی لیے وہاں نہ بلیاں نظر آتی ہیں اور نہ کتے۔ جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں میں ہر حرکت کرنے والا مخلوق کو کھالیا جاتا ہے۔ بلی، کتے، سانپ، مینڈک، کچھوے، چھکلی، بندر، کچھوے، چکاوڑ۔ یہ بلا نوش لوگ ہر چیز کھا لیتے ہیں۔ ہر قسم کے پرندے اور آبی مخلوق ان کی پسندیدہ خوراک ہے۔ آپ کسی بھی قسم کے جانور یا پرندے نام لیں یہ ان کی خوراک میں شامل ہیں۔ نہ جانے یہ لوگ

الو بھی کھاتے ہیں یا اس کو فلاسفر سمجھ کر بخش دیتے ہیں۔ شاید ایک وجہ یہ بھی ہے کہ الو بہت کمیاں جانور ہے اور انسانوں سے دور چھپ کر رہتا ہے۔

ہم نے اپنے بچپن میں گھر میں بولنے والا تو تا بھی پلا ہوا دیکھا تھا۔ بولنے والا تو تا کہنے کو تو بولنے والا ہوتا ہے لیکن تو تا فروشوں نے بتایا کہ دراصل کسی بھی تو تے کو اگر چھوٹی عمر سے سکھایا جائے تو وہ بول سکتا ہے۔ ہمارے گھر میں جو تو تا تھا اس کا نام تو یا د نہیں رہا، شاید موتی اس کا نام تھا۔ لیکن اس کی باتیں اور حرکتیں یاد ہیں۔ یہ تو تا سارے گھر میں آزادی سے گھومتا پھرتا تھا۔ گھر میں کام کرنے والی بڑی عمر کی خاتون کو سب بوا کہا کرتے تھے۔ بوا کی اور موتی کی کبھی نہیں بنی۔ اس میں قصور وار کون تھا یہ تو معلوم نہیں لیکن اب سوچتے ہیں تو خیال آتا ہے کہ شاید دونوں ہی قصور وار تھے، ان کی ناپسندیدگی مشترکہ اور دو طرفہ تھی۔

بوا بہت باتونی تھیں اور ہر ایک کے بارے میں ریمارک دیتی رہتی تھیں۔ مثلاً تو تے کی کسی بات پر ناراض ہوئیں تو اماں سے کہتیں۔ ”بڑی بیگم، آپ نے یہ موا تو تا کیوں پال لیا۔ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔ یہ تو ایسا جانور ہے جو بالکل بے فیض ہوتا ہے۔ صرف اس کی زبان ہی ٹر ٹر چلتی ہے۔ اس کے سوا یہ جھاڑو پھرا کچھ بھی نہیں کرتا۔“

اماں کہتیں ”بوا، تم اس بے چارے بے زبان کے کیوں خلاف ہو گئی ہو۔ اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو ہر وقت اس کے لئے لپتی رہتی ہو۔“

”یہ بے زبان ہے؟ ارے بیگم یہ تو اول نمبر کا بے زبان ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ بکاتا ہی رہتا ہے۔ ہر معاملے میں ناگاہک اڑاتا ہے۔“

”بوا۔ وہ تو جو دیکھتا اور سنتا ہے وہی بولتا ہے۔ اپنی طرف سے تو کچھ نہیں کہتا۔“

”ارے بڑی بیگم، دنیا بھر کی باتیں تو کرتا ہے۔“ اتنی دیر میں تو تا بھی گھومتا پھرتا آگیا تھا۔ اس کی آواز سنائی دی ”چپ کر بڑھیا، چپ کر۔“

بوانے چونک کر دیکھا تو موتی کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا۔

”بڑی بیگم سن رہی ہیں آپ اس کی بدکلامی اور بدتمیزی۔“

اماں نے بہت مشکل سے ہنسی روکی۔ ”چپ کر بڑھیا، ٹر نہ کر۔“ یہ کہہ کر موتی رخصت ہو گیا۔

بوا غصے سے دیکھتی رہ گئیں۔ ”سن لی آپ نے اس کی لپ ترائی؟“

”بوا۔ جو اس نے سنا ہے وہی دہرا رہا ہے نا۔ تم بھی تو اس کو ہر وقت ڈانٹتی رہتی ہو کہ اپنی ٹر بند کر۔“

موتی کی اور ہماری بھی کبھی نہیں بنی۔ ہماری عمر چار پانچ سال ہوئی۔ ہم بچپن میں ”توتے“ تھے مطلب یہ کہ توتے تو ”ک“ کی جگہ ”ت“ بولتے ہیں مگر ہم ک کی جگہ ”ٹ“ بولتے تھے۔ مثلاً کتاب کو ٹباب، قفل کو ٹفل، تالے کو ٹالا۔ موتی ہماری نقل کرتے ہوئے اسی ٹوٹی زبان میں بولتا تھا جو ہمیں بہت ناگوار گزرتا تھا۔

ہم کہتے ”ہم کہتے ہیں قفل مگر تم کہو قفل۔“ وہ کہتا ”قفل۔“

کچھ دیر تک یہ تکرار جاری رہتی اور پھر ہم غصے میں اس کو چھڑی سے مارنے کے لیے لپکتے تو وہ بھاگ جاتا یا اپنے پنجرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتا۔ وہ اپنے پنجرے کا دروازہ کھول سکتا تھا اور اندر سے اس کو بند بھی کر لیا کرتا تھا۔ بالآخر بوا اماں کی توجہ اس طرف مبذول کر دیتی ”بڑی بیگم، دیکھیے یہ موا کس طرح بچے کو تنگ کر رہا ہے۔“

موتی جواب میں ڈانٹ دیتا ”چپ کر بڑھیا۔ ٹر نہ کر۔“ اماں کی مداخلت سے یہ جھگڑا ختم ہوتا تھا۔ ہمارے

ایک ماموں نے بلی اور تو تا پالا تھا۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان دونوں میں بہت دوستی تھی۔ اکثر تو تا بلی کے پاس جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بلی اس کو اپنی کمر پر بٹھا کر گھر بھر کی سیر بھی کراتی تھی۔

ہماری بہن نے ایک بہت دلچسپ واقعہ سنایا۔ انہوں نے کہا کہ وہ کسی کے گھر گئیں۔ اہل خانہ نے ان کی حسب توفیق خاطر مدارات کی۔ یہ لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنے بچے سے کہا کہ فرنج میں سے ملائی نکال کر لے آئے۔ بچہ چلا گیا۔ کچھ دیر بعد آواز آئی ”پھر فرنج کھولا، بند کرو۔“

کئی بار یہ باریک سی آواز سنائی دی معلوم ہوا کہ یہ آواز پالتو تو تے کی ہے۔ اس کی عادت تھی کہ جو کوئی بھی (گھر کی مالکین کے علاوہ) فرنج کھولتا تو تو تا فوراً نوک دیتا ”پھر فرنج کا دروازہ کھولا۔ بند کرو“ اس طرح وہ گھر کی مالکین کو مطلع کر دیتا تھا کہ کوئی فرنج کھول رہا ہے۔ تو تے کا پنجرہ اتفاق سے فرنج کے سامنے ہی رکھا رہتا تھا۔ پنجرے سے باہر نکل کر تو تا سارے گھر میں گھومتا پھرتا تھا مگر اس کی نظریں

فریج پر ہی لگی رہتی تھیں۔ خصوصاً کسی ملازم کے فریج کھولنے پر تو تا ضرور ٹوکتا تھا۔

ایک صاحب نے بتایا کہ ان کے دوست کے گھر میں ایک تو تالا لگا گیا ہے جو ہر وقت کچھ نہ کچھ بولتا رہتا ہے۔ گھر کی بزرگ خاتون کے تمام فقرے وہ یاد کر چکا ہے اور دہراتا رہتا ہے۔ مثلاً۔

”ارے تمہیں تو کوئی ڈھنگ ہی نہیں ہے۔“

”سر پر دوپٹا ڈالو۔“

”بڑوں کے منہ میں مت بولو“ وغیرہ۔

”دلہن شرم کرو۔“

”تمیز سیکھو مجھے بدتمیزی پسند نہیں ہے۔“

توتے نے ان کے تمام فقرے یاد کر لیے تھے اور موقع بہ موقع انہیں دہراتا رہتا تھا۔ یہ تو تا بعض اوقات گھر والوں کے لیے مشکل بھی پیدا کر دیتا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ایک بار انہوں نے اپنے ایک نئے شادی شدہ دوست کو دعوت پر بلایا۔ دولہا دلہن گھر آئے تو ان کا خیر مقدم کیا گیا۔ دلہن آج کے زمانے کی یاڈرن فیشن اسٹیل لڑکی تھی جو بلا آستین کی قمیص پہنے ہوئے تھی۔ موجودہ زمانے کے دستور کے مطابق دوپٹا غائب تھا، ہمارے دوست کی والدہ کو ان کا یہ حلیہ پسند نہیں آیا اور وہ تنقیدی نگاہوں سے دلہن کو دیکھتی رہیں مگر کچھ بولیں نہیں۔

دولہا دلہن کو چائے پیش کی گئی تو اتفاق سے چائے کی پیالی چھلک گئی اور چائے دلہن کے لباس پر گر گئی۔

اس سے پہلے کہ میزبان کی اماں کچھ کہیں توتے نے کہا۔ ”ارے تمہیں تو کوئی ڈھنگ ہی نہیں ہے۔“

دلہن اپنے لباس کی طرف متوجہ تھی۔ اس کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو وہ بھی کہ میزبان کی والدہ نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ دلہن کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس کا موڈ بگڑ گیا۔

دلہن کے کان میں دوسری آواز پڑی ”سر پر دوپٹا ڈالو۔“ اس کے لباس کے ساتھ تو دوپٹا ہی نہیں تھا۔ سر پر کیسے ڈالتی مگر اس کو میزبان کی والدہ کا اس طرح ٹوکتا بہت برا لگا۔ اس کے شوہر کو بھی یہ روک ٹوک پسند نہیں آئی۔ وراصل اس کو بھی علم نہیں تھا کہ اس گھر میں ایک پالتو تو تا ہے جو بولتا بھی ہے۔ اس نے بھی نا پسندیدگی سے اپنے دوست کو دیکھا۔

میزبان نے اپنے دوست اور اس کی بیوی کو سمجھانا چاہا اور کہا۔ ”تم خواہ مخواہ ناراض نہ ہونا۔ وراصل ہمارے گھر میں۔۔۔۔۔“

دلہن اب تک برداشت کر رہی تھی وہ سمجھی کہ میزبان یہ کہنا چاہتا ہے کہ ہمارے گھر میں ہماری امی پرانے زمانے کی ہیں۔ آج کے زمانے کے طور طریقوں کو وہ نہیں نہیں کرتیں۔

دلہن نے بات کاٹ کر اپنے شوہر سے کہا۔ ”آپ میری بے عزتی کرانے کے لیے یہاں لائے ہیں؟“ اور انہوں نے کھڑی ہو گئی۔

تو تا، پھر بول پڑا ”دلہن شرم کرو۔“

اس کے بعد میاں بیوی کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوا تھا۔ انہوں نے خدا حافظ کہا نہ کچھ اور غصے میں اٹھ کر پلٹ دیے۔ میزبان ان کو روکتے رہ گئے مگر انہوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا اور چل دیے۔

بیٹے نے اماں سے کہا۔ ”اماں۔ دیکھا آپ کے توتے نے کیا کر دیا ہے۔ میں اس کی گردن مروڑ دوں گا۔“ اس طرح ایک بولنے والے توتے نے دو دوستوں کے درمیان میں نفرت کی دیوار کھڑی کر دی۔

ہمارے ایک اور جاننے والے ہیں جنہوں نے وہی بارہ بلیاں پال رکھی ہیں ابھی تک ان کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ اکیلے رہتے ہیں اور بلیوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ شادی کے بعد ان کی ٹیکم نے ان درجن بھر بلیوں کے ساتھ کیسے گزارا کیا ہوگا یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔

بلیوں کے حق میں تقریریں کرتے رہتے ہیں اور بلیاں پالنے کے فوائد بیان کرتے رہتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے۔ ”کتے اپنے مالک کو خوش کرنے کے لیے اور ایکٹنگ کرتے رہتے ہیں۔ بلا وجہ اچھیلیں گے۔ کودیں گے، بھونکیں گے، پھلانگیں لگائیں گے، پیروں سے آکر لپٹیں گے۔ یہ سب ظاہر داری کی اچھی حرکتیں ہیں۔ بلی کبھی مالک کو خوش کرنے کے لیے ایسی حرکتیں نہیں کرتی۔“

ہم نے کہا۔ ”ظاہر ہے، بلی بھونکنے سے تو رہی۔“ ”ارے بھی اچھل کود تو کر سکتی ہے۔ پیروں میں لوٹ تو سکتی ہے۔ پھلانگیں تو لگا سکتی ہیں۔ مگر نہیں۔ وہ ایسا اچھی حرکتیں نہیں کرتیں۔ بلی بہت سمجھدار اور سنجیدہ جانور ہے۔ بلیوں کو شہلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کتوں کے مالک زنجیریں سنبھالے ہوئے اپنے کتوں کو شہلاتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات تو یوں لگتا ہے جیسے کتا مالک کو شہلاتا ہے۔ کتوں کی ایک بری عادت یہ ہے کہ وہ اظہار محبت کے لیے مالک کا منہ چاٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلیاں

ایسی بدتمیزی نہیں کرتیں۔ بھلا یہ محبت ظاہر کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ کتے پوٹی کرنے کے بعد اس پر مٹی ڈالنے کی زحمت بھی مٹا رہے نہیں کرتے مگر بلی پوٹی کرنے کے بعد اس پر مٹی ڈال کر اس کو چھپا دیتی ہے۔ بلیاں تو بہت سی گھریلو چیزیں ہیں تاہم کتے کے پیچھے چھپا دیتی ہیں۔ اپنی دانست میں وہ ان کی حفاظت کے خیال سے ایسا کرتی ہیں۔

کتے کو مالک نہلاتے ہیں کیونکہ کتے صفائی پسند نہیں ہوتے۔ لیکن بلی خود ہی اپنے چہرے اور جسم کی صفائی کرتی رہتی ہے۔ کتوں پر عموماً کھیاں بھینکتی رہتی ہیں مگر آپ نے کبھی بلی پر کھیاں بھینکی دیکھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بلیاں خود کو صاف تھرا رکھتی ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ کتے منہ سے اپنی دم پکڑنے کی کوشش میں گول گول چکر کاٹتے ہیں مگر بلیاں ایسی حماقت نہیں کرتیں کیونکہ وہ عقلمند ہوتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ وہ اپنے منہ سے اپنی دم نہیں پکڑ سکتیں۔

بلیوں کی وجہ سے گھر میں چوہے اور چھوٹے موٹے کیڑے قدم بھی نہیں رکھتے۔ کتے کے سامنے چوہے کھیلتے پھرتے ہیں مگر وہ انہیں دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں بلکہ سو جاتے ہیں۔

بلیوں کی حماقت میں ان کو پسند کرنے والے بے شمار دلائل دیتے ہیں مگر ہمارے نزدیک بلیوں کو پسند کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلیاں بہت پسند تھیں اور وہ بھی بلیوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ بلیاں صاف ستھری ہوتی ہیں۔ کبھی کسی گندی جگہ پر نہیں بیٹھتیں۔ ہر وقت اپنے چہرے اور جسم کی خود ہی صفائی کرتی رہتی ہیں۔ آپ کے پاس آکر دم تو نہیں ہلاتیں مگر ہمارے پاس کھس کر بیٹھ جاتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ انہیں پیار کیا جائے۔ بلیاں کے بچے کھلونوں کی طرح دکھش ہوتے ہیں۔ وہ بہت کھلندے رہتے ہیں۔ ہر وقت ہر چیز سے کھیلتے اور کھیلنے کو دیتے رہتے ہیں جنہیں دیکھ کر آپ ایک تازگی محسوس کرتے ہیں اور دیر تک یہ تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔

دیکھئے۔ چیکو کے تذکرے سے بات کہاں سے کہاں آگئی۔ چیکو اپنے بچپن اور لڑکپن میں بہت ہی شوخ و شریل اور کھلندے رہتا تھا۔ کوئی بھی چیز جو اسے حرکت کرتی نظر آتی تھی اس پر ہمیشہ پڑتا تھا۔ کئی بار ہمارے گھر ملنے والے آئے۔ انہوں نے کار کی چابیوں والا ہاتھ صوفے کے پیچھے پھیلایا تو

چیکو نے چابیوں پر چھلانگ لگا دی اور وہ اس اچانک ”آفت“ سے گھبرا گئے۔ چیکو میں توانائی یعنی انرجی بہت زیادہ تھی۔ وہ ہر وقت گھر کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک خود ہی بھاگتا رہتا تھا اور تیزی میں کھڑکیوں پر چڑھ جاتا تھا۔ پھر وہاں سے بھاگتا تو دوسرے کنارے تک دوڑتا ہوا جاتا اور جوش میں دروازے پر بھی چڑھ جاتا تھا۔ ”چیکو“ سارے گھر کا لاڈلا تھا۔ سارا دن اسی کی باتیں ہوتی رہتی تھیں کہ آج چیکو نے کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ چیکو سارے گھر والوں کے لیے نہ صرف ایک تماشا تھا بلکہ گفتگو کا موضوع بھی تھا۔

آپ نے فلموں میں دیکھا ہوگا کہ بعض کردار اچانک اپنی یادداشت کھو بیٹھتے ہیں۔ انسانوں کو یادداشت کھوتے ہوئے تو دیکھا ہے لیکن ایک بار چیکو بھی اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ یہ بھی ایک عجیب واقعہ تھا۔

چیکو جب گھر سے باہر جانا چاہتا تھا تو دروازے پر جا کر پنے مار کر سب کو متوجہ کرتا تھا کہ دروازہ کھولو مجھے باہر جانا ہے۔ ہم لوگ کوشش کرتے تھے کہ وہ کم سے کم باہر جائے۔ وجہ یہ تھی کہ اکثر اس پاس کے آوارہ بے جوہر جگہ کھومتے پھرتے تھے اکٹھے ہو کر اس پر حملہ آور ہو جاتے تھے۔ چیکو ایک طاقتور اور اونچے قد کا بڑا تھا۔ اس کے اندر ایک خاص قسم کی وجاہت اور حسن تھا جو دوسرے آوارہ بلیوں کو نصیب نہ تھا۔ شاید وہ اس سے حد کرتے تھے۔ اس لیے جب بھی اسے اکیلا پاتے تو پاؤں چھ بے اکٹھے ہو کر اسے گھیر لیتے۔ بے اور بلیاں لڑائی شروع کرنے سے پہلے غصہ بھری خوفناک آوازیں نکالتے ہیں۔ اگر گھر کے اندر کوئی یہ آوازیں سن لیتا تو فوراً باہر جا کر آوارہ بلیوں کو بھگا دیتا تھا اور چیکو کو گھر کے اندر لے آتا تھا مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا تھا اور چیکو جب گھر میں آتا تو اس کے چہرے پر خراشیں دیکھ کر معلوم ہو جاتا تھا کہ آج کوئی جنگ ہوئی ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ہمارے کتے چنلی کے ساتھ بھی آوارہ کتوں کی دشمنی تھی اور اس کی موت کا سبب بھی وہ زخم بنے تھے جو لڑائی میں اس کے جسم پر آئے تھے۔

ہم آپ کو چیکو کی یادداشت کھوجانے کا قصہ سنا رہے تھے کہ اچانک چنلی، کا تذکرہ شروع ہو گیا۔ وراصل ان واقعات کا آپس میں تعلق ہے جو ابھی آپ کو پتا چل جائے گا۔ ایک بار چیکو گھر سے باہر گیا تو لوٹ کر نہ آیا۔ ہم سب بہت پریشان ہوئے۔ پہلے تو اس کا انتظار کیا پھر اس کی تلاش

شروع کردی مگر چیکو کا کچھ پتہ نہ چلا۔ گھر میں ایک خاموشی اور اداسی کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ سب چیکو کو یاد کرتے تھے مگر اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ ایسا بھی نہیں ہوا تھا۔ چیکو زیادہ سے زیادہ دو تین گھنٹے بعد واپس آ جایا کرتا تھا مگر اس بار ایسا نہ ہوا۔

دو تین دن اسی طرح گزر گئے۔ ایک دن بچوں نے آکر خوش خبری سنائی کہ چیکو واپس آ گیا ہے۔ وہ خوشی کے مارے پاگل ہو رہے تھے۔ سب بیک وقت بول رہے تھے اس لیے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جب ان کا جوش و خروش کم ہوا تو معلوم ہوا کہ ہماری کوٹھی کے پیچھے رانا صاحب کی جو بہت بڑی کوٹھی تھی۔ رانا صاحب اور ان کے گھر والوں سے ہم لوگوں کے بہت قریبی تعلقات تھے۔ وہاں ایک درخت کی سب سے اوپر والی شاخ پر چیکو بیٹھا ہوا ہے۔ بچوں نے اس کو بہت پکارا۔ چکارا لیکن وہ انجان بنا درخت پر بیٹھا رہا۔ ہم سب گھر والے بھاگ کر گئے۔ دیکھا تو چیکو درخت پر بیٹھا ہوا تھا لیکن ہم لوگوں کو دیکھ کر بھی اس نے نہ تو حرکت کی اور نہ ہی کسی رد عمل کا اظہار کیا حالانکہ پکارنے پر وہ فوراً بھاگا ہوا آ جاتا تھا۔

ہم سب رانا صاحب کی کوٹھی میں چلے گئے۔ وہ حیران ہوئے کہ اچانک کسی اطلاع کے بغیر ہم سب گھر والے، بچوں سمیت، ان کے گھر کیسے آ گئے۔ ہم نے انہیں بتایا کہ دراصل ہم اپنے گمشدہ بے کو لینے آئے ہیں جو آپ کی کوٹھی میں ایک درخت پر چڑھا ہوا بیٹھا ہے اور ہماری آواز پر بھی کان نہیں دھرتا۔ یہ سن کر رانا صاحب بھی ہم لوگوں کے ساتھ لان میں درخت کے پاس گئے مگر چیکو بدستور بے تعلق اور بے پروا درخت کی شاخ پر بیٹھا رہا۔ رانا صاحب نے اپنے مالی سے کہا کہ درخت پر چڑھ کر بے کو پکڑ کر نیچے لے آئے مگر ہم نے مشورہ دیا کہ آپ اپنے مالی کو درخت پر نہ چڑھائیں، چیکو اس سے ناواقف ہے وہ اس پر حملہ بھی کر سکتا ہے۔ بالآخر طے پایا کہ ہمارا ملازم درخت پر چڑھے اور چیکو کو اتار کر لائے۔ اب مشکل یہ تھی کہ ملازم کو درخت پر چڑھنا نہیں آتا تھا۔ رانا صاحب کے مالی اور ہمارے مالی نے اس کی مدد کی اور اس کو درخت پر چڑھایا۔ نیچے کھڑے ہم سب ہدایات دیتے رہے کہ کیا کرو، کیا نہ کرو، ایسا نہ ہو چیکو پریشان ہو جائے۔

ملازم نے چیکو کے پاس جا کر اس کو پکارا اور چکارا مگر چیکو اجنبی نظروں سے اس کو دیکھتا رہا۔ مالی نے ہاتھ

بڑھا کر اس کو شاخ پر سے اٹھایا اور نیچے لے آیا۔ ہم نے کو فوراً گود میں لے کر چکارا اور پیار کیا۔ خوشی کے مارے ہمارا دل بھر آیا۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ سب گھر والے چیکو کے لیے لے کر پیار کرنے کے لیے بے تاب تھے مگر چیکو اب بنا ہوا تھا۔

اپنے گھر میں لا کر چیکو کی یادداشت واپس لانے کے لیے اس کو گھر کا ہر حصہ دکھایا گیا۔ باورچی خانہ، غسل خانہ، کمرے، لان، یہاں تک کہ کار بھی دکھادی گئی کہ شاید اس پرانی باتیں یاد آجائیں۔ بچے اس کو دودھ پلانے اور کھلانے کے لیے بے تاب تھے۔ چیکو نے دودھ تو پی لیا کچھ اور کھانے سے انکار کر دیا۔ سارے گھر والے چیکو کے لیے لینے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ سب نے باری باری اس کو پیار کیا مگر اس کی یادداشت واپس نہ آئی۔

اچانک پارو کو خیال آیا کہ چیکو کو اوپر لے جا کر اس کو ٹائلٹ دکھایا جائے تو شاید اس کی یادداشت واپس آجائے۔ پارو نے چیکو کو گود میں اٹھایا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھی تو چیکو نے بہت غور سے سیڑھیوں کو دیکھا اور پارو کی گویا سے اترنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگا۔ پارو نے اس کو چھوڑا تو چیکو پرانی عادت کے مطابق تیزی سے دوڑتا سیڑھیوں پر چڑھا اور بھاگتا ہوا اپنے ٹائلٹ میں چلا گیا۔ چند لمحوں کے بعد چیکو واپس آیا تو شکر ہے کہ اس کی یادداشت واپس آ چکی تھی اور وہ پرانا چیکو بن چکا تھا۔

چیکو کی یادداشت تو واپس آ گئی مگر گھر سے باہر وہ آوارہ بلوں سے لڑائی میں اس کو کان کے اندر جو زخم آیا تھا، ٹھیک نہیں ہوا۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور چیکو کا باقاعدہ علاج شروع ہوا۔ انجکشن لگے۔ مختلف دوائیاں کھلائی گئیں مگر زخم بگڑتا چلا گیا۔ چند دن کے اندر چیکو کا بھی وہی حال ہو گیا جو چنگی کا ہوا تھا۔ وہ خاموش بے حس و حرکت لیٹا رہتا۔ کھانا پیتا بھی نہیں تھا۔ اس کو سہلاؤ اور پیار کرنا درد بھری نظروں سے آنکھیں کھول کر دیکھتا اور پھر آنکھیں بند کر لیتا۔ ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ چیکو بھی ان ہی مراحل سے گزر رہا ہے جن سے چنگی گزرا تھا۔ چیکو کی جدائی کے خیال سے دل بھر آیا۔ بچے نماز پڑھ کر اس کی صحت اور زندگی کے لیے دعائیں کرتے تھے۔ ہمارے باورچی نے دن دربار جا کر چیکو کی صحت مندی کے لیے دعا بھی کی اور منہ بھی مانی مگر چیکو صحت مند نہ ہو سکا۔

جس دن چیکو اللہ کو پیارا ہوا اس روز سارے

گھر والے چپ چاپ اس کے چاروں طرف بیٹھے تھے۔ کچھ دنوں خواتین باقاعدہ رو رہی تھیں۔ گھر کا ماحول سوگوار ہو گیا تھا۔

چیکو کئی گھنٹے سے بے ہوش تھا۔ پکارنے پر آنکھیں کھول کر دیکھا۔ آخر اسی حالت میں چیکو، ہم سب کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔

چیکو کی موت سب کے لیے ایک گہرا صدمہ تھی۔ ہم جو انسانوں کے مرنے پر بھی نہیں روتے چیکو کے مرنے پر آنسو بہاتے رہے۔ چیکو کے مردہ جسم کو کوٹھی کے لان میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے قبر بنا کر دفن کر دیا گیا۔ چیکو کی موت کا صدمہ کئی روز تک سب پر طاری رہا۔ ہم سب اس کی باتیں کرتے۔ اس کی شوخیاں اور شرارتیں یاد کرتے اور وہ دن یاد کرتے تھے جس روز چیکو پہلی بار ہمارے گھر میں آیا تھا۔ وہ جس طرح بلا توقع اچانک آیا تھا اسی طرح ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

اب تک ہمارا دل تین گہرے صدمے سہہ چکا تھا۔ پہلے خرگوش پی جو، کا صدمہ۔ پھر چنگی کا صدمہ اور اب چیکو کی موت کا صدمہ، یہ تینوں صدمے بہت گہرے تھے جو آج بھی ہمارے سینے میں دفن ہیں۔ ان تینوں پالتو جانوروں کی موت نے ہمیں جو دکھ پہنچائے تھے ان کے بعد ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اب آئندہ کوئی پالتو جانور نہیں پالیں گے۔

ہماری ایک فلم کا ایک گیت بہت مشہور ہوا تھا۔

تھا فیصلہ نہ پیار کریں گے کسی سے ہم نے بھی سوچ لیا تھا کہ بس بہت دکھ سہہ لیے۔ اب کوئی پالتو جانور نہیں پالیں گے۔ دنیا میں دوسرے دکھ اور غم کیا کم ہیں کہ آپ پالتو جانوروں کے غموں کو بھی لے کر

بزرگوں نے درست کہا ہے کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ اپنی عزیز ترین ہستی سے بچھڑنے کا غم بھی انسان بالآخر بھول جاتا ہے۔ قدرت نے نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ ہر مرنے والے کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ عزیز ترین ہستیاں، ماں، باپ، بہن بھائی اور دوسرے جان سے زیادہ عزیز رشتے دار اور دوست دنیا سے چلے جاتے ہیں لیکن انسان کو رفتہ رفتہ صبر آتی جاتا ہے اور زندگی کا پیہیہ اسی طرح رواں دواں رہتا ہے۔

ایک شام پارو بہت زیادہ بیجان اور خوشی میں مبتلا آئی اور اعلان کیا۔ ”پاپا، ماما، آپ، سب گھر والوں لو۔ ہمارے گھر میں ایک نیا مہمان آیا ہے۔“

سب نے حیران ہو کر دیکھا۔ پارو نے اپنے دوپٹے کے پلو کو ہٹا کر ایک چند ہفتے کا بلی کا بچہ سامنے قالین پر رکھ دیا۔ یہ بچہ بہت خوبصورت تھا۔ سفید اور براؤن رنگ، نیلی آنکھیں، جسم کا نرم رواں اور موٹی سی دم۔ بلی کے بچے نے گود سے اترتے ہی تکلف کرنے کے بجائے اچھلنا کودنا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی دیکھنے والوں کے دل بھی اچھلنے لگے۔

نادیدہ نے پوچھا ”بلی کا بچہ تم کہاں سے لائی ہو؟“

”آپ!۔ یہ گیارہ بج میں بیٹھا ہوا تھا۔ شاید راستہ بھول گیا ہے۔ چپ چاپ ایک کونے میں دبکا ہوا بیٹھا تھا۔ دیکھو تم کتنا پیارا ہے۔ ہیں نا؟“

ہم نے کہا۔ ”پارو، یہ بہت پیارا ہے مگر ہم اسے نہیں پالیں گے۔“

”کیوں پاپا۔ آپ کو پیارا نہیں لگا؟“

”بہت پیارا لگا ہے۔ اسی لیے اس کو نہیں پالیں گے۔“

پارو نے حیران ہو کر دیکھا ”پیارا بھی لگا ہے پھر بھی آپ اسے کیوں نہیں پالیں گے۔“

”پہلے جو پالے تھے وہ اب کہاں رہے؟“

پارو نے بہت فلسفیانہ بات کی ”پاپا۔ دنیا میں تو آتا جاتا لگا ہی رہتا ہے۔ انسان ہو یا جانور۔ جو بھی دنیا میں آتا ہے ایک دن تو اس کو جانا ہی ہوتا ہے۔“

”بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بچہ تم وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے لائی ہو۔ ہو سکتا ہے اس کی ماں اس کی تلاش میں ہو اور ڈھونڈتی ہوئی اس کو پالے۔ یا اس کو خود ہی اپنا گھر یاد آجائے۔“

پارو نے کہا۔ ”پاپا۔ دیکھئے۔ یہ چیکو ہی کا بچہ لگتا ہے۔“

کیا آپ چیکو کے بچے کو گھر سے نکال دیں گے؟

”تم کو کیسے معلوم کہ یہ چیکو کا بچہ ہے؟“

”اس کا رنگ دیکھئے۔ بالکل چیکو جیسا ہے۔ اس کا منہ دیکھئے۔ چیکو کی طرح ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھیں بالکل چیکو جیسی ہیں۔“

پارو نے اتنی دلیلیں دیں کہ مجبوراً ہم اس بلی کے بچے کو پالنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اور سوال یہ تھا کہ اس کا نام کیا رکھا جائے۔ یہ بلی بھی اس لیے اس کا نام بھی زنانہ ہی ہونا چاہیے تھا۔ سب بچوں نے گم ہو جانے والی ”لوسی“ کی یادیں تازہ کرنے کے لیے اس بلی کے بچے کا نام بھی ”لوسی“ رکھ دیا۔

لوسی کو دودھ پلانے کے لیے ایک فیڈر منگایا گیا۔ اس کے لیے ایک کمرے کے گوشے میں آرام دہ بستر بنادیا گیا۔ اس کو پوتی ٹرینڈ کرنے کے لیے چیکو کے ٹوائسٹ میں لے جا کر اس کو تربیت دینے کی کوشش کی گئی لیکن یہ بات لوسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس کو جب ریت اور مٹی سے بھرے ہوئے کوٹھے میں بٹھایا جاتا تو وہ ریت اور مٹی سے کھیلنا شروع کر دیتی تھی اور کچھ دیر بعد چھلانگ لگا کر اس سے باہر نکل جاتی تھی۔ یہ گھر والوں کے لیے ایک مسئلہ تھا کہ لوسی کے ٹوائسٹ کے لیے کیا بندوبست کیا جائے کہ وہ گھر کے کمروں کو اس مقصد کے لیے استعمال نہ کرے۔

لوسی چیکو کی طرح بہت زیادہ شوخ و شریار اور کھلندری نہیں تھی۔ اگر کہا جائے کہ وہ بہت سنجیدہ اور غور و فکر کرنے والی بلی تھی تو غلط نہ ہوگا۔ جب وہ بڑی ہوئی اور فیڈر کے بجائے اس کو پیالے میں دودھ دیا گیا تو وہ بہت دیر تک بیٹھی غور کرتی رہی اور سب گھر والے اس کو دیکھتے رہے۔ آخر اس نے پیالی میں منہ ڈال دیا اور دودھ پینا شروع کر دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لوسی اب بچپن کی عمر سے نکل کر لڑکپن میں داخل ہو چکی تھی۔ اس کو کھیلنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب کاغذوں کی ایک گیند بنا کر اس کے سامنے پھینکی گئی تو گیند کے پیچھے بھاگنے یا اس سے کھیلنے کے بجائے وہ خاموش بیٹھی اس گولے کو دیکھتی رہی۔ اس سے ثابت ہوا کہ وہ غور و فکر کرنے والی ایک فلسفی قسم کی بلی تھی۔ البتہ اس میں اور چیکو میں یہ فرق تھا کہ لوسی گھر والوں کے پاس گھس کر بیٹھنا اور رات کے وقت ہمارے بیڈ پر سونا پسند کرتی تھی۔

جوان ہو کر لوسی بہت خوبصورت بلی بن گئی۔ اس کی دم اور زیادہ موٹی ہو گئی۔ وہ جب فرش پر بیٹھ کر اپنی دم کو

حرکت دیتی تھی تو فرش کا وہ حصہ صاف ہو جاتا تھا۔ اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس سے گھر کے فرش کی صفائی کا کام جائے۔ اس کو مختلف جگہوں پر بٹھایا جائے اس طرح فرش صاف ہو جائے گا۔ مگر لوسی اس سازش کو بھانپ گئی ہر جگہ بیٹھ کر وہ دم نہیں ہلاتی تھی بلکہ وہاں سے اٹھ کر کسی صوفے یا بیڈ پر بیٹھ جاتی تھی۔

لوسی ہم سے اور ہمارے کمرے سے بہت زیادہ مانوس تھی اور زیادہ تر ہر وقت ہمارے کمرے میں ہی گزارنا چاہتی تھی۔ اس کو گود میں بیٹھنے کا بھی بہت شوق تھا حالانکہ چیکو کو پکڑ کر بھی گود میں بٹھایا جاتا تو وہ زور لگا کر اٹھ جاتا تھا، ہاں برابر ہاتھ بیٹھنے کا وہ شوقین تھا۔ جس کے برابر بیٹھتا تھا تو اسے پیار سے چمکنے اور سہلانے میں بہت مزہ آتا تھا۔ وہ خود بھی اس سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اس کے برعکس لوسی کی خواہش ہوتی تھی کہ جو اس کو پیار کرے وہ اس کی گود میں جا کر بیٹھ جائے۔

ہم نے اپنے۔۔۔ بیڈروم میں ایک چھوٹی سی میز اور نازک سی کرسی رکھ لی تھی اور لائبریری میں جا کر لکھنے کے مقابلے میں ہم اس میز پر بیٹھ کر لکھنا پسند کرتے تھے، جب ہم لکھنے کے لیے کرسی پر بیٹھتے تو لوسی کہیں سے آ جاتی اور اچھل کر ہماری گود میں بیٹھ جاتی تھی۔ ایک دن لپٹی نے ہم سے کہا کہ آپ کو جب بھی لکھنا ہو جلدی کرسی پر بیٹھ جایا کیجیے۔

”وہ کس لیے؟“

”اس لیے کہ جب تک آپ کرسی پر نہیں بیٹھتے لوسی میز اور کرسی کے آس پاس آپ کے بیٹھنے کے انتظار میں منڈلاتی رہتی ہے۔ جتنی دیر ہوتی ہے اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔“

ہم نے آزما کر دیکھا تو یہ بات درست تھی۔ ہم جان بوجھ کر کرسی کے آس پاس بیٹھتے رہے۔ کبھی کھڑکی کے پاس جا کر باہر جھانک لیتے مگر انکھیں اس سے ہم نے دیکھا تو وہ لوسی کا لین پر بیٹھی منتظر نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ جب ہی ہم کرسی پر بیٹھے وہ فوراً کود کر ہماری گود میں بیٹھ گئی۔ اس میں بیٹھنے کے بعد اس کی خواہش ہوتی تھی کہ ہم اس کو کچھ بھی کریں۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو وہ اپنے نازک پنجے میز پر رکھ کر ہمیں یاد دلانی کہ کیا آپ بھول گئے؟ میں آپ کی گود میں بیٹھی ہوں۔

اس کے بعد ہم نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک ہاتھ سے لکھتے اور دوسرے ہاتھ سے اس کا سر اور گردن سہلاتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کو نیند آ جاتی اور وہ سو جاتی لیکن جیسے ہی

ہم اس کو سوتا سمجھ کر اسے سہلانا بند کرتے وہ فوراً اپنے پنجے میز پر کاغذوں کے اوپر رکھ دیتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ معمول بن گیا۔ ہم نے پہلی بلی دیکھی جو جاڑوں کے موسم میں رات کو ہمارے پاس آ کر ہاتھ پیر پھیلا کر اور کروٹ لے کر لیٹ جاتی تھی اور وہیں سو جاتی تھی۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ انسانیوں کی طرح کروٹ لے کر لیٹ جائے۔ یہ اس کی نرالی عادت تھی۔ لوسی کو عام طور پر گھر سے باہر نہیں جانے دیا جاتا تھا لیکن جب اس کو ٹوائسٹ کے لیے باہر جانے کی ضرورت پیش آتی تو وہ باہر جانے والے دروازے کے پاس جا کر بیٹھ جاتی اور دروازے میں لٹکی ہوئی چابی کو اپنے ہاتھوں سے پھینکتی، اس آواز سے سب گھر والوں کو معلوم ہو جاتا تھا لوسی دروازے پر پہنچ گئی ہے اور گھر سے باہر جانا چاہتی ہے۔ یہ طریقہ اس نے خود ہی اختیار کیا تھا۔ کسی نے اس کو سکھایا نہیں تھا۔ یہ اس کی صفائی پسندی تھی کہ اس نے کبھی گھر کے اندر گندگی نہیں پھیلائی۔ اس زمانے میں آس پاس کے گھروں کی پالتو بلیوں یا آوارہ بلیوں کے بچے بھی ہمارے گھر میں باورچی خانے کے دروازے کے باہر اٹھتے ہو جاتے تھے۔ یہ ان کے بچے کا وقت ہوتا تھا اور انہیں باقاعدہ دودھ، دودھ ڈیل روٹی یا کوئی اور چیز کھانے کے لیے دی جاتی تھی۔ وہ صبح باورچی خانے کے دروازے کے باہر بیٹھ کر انتظار کرتے تھے۔ اندر کبھی نہیں آئے۔ لوسی بہت کشادہ دل تھی۔ ان غیر بلیوں، کو دودھ پلانے کا اس نے کبھی برا نہیں مانا۔ اگر کبھی گھر والے یا باورچی باہر بیٹھے بلی کے بچوں کی آمد سے بے خبر ہوتا تھا تو لوسی دروازے کے پاس جا کر میاؤں میاؤں کی آوازیں نکال کر یہ اطلاع دیتی تھی کہ مہمان آ گئے ہیں۔ انہیں بچ دے دیا جائے۔

لوسی دیکھتے ہی دیکھتے بڑی ہو گئی مگر اس کی نزاکت کی وجہ سے ہم لوگوں کو احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ بڑی ہو چکی ہے اور اب اس کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ ڈھونڈنا چاہیے۔ جب گھر والوں نے اس کا گھر بسانے کی طرف توجہ نہیں دی تو اس نے خود ہی ایک بوائے فرینڈ ڈھونڈ لیا مگر وہ بھی ڈیٹ پر اپنے بوائے فرینڈ کو گھر لے کر نہیں آئی جس کی وجہ سے ہم اس سے خبر ہی نہ رہے۔

جب لوسی ماں بننے والی ہوئی تو گھر والوں کو خبر ہوئی کہ گھر میں مہمان آنے والے ہیں۔ بلیاں عام طور پر ایک وقت میں تین چار بچے دیتی ہیں مگر لوسی نے صرف ایک بچے کو جنم دیا۔ گھر والوں نے کھوج لگانے کی بہت کوشش کی مگر یہ نہ جان

سکے کہ لوسی نے بچے کو کہاں جنم دیا ہے۔ مگر ہم جانتے تھے کہ بلیاں اپنے بچوں کو ایک جگہ نہیں رکھتیں۔ ان کی حفاظت کے خیال سے اپنے بچوں کو مختلف جگہوں پر رکھ دیتی ہیں۔

ایک دن لوسی ہمارے کمرے میں آئی۔ ہم مطالعے میں مصروف تھے۔ لوسی نے کمرے کے تین چار چکر کاٹے اور پھر رخصت ہو گئی۔ چند لمحے بعد وہ ایک بچے کو منہ میں لٹکائے ہوئے اندر آئی۔ مختلف کونوں اور الماریوں کا جائزہ لیا اور پھر سب سے زیادہ محفوظ جگہ اس کو ہماری قمیص ہی نظر آئی۔ اس نے ہماری پشت کی طرف سے آ کر اپنے بچے کو ہماری قمیص کے اندر چھپا دیا۔ ہماری کمر میں بچے کے نرم جسم کی وجہ سے گد گدی ہونے لگی مگر ہم خاموش بے حس و حرکت بیٹھ رہے تاکہ لوسی بچے کو اٹھا کر کہیں اور نہ لے جائے۔

لوسی بچے کو ایک محفوظ جگہ پہنچا کر کمرے سے رخصت ہو گئی تو ہم نے پشت کی طرف ہاتھ بڑھا کر بچے کو اٹھا لیا۔ اس خوبصورت ننھے سے بچے کو دیکھ کر ہم دیکھتے ہی رہ گئے اتنا خوبصورت بلی کا بچہ ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سر سے دم تک برف کی طرح سفید اور چمکدار تھا۔ جسم پر کسی جگہ کسی اور رنگ کا دھبہ تک نہ تھا اس کی دم موٹی تھی۔ رواں بہت نرم اور روئی کے گالوں کی طرح پھولا پھولا تھا جس کی وجہ سے اس کو چھو کر ہی بے حد لطف آتا تھا۔ بلی کے بچے کی آنکھیں بلور کے شیشوں کی طرح نیلی تھیں۔ ہم بہت دیر تک اس پیارے سے کھلونے کو دیکھتے رہے اور سوچتے رہے کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی مخلوق کس قدر حسین ہوتی ہے۔ لوسی نے کچھ دیر بعد آ کر کمرے میں جھانکا۔ دراصل وہ اپنے بچے کی دیکھ بھال کے لیے آئی تھی کہ وہ خیریت سے اور محفوظ تو ہے۔ ہمیں اس بچے کے ساتھ کھیلنے ہوئے دیکھ کر وہ ہمارے پاس آئی۔ بچے کو سونگھا یعنی پیار کیا اور پھر ہماری گود میں بیٹھ گئی۔ جیسے کہ اس کے بچے کی دیکھ بھال کرنے کا شکر یہ ادا کر رہی ہے۔

اگلے دن اسی بچے کو لے کر کہیں دور چلی گئی۔ یہ صحیح ہے کہ بلیاں اپنے بچوں کو ابتدائی دنوں میں کم از کم سات مختلف جگہوں پر ضرور رکھتی ہیں۔ ہمارے گھر میں پتی ہوئی بلیوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ ہمارا ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ہے۔

چند دن کے بعد لوسی اپنے بچے کو گھر میں لے آئی۔ یہ بچہ اپنی ماں کے مقابلے میں زیادہ شوخ اور کھلندرا تھا۔ ہم نے مانتا کا یہ منظر بھی دیکھا کہ لوسی جیسی آرام طلب اور سنجیدہ بلی اپنے بچے کی خاطر کیسی کھلندری ہو گئی تھی۔ دونوں ماں بیٹا سارے گھر میں ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگتے

خواب گاہ میں چیتا

اسلم فرخی

کسی شکاری کی خواب گاہ میں چیتا خود آجائے، شکاری کی آنکھ کھلے تو اس کے بستر کے قریب کھڑا چیتا نظر آجائے تو اس پر کیا گزرتی ہے۔ ایک مشہور شکاری کی خودنوشت سے ایک دلچسپ قصہ۔



شکاریات کا مزہ لینے والوں کے لیے ایک انوکھا واقعہ

اگلی صبح آنکھ کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ موسم خوش گوار ہے۔ میں نے گوشت کو بیدار کیا۔ رات دیر سے سونے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں نیند تھی۔ بہر حال وہ اٹھ گیا کیونکہ ہمیں ابھی شیر کے شکار پر جانا تھا۔ وہ شیر علی الصبح دریا پر پانی پینے آتا تھا۔ کیمپ میں ابھی کوئی اور سوکر نہیں اٹھا تھا۔ رستم جو ہمارا ہاتھی ہے، وہ کہیں دکھائی نہیں دیا۔ پوچھتے تو کس سے پوچھتے وہاں سب پڑے سو رہے تھے۔ گوشت کے جلنے سے اسٹو وجلایا اور ہم دونوں کے

رہتی تھی۔ ہم سب گھر والے بھی بلوری کی صحت مندی کے دعا کرتے رہتے تھے مگر نہ کسی دوائے کام کیا نہ ہی دعا کا کام ہوئی۔ ایک شام بلوری چپکے سے لوسی اور ہم سب کو روتا ہوا گھر کر دینا سے رخصت ہو گیا۔

بلوری کا مرنا ہم سب کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ سے کم نہ تھا۔ وہ ہمارے ساتھ بہت کم عرصے رہا لیکن اپنی پادوں کا گہرا نقش چھوڑ گیا۔ اس کے سوگ کے طور پر کہ میں فی وی بھی نہیں چلایا گیا۔ ایک عجیب سنگین سی خاموشی سارے گھر والوں کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ بچے اور بزرگ لوگ کئی دن تک اس کو یاد کر کے آنسو بہاتے رہے۔

لوسی پر کیا گزری؟ آخر وہ ایک ماں تھی اور بلوری اس کا پہلو بھی کا اٹھوتا بچہ تھا۔ اس نے کئی دن تک کھانا نہیں کھا چپ چاپ ایک کونے میں پڑی رہی تھی۔ نہ اس کی آواز سنائی دی نہ ہی وہ بھاگتی دوڑتی نظر آئی وہ اپنے طور پر اپنے بچے کی موت کا ماتم کرتی رہی۔ اب ہم سب لوسی کی طرف سے بہت فکر مند تھے۔ اس کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔

ڈاکٹر نے کہا کہ اس کو اپنے بچے کی موت کا گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ ہم نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب انسانوں کو تو گہرا صدمہ پہنچتا ہے مگر لوسی تو ایک بلی ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”مگر بے جاندار، اس کے اندر مامتا کا جذبہ بھی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بچے کی موت کے بعد اس طرح سوگ کیوں مناتی؟“ ڈاکٹر صاحب نے لوسی کو کھلانے کے لیے کوئی دوا نہیں دی۔ بس تسلی دے کر رخصت کر دیا۔

اس واقعے کو ایک دو روز ہی گزرے تھے کہ لوسی اچانک غائب ہو گئی۔ اس کو چاروں طرف تلاش کیا۔ اس پاس کی کوٹیوں کے رہنے والوں سے معلوم کیا لیکن لوسی کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اس سے پہلے کتیا لوسی بھی اچانک ہی طرح غائب ہوئی تھی۔ اب اس کی ہم نام بلی بھی پر اس طرح طور پر غائب ہو گئی تھی کہیں اس لیے تو نہیں کہ یہ دونوں نام تھیں؟ اگر ایسا نہ تھا تو پھر لوسی پہلی لوسی کی طرح اچانک غائب کہاں ہو گئی؟ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نکل گیا؟

لوسی اور اس کے بچے کی قریب قریب ایک سالہ گمشدگی پر کئی دن تک ہمارے گھر میں سوگ کا عالم رہا لیکن پھر رفتہ رفتہ صبر آ گیا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ نے عجیب نظام بنایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہر شخص اپنے پیاروں کے ساتھ مر جاتا اور اس طرح دنیا کی آبادی نصف رہ جاتی!

(جاری ہے)

پھر رہے ہیں۔ کبھی صوفے پر، کبھی بیڈ پر، کبھی سیڑھیوں پر چھلانگیں لگا رہے ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے دونوں آنکھ کھولی کھیل رہے ہیں۔ جب لوسی کھیلتے کھیلتے تھک جاتی تو آرام سے فرش پر بیٹھ جاتی تھی۔ مگر بچہ مزید کھیلنا چاہتا تھا۔ کبھی اس پر چھلانگ لگاتا۔ کبھی اس کے پاس جا کر اس سے چھیڑ خانی کرتا۔ لوسی اس کو یوں دیکھتی تھی جیسی کہہ رہی ہو کہ دیکھو بیٹا۔ میں تھک گئی ہوں۔ اب مجھے آرام کرنے دو۔

مگر بچہ کہاں ماننے والا تھا۔ اس کے اندر تو بجلی سی بھری ہوئی تھی۔ آخر اس کی ترکیب لوسی نے یہ نکالی کہ بیٹھے بیٹھے اپنی موٹی خوبصورت دم کو کبھی دائیں جانب اور کبھی بائیں جانب حرکت دیتی اور بچہ اس کی دم پکڑنے کے لیے دائیں بائیں اچھلتا رہتا۔

لوسی اور اس کا بچہ سارے گھر کے لیے کھلنا تھے۔ ہم سب ان کی بھاگ دوڑ کا تماشا دیکھتے رہتے تھے۔ لوسی کے بچے کا ابھی تک کوئی نام نہیں رکھا گیا تھا۔ دراصل وہ اس قدر خوبصورت تھا کہ کسی ایک نام پر تصفیہ نہیں ہو سکا تھا۔

کوئی اس کو بلوری کہتا۔ کوئی نیلا کہہ کر پکارتا۔ کوئی اس کو ”گورا“ کہتا تھا۔ لوسی اور اس کے بچے کی بے شمار تصویریں بنائی گئی تھیں۔ گھر کے ہر فرد نے یہاں تک کہ نوکروں نے بھی فرمائش کر کے بھوری کو گود میں لے کر تصویریں بنوائیں۔ ہمارے گھر جو بھی ملاقاتی آتا وہ ہم سب کو بھول کر بس بلی کے بچے ہی کو دیکھنے میں مصروف ہو جاتا تھا۔ مہمانوں کے آنے والے بچے اس کے ساتھ کھیلتا اور تصویریں بنوانا ضروری سمجھتے تھے۔

بلوری ابھی ڈیڑھ ماہ کا بھی نہ ہوا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ اس نے بھاگ دوڑ ترک کر دی۔ چپ چاپ بیٹھا یا لیٹا رہتا تھا۔ لوسی اس کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ اس کو چومتی، چاٹتی، پیار کرتی مگر وہ کھیلنے پر آمادہ نہ ہوتا۔ اس نے کھانا پینا بھی بہت کم کر دیا تھا۔ ہم لوگ اس کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر دیر تک اس کا معائنہ کرتا رہا آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ بلوری کو ایک لاعلاج بیماری ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر نے اس کو انجکشن بھی لگایا۔ دوائی بھی دی مگر اس کی حالت روز بروز بگڑتی رہی۔ اس کی بیماری کی وجہ سے لوسی کی پریشانی دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ ایک بے زبان جانور تھی مگر یقیناً اپنی زبان میں اللہ سے اس کی صحت اور تندرستی کے لیے دعا کرتی ہوگی۔ بلوری کے ساتھ ہی لوسی نے بھی کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ سارے گھر میں بے چین سی پھرتی رہتی اور پھر اپنے بچے کے پاس آ کر اس کو پیار کرتی

لیے ناشتا تیار کیا۔ ہم نے جلدی جلدی پراٹھے کے نوالے حلق سے اتارے اور جنگل کی طرف چل پڑے۔ اندازہ تھا کہ اگر وہ کہیں دور نہیں گیا ہوگا تو ہم اسے تلاش کر لیں گے۔ گاؤں کے اختتام پر بہت سے دیہاتی ملے ان میں سے ایک نے بڑھ کر مجھے سلام کیا اور رستم کے بارے میں بتایا کہ وہ کیمپ سے نکل کر یہاں تک آ گیا تھا اور خواہ خواہ چٹکھاڑ رہا تھا۔ انہوں نے اسے قابو میں کر لیا ہے۔ میں نے پوچھا کیسے تو انہوں نے بتایا کہ دوسرے ہاتھیوں کی مدد سے۔ کچھ فاصلے پر گیا تو میں نے اسے بندھا ہوا دیکھا۔ دیہاتیوں نے اسے اس طرح سے باندھا تھا کہ وہ قیامت تک وہاں سے ہل نہیں سکتا تھا۔ یہ طریقہ خاص طور پر آسام کے شکاری استعمال کرتے ہیں۔ وہ بے بسی سے سر جھکائے کان ہلا رہا تھا۔ اس کے آگے چند گتے پڑے تھے، مگر اس کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ہم نے اطمینان کا گہرا سانس لیا اور دائیں جانب چل پڑے تاکہ دریا تک پہنچ سکیں۔ ہمارے لیے اونچے درختوں پر پاڑ باندھ دیا گیا تھا۔ جب ہم مچان پر جا کر بیٹھ جاتے تو ہانکا دینے والے ہانکا لگاتے۔

دریا کی طرف جانے والا راستہ کچھ طویل تھا۔ اس لیے گوگلے کہنے لگا۔ ”سنا ہے کہ آپ کی کچھلی مہم بہت ہولناک تھی اور چیتا آپ کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا تھا! وہ واقعہ سنائیے نا؟“

”ہاں وہ ظالم معلوم نہیں کیسے وہاں تک آ گیا تھا۔“ میں نے رومال سے پسینا صاف کرتے ہوئے کہا۔ صبح کا وقت تھا، لیکن جس ابھی سے چھکے چھڑائے دے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ حلق خشک ہو رہا ہے۔ میں نے خیالات کو مجتمع کیا اور کہنا شروع کیا۔ ”یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میں انگلستان سے بھاگ پورا آیا تھا۔ وہاں ترائی میں جنگل پڑتا ہے جہاں میرا کیمپ لگایا گیا تھا۔

لوگوں نے بتایا کہ جنگل میں ایک چیتا اچھلتا کودتا پھرتا ہے اور اسے کسی کا خوف نہیں ہے۔ وہ ہماری گائے اور بکریوں کو مار ڈالتا ہے اور انہیں گھسیٹتا ہوا جنگل میں لے جا کر تیا پانچا کر دیتا ہے۔ جب ہم جنگل میں جاتے ہیں تو ہمارے ہاتھ ہڈیاں ہی آتی ہیں، جانور آج تک سلامت نہیں ملا۔ ہم میں سے کسی کو بددوق چلانا نہیں آتی۔ اس لیے کہ ہمارا تو کام بس کپڑا اُبتنا ہے۔ ہمارے باپ دادا نے بھی بددوق ہاتھ میں نہیں لی۔ البتہ تصویر میں ضرور دیکھی ہے۔

میں نے انہیں تسلی دی کہ وہ پریشان نہ ہوں، میں نے اپنی ساری زندگی جنگلات میں ان وحشیوں کا مقابلہ کرنا گزاری ہے۔

میرا کیمپ ایک دریا کے کنارے تھا۔ دریا کا پانی صاف ستھرا اور حیات بخش تھا۔ اس سے گاؤں سیراب ہو رہا تھا، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کب سے اس آبادی کے قریب سے گزر رہا تھا۔

گیہوں کی فصل پک کر تیار ہو چکی تھی۔ اس کی کٹائی اور ڈھلوانی وغیرہ کی جارہی تھی۔ اس لیے میرا تمام دن مصروفیت میں گزرا۔ میں جس زمین دار کے ہاں ٹھہرا تھا، اپنی شان دار مسہری پر بیٹھا اگلی فصل تیار کرنے کے احکام صادر کر رہا تھا۔ وہ مختلف کاموں کے لیے رقم دے رہا تھا۔ اس کے قریب دو فنی بیٹھے زکل کے قلم سے حساب کتاب کر رہے تھے۔ وہ صورت سے ہی بیوی باری معلوم ہوتے تھے۔ وہاں آنے والے کسان اہلی اور نیم کے گھنے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر چلم یا حقہ پیتے رہے۔ ان میں سے کسی نے اس وقت مجھے لفت نہیں کرائی۔ بہر حال وہ چاہتے تھے کہ اس چیتے سے چھٹکارا نصیب ہو جائے۔

اس روز بلا کی گرمی تھی اور مغرب کی طرف سے جنم زار ہوائیں چلتی رہیں۔ ٹھنڈا پانی پی پی کر میرا تو برا حال ہو گیا۔ خیمے میں لکڑی اور کپڑے کا چٹکھا لگا ہوا تھا، لیکن اس سے بھی گرمی دور نہیں ہو رہی تھی۔ بالآخر سورج ڈوب گیا تو قدرے ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں، پھر کچھ سکون محسوس ہوا۔ وہ ملازمین جو برگد کی مٹھی چھاؤں میں سو رہے تھے، اٹھ کر کام کاج کرنے لگے۔ انہوں نے گھوڑوں کو دانہ پانی ڈال دیا اور کتوں کو کھول دیا تھا۔ اچانک تیز ہوا چلنے لگی تو اہم کاغذات اڑنے لگے۔ منشیوں نے انہیں سمیٹا اور اپنے گرم جوتے پہن کر فرشی سلام کیا اور وہاں سے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد گاؤں کا کھیا وہاں آن پہنچا۔ جاگیر دار کے سامنے احکام صادر کرنے لگا۔ کون کون کام پر جائے گا؟ کس کس کی تیل گاڑی مال خانے جانے گی۔ ان انتظامات کو طے کرنے کے بعد اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور اس چیتے کا تذکرہ کیا۔ اس نے بتایا کہ گاؤں والے اس سے بے حد پریشان تھے۔ اس لیے کہ گزشتہ رات بھی وہ ایک بچھڑا کھینچ کر لے گیا تھا۔

میں نے اسے دریا کے کنارے مچان بندھوانے کی ہدایت کی اور بتایا کہ ہانکا کس وقت لگایا جائے گا۔ زمین دار

میرم نے دم دلا سا دیا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ اینڈرسن بابا اسی مقصد کے لیے تشریف لائے ہیں۔ وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔

ان لوگوں نے رات کا کھانا میرے لیے خاص اہتمام سے تیار کیا تھا۔ میں انڈیا میں اتنا زیادہ رہا ہوں اور میں نے اپنی زندگی جنگلوں میں ہی بسر کی ہے، اس لیے میں ان کے مہرج مسالوں کا عادی ہو گیا ہوں۔ چنانچہ جب ان لوگوں نے میرے لیے سالن والا مرغ تیار کیا تو اسے کھانے میں میں نے کوئی عارضہ نہیں سمجھی۔

اس کے بعد میں نے وہ سسکی کا ایک جام چڑھایا اور پھر ان اخبارات کو کھول کر بیٹھ گیا جو گاؤں کا ایک کسان میرے لیے دس میل کے فاصلے سے دوسرے گاؤں کے انجین سے لایا تھا۔ وہ اخبارات انگریزی کے تھے اس لیے اور کہیں نہیں ملتے تھے۔

اخبارات کا مطالعہ کرنے کے دوران مجھے نیند آنے لگی تو میں نے سوچا جانا ہی بہتر سمجھا، اس لیے کہ گرمی میں جلد سونا اور صبح جلد اٹھنا بہتر ہوتا ہے۔ صبح کا وقت ٹھنڈا ہوتا ہے، اس لیے انسان خود کو تروتازہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ سورج کی شعلہ بارکروں کے پھیلنے سے پشتر اٹھنے میں حرج آتا ہے۔

اس خیال سے کہ خیمے میں ٹھنڈی ہوا آتی ہے، میرے ملازمین نے اطراف کی قاتیں علیحدہ کر دی ہیں، مگر ٹھنڈی ہی دیر بعد ہوا بند ہو گئی اور وہی جس مسلط ہو گیا۔ دور سے گاؤں والوں کی آوازیں میرے کانوں میں آرہی تھیں۔ موسیقی مختلفوں میں ہی تھا۔ میں چونک اٹھا میں کافی عرصے سے قیام پذیر تھا اس لیے میں نے اپنا کام چلانے کے لیے بولیاں سکھ لی تھیں۔

کیمپ کے لوگ کھانا ہضم کرنے کے لیے مپ شپ کر رہے تھے۔ میرے کتے جنہیں میں اپنے ساتھ انگلستان سے لایا تھا گرمی سے بے تاب رہے تھے۔ دور کہیں سے ڈھول بجانے کی آواز آرہی تھی جس میں جینا کی دل خراش آواز بھی شامل تھی۔ تاریکی میں اضافہ ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی خاموشی بھی ماحول کو اپنی گرفت میں لے رہی تھی اور ہر چیز کو لگتی جارہی تھی۔

میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں، لیکن نزدیک ہی کہیں گیدڑ بولنے لگے تو کتے بھونکنے لگے، لہذا آنکھ پھر کھل

ماسٹر پیارے لال، آشوب

(1838-1910ء) ادیب، دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ 1857ء میں آگرہ کالج سے سند پائی اور 1858ء میں بریلی میں سرکاری ملازم ہو گئے۔ 1864ء میں لاہور آکر سررشتہ تعلیم کے کورسٹر مقرر ہوئے اور تیس برس تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ 1884ء سے 1895ء تک دہلی اور جالندھر میں انسپکٹر آف اسکولز رہے۔ 1892ء میں حکومت سے رائے بہادر کا خطاب پایا اور پنجاب یونیورسٹی کے فیلو ہوئے۔ 1895ء میں ریٹائرڈ ہو کر دہلی میں سکونت اختیار کی اور وہیں وفات پائی۔ 1864ء میں دہلی لٹریچر سوسائٹی قائم کی۔ قیام لاہور کے زمانے میں کئی سال سرکاری اخبار کے ایڈیٹر رہے۔ مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کے دوست تھے۔ ”رسوم ہند“ کے پہلے تین باب اور قصص ہند کے حصہ اول اور سوم کے مصنف تھے۔ ان مشہور کتابوں کے علاوہ ترجمہ تاریخ انگلستان اور ترجمہ دربار قیصری بھی مرتب کیا۔

مرسلہ: شاہد نظیر، ساہیوال

گئی۔ کتے باہر چلے گئے۔ ملازمین نے انہیں آواز دے کر خاموش کرایا۔ گیدڑ کے آنے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ وہ محض چیزیں اٹھا کر لے جاتے ہیں یا پھر جوتے منہ میں دبا کر لے جاتے ہیں۔ معلوم نہیں ان جوتوں کو وہ پہنتے ہیں یا فروخت کر کے اپنے لیے مردار گوشت لے لیتے ہیں۔ کم از کم مجھے اتنا یقین تھا کہ وہ انہیں کھا نہیں سکتے۔

نیند اٹھ چکی تھی، اس لیے میں بے چین ہو گیا۔ گھوڑے گرمی سے پریشان ہو کر پاؤں پیچ رہے تھے۔ مجھے اپنے وطن کے حالات یاد آنے لگے۔ اپنی کاؤنٹی کے خدوخال نمایاں ہو گئے۔ چھوٹا سا چرچ، پن چکی، چھوٹی پہاڑیاں، رنگ برنگے پرندے، نزدیک بہنے والی ندی اور جنگل کی طرف سے لوٹ کر آنے والا چرواہا اور اس کی بھیڑیں۔ اس چرواہے کا نام ٹام روگ تھا۔ وہ بھیڑیں چرانے اور بانسری بجانے کے علاوہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اس کی صحت ہم سب کے مقابلے میں اچھی تھی۔ اس لیے کہ وہ خالص دودھ اور مکھن کا استعمال کرتا تھا۔

ایسے ہی انٹ خدث خیالات دماغ میں گردش کرتے رہے تو مجھے نیند کی دیوی نے آلیا۔ معلوم نہیں وہ رات کا کون سا

ترکی نمی نام

سرگزشت کا خاصہ ہے کہ دلچسپ اور انفرادیت کے حامل سفرنامے پیش کرتا ہے۔ جو صرف سفرنامہ نہیں معلومات کا خزانہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ سرگزشت کے مستقل قلمکاروں میں علی سفیان آفاقی جیسے کہنہ مشوق قلمکار بھی ہیں۔ عرصے سے قارئین اصرار کفران تھے کہ ان کے سفرنامے دوبارہ پیش کیے جائیں۔ پاک فلم نگری کو جب عروج حاصل تھا اور علی سفیان آفاقی فلم یونٹ کے ساتھ ملکوں ملکوں جایا کرتے تھے اس دور کے قصے تو وہ بیان کر ہی چکے ہیں لیکن جب جب سفر برائے شوق کیا اس دور کے قصے بھی کم دلچسپ نہیں وہی کچھ وہ سنار رہے ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخاست، جملوں کی خوبصورت ادائیگی اور روانی بہت کچھ آپ اس سفر کہانی میں پائیں گے۔



ترکی کے سفر کی دلچسپ روداد، سفر کہانی کی دوسری کڑی

بٹ صاحب استنبول کے اتر پورٹ سے بہت متاثر
نظر آئے تھے۔ وہ رہ کر کسی نہ کسی پہلو سے اتر پورٹ کی تعریف
کرتے ہیں مصروف تھے۔
میں نے کہا: ”بٹ صاحب۔ اب تو جہاز کراچی کا
مابینا مسرگزشت
اٹر پورٹ بھی بہت خوبصورت اور ماڈرن ہو گیا ہے۔“
بولے۔ ”لیکن استنبول کے اتر پورٹ کی کیا بات ہے؟“
”مثلاً آپ کو اس میں کیا خاص بات نظر آئی ہے؟“
کہنے لگے۔ ”یہاں رونق بہت ہے اور ہر چیز سلیقے کی
منی 2013ء

تھا جیسے مجھے کسی نے تور میں پھینک دیا ہو۔ چیتا دانت ٹکوسے
ہوئے تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ کیا
کرنا چاہیے۔

کرب و اذیت کے یہ ہولناک لمحات ختم ہوئے اور
چیتے نے اپنی گردن موڑ لی۔ ایک بار مڑ کر میری طرف دیکھا
جیسے وارننگ دے رہا ہو کہ خبردار اپنی جگہ سے نہ ہلنا۔ ورنہ
مجھے تمہاری نکال بوتلی کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

اس ناہنجار نے ایک سوتے ہوئے ملازم پر سے
جست لگائی اور نہایت بے تلی قدم رکھتا ہوا آگے بڑھ
گیا۔ جب وہ چھو لداری سے نکل گیا تو میں پوری طاقت
سے چیخا اور میں نے نیچے کے نیچے سے ریوالتور نکال کر دو فائر
کیے۔ میرا اندازہ تھا کہ ایک گولی چیتے کو لگی ہے۔ اس لیے کہ
اس نے منہ سے خوفناک آواز نکالی تھی۔

کتنے ہڑبڑا کر اٹھ گئے اور ملازمین میں سے بھی کچھ
جاگ گئے اور ایک دوسرے کو آوازیں دینے لگے۔ میں
چھلانگ لگا کر چھو لداری کے دائیں گوشے میں گیا اور میں
نے اپنی ریمنگٹن رائفل اٹھالی۔ اس رائفل سے میں پہلے
بھی شوریدہ سرچیتوں کا شکار کر چکا تھا۔

چیتا ایک درخت کے پاس کھڑا غرا رہا تھا۔ میں نے
ہلکی چاندنی میں دیکھا کہ اس کے ایک کان سے خون بہہ رہا
ہے۔ یقیناً میری چلائی ہوئی گولی اس کے کان پر لگی
تھی۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور فوراً رائفل سے
فائر کر دیا۔ ”دھام“ ایک ہولناک آواز آئی اور گولی چیتے
کے شانے پر لگی۔ وہ بری سے چیخا ہوا زمین پر گر گیا اور
لوٹنے لگا۔ سب خوف زدہ تھے اور کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ
اس کے نزدیک جائے۔

جب اس کی غرائشیں بتدریج ماند پڑ گئیں تو دیہاتی جو
وہاں جمع ہو گئے تھے اس کے نزدیک گئے۔ انہوں نے اس
چیتے کو ناپا تو اس کی لمبائی ۷ فٹ ۹ انچ نکلی۔ میری ایک ہی
گولی نے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔

وہ میری چھو لداری تک کیسے پہنچ گیا اور گٹوں نے
اس کی آمد کو محسوس کیوں نہیں کیا؟ ان سوالوں کا جواب اب
تک میرے پاس نہیں ہے۔ بہر حال میں اتنا جانتا ہوں کہ
اس کی کھال میری والدہ کی خواب گاہ کی زینت بنی ہوئی ہے
اور جب بھی میری نگاہ اس پر پڑتی ہے تو مجھے یاد آ جاتا ہے
کہ میں نے اپنی خواب گاہ میں اس کا شکار کیا تھا۔

پھر تھا جب مجھے نیند آئی تھی۔ یہ احساس البتہ تھا کہ لیمپ بجھ گیا
ہے، اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ مٹی کا تیل ختم ہو گیا ہو۔
معلوم نہیں میں کتنی دیر سویا تھا کہ پھر آنکھ کھل
گئی۔ میری آنکھیں بند تھیں اور خوف و دہشت کی ایک لہر
نے مجھے دبوج رکھا تھا۔ یہ میری چھٹی حس تھی جو مجھے آنکھ
کھولنے سے منع کر رہی تھی۔ چنانچہ میرے ہاتھ پاؤں شل
ہو رہے تھے اور میں حرکت نہیں کر پا رہا تھا۔

میں نے چاہا کہ ملازمین کو آواز دوں، لیکن حلق سے
آواز ہی نہیں نکل سکی۔ زبان تالو سے چپک گئی تھی۔ کچھ عجیب
سی کیفیت طاری تھی جیسے یقیناً لفظوں میں بیان نہیں کیا
جاسکتا۔ چھٹی حس بتا رہی تھی کہ میں خطرے سے دوچار ہوں۔
جب کچھ وقت اسی انداز سے گزر گیا تو میں نے آنکھ
کھولی تاکہ صورت حال سے آگاہ ہو سکوں۔ خیمے میں ہلکی
روشنی ہو رہی تھی اس لیے کہ چاند خیمے میں جھانک رہا
تھا۔ اس کی سحر انگیز کرنیں بستر تک آرہی تھیں۔ میرے بستر
سے دو فٹ کے فاصلے پر ایک تندرست و توانا چیتا کھڑا مجھے
گھور رہا تھا۔ اس کی دم خوفناک انداز میں بل کھا رہی
تھی۔ غالباً میں نے زندہ چیتے کو کبھی اتنے قریب سے نہیں
دیکھا تھا۔

اس کی آنکھوں میں جھانکنے سے یہ پتا نہیں چل سکا
کہ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ میرے سر پر پائے ناشتے
کے طور پر اپنے معدے میں اتارے گا یا کوئی پیغام خیر سگالی
لے کر میرے پاس آیا ہے؟

چھو لداری میں مکمل خاموشی تھی اور صرف گٹوں کے
خراٹوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان کی حیات نے انہیں یہ
قطعی نہیں بتایا کہ ایک چیتا داخل ہو چکا ہے اور ٹھیک میرے
سر پر سوار ہے اور مجھے قلمہ تر بنا کر نگلنے کی فکر میں ہے۔ خوف و
دہشت کی جس لہر نے مجھے لپیٹ میں لے رکھا تھا اس سے
آپ اسی وقت آگاہ ہو سکتے ہیں جب ایک چیتا آپ کی
خواب گاہ میں داخل ہو جائے اور اپنے ارادوں سے آپ کو
آگاہ نہ کرے۔ یعنی اضطراب و تشویش کو طول دیتا
رہے۔ مارے نہ اور مرنے بھی نہ دے۔

میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنے لوگوں کی
موجودگی میں وہاں تک کیسے پہنچ گیا؟ اس کی آمد کا کسی نے
نوٹس کیوں نہیں لیا؟

اس کی آنکھیں پھیل اور سکڑ رہی تھیں۔ میں پسینے سے
شرابور ہوا جا رہا تھا۔ گرمی تو پہلے ہی تھی اب ایسا معلوم ہو رہا

ہے۔ چہل پہل، گہما گہمی، مہذب ماحول۔ مسافر بھی کتنے اچھے ہیں؟“

خان صاحب کہنے لگے۔ ”مسافروں سے انٹرپورٹ کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ صاحب۔ مسافر منتخب کرنے کا حق کسی بھی انٹرپورٹ کو نہیں ہوتا۔ جو بھی مسافر سفر کرتا ہے چاہے وہ جیسا بھی ہو، انٹرپورٹ اس کا داخلہ تو بند نہیں کر سکتا۔“

”پھر بھی استنبول کے انٹرپورٹ میں ایک خاص بات ہے۔“

”سمجھ گئے؟ خاص بات یہ ہے کہ یہاں یورپین اور مغربی ملبوسات میں خواتین بہت زیادہ نظر آرہی ہیں اس لیے بٹ صاحب کو انٹرپورٹ بھی بہت اچھا لگ رہا ہے۔“ ہم نے کہا ”بٹ صاحب! کیا بات ہے؟ استنبول کے انٹرپورٹ پر اتر کر آپ نے ایک بار بھی لاحول نہیں پڑھی ہے۔“

”آپ نے دیکھا نہیں کہ استنبول ایک اسلامی ملک کا شہر ہے۔ جب ہوائی جہاز زمین پر اتر رہا تھا تو نیچے ہر طرف مسجدوں کی مینار ہی مینار نظر آرہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی مسجدوں اور میناروں کا شہر ہو۔“

”یہ تو آپ نے ٹھیک کہا۔ لیکن لاحول تو آپ مسافروں کو دیکھ کر پڑھتے ہیں۔ شہروں کو دیکھ کر نہیں۔“ ”دراصل میں ابھی جائزہ لے رہا ہوں کہ ابھی تو ہم شہر میں پہنچے بھی نہیں ہیں۔“

”گویا ابھی آپ نے استنبول کو رعایتی نمبر دے رکھے ہیں۔“

انٹرپورٹ سے استنبول شہر کا راستہ انتہائی خوبصورت تھا۔ ایک جانب نیلا سمندر جو بہت دور نیلے آسمان سے گلے ملتا ہوا نظر آرہا تھا۔ دوسری جانب خوشنما اور جدید کئی منزلہ عمارتیں۔ بہت دلکش نظارہ تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ استنبول کے تاریخی شہر میں بلند و بالا جدید عمارتوں کی اتنی بھرمار نہیں ہے جو ہمارے شہروں میں نظر آتی ہے۔ ہم نے تو اپنے شہروں کا حلیہ ہی بدل دیا ہے۔ ان کی روح قبض کر لی ہے۔ اب یہ روحوں سے محروم سینٹ اور لوہے کی اونچی عمارتوں میں تبدیل ہو چکے ہیں، قدیم تاریخی یادگاروں کو بھی مسمار کر کے ان کی جگہ نئی عمارتیں تعمیر کر دی گئی ہیں۔ مثلاً لاہور کی مال روڈ ہی کا ایک پھیرا لگائے تو بہت سی تاریخی قدیم یادگار عمارتیں اب غائب ہو چکی ہیں۔ شکر ہے کہ

لاہور یوں کے پر زور اور مسلسل احتجاج کے بعد حکومت نے مجبوراً باقی ماندہ عمارتوں کو محفوظ کر لیا ہے۔ اب ان عمارتوں کی بیرونی شکل و صورت کو تبدیل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ شاید اسی وجہ سے آپ کو گورنمنٹ کالج کی خوبصورت عمارت۔ پنجاب یونیورسٹی کی پرانی عمارت، عجائب گھر، ٹونشن مارکیٹ، بھنگیوں کی توپ، پوسٹ آفس کی عمارت۔ دیال سنگھ منشن، شاہ دین بلڈنگ اور اس کے بالمقابل پرانے جادو گھر کی عمارت نظر آ جاتی ہے ورنہ جس تیزی سے مال روڈ پر تاریخی قدیم عمارتوں کو مسمار کر کے ان کی جگہ نئی عمارتیں، پلازے اور شاپنگ سینٹر بن رہے تھے اگر ان پر پابندی نہ لگتی تو مال روڈ بالکل ہی نہیں پہچانی جاتی۔ ان کے دوسرے تاریخی شہروں میں پرانی عمارتوں اور یادگاروں کو بہت احتیاط سے سنبھالا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے آج بھی روم، لندن اور پیرس جیسے شہروں کی پرانی پہچان اور نشانیاں محفوظ ہیں۔ لندن اور پیرس میں تو ان عمارتوں کے بیرونی حصوں کو اس طرح چمکا کر رکھا گیا ہے کہ خیال ہوتا ہے کہ یہ حال ہی میں تعمیر ہوئی ہیں۔ روم کا بھی یہی معاملہ ہے۔ ان عمارتوں کے اندرونی حصوں میں ریسٹوران، شاپنگ سینٹر، سینیما گھر وغیرہ بن چکے ہیں لیکن بیرونی منظر میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔

استنبول وہ شہر ہے جس کی فتح کے لیے رسول اللہ ﷺ نے دعا فرمائی تھی۔ آپ نے فرمایا ”خوب ہو گا وہ لشکر جو رومن ایمپائر کے مرکز قسطنطنیہ کو فتح کرے گا۔“

رسول اکرم کی یہ دعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور مسلمانوں کی طرف سے شہر کو فتح کرنے کی متعدد کوششوں کی ناکامی کے بعد ترکی کے 21 سالہ سلطان فاتح محمد نے اس شہر کو فتح کر کے دنیا کو حیران کر دیا۔ خصوصاً عیسائی اور مغربی دنیا کے لیے اس ناقابل شکست شہر کو مسلمانوں کا فتح کرنا بہت بڑے ایسے سے کم نہ تھا۔ قسطنطنیہ پر اس زمانے میں رومن حکومت قابض تھی۔ شہر کو فتح کرنے کے لیے باسفورس کے راستے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ باسفورس کے راستے کو رومی حکومت نے کشتیوں کے حصار میں لے کر ناقابل رسائی بنا دیا تھا۔ سلطان محمد نے اس رکاوٹ سے بچنے کے لیے ایسی جنگی چال سوچی کہ رومن فوجیں حیران رہ گئیں۔ سلطان نے بڑے بڑے درخت کٹوا کر ہزاروں تختے بنوائے جنہیں چربی لگا کر چمکا کیا گیا۔ اس طرح سلطان نے اپنے بحری جنگی جہاز خشکی کے راستے باسفورس کو

مہر کر کے قسطنطنیہ تک پہنچا دیے۔ وہاں اپنی افواج اور بحری طاقت کو اکٹھا کر کے سلطان کی فوجوں نے ایسا بھرپور حملہ کیا کہ رومن فوجیں زیادہ دیر تک مقابلہ نہ کر سکیں اور ہتھیار ڈال دیے۔ اس طرح رسول اکرم کی دعا کی برکت اور سلطان محمد کی ذہانت اور بہادری کی وجہ سے یہ ناقابل تخریب شہر مسلمانوں نے فتح کر لیا۔ جب سلطان شہر کے اندر داخل ہوا اور ابابہ صوفیہ کے تاریخی گرجا گھر میں داخل ہوا تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک یہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں ہے اور اس کا نام تبدیل کر کے استنبول رکھ دیا گیا ہے۔ استنبول دنیا کا واحد شہر ہے جس کا نصف حصہ مشرق میں اور نصف مغرب میں ہے۔ درمیان میں ایک خلیج حائل ہے۔ ایک مضبوط کشادہ اور خوبصورت پل کے ذریعے دونوں حصوں کو جوڑا گیا ہے۔ دیکھئے دوسروں کو محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کس وقت مشرق سے مغرب میں پہنچ گئے ہیں۔ اب بظاہر ایک سیاح کو یہ ایک ہی شہر معلوم ہوتا ہے۔

بس نے ہمیں شہر کے نئے اور پرانے حصوں سے گزرا کر ٹریٹل پر پہنچا دیا۔ ٹریٹل پہنچ کر دل خوش ہو گیا۔ اتنی خوبصورت، صاف ستھری، سفید انڈے کی طرح چمکتی ہوئی عمارت۔ بٹ صاحب نے فوراً اٹھ کر باہر نکلنے کا ارادہ کیا مگر ہم نے انہیں روک دیا۔

”بٹ صاحب، صبر سے کام لیں۔ دیکھئے سب مسافر اقدار لگا کر باری باری باہر جا رہے ہیں، آپ کو اتنی بے تابی کیوں ہے؟“

خان صاحب بولے ”بٹ صاحب کو خراب عادتیں پڑی ہوئی ہیں۔ لاہور میں تو دھکے بازی کے بغیر کوئی کام ہی نہیں چلتا۔ ایک زمانے میں جب ہم دونوں فلم دیکھنے جاتے تھے تو ٹکٹ خریدنے کے لیے کھڑکی کے باہر ایک ہجوم دھکم پیل کرتا نظر آتا تھا۔ جو طاقور ہوتا تھا وہی کھڑکی تک پہنچ کر ٹکٹ خرید سکتا تھا۔ باقی سب تو مت دیکھتے ہی رہ جاتے تھے یا پھر ہلکے سے ٹکٹ خریدتے تھے۔ لاہور یے ٹکٹ خریدنے کے لیے عجیب عجیب طریقے استعمال کرتے تھے۔ کئی لوگ ٹکٹ خریدنے کے لیے کھڑکی کے اوپر چڑھ کر اٹھ بڑھا کر اس طرح ٹکٹ خریدتے تھے۔ ایک دو بار تو بٹ صاحب نے بھی ”مشرم کرو۔ میں نے اس طرح کبھی ٹکٹ نہیں خریدا۔“

ہاں تمہاری کوشش یہی ہوتی تھی کہ کسی طرح سے بھی ٹکٹ ضرور خریدو۔“

”جی ہاں۔ اس لیے کہ آپ سنیما جا کر بغیر فلم دیکھے گھر جانا ہی نہیں چاہتے تھے۔ یاد ہے۔ آپ کہا کرتے تھے کہ ہم تو کشتیاں جلا کر آئے ہیں۔ فلم دیکھے بغیر گئے تو گھر والوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔“

اتنی دیر میں بس خالی ہو گئی تھی۔ ہم لوگ بھی بس سے باہر آئے۔ اپنا سامان سمیٹا اور چل پڑے۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”ظاہر ہے کہ پاکستان تو واپس نہیں جا رہے۔ ہم ہوٹل کی تلاش میں جا رہے ہیں۔“

”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ ہوٹل کی بکنگ کرالو ورنہ جگہ نہیں ملے گی۔“ بٹ صاحب نے کہا۔

”بھائی اتنا بڑا شہر ہے۔ کیا ہم تین مسافروں کے واسطے کسی ہوٹل میں جگہ نہیں ملے گی۔ آؤ میرے ساتھ۔ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔“

”وہ نیک لوگوں کو ملتا ہے۔ آپ جیسوں کو نہیں جو کبھی نماز تک نہیں پڑھتے۔ کان کھول کر سن لو بٹ جی۔ صرف لاحول پڑھنے سے تم نہیں بخشتے جاؤ گے۔“

”نماز تو میں پڑھتا ہوں۔ لیکن باقاعدگی سے تمام نمازیں نہیں پڑھتا۔ ایک فجر کی نماز نہیں پڑھتا۔ دوسرے عشاء کی نماز نہیں پڑھتا۔ صبح دیر سے اٹھتا ہوں اس لیے اور رات کو سستی آ جاتی ہے۔“

”اچھا! خان صاحب نے پوچھا ”اور باقی تین نمازیں کب اور کہاں پڑھتے ہیں؟“

”دیکھیے۔ نماز دنیا کو دکھانے کے لیے نہیں پڑھی جاتی۔“

”اسی لیے شاید آپ چلتے پھرتے دل ہی دل میں نماز پڑھ لیتے ہیں۔“

”دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔“

ہم نے تنگ آ کر کہا۔ ”اب یہیں کھڑے بحث کرتے رہو گے یا ہوٹل بھی تلاش کرو گے؟“

”چلو بھی چلو۔ ہوٹل تلاش کرتے ہیں۔“

ہم تینوں نے اپنے اپنے سوٹ کیسوں کو پیہوں کے بل گھسیٹنا شروع کر دیا۔ چھوٹے بیگ کا ندھوں پر ڈال لیے۔

”ہاں۔ اب لگتے ہو نورسٹ۔“

استنبول میں سائن بورڈ عموماً ترکی زبان میں لکھے

ہوتے ہیں جو ہم نہیں پڑھ سکتے تھے۔

”اب کیا کریں؟“

”بھئی کسی سے پوچھ لیتے ہیں۔“ بٹ صاحب نے کہا اور پاس سے گزرتی ہوئی ایک ماڈرن مغربی لباس میں ملبوس.... خاتون کی طرف بڑھے۔ پہلے لاحول پڑھی پھر انگریزی میں پوچھا۔ ”ایکسیکوزی لیڈی؟“

خاتون نے رک کر ان کی طرف دیکھا۔

”آپ بتا سکتی ہیں کہ اس پاس کوئی ہوٹل ہے؟“

خاتون نے کندھے اچکائے جس کی وجہ سے ان کے جسم میں خطرناک قسم کی حرکت پیدا ہو گئی۔ پھر انہوں نے ترکی زبان میں کچھ کہا۔ دوبارہ کاندھے اچکائے اور چلی گئیں۔

بٹ صاحب لاحول پڑھتے ہی رہ گئے۔ ”توبہ توبہ،

اس قدر عریانیٹ، لباس مغربی مگر انگریزی میں صفر۔“

خان صاحب ہنسنے لگے۔ ”بٹ صاحب۔ آپ نے

کہہ دیا ہوتا کہ زبان یا رمن ترکی و رمن ترکی نمی دانم۔“

بٹ صاحب نے انہیں گھور کر دیکھا ”خان صاحب،

یہ فارسی زبان ہے۔ جو عورت انگریزی نہیں جانتی وہ فارسی

کیسے سمجھے گی۔“

ایک نیک دل خوش پوش آدمی نے شاید ہماری مشکل

جان لی اور پاس آکر انگریزی میں پوچھا۔

”آپ ٹورسٹ اور غیر ملکی نظر آتے ہیں۔“

”آپ ٹھیک سمجھے۔ دراصل ہم غیر ملکی بھی ہیں اور

ٹورسٹ بھی۔ ہمیں کوئی ہوٹل بتائیے جو زیادہ مہنگا بھی نہ ہو۔“

وہ مسکرائے۔ ”آپ کہاں سے آئے ہیں؟ انڈیا سے؟“

”لا حول ولا قوۃ۔“ بٹ صاحب زیر لب بولے۔

اس شخص نے حیران ہو کر بٹ صاحب کو دیکھا۔

ہم نے کہا ”انہیں چھوڑیے یہ اللہ والے ہیں۔ اکثر

اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ دراصل ہم پاکستانی ہیں۔“

”پاکستان“ ان صاحب نے خوش ہو کر ہم لوگوں کو

دیکھا۔ ہم نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر انہوں نے

ہمیں گلے لگا لیا۔ ”پاکستان، آئی لو پاکستان“ پھر وہ باری

باری بٹ صاحب اور خان صاحب سے بھی بغلیں ہوئے۔

وہ بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔

”آپ پاکستان سے آ رہے ہیں؟“

”جی نہیں۔ ابھی تو ہم یورپ سے آئے ہیں، ترکی

دیکھنے کی بہت خواہش تھی۔ ہم لوگوں کو بھی ترکی اور ترکی کے

لوگوں سے بہت محبت ہے۔“

”اس لیے کہ... ہم بھائی بھائی ہیں۔“ انہوں نے

ہمیں دوبارہ گلے لگایا اور باری باری ہمارے دونوں گلے

چومے۔ پھر پیشانی چومی۔

بٹ صاحب بھی آگے بڑھے اور منہ اٹھا کر کھڑے

ہو گئے۔ ترک بھائی نے ان کے دونوں رخسار بھی چومے۔

”میرے ساتھ آئیے۔ میں آپ کو ہوٹل لے چلتا ہوں۔“

ہم ان کے ساتھ چل پڑے۔

”آپ اس وقت سلمان احمد ڈسٹرکٹ میں ہیں۔“

خان صاحب نے کان میں کہا ”ان کا مطلب ہے

سلمان احمد، یہ شاید تو تلے ہیں یا پھر ترک ”ڈ“ کو ”ت“

بولتے ہیں۔“

وہ صاحب بہت تیز چل رہے تھے۔ مجبوراً ہم لوگوں کو

بھی ان کے ساتھ تیز چلنا پڑ رہا تھا۔

”یہاں بہت سے ہوٹل مل جائیں گے جو مہنگے بھی

نہیں ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ سلمان احمد کی خاص بات

کیا ہے؟“

”نہیں۔“

”یہاں تاریخی بلیو مسجد ہے، یہ مسجد سلمان احمد نے

1609ء میں بنوائی تھی۔ جو بھی استنبول آتا ہے وہ بلیو مسجد

ضرور دیکھتا ہے، بڑی شاندار مسجد ہے۔ اس کی تعمیر میں

سات سال لگے تھے۔ آپ نے بھی بلیو مسجد کے بارے میں

ضرور سنایا پڑھا ہوگا؟“

”جی ہاں“ ہم نے سر ہلایا۔ ”یہ استنبول کے چند

قابل دید مقامات میں شامل ہے۔“

”وہ دیکھیے۔ اس کے مینار نظر آ رہے ہیں“ انہوں

نے فٹ ہاتھ پر مڑتے ہی اشارہ کیا۔ واقعی بلیو مسجد

شاندار گنبد نظر آ رہا تھا۔

”بس۔ ہمیں اس پاس ہی کوئی ہوٹل مل جائے تو

اچھا ہوگا۔“

”کیوں نہیں۔ جب تک آپ کو ہوٹل نہیں ملے گا

آپ کے ساتھ ہی رہوں۔“

بٹ صاحب کو اچانک یاد آ گیا۔ ”ارے، ہم

آپ کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔“

”معافی چاہتا ہوں مجھے خود ہی اپنا تعارف

چاہیے تھا۔ میرا نام عدنان ہے، میں یہاں ایک کمپنی میں

کرتا ہوں، یہ کیجیے میرا کارڈ رکھ لیجیے۔“

انہوں نے اپنا تعارفی کارڈ نکال کر ہمارے حوالے کیا۔

ہم تینوں نے بھی اپنے نام بتائے۔ ایک بار پھر

انہوں نے سب سے ہاتھ ملایا اور باری باری ہمیں گلے

لگایا۔

دو تین موڑ مڑنے کے بعد ہم ایک قدرے کھلی سڑک

پر پہنچ گئے۔

یہ بہت بارونق سڑک تھی، دکائیں، ریسٹوران اور

ہوٹل۔ عدنان نے ایک دو ہوٹلوں کے اندر جا کر دریافت کیا

اور باہر آ کر آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی

میں سیکر حکومت تھی۔ عورتوں کا حجاب پہننا بھی منع تھا۔ جسے

دیکھنے انگریزی میم نظر آتی تھی۔

مغربی انداز، مغربی طور طریقے، جینز نصف آستین یا

بغیر آستین کی ٹیسیں، یا پھر اسکرٹ اور بلاؤز، کھلے گلے۔

انداز بھی مغربی لیکن تہذیب کے دائرے میں رہتے

ہوئے۔ بٹ صاحب کی تو آنکھیں جھپکے لگیں۔

بولے ”میری تو آنکھیں کھل گئی ہیں۔ کتنے لاحول

پڑھوں اور کس کس پر پڑھوں؟“

خان صاحب نے کہا۔ ”آپ ایسا کیجیے کہ ایک بار

لا حول پڑھ کر کہہ دیں ضرب ایک ہزار، اچانک آپ کی

آنکھیں کھل جائیں گی۔ کیا پائیں دن ہو گئے۔“

”دیکھیے آفاقی صاحب، یہ مجھے کتا کہہ رہے ہیں؟“

”توبہ توبہ، میں نے آپ کو کب کہا ہے کتا۔“

”جی نہیں کہا۔ مگر مطلب تو وہی ہے نا، کتے کے بچوں کی

آنکھیں ہی پائیں دن بعد کھلتی ہیں۔“

”بٹ صاحب آپ تو خواجہ ہر بات کا کچھ اور

مطلب نکالتے ہیں۔“

”مل گیا، مل گیا“ یہ عدنان کی آواز تھی جو ایک ہوٹل

سے خوش خوشی باہر آ رہے تھے۔

”آئیے میرے ساتھ۔ آپ کے لیے دو کمروں کا

بندوبست ہو گیا ہے۔ بہت اچھا ہوٹل ہے، میں نے کمرے

بھی دیکھے لیے ہیں، کرایہ بھی مناسب ہے۔“

”ویری گڈ، مگر اس ہوٹل کا نام کیا ہے؟“

”وہ سامنے لکھا ہوا ہے۔ ہوٹل از میر۔“

”بہت شکریہ آپ کا۔ آپ نے واقعی بہت تکلیف

اٹھائی۔“

”جی نہیں۔ میں تو بہت خوش ہوں کہ پاکستانی بھائیوں

کے کام آیا۔ اور ہاں، اس ہوٹل کے ریسپشن پر ایک خاتون

ماہنامہ سرگزشت

تھوڑی بہت انگلش بھی جانتی ہیں۔“

”صرف ایک!“ بٹ صاحب نے مایوسی سے کہا۔

”نہیں۔ اور لوگ بھی ہیں، مطلب کے مطابق

انگریزی سمجھ لیتے ہیں۔“

ہم لوگ ہوٹل میں داخل ہوئے، لابی زیادہ بڑی نہیں

تھی مگر کشادہ اور خوبصورت تھی۔ استقبالیہ میز پر ایک خوش

شکل خاتون سفید بلاؤز اور نیلے رنگ کا اسکرٹ پہنے بیٹھی

مسکرا رہی تھیں۔

”یہ مسکرا کیوں رہی ہیں، کیا ہمیں پہچانتی ہیں؟“

”بٹ جی، بیوقوفی کی باتیں مت کرو، ریسپشنٹ کا

کام ہی مسکرانا ہوتا ہے۔ بھول گئے۔ استنبول آدھا یورپ

میں ہے۔“

”کاش پورا ہی یورپ میں ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔“

بٹ صاحب نے کہا۔

”اطمینان رکھو۔ باقی آدھے میں بھی آپ کو یہی کچھ

نظر آئے گا۔ یہ قوم اب تقریباً انگریزی ہی ہو گئی ہے۔“

”جی، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“

استقبالیہ پر خاتون نے مزید مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”یہی تو آپ کے مہمان ہیں۔ ابھی میں نے دو

کمرے ان ہی کے لیے بک کرائے ہیں۔“

”موسٹ ویلم۔ ہمارے لیے بہت خوشی کی بات ہے۔“

”اور یہ پاکستان سے آئے ہیں۔“ عدنان نے مزید

تعارف کرایا۔

”پاکستان؟“ خاتون کی خوشی میں اضافہ ہو گیا۔

انہوں نے خوش ہو کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھادیا اور بڑی

گرجوشی سے ہم تینوں سے ہاتھ ملایا۔ ”بہت خوشی ہوئی آپ

سے مل کر۔ یہاں آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

بٹ صاحب سمجھ رہے تھے کہ شاید عدنان کی طرح وہ

بھی خوش ہو کر گلے لگائے گی اور گال چومے گی۔

خان صاحب نے کہا ”بس بٹ صاحب، اس پر اکتفا

کریں۔ اس سے زیادہ کی امید نہ رکھیں۔“

بٹ صاحب کچھ شرمندہ سے ہو گئے۔

”آئیے، میں آپ کو کمرے دکھاؤں۔“ خاتون نے

دو چابیاں اٹھائیں اور ہمیں ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ”سامان

آپ یہیں چھوڑ دیں۔ کمرے میں پہنچ جائے گا۔“

وہ اٹھ کھلی چال چلتی ہوئی میز کے پیچھے سے نکل کر

لفٹ کی طرف بڑھیں۔

بٹ صاحب سے نہ رہا گیا، بولے: ”سنئے۔ آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔“
 ”آپ نے پوچھا ہی نہیں۔“ وہ مسکرائیں۔
 ”اب تو پوچھ لیا۔“
 ”میرا نام فاطمہ!“
 ”اور میرا خاور بٹ اور.....“

”آپ لوگوں کے نام میں جانتی ہوں۔ آپ کے پاسپورٹ دیکھ چکی ہوں۔“
 لفٹ زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ ہم سب بڑی مشکل سے پھنس کر اس میں داخل ہوئے۔ دراصل دو یا تین آدمیوں کی گنجائش تھی، ہم نے اور خان صاحب نے اپنے آپ کو سمیٹ لیا کہ فاطمہ سے نہ ٹکرائیں۔ بٹ صاحب بھی خاصے بچا کر کھڑے ہوئے تھے۔ چاہے کچھ ہو، بٹ صاحب میں مشرقی شرم و لحاظ کے جراثیم تو تھے۔
 ایک چھوٹی سی سرخ قالین کے فرش کی گیلری سے گزر کر ہم ایک کمرے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ایک کمرہ یہ ہے اور دوسرا یہ برابر والا۔ آپ جس طرح چاہیں تقسیم کر لیں۔“

کمرے خاصے کشادہ اور سجے ہوئے تھے۔ مڑک کی جانب ایک بڑی سی کھڑکی تھی۔ دو کرسیاں، ایک سنگھار میز، ایک سینئر ٹیبل اور ڈبل بیڈ، بہت روشن اور آرام دہ کمرہ تھا۔
 ”میز پر فون بھی رکھا ہے۔ اس کے ذریعے آپ روم سروس اور ریسپشن سے بات کر سکتے ہیں اور زیر و بمبر ملا کر ہوٹل سے باہر بھی بات چیت کر سکتے ہیں۔“
 ”بہت شکریہ۔“

”دوسرا کمرہ بھی دکھا دوں، بالکل اسی جیسا ہے!“
 ”وہ ہم خود دیکھ لیں گے۔“
 ”آرام سے رہیے۔ اللہ حافظ۔“ وہ مسکرا کر کھٹ کھٹ کرتی ہوئی چلی گئیں۔
 ”کمرہ اندھیرا اندھیرا سا لگنے لگا ہے۔“ بٹ صاحب نے خیال ظاہر کیا۔

”کیا آپ کی آنکھوں میں اچانک موتیا اتر آیا ہے؟“
 ”سمجھا کرو۔ تم تو بہت کوڑھ مغز ہو۔“ بٹ صاحب کچھ ناراض سے ہو گئے۔
 ”اچھا۔ تو یہ کمرہ تو ہمارا ہو گیا۔“ ہم نے کہا۔ آپ دونوں اس کمرے میں رہیں گے۔“
 ”معاف کیجیے۔ میں ساری رات خراٹے سننے اور

جاگنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“
 خان صاحب نے احتجاج کیا۔ ”آپ دونوں اس کمرے میں رہیے۔“
 ”مگر میرا کیا قصور ہے؟“ ہم نے معصومیت سے پوچھا۔
 ”آپ بٹ صاحب کے بغیر پاکستان سے لکھنا برداشت نہیں کرتے تو ان کے خراٹے بھی برداشت کر لیں۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ بٹ صاحب ناراض ہو گئے ”میں الگ کمرے لوں گا۔“
 ”آپ نے سنا نہیں کہ یہ دو کمرے بھی مشکل ہی سے ملے ہیں۔ تیسرا کمرہ تو آپ کو خود بنانا پڑے گا اور اس میں دیر لگ جائے گی اس لیے صبر کریں اور خان صاحب کے ساتھ ہی رہیں۔“
 ”ارے۔“ اچانک خان صاحب کو یاد آیا ”وہ عدنان بے چارہ تو لا بی میں ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔“
 ”واقعی۔ کتنا اچھا آدمی ہے۔“
 ”آدمی نہیں۔ ترک ہے۔“

عدنان ہمارے انتظار میں بیٹھا تھا۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”کمرے پسند آئے؟“
 ”بہت اچھے ہیں۔“
 ”دونوں کا کرایہ صرف چار ڈالر ہے۔“
 ”جی ہاں۔ ایک ڈالر میں ساڑھے سات ہزار ترش لہرا ہوتے ہیں۔“

”یعنی تیس ہزار لیر اور زائد۔“
 ”لیر کی قیمت آج کل کافی گری ہوئی ہے۔“
 ”ہمیں کچھ ڈالر لیر میں تبدیل کرانے ہیں۔“
 ”نو پر اہل۔ کرنسی تبدیل کرنے والے ہر جگہ ملتے ہیں۔“ عدنان نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ ”بلیو میج یہاں سے پندرہ منٹ کی واک پر ہے۔ آپ آرام کر لیجئے یا بلیو مسجد دیکھنے چلیں گے۔ نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ جلدی تیار ہو جائیں تو نماز بھی وہیں پڑھ سکتے ہیں۔“

”کیا وہاں نماز پڑھ سکتے ہیں؟“
 ”کیوں نہیں۔ وہاں باقاعدہ جماعت کے ساتھ نماز ہوتی ہے۔“
 ”اگر دس پندرہ منٹ کی مہلت ملے تو ہم تیار ہو کر آ جاتے ہیں۔“
 ”ہاں ہاں۔ ضرور۔ میں یہیں انتظار کرتا ہوں۔“

کمروں کی تقسیم اسی طرح ہوئی جیسے ہم نے کہا۔ خان صاحب اور بٹ صاحب ایک دوسرے کو گھورتے ہوئے دوسرے کمرے میں اپنا سامان لے گئے۔ غسل کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ہم نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور وضو کر کے لابی میں چلے گئے۔ بٹ صاحب سب کے بعد آئے۔
 ”اتنی دیر کیوں لگا دی؟“ ہم نے پوچھا۔

”آپ بھول رہے ہیں کہ اس کمرے میں صرف ایک غسل خانہ ہے۔ ان کے وضو کرنے کے بعد میں نے سوچا نہالوں۔ وضو میں بھی اتنی ہی دیر لگے گی۔ بس جلدی جلدی پانی بہا کر آ گیا۔“

”کیا مطلب۔ آپ نے کمرے میں بھی پانی بہا دیا؟“ ہم نے حیرت سے پوچھا۔
 ”کمرے میں نہیں۔ اپنے جسم پر۔“

خان صاحب نے کہا۔ ”اتنی دیر میں تو نہانا ممکن نہیں ہے۔ شاید آپ حیم کر کے آ گئے ہیں۔“
 ہم لوگ اردو میں بات کر رہے تھے۔ عدنان غریب ہمارا منہ دیکھ رہا تھا۔

”بس اب چلو، یہ ہمارا نوکر تو نہیں ہے جسے ہم نے خواخواہ الجھا رکھا ہے۔“

”ہم نے نہیں الجھایا، وہ خود ہی الجھ گیا ہے۔“
 ریسپشن پر چابیاں دینے کے لیے بٹ صاحب گئے۔ دونوں طرف سے مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔ بٹ صاحب کچھ بات کرنا چاہتے تھے مگر خان صاحب نے پکار کر کہا ”بس آ جاؤ نماز قضا ہو جائے گی۔“
 بٹ صاحب بادل خواست آ گئے۔

ہوٹل کے باہر بڑی چہل پہل تھی۔ فٹ پاتھ پر چند دکھاندار زمین پر سامان رکھے بیٹھے تھے۔ ایک صاحب نے پنے یا موٹو بچا کی قمیص کی کوئی چیز فروخت کر رہے تھے۔

بٹ صاحب نے ادھر کا رخ کیا مگر خان صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ ”یہ آپ بعد میں بھی کھا سکتے ہیں۔“
 تیزی سے چلتے ہوئے ہم لوگ بلیو مسجد پہنچ گئے۔ سبحان اللہ۔ کتنی خوبصورت مسجد ہے۔ دیکھ کر آنکھیں روشن ہوئیں۔ حیرت اور خوشی کی بات یہ تھی کہ مسجد کو دیکھ کر اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ وہ صدیوں پرانی عمارت ہے۔ لگتا تھا حال ہی میں تعمیر ہوئی ہے۔ دیکھ بھال کرنے والوں کو داد دینا زیادتی ہوگی۔

مسجد کے اندر داخل ہوتے وقت ہم سب کو پلاسٹک

کے تھیلے دیئے گئے۔ ہم حیران ہی ہو رہے تھے کہ عدنان نے بتایا کہ یہ جوتے رکھنے کے لیے ہیں تاکہ مسجد میں جوتوں کی مٹی نہ پھینچے۔ اس کا کوئی کرایہ نہیں ہے۔ جلدی جلدی کرنے کے باوجود جماعت ہو چکی تھی۔ نمازی واپس جا رہے تھے۔ مرد تو قیص پتلون پہنے ہوئے تھے بعض خواتین نے اپنے سروں پر اور جسم پر بڑے سے رومال ڈال رکھے تھے۔ اسکرٹ پہننے والی خواتین کو ناگس ڈھانپنے کے لیے تہبند کی قسم کے کپڑے دیئے گئے تھے۔

ہم لوگ تو نماز پڑھ رہے تھے لیکن بہت سے غیر ملکی سیاح نماز پڑھنے والوں اور مسجد کی تصاویر بنانے میں مصروف تھے۔ ان میں یورپین خواتین سیاح بھی شامل تھیں جو مسجد کی تعمیر کی خوبیوں کو دیکھ کر بے اختیار ان کی تعریف کر رہی تھیں۔

مسجد کے بڑے ہال کے درمیان میں چار بڑے ستون ہیں۔ ان کے درمیان میں چار بڑی محرابیں ہیں۔ یہ ایک بہت وسیع ہال ہے جس میں بیک وقت پانچ ہزار سے بھی زیادہ افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔ مسجد کی چھت نقاشی کا حسین نمونہ ہے۔ اس مسجد کو بلیو مسجد کیوں کہا جاتا ہے؟ دراصل مسجد کی تعمیر میں ہلکے نیلے رنگ کا پتھر استعمال کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس میں انفرادیت اور ایک آسودگی کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ نیلا رنگ ذہن کو سکون پہنچانے والا رنگ سمجھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ اپنے بیڈروم کی دیواریں نیلے رنگ سے پینٹ کراتے ہیں اور بیڈروم میں سکون پرور ماحول پیدا کرنے کی غرض سے اسی رنگ کے قالین اور پردے بھی استعمال کرتے ہیں۔

مسجد سے نماز ادا کر کے اور اس کا نظارہ کر کے باہر نکلے تو سبھی پر ایک عجب قسم کی کیفیت طاری تھی۔ مسجد کے ماحول نے ہم سب کو کسی اور زمانے میں پہنچا دیا تھا۔ استنبول کو اگر مساجد کا شہر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ استنبول کی بھی مسجدوں کے مینار ایک جیسے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی ایک ہی معمار نے یہ سب مسجدیں بنائی ہیں اور ایک ہی طرز کے مینار بنائے ہیں۔

اس دوران میں عدنان ہمارے ساتھ تھے۔ خان صاحب نے ہم سے کہا ”بھائی۔ یہ شخص تو ہوٹل کا پتا بتانے کے سلسلے میں ہمارے قابو میں آ گیا ہے۔ یہ اس کی محبت اور خوش اخلاقی ہے لیکن وہ ہمارا غلام تو نہیں ہے۔“
 ”تو پھر کیا کریں؟“

”ان کا شکریہ ادا کر کے کہیں کہ آپ اپنا ہرج کیوں کرتے ہیں۔ ہماری خاطر اپنے دوسرے کام تو خراب نہ کریں۔“

بٹ صاحب جو عدنان کے ساتھ ساتھ ہم سے آگے جا رہے تھے یہ سن کر پلٹ کر ہمارے پاس آئے۔ اور کہنے لگے ”یہ تو احسان فراموشی اور بدتمیزی ہوگی بلکہ اول درجے کی خود غرضی ہوگی۔“

”آپ کس بارے میں کہہ رہے ہیں؟“

”عدنان صاحب کے بارے میں۔ بھی ایک شخص ہمارے لیے اتنا کچھ کر رہا ہے اور آپ اس کو محض شکریہ ادا کر کے ٹرانا چاہتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ انہیں کھانے کی دعوت دیں اور ان کا پتا اور فون نمبر لیں تاکہ بعد میں بھی ان سے بات کر سکیں۔“

خان صاحب چلتے چلتے رک گئے۔ ”بٹ صاحب یار تم تو بہت سمجھدار لگتے۔ بٹوں کے بارے میں تو یہ سنا ہے کہ وہ اپنے پیٹ سے سوچتے ہیں، دماغ سے نہیں۔“

”بھائی۔ اگر پیٹ خالی ہو تو دماغ بھی کام نہیں کرتا۔ اسی لیے ہم لوگ پیٹ پوجا پر بہت زور دیتے ہیں۔“

”آپ نے ٹھیک کہا۔ مثال کے طور پر پہلوانوں کو دیکھ لیجیے ایک وقت میں سالم بکرا کھا جاتے ہیں۔ بالٹی بھر دودھ پی لیتے ہیں۔ سیروں خشک میوہ اور پھل کھا جاتے ہیں مگر دماغ سے کچھ سوچ نہیں سکتے۔“

بٹ صاحب نے جواب دیا ”آپ کو پہلوانوں کے بارے میں کچھ علم ہی نہیں ہے تو بلاوجہ باتیں کرنے کا کیا فائدہ، ارے بھائی پہلوان جو کشتی جیتتے ہیں وہ صرف طاقت کے زور سے نہیں، دماغ لگا کر ڈاؤ پیچ سوچتے ہیں کہ کس وقت کون سا ڈاؤ استعمال کر کے حریف کو چت کیا جاسکتا ہے کیونکہ گاما پہلوان اپنے سے بہت زیادہ طاقتور پہلوانوں کو منٹوں میں ہرا دیتے تھے۔ صرف طاقت سے نہیں، دماغ سے۔“

ہم لوگ آہستہ خرامی سے باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ عدنان نے پلٹ کر دیکھا تو ہم لوگوں کے پاس آگئے۔ ”کیا بات ہے؟ کوئی پرابلم؟“

”نہیں، کوئی نہیں، ہم یہ سوچ رہے تھے کہ اب ہم لوگوں کو کہیں کھانا بھی کھالینا چاہیے۔“

”ارے یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ واقعی اب تو بھوک بھی لگ رہی ہے۔ اب یہ بتائیے کہ آپ کس قسم کا کھانا پسند

کریں گے؟“

”ظاہر ہے۔ ہم ترکی کھانے پسند کریں گے کیونکہ دوسرے کھانے تو اور دیگر جگہ بھی مل جاتے ہیں۔“

”دیکھیے ایک تو یہاں کے کباب بہت مشہور ہیں۔ ڈونر کباب، شورما وغیرہ۔ اس کے بعد سی فوڈ ہے۔ یہاں سی فوڈ بہت اچھا اور مزیدار ہوتا ہے کیونکہ اس پاس ہر طرف سمندر ہے۔ جھینگے، مچھلی، کیکڑے۔۔۔۔۔“

”بس بس، یہ چیزیں تو رنے ہی دیجیے۔ ہم لوگ تو زیادہ سے زیادہ پھل کھاتے ہیں۔ کچھ لوگ جھینگے بھی پسند کرتے ہیں لیکن ہم تینوں میں سے کوئی جھینگے نہیں کھاتا۔“

عدنان بولے ”اچھا ہوا آپ نے بتا دیا۔ استنبول میں کھانے کے ریسٹوران زیادہ تر سمندر کے ساحل پر ہیں جہاں ہر قسم کا کھانا مل سکتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بے شمار ریسٹوران ساحل سمندر پر بکھرے ہوئے ہیں۔ یہاں ایسے ہوٹل اور ریسٹوران بھی ہیں جو کسی زمانے میں محلات تھے۔ ایک ہوٹل ہے۔ یہ انیسویں صدی میں جیل خانہ تھا مگر یہاں اہم قیدی ہی رکھے جاتے تھے۔ میرا تو یہ مشورہ ہے کہ ہم ندی کے کنارے والے گاؤں میں چلیں۔“

”گاؤں میں؟“

”جی ہاں۔ اس جگہ کا نام ہی دلچ ہے۔ یہاں بہت لذیذ کھانا مل جاتا ہے۔ مہنگا بھی نہیں ہوتا۔ یہ جگہ سیاحوں کی دلچسپی اور کشش کے لیے بھی بہت اچھی ہے۔ یہاں آپ کو قدیم ترکی کا ماحول اور لذیذ ترکی کھانے بھی مل جائیں گے۔ سیاحوں کے لیے یہ جگہ بہت پسندیدہ ہے۔“

”یہاں آپ کو تازہ اور گرم گرم نان (روٹی) بن، چائے، کافی بھی کچھ مل جائے گا۔ یہاں سمندر میں تیرتے ہوئے ریسٹوران بھی ہیں جہاں کشتیوں کے ذریعے جاتے ہیں، یہاں بھی ہر قسم کے ترکی کھانے مل جاتے ہیں۔ اب آپ بتائیے کہ آپ کہاں جانا پسند کریں گے۔“

ہم تینوں نے آپس میں مختصر مشورہ کیا اور طے پایا کہ فی الحال وینج جانا مناسب ہوگا۔ اس کے بعد دوسرے ریسٹورانوں کا مزہ بھی چکھ لیں گے۔

”ٹھیک ہے۔ تو پھر آئیے میرے ساتھ۔“ عدنان نے دونوں ہاتھ ملے ہوئے کیا۔ دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے رہنا عدنان کی عادت تھی۔

ہم نے کہا۔ ”مسٹر عدنان، جانے سے پہلے ایک بات طے ہو جانی چاہیے۔“

”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ کھانے کا بل ہم ادا کریں گے۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔“

”مہمان تو آپ ہیں۔ اتنی دور پاکستان سے آئے ہیں۔“

”مگر اس وقت آپ مہمان اور ہم میزبان ہوں گے۔“

”جیسی آپ کی خوشی، آئیے۔“

ہم عدنان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے اجنبیوں میں ہمیں ایک راہبر عطا فرمایا تھا۔ یہ اللہ کی دین ہی تھی جو راہ چلتے مل گیا تھا۔ خان صاحب نے عدنان کو خواجہ عدنان کے نام سے مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا۔

”خواجہ؟“ وہ حیران ہو کر بولا۔ ”یہ کس لیے؟“

”آپ نے خواجہ خضر کا نام تو سنا ہوگا جو بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ بتا کر منزل تک پہنچاتے تھے۔ آپ بھی ہمارے لیے یہی کام کر رہے ہیں۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”کھواجا؟“

”کھواجا نہیں خواجہ۔“

عدنان نے چند بار خواجہ کہنے کی کوشش کی مگر صحیح تلفظ نہ آتا ہوا۔

”ٹھیک ہے آپ کھواجا کہتے رہیے۔ کوئی ہرج نہیں ہے۔“

ایک کشتی میں بیٹھ کر ہم لوگ تقریباً پندرہ منٹ میں ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ اس کا نام انہوں نے ”اس قدر“ بتایا۔ وینج ایک پرانی ترک آبادی کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ کشتی سے زمین پر قدم رکھتے ہی کھانوں کی مختلف اشتہا انگیز خوشبوؤں نے ہماری بھوک کو مزید چمکا دیا۔ ہر طرف مقامی لوگوں اور سیاحوں کے ہجوم تھے۔

اس سے پہلے کہ بٹ صاحب ”لا حول“ پڑھتے خان صاحب نے انہیں ٹوک دیا ”بٹ صاحب، مہربانی سے اس وقت لا حول نہ پڑھیں ورنہ بھوک غائب ہو جائے گی۔“

بٹ صاحب مسکرائے ”ہم نے تو سنا تھا کہ لا حول سن کر شیطان غائب ہو جاتا ہے۔“

خان صاحب نے فوراً فقرہ کسا ”مگر آپ تو آج تک غائب نہیں ہوئے۔“

یہ گاؤں بہت صاف ستھرا تھا۔ خوبصورت مکانات، چمروں کی سڑکیں اور گلیاں، یہاں کشتی کے ذریعے جاتے ہیں اس لیے کسی قسم کی سواری یعنی کار، موٹر سائیکل یہاں تک کہ سائیکل تک نظر نہیں آتی۔

جب عدنان کی توجہ اس طرف دلائی گئی تو اس نے

مسکرا کر کہا ”پیدل چلنے سے کھانا ہضم ہو جاتا ہے اور بھوک بھی زیادہ لگتی ہے۔“

یہاں کھلے آسمان کے نیچے کئی ریسٹوران تھے۔ صاف ستھری میزیں اور کرسیاں اور میزوں پر گلین خانے دار میز پوش بہت اچھا منظر پیش کر رہے تھے۔

بٹ صاحب نے ایک طرف دیکھا جہاں بہت زیادہ تعداد میں سیاح مرد اور خواتین موجود تھے۔

”میرے خیال میں اس جگہ چلتے ہیں۔“

”مگر کیوں؟“

”دیکھتے نہیں وہاں کتنا رش ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہاں کھانا بھی سب سے لذیذ ہوگا۔“

ہم نے کہا ”وجہ تو ہم سمجھ گئے ہیں، مگر اپنا وعدہ یاد رکھیے گا۔ لا حول بالکل نہیں پڑھیں گے۔“ بٹ صاحب نے سر ہلا کر اقرار کیا۔

اس ریسٹوران کی طرف چلے تو ہمارے چاروں طرف مختلف کھانوں کی خوشبوئیں بکھری ہوئی تھیں۔ یوں محسوس ہوا کہ کھانے کی خوشبوؤں کی کاک ٹیل تھی۔

ہمیں دیکھتے ہی ایک نوجوان ترک نے ترکی زبان میں ہمارا خیر مقدم کیا۔ مگر اس سے پہلے ”خوش آمدید“ کہنا نہیں بھولا۔

ترک ویٹر اور عدنان کے مابین ترکی زبان میں کچھ گفتگو ہوئی جو یقیناً ہم لوگوں کے بارے میں تھی۔ ویٹر نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹرے ایک میز پر رکھی اور بڑی عقیدت کے ساتھ ہم لوگوں کی طرف بڑھا۔ ”پاکستان“ اس نے خوش ہو کر اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ بٹ صاحب نے بھی اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ لیے ”پاکستان۔“

اس نے ہم تینوں سے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور پھر گلے لگانے کے لیے آگے بڑھا مگر عدنان نے کچھ کہہ کر روک دیا۔

بٹ صاحب بولے۔ ”اس نے کہا ہے کہ بھائی پہلے بھوکوں کو کھانا کھلاؤ۔ گلے بعد میں لگا لیتا۔“

ویٹر مسکراتا اور ہم لوگوں کو مسرت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا ایک میز کی طرف بڑھا اور ہمیں وہاں بٹھا کر جیب سے ایک مینو نکال کر بڑے احترام سے ہمارے سامنے پیش کیا۔

مینو عدنان نے لے لیا اور غالباً اس سے کہا کہ یہ لوگ تو ترکی نہیں جانتے اور نہ ہی کھانوں کے ناموں سے واقف

ہیں۔ آپ جوں لے آئے۔ اتنی دیر میں ہم فیصلہ کر لیں گے۔ ویٹر کے چہرے سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ یہ بات ہم نے خاص طور پر دیکھی کہ پاکستان کا نام سنتے ہی ترک سر اپا عقیدت و محبت بن جاتے ہیں۔

عدنان نے مینو پڑھ کر ہمیں کھانوں کے نام اور پھر ان کی نوعیت بتائی۔

”میری مایے تو پہلے اپنے ٹائزر سے بسم اللہ کریں؟“

”وہ کیا ہوتا ہے، کوئی سوپ ہے؟“

”یہ خالص ترکی مشروب ہے جو کھانے سے پہلے لیتے ہیں۔“

”تو پھر ضرور منگائیے۔“

”اس کا نام کیا ہے؟“

”اس کو ترکی میں میوز (سے زح) کہتے ہیں۔“

خان صاحب بولے۔ ”ٹھیک ہے۔ ہم اسے مزاج کہا کریں گے۔“

یہ سوپ کی نسل کی کوئی چیز ہوتی ہے جس میں پھلوں، سلاڈ، منڈ، اورک اور پسا ہوا گوشت یعنی قیمہ جیسی چیز بھی شامل ہے۔ اس کو پینے سے زیادہ چمچے سے کھایا جاتا ہے۔ ہم نے بٹ صاحب سے پوچھا ”مزاج کھاؤ گے یا پو گے؟“

”کیا۔“ وہ ایک دم چونک پڑے دراصل ان کی تمام تر توجہ پاس سے بہت آہستگی سے گزرتے ہوئے ایک تیرتے ہوئے ریسٹوران پر تھی جس پر سیاح خواتین کا جھگڑا تھا۔ سب ہنستی، قہقہہ لگاتی ہوئی جا رہی تھیں۔

”کیا پوچھا آپ نے؟“

”بھائی آپ یہاں کھانا کھانے آئے ہیں یا سیاح خواتین کی گنتی کر رہے ہیں؟“

وہ کھسانی مسکراہٹ سے بولے ”ارے نہیں۔ میں تو دیکھ رہا تھا کہ ایسا منظر کہیں اور نہیں دیکھا۔“

”منظر بھی دیکھ لیجیے گا۔ پہلے پیٹ پوجا کر لیجیے۔ یہ ان کا مخصوص اپنے ٹائزر ہے جسے ”میوز“ کہتے ہیں۔“

”نام ہی ہنسانے والا اور مزاجیہ ہے۔ ضرور منگائیے۔“

بٹ صاحب ابھی تک کشتیوں میں تیرتے ہوئے ریسٹورانوں کے نظارے میں کھوئے ہوئے تھے اچانک کہنے لگے۔ ”کتنا مزہ آتا اگر یہ جزیرہ جس پر ہم گاؤں میں بیٹھے ہیں سمندر میں تیر رہا ہو تو کیسا منظر ہوگا؟“

خان صاحب بولے ”بٹ صاحب آپ فرض کر لیجیے کہ سامنے جو ریسٹوران تیر رہے ہیں یہ زمین پر ساکت ہیں اور آپ کا گاؤں تیر رہا ہے۔ دیکھیے مطلب تو تیرتی ہوئی چیز کو دیکھنے کا ہے نا۔ ریسٹورانوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو شاید ہم اور ہمارا گاؤں تیرتا ہوا نظر آ رہا ہوگا۔“

ہم نے کہا۔ ”بٹ صاحب آپ کو اگر تیرتی ہوئی چیزیں دیکھنے کا اتنا ہی شوق ہے تو آپ خود کیوں نہیں تیرتے؟ ہر چیز آپ کو تیرتی ہوئی نظر آئے گی۔“

ویٹر اتنی دیر میں پھر مسکراتا ہوا چلا آیا اور عدنان سے ترکی میں گفتگو کرنے لگا لیکن باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں ہم لوگوں کی طرف دیکھتے رہے۔

عدنان نے انگریزی میں ہم سے کہا ”برادر، ہمارے میزبان کا مشورہ یہ ہے کہ ہم پھل کی کھانیں یہاں کی پھلی بہت مشہور ہے۔“

”ہاں پھل کھانے میں کیا ہرج ہے۔ ضرور منگائیے۔ ہم بھی دیکھیں کہ دریائے راوی کے کھنگے پھلی اور باسفورس کی پھلی کے مزے میں کتنا فرق ہوتا ہے۔“

”آپ کس قسم کی پھلی کھائیں گے؟“

”وہ جو پانی میں تیرتی ہے۔“ خان صاحب نے کہا۔

”مطلب یہ کہ پھلی کی بھی اقسام ہوتی ہیں۔“ عدنان نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ”ایک ٹونا پھلی ہوتی ہے۔“

”بس بس۔ ہم ٹونا پھلی ہی کھائیں گے۔“ خان صاحب نے بات کاٹ کر کہا۔

کچھ دیر بعد ٹرے میں پھلی کی پلٹیں بھی آ گئیں۔ ہر شخص کے لیے ایک علیحدہ پلیٹ تھی جس میں بھی ہوئی پھلی کے ٹکڑے سجے ہوئے تھے، ساتھ میں ایک چھوٹی سی خوبصورتی نوکری میں تازہ سلاڈ تھی جس کے اوپر سرخ نمائے کے ترشے ہوئے ٹکڑے سجائے گئے تھے۔ پیاز بھی گول گول دائروں میں کٹی ہوئی ایک طرف رکھی تھی۔ ساتھ ہی پھولی ہوئی روٹی تھی جس کی خوشبو سے لگ رہا تھا کہ ابھی ابھی پکا گئی ہے۔ سلاڈ کے اوپر زیتون کے تیل کے چھینٹے تھے جنہیں بٹ صاحب نے تیل کا چمڑکاؤ کا نام دیا تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ عربوں کی طرح ترک بھی زیتون کا استعمال بہت زیادہ کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ایک طشتری میں چینی چائے جیسی کوئی چیز بھی تھی۔

پھلی کھانے سے پہلے بٹ صاحب نے تفتیش کر ”اس پھلی میں کانٹے تو نہیں ہیں؟“

”آپ بے فکر ہو کر کھائیے۔“ عدنان نے یقین دلایا ”ایک بھی کانٹا آپ کو نہیں ملے گا۔“

بٹ صاحب نے کہا۔ ”پھلی مجھے بہت پسند ہے مگر اس کے کانٹوں سے ڈر لگتا ہے۔ ایک بار میرے ایک دوست کے گلے میں پھلی کا کانٹا پھنس گیا تھا۔ بڑی مشکل سے آپریشن کر کے نکالا گیا تھا۔“

پھلی واقعی بہت لذیذ تھی۔ خدا جانے اس کو کیسے بھونا گیا تھا لیکن بہت ہی مزیدار اور کرکری تھی۔ سلاڈ اور چینی کے ساتھ اس کا ذائقہ اور بھی زیادہ اچھا ہو گیا تھا۔ روٹی بھی بہت مزیدار تھی۔ ترکی میں روٹی کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اور ہر ایک روٹی کا ذائقہ تھوڑا سا مختلف ہوتا ہے۔

”کھانے کے بعد آپ لوگ چائے پینا پسند کریں گے؟“

”ضرور ضرور۔“ ہم سب نے ہم آواز ہو کر کہا۔

ٹیولپ کے پھولوں جیسی نازک اور رنگین پیالیوں میں گرم بھاپ اڑتی ہوئی چائے آ گئی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گیا ہوگا کہ چائے انگلستان کے سوا ہر ملک میں دودھ کے بغیر پی جاتی ہے۔ کہیں چائے ہوتی ہے اور کہیں گرم رنگ کی۔ کئی جگہ چائے اور کافی کے ساتھ دودھ اور چینی بھی استعمال نہیں کی جاتی۔ البتہ ہم نے ایران میں دیکھا کہ خوبصورت فجاٹوں میں بغیر دودھ کی بلکے رنگ کی چائے پی جاتی ہے۔ ساتھ ہی چینی کے چھوٹے چھوٹے کیوب پیش کیے جاتے ہیں۔ جو چاہے چینی کا ایک کیوب منہ میں ڈال کر منہ کے ایک کونے میں رکھ لیتا ہے۔ جب تک چائے پی جاتی ہے چینی کا یہ کیوب آہستہ آہستہ ہر گھونٹ کے ساتھ گھلنا رہتا ہے۔

”کیوں کیسی لگی پھلی؟“ عدنان نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

”بہت اچھی۔“

”بہت مزیدار۔“

”اور آپ کو کیسی لگی؟“ عدنان نے بٹ صاحب سے دریافت کیا۔

بٹ صاحب بولے۔ ”جیسی سب پھلیاں لگتی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ عدنان نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ کو اس بھی ہوئی ٹونا فٹش اور دوسری پھلیوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔“

”دراصل میں پھلی زیادہ نہیں کھاتا۔ ہمارے لاہور میں دریائے راوی میں جو کھنگا پھلی ہوتی ہے میں نے تو بس

وہی کھائی ہے۔ سادہ چاول کے ساتھ پھلی کا شوربہ کھائیں گے تو سب پھلیوں کو بھول جائیں گے۔“

”پھلی کا شوربہ؟ آپ کا مطلب ہے۔۔۔۔۔“

”جی۔ میرا مطلب ہے شوربہ، عدنان بھائی کبھی لاہور آؤ گے تو گھر کی پکی ہوئی کھنگا پھلی کھلاؤں گا۔ بس اگلیاں چائے رہ جاؤ گے۔“

”پھلی سے اگلیوں کا کیا تعلق ہے؟“ وہ مزید حیران ہو گیا۔

ہم نے کہا ”دراصل ہم لوگ چاول ہاتھ سے کھاتے ہیں۔ چمچے یا کانٹے سے نہیں۔“

”مگر ہاتھ سے کیوں؟“

”اس لیے کہ ہاتھ سے چاول کھانے کا جو مزہ ہے وہ چھری کانٹے سے کھانے میں نہیں ہوتا۔“

خان صاحب نے شاید عدنان کا دل رکھنے کو کہا ”مگر اس بھی ہوئی پھلی کا مزہ ہی کچھ اور ہے، بہت لذیذ پھلی ہے۔“

”شیکر ایڈرم؟“ عدنان خوش ہو گیا۔ ہم لوگوں کو حیران دیکھ کر بولا۔ ”سوری، میں تو بھول ہی گیا کہ آپ کو ترکی زبان نہیں آتی میں نے آپ کو تھینک یو کہا ہے۔“

خان صاحب نے بڑے پتے کی بات کی بولے ”اردو سے ناواقف ہیں۔“

”دراصل تلفظ اور ادائیگی کا فرق ہے۔ ہم جس طرح کوئی لفظ بولتے ہیں آپ اس کو اور طرح بولتے ہیں۔ اور پھر قدیم ترکی اور جدید ترکی میں فرق بھی ہے۔“

ہم نے کہا ”آپ نے صحیح کہا۔ اب دیکھیے نا۔ اردو زبان تو دوسری زبانوں سے مل کر بنی ہے۔ فارسی اور عربی کے بھی بے شمار الفاظ اردو میں شامل ہیں۔ مگر جب کوئی ایرانی یا عرب وہی لفظ بولتا ہے تو ہم نہیں سمجھتے۔ ہمارے الفاظ ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے۔ ہمارے بڑے بڑے قابل فارسی داں جب ایرانیوں سے فارسی بولتے ہیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اسی طرح ان کی فارسی کا لہجہ اور تلفظ ہمارے فارسی کے ماہر بھی نہیں سمجھ سکتے۔“

بٹ صاحب اس سنجیدہ گفتگو سے بور ہو رہے تھے۔ عدنان سے کہنے لگے ”بھائی عدنان۔ آپ دو چار الفاظ ترکی کے ہمیں بھی سکھا دیں۔ جب ہم یہاں ترکی الفاظ بولیں گے تو ترک بہت خوش ہوں گے۔“

بٹ صاحب اس سنجیدہ گفتگو سے بور ہو رہے تھے۔ عدنان سے کہنے لگے ”بھائی عدنان۔ آپ دو چار الفاظ ترکی کے ہمیں بھی سکھا دیں۔ جب ہم یہاں ترکی الفاظ بولیں گے تو ترک بہت خوش ہوں گے۔“

عدنان کو یہ آئیڈیا پسند آیا۔ ”اچھا تو کہیے گولے گولے۔“
 ”گولے گولے۔ مگر اس کا مطلب کیا ہے؟“
 ”اس کا مطلب ہے گڈ بائی۔ اللہ حافظ۔“
 ”گولے تو ہماری اردو میں بھی ہوتے ہیں مگر ہم گیند کی طرح گول چیز کو گولے کہتے ہیں۔ یا پھر توپ کے گولے ہوتے ہیں۔ گولے یعنی بومب Bomb۔“
 عدنان ہنسے لگا۔ ”واقعی، ہر زبان دوسری زبان سے مختلف ہوتی ہے۔“
 ”مختلف نہ بھی ہو تو بولنے کا طریقہ اور انداز مختلف ہوتا ہے۔“ ہم نے کہا۔
 بٹ صاحب نے کہا۔ ”کیا ہی اچھا ہوا اگر ساری دنیا میں ایک ہی زبان بولی جائے۔“
 ترک ویٹر بل لے کر آ گیا تھا۔ وہ ہر وقت مسکراتا رہتا تھا یا شاید ہم پاکستانیوں کو دیکھ کر خوشی سے مسکرا رہا تھا۔
 بل عدنان کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے ترکی زبان میں اس سے کچھ کہا۔ عدنان انکار میں سر ہلانے لگا۔
 ”ان کی خواہش ہے کہ پاکستانی مہمانوں کا بل یہ ادا کریں۔“
 ہم نے ہاتھ بڑھا کر عدنان کے سامنے سے بل اٹھالیا۔ ”بل تو ہم ہی ادا کریں گے شکر ایلریم۔“
 ترک ویٹر حیران ہو کر ہمیں دیکھنے لگا۔ عدنان نے اس سے کہا ”یہ ترکی زبان میں آپ کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔“
 وہ اتنا خوش ہوا کہ ہمارا ہاتھ چومنے لگا۔
 بل ادا کر کے رخصت ہونے لگے تو اس نے ہم سب کو گلے لگایا اور دونوں رخساروں پر پیار کیا۔
 بٹ صاحب چلتے چلتے رک گئے۔ عدنان سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”آپ نے ان کا نام تو بتایا ہی نہیں۔“
 ”اوہ سوری۔ میں تو پوچھنا ہی بھول گیا۔“ پھر اس نے ویٹر سے کچھ کہا۔ شاید یہ کہ یہ تمہارا نام جاننا چاہتے ہیں۔
 وہ خوش ہو کر بولا۔ ”ایدام“
 خان صاحب اردو میں بولے ”عجیب نام ہے۔“
 ہم نے کہا۔ ”دوسری زبان کا نام عجیب ہی لگتا ہے۔“
 اب اگر ہم انہیں اپنے نام بتائیں گے تو انہیں بھی عجیب ہی لگیں گے۔“
 فیری میں بیٹھ کر ہم لوگ تیرتے ہوئے ریسٹورانوں کی دنیا سے باہر آ گئے۔ ہم نے عدنان کا پھر شکریہ ادا کیا۔ ”ہم لوگوں نے آپ کا بہت وقت ضائع کر دیا۔“
 ”ارے نہیں۔ میرے لیے تو یہ بہت خوشی کی بات

ہے کہ آپ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ چلیے میں آپ کو ہوٹل تک چھوڑ دوں۔“
 ”ارے نہیں۔ ہم لوگ ادھر ادھر گھومیں گے اور پھر ہوٹل چلے جائیں گے۔ ہم کوئی بچے تو نہیں ہیں کہ راستہ بھول جائیں گے۔“
 ”میرا کارڈ تو آپ کے پاس ہے نا۔ اور میرے پاس آپ کے ہوٹل کا نمبر ہے۔ پھر ملاقات ہوگی۔ اللہ حافظ۔“
 ہم لوگ پیدل گھومتے ہوئے بلیو مسجد کی طرف نکل گئے۔ بلیو مسجد ایک اونچی جگہ واقع ہے۔ اس کا گنبد دوری سے نظر آ جاتا ہے۔ بہت خوبصورت گنبد ہے اور مسجد کے اندر کی چھت بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ منتقل پھول پیتاں اور قرآنی آیات چھت پر لکھی ہوئی ہیں۔ مسلمانوں کی مسجدیں خواہ کسی بھی ملک میں ہوں قرآنی آیات ضرور لکھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ واقعی اسلام اخوت اور محبت کا بھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہے۔
 بلیو مسجد کے آس پاس کا علاقہ ”پیو ڈروم“ کہلاتا ہے۔ عدنان نے ہمیں بتایا تھا کہ جس زمانے میں یہاں بازنطینی حکومت تھی اس جگہ رتھوں کی ریس ہوا کرتی تھی۔ ہم نے بھی پرانے دور سے تعلق رکھنے والی فلموں میں رتھوں کی ریس دیکھی ہے۔ رتھ میں ایک شخص کے بیٹھنے یا سوار ہونے کی جگہ ہوتی ہے۔ بظاہر دیکھنے میں یہ بلکی پچھلی نظر آتی ہے مگر بہت مضبوط ہوا کرتی تھی۔ رتھ میں ایک گھوڑا ہوتا تھا اور ایک سوار، ریس کے وقت سوار کو بیٹھنے کا ہوش ہی نہیں ہوتا تھا، وہ عموماً کھڑے ہو کر رتھ دوڑاتا تھا۔
 آج کل اس میدان کے وسط میں ایک اونچی سی مینار نما یادگار کھڑی ہے۔ یہ اس لحاظ سے بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہے کہ ایرانی اس کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ ترکی مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا مرکز ہے۔ رومن، بازنطینی، ایرانی اور ترک یادگاریں یہاں جگہ جگہ آج بھی نظر آتی ہیں۔ ہر ملک مختلف تہذیبوں کا مسکن ہے، شکر ہے کہ سلطان احمد کے فتح کرنے کے بعد سے یہ ترک مسلمانوں کے قبضے میں ہے۔ قسطنطنیہ کے لیے عیسائیوں اور مسلمانوں میں رزم آرائیاں ہوتی رہی ہیں۔ یہ بھی صلیبی جنگوں ہی کا حصہ تھا۔ ان کا سلسلہ سالہا سال جاری رہا ہے اور آج بھی جاری ہے۔ 9/11 کے واقعے کے بعد امریکی صدر بش یہ کہہ بیٹھے نہیں رہے تھے کہ بس اب صلیبی جنگ کا آغاز ہو گیا ہے۔ جنگ آج بھی جاری ہے اور جب تک دنیا میں مسلمان

عیسائی رہیں گے صلیبی جنگ کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ مسلمانوں سے نفرت غیر مسلموں کے خون میں رچی بسی ہے چاہے وہ عیسائی ہوں، یہودی ہوں یا ہندو، اب تو امن پسند مذہب کو مانتے والے بھی مسلمانوں کے دشمن ہو گئے ہیں۔ میانمار میں بدھ مت والوں نے مسلمانوں پر جو ظلم کے پہاڑ توڑے ہیں ان سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ بدھ مت کے ماننے والے جو کیزے مکڑوں کو مارنا بھی گناہ سمجھتے ہیں مسلمانوں کو تیر کر کے ہلاک کرنا ان کے لیے عین ثواب ہے۔
 اس میدان میں ایرانیوں کی اس اونچی مینار نما یادگار کے علاوہ ایک سیسے کی اونچی یادگار بھی ہے۔ اس کو سر پینٹ کالم کہتے ہیں۔ چوتھی صدی عیسوی میں یہ کالم (یادگار) یونانیوں نے تعمیر کیا تھا۔ ایرانیوں پر فتح حاصل کرنے کے بعد یونانیوں نے اپنے دیوتا اپولو کی یادگار کے طور پر اس کو تعمیر کیا تھا۔ اپولو یونانیوں کے نزدیک فتح کا دیوتا تھا۔ اس یادگار کے برابر میں ایک اور یادگار بھی ہے۔ یہ بازنطینی عہد میں تعمیر کی گئی تھی۔
 سلطان احمد کے علاقے میں سڑکوں پر گھومتے ہوئے ایک جگہ پرانی دکانیں نظر آئیں۔ اس چوک میں درختوں کے درمیان میں ایک فوارہ بھی ہے۔ رومن عہد میں ایسے بازاروں کو ”آگورا“ کہا جاتا تھا۔ یہاں کے مکانات لکڑی سے بنائے گئے ہیں تاکہ زلزلہ آئے تو زیادہ جانی اور مالی نقصان نہ ہو۔ سنا ہے کہ اس علاقے میں زلزلے بہت آتے تھے۔ ان مکانات کے پچھلے حصے میں بڑے بڑے صحن ہیں جن میں تالاب بھی ہوتے تھے۔ یہ جگہ خاندانوں کے اکٹھے ہونے کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔
 ہمارا ہوٹل یہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ پیدل جانے کے لیے ایک کھنے کا راستہ تھا۔ اس لیے سوچا کہ ٹیکسی کی خدمات حاصل کی جائیں۔
 بٹ صاحب نے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر ہر گزرتی ہوئی ٹیکسی کو دیکھ کر ہاتھ ہلانا اور ٹیکسی ٹیکسی پکارنا شروع کر دیا حالانکہ ان سب ٹیکسیوں میں مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔
 خان صاحب نے کہا ”بھائی دیکھ تو لیا کرو کہ ٹیکسی خالی ہی ہے یا نہیں۔“
 ”جب تک ٹیکسی نزدیک نہ آجائے کیسے پتا چل سکتا ہے کہ وہ خالی ہے یا اس میں سوار یاں بیٹھی ہوئی ہیں۔“ بٹ صاحب کی بات واقعی معقول تھی۔
 ایک ترک نے ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے ٹوٹی

پھوٹی انگریزی میں پوچھا۔ ”آپ کو ٹیکسی کی ضرورت ہے؟“
 ”جی۔“
 ”پھر آپ ”ٹاکسی“ کو آواز دیں۔ ٹیکسی کوئی نہیں سمجھے گا۔“ وہ یہ اطلاع دے کر آگے چلے گئے۔
 ”اب پتا چل گیا نا کہ ٹیکسی کو یہاں ٹاکسی کہا جاتا ہے۔“
 بٹ صاحب نے جیسے ہی ٹاکسی ٹاکسی پکارا ایک ٹیکسی ہمارے پاس آ کر رک گئی۔
 بٹ صاحب نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ”از میر ہوٹل؟“
 ٹیکسی ڈرائیور نے فوراً اتر کر دروازہ کھول دیا اور ترکی میں کچھ کہا۔
 بٹ صاحب بولے ”یہ کہہ رہے ہیں کہ تشریف رکھیے۔ میں آپ کو ہوٹل پہنچا دوں گا۔“
 ”بھئی آپ تو خوب ترکی سمجھنے لگے ہیں۔“
 بٹ صاحب نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”زبان یا رومن ترکی و من ترکی نمی دانم۔“
 اب تک ہم نے جو بھی خرچ کیا تھا وہ پونڈز اور ڈالرز میں کیا تھا جو بہت کم تھا۔
 ہم لوگوں کا خیال تھا کہ شاید استنبول ایک سستا شہر ہے لیکن اس سے پن کا سبب اس وقت معلوم ہوا جب ہم ڈالروں کو ترکی لیرا میں تبدیل کرانے گئے تھے۔
 ہم نے کرنسی تبدیل کرنے والے کو پندرہ ڈالر دیے۔ اس نے حساب لگانے کے بعد ہم لاکھوں ترکی لیرا دے دیے۔ جب اس نے لیرا کی رقم بتائی تو بٹ صاحب بہت پریشان ہوئے کہ اتنی زیادہ رقم ہم کہاں رکھیں گے مگر جب ہمیں رقم ملی تو اس میں دس ہزار، بیس ہزار، پچاس ہزار اور ایک لاکھ کے نوٹ بھی شامل تھے۔ اس زمانے میں ترکی کی اقتصادی حالت خراب تھی۔ ترکی لیرا کی قدر و قیمت بہت کم ہو گئی تھی۔ ملک میں افراطی کی وجہ سے مہنگائی بھی زیادہ تھی۔
 خان صاحب نے سارے نوٹ دیکھے اور خوش ہو کر بولے۔ ”ہم تو بیٹھے بیٹھے لکھ پتی ہو گئے۔“
 ”جی ہاں۔ لیکن خرچہ بھی لاکھوں میں کرنا پڑے گا۔“
 ”تو کیا ہوا۔ پیسا تو ہاتھ کا میل ہے۔“ بٹ صاحب تھے۔ ”ذرا پچاس ہزار اور ایک لاکھ کا نوٹ تو مجھے دکھائیے۔ میں اپنے بچوں کو فخریہ بتا سکوں گا کہ میں نے اتنی بڑی رقم کے نوٹ بھی دیکھے ہیں۔“

عدنان کے رخصت ہو جانے کے بعد ہم لوگ خود ہی اپنی مرضی سے گھومتے رہے۔ کتنی سے اتر کر ہم کو معلوم ہوا کہ استنبول کا گریڈ بازار اور سالہ بازار بھی نزدیک ہی ہے مگر فی الوقت ہم نے ان بازاروں کا رخ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہماری طرح استنبول میں بھی مارکیٹ کے لیے بازار کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس زبان کے بے شمار الفاظ اردو میں شامل ہیں لیکن ان کے تلفظ کی وجہ سے یہ جاننا مشکل ہے کہ اردو کا کون سا لفظ ہم سن رہے ہیں۔ مثلاً استنبول کا مشہور و معروف اور بہت زیادہ بارونق اسکوائر تنظیم چوک کہلاتا ہے۔

اسی طرح استنبول کیڈیسی شہر کا سب سے بارونق اور چہل پہل والی سڑک ہے۔ کیڈیسی ترکی میں روڈ کو کہتے ہیں۔ پیدل سیر کرنے والوں کی سب سے پسندیدہ جگہ ہے جوڈسٹرکٹ بیوغلو میں واقع ہے۔ یہ ایک کشادہ سڑک ہے جس کے فٹ پاتھ بھی کافی چوڑے ہیں۔ اس سڑک پر ہر قسم کی سواری کا داخلہ ممنوع ہے۔ یہ صرف پیدل چلنے والوں کی سڑک ہے۔ انگلستان اور یورپ کے شہروں میں بھی کئی بارونق چوک، بازار اور سڑکیں ایسی ہیں جہاں ہر قسم کی سواری کا داخلہ منع ہے۔ یہ پیدل چلنے والوں کی جنت ہے۔ وہ کسی رکاوٹ کے بغیر گھومتے پھرتے اور خریداری کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو پیدل چلنے والوں کے حقوق ہی نہیں ہیں۔ اگر حکومت کا بس چلے تو شاید پیدل چلنا ہی خلاف قانون قرار دے دے۔ سڑکوں پر زیر اکرانگ پر بھی ٹریفک رواں دواں رہتی ہے جس کی وجہ سے سڑک عبور کرنا ہمارے مصروف شہروں میں جان جوکھوں کا کام ہے۔ ایک بہت پرانا لطیفہ ہے کہ ایک سفید ڈاڑھی والے بزرگ سڑک عبور کرنے کے لیے فٹ پاتھ پر کھڑے تھے۔ ایک نوجوان بھی سڑک عبور کرنے کے لیے آیا۔ سڑک پر ٹریفک کے سیلاب کو دیکھ کر بزرگ سے پوچھنے لگا۔ ”مجھے بتا سکتے ہیں کہ سڑک کیسے عبور کرتے ہیں؟“

بزرگ نے اپنی سفید ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور بولے ”برخوردار میں جب یہ سڑک پار کرنے کے لیے آیا تھا تو تمہاری طرح نوجوان تھا۔ یہ بال سڑک عبور کرنے کے انتظار میں ہی سفید ہوئے ہیں۔“

لطیفوں میں تھوڑا مبالغہ تو ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے شہروں میں سڑک عبور کرنا بہت دشوار ہے، جن سڑکوں پر سوار یوں کا داخلہ بند ہے وہاں بے روک ٹوک

کاریں، ٹرک، رکشا موٹر سائیکل اور ریڑھے پیدل راہ گیموں کے لیے مصیبت بنے رہتے ہیں۔ جہاں دن و سہ ٹریفک کا بورڈ لگا ہوا ہے وہاں دونوں طرف ٹریفک کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مگر یہ مہذب اور قانون کی پاس داری کرنے والوں کا طریقہ ہوتا ہے۔ یہاں تو خود حکمران اور منتخب نمائندے ہی قانون کی خلاف ورزی کرنے کو ”فحری بات“ سمجھتے ہیں تو پھر عام لوگوں سے قانون کا احترام کرنے کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے؟

آئیے۔ اب ذرا استقلال روڈ پر چلتے ہیں جیسا کہ پہلے بتایا کہ پیدل راہ گیموں کے لیے یہ جنت ہے۔ ہمیں یوں لگا جیسے ہر فکر سے آزاد ہو گئے ہیں۔ اس سڑک پر چہل قدمی کرنے والوں کے علاوہ خریدار بھی خریداری کرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں لاٹری کے ٹکٹ فروخت ہو رہے ہیں۔ کہیں بھٹے بھونے جارہے ہیں۔ کہیں ٹرے گلے میں ڈالے مختلف کھانے پینے کی چیزیں فروخت کرتے والے گھوم رہے ہیں۔ ہر طرح کی اشیاء یہاں فروخت ہوتی ہیں۔ نقلی زیورات، بنیان، موزے، چھوٹے چھوٹے نوادرات، کپڑے، جوتے، رومال، آپ کو جس چیز کی روزمرہ ضرورت پیش آتی ہے وہ استقلال روڈ سے خرید لیجیے۔

دنیا کے مختلف شہروں میں فٹ پاتھوں پر اسی قسم کی چیزیں بکتی ہیں۔ اس ملک یا شہر سے متعلق یادگاروں کے چھوٹے چھوٹے نمونے دیکھنے میں چھوٹے ٹکٹے ہیں مگر ان کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جب ہم یورپ کے شہروں میں شوننگ کے سلسلے میں جایا کرتے تھے اس زمانے میں ایک اچھی قمیص ڈیڑھ دو پونڈ میں مل جاتی تھی۔ جوتے، کپڑے، ٹائیاں اور اس قسم کی دوسری چیزیں بھی خصوصاً انگلستان میں بہت سستی ہیں۔ ہمارے سامنے سامان خرید کر اپنے سوٹ کیس بھرتے رہتے تھے مگر ہم زیادہ تر یہ چھوٹے چھوٹے نوادرات خرید لیتے تھے جو نسبتاً مہنگے ہوتے تھے اور کم جگہ گھیرتے تھے، قمیص، چٹوئیں، ٹائیاں وغیرہ تو کب کی بیکار ہو گئیں مگر ہمارے نوادرات آج بھی ویسے کے ویسے ہی ہیں اور اب وہ زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔ ہر ملک اور ہر شہر کی چھوٹی چھوٹی یادگاریں، مگر کیس، تاریخی عمارتوں کے چھوٹے چھوٹے نمونے۔ ان شہروں کی تصاویر سے بھی ہوئی ایٹش ٹریڈ وغیرہ۔ یہ سب چیزیں آج بھی ہم نے سجا کر حفاظت سے رکھی ہیں۔ ہمارے آنے والی نسلیں بھی انہیں دیکھ کر ہمیں یاد کیا کریں گی۔

خود بھی جب انہیں دیکھتے ہیں تو پرانی یادیں گھیر لیتی ہیں۔ وہ زمانہ اور مناظر آنکھوں میں گھومنے لگتے ہیں۔ یہ بہت قیمتی یادیں ہیں جن کا کوئی اور بدل نہیں ہو سکتا۔ استقلال ایونیو میں ہم نے نوادرات کی دکانوں کا رخ کیا۔ خان صاحب نے بھی چھوٹی چھوٹی دکانوں پر اپنے مطلب کی چیزیں تلاش کرنی شروع کر دیں۔ بٹ صاحب کی جانب سے ہم کچھ دیر کے لیے بے خبر ہو گئے تھے۔

کچھ دیر بعد ان پر نظر پڑی تو بقول خان صاحب وہ لکھائی ہوئی گائے کی طرح ادھر ادھر گھومتے پھر رہے تھے۔ یہاں سیاحوں کی ٹولیاں گھوم رہی تھیں جن میں مختلف ملکوں کی طرحدار خواتین اپنے اپنے ملکوں کے برائے نام لباسوں میں لباس مختلف چیزیں خرید رہی تھیں۔ بٹ صاحب بھی خریدار بن کر اس گروہ میں شامل تھے۔

خان صاحب نے ہماری توجہ ان کی طرف دلائی تو ہم بھی اس طرف چلے گئے۔ اس وقت بٹ صاحب نقلی زیورات کے ایک ٹھڑے کے سامنے کھڑے تھے۔ خان صاحب نے پیچھے سے جا کر کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

وہ چونک پڑے۔ دھیان ان کا کسی اور طرف تھا لیکن فوراً بھانہ بنا دیا۔ ”یہ زیورات دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری بھابی کے لیے۔“

”شرم کیجیے بٹ صاحب۔ بھابی کو نقلی زیور پہناؤ گے؟“ اس وقت تک نقلی زیورات پہننے کا رواج نہیں ہوا تھا اور خواتین ان کے استعمال کو مناسب نہیں سمجھتی تھیں۔ ”نقلی ہے تو کیا ہوا، دیکھتے نہیں کتنا خوبصورت ہے۔ جب تمہاری بھابی کو لے جا کر تجھے میں دوں گا تو وہ بہت خوش ہوگی اور سب سہیلیوں اور رشتے داروں کو دکھائے گی۔“

”مگر بٹ صاحب۔ اب تو آپ لکھ پتی ہو گئے ہیں بلکہ اب پتی۔ چاہیں تو اصلی زیور بھی خرید سکتے ہیں۔“

”ہم اب پتی تو ہو گئے ہیں مگر اصلی زیورات کے لیے یہ دولت بھی کم ہے۔ تم نہیں جانتے۔ باہر کے ملکوں سے لائے ہوئے تحفوں کی کتنی اہمیت ہوتی ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”بٹ صاحب بس بھانے نہ بنائیے۔ آپ نامحرم عورتوں کے جھرمٹ میں گھوم پھر رہے ہیں۔“

”بچ کہا آپ نے، مگر یہ سوچئے کہ ایسے منظر ہمارے ملک میں دیکھنے کو نہیں ملتے۔ ہم تو ٹورسٹ ہیں، ہر دیکھنے والی چیز کو دیکھ رہے ہیں۔“

”اچھا۔ تو آپ ان کو دیکھتے رہیے۔ ہم تو کافی پیٹے جا رہے ہیں۔“

”کہاں۔“

”سامنے آئیے بہت سے ریسٹوران ہیں۔ کہیں بھی بیٹھ جائیں گے۔“

”کہیں بھی نہیں۔ کسی ایسے ریسٹوران میں جہاں بیٹھ کر باہر کا نظارہ بھی کر سکیں۔ یاد رکھیے خان صاحب بلکہ میری بات لکھ کر رکھ لیجیے۔ پاکستان واپس جا کر آپ ان نظاروں کے لیے ترسا کریں گے۔“

ہم نے دیکھا کہ ایک اونچی سی جگہ پر ایک ٹائٹ کلب کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ اتفاق سے ترکی زبان کے ساتھ انگریزی میں ٹائٹ کلب لکھا ہوا تھا جس کے الفاظ رنگین روشنیوں میں جلتے بچتے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ پھر بھی تصدیق کرنی ضروری تھی۔ ہم نے دو چار گزرتے ہوئے لوگوں سے پوچھا۔ ”یو اسپیک انگلش؟“ وہ سب مسکرا کر اور انکار میں سر ہلا کر آگے چلے گئے۔

ایک ادھیڑ عمر کے ترک سوٹ پہنے اور سرخ بوٹائی لگائے ہوئے نظر آئے تو خان صاحب نے کہا۔ ”یہ بڑے صاحب ضرور انگریزی جانتے ہوں گے۔“

وہ پاس آئے تو خان صاحب نے ان سے پوچھا۔ ”ایکسیوزی!“

وہ رک کر ہم لوگوں کو دیکھنے لگے۔

خان صاحب نے انہیں سر تا پا دیکھا۔ پچاس برس کی عمر ہوگی۔ سر اور مونچھوں کے بال سفید چمکدار تھے لیکن بھٹو میں بالکل سیاہ اور گھنی تھیں۔ چہرہ سیب کی طرح سرخی سے دمک رہا تھا۔ بہت شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک نازک سی چھری تھی جسے وہ کبھی کبھی گھما بھی لیتے تھے۔

انہوں نے اپنی بڑی بڑی چمکدار آنکھوں سے رک کر ہم لوگوں کو سوالیہ انداز میں دیکھا۔ ان کی یادگار اور بارعب شخصیت سڑک پر چلنے والوں میں بھی نمایاں تھی۔

خان صاحب نے انہیں رکتے ہوئے دیکھا تو کچھ شیشا سے گئے مگر کچھ کہنا بھی ضروری تھا۔ ”سر، یو اسپیک انگلش؟“

وہ مسکرائے تو ان کے موتیوں جیسے سفید اور ہموار دانت مونچھوں کے سائے میں چمکتے ہوئے نظر آئے۔ وہ بولے "بس آئی اسپیک انگلش دیری گڈ، یو آسک وہائی؟" مطلب یہ تھا کہ ہاں میں بہت اچھی انگریزی بولوں ہوں مگر آپ کیوں دریافت کر رہے ہیں۔

بٹ صاحب نے آہستہ سے کہا "بس، انگلش تمام شد۔"

ہم نے اردو میں جواب دیا۔ "جو بھی دال دلیہ مل جائے غیبت ہے۔"

وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے اور ہماری گفتگو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

خان صاحب بھی شاید ان کی انگریزی کے رعب میں آگئے تھے۔ "آئی آسک، ازات نائٹ کلب؟"

وہ ایک بار پھر مسکرائے اور اپنی انگریزی میں جواب دیا۔ (اردو ترجمہ پیش ہے)

"جی ہاں۔ یہ روف ٹاپ ریسٹوران ہے۔ وہاں بیٹھ کر سارے استنبول کا نظارہ بہت دلکش لگتا ہے۔ اس کا نام "نوتراس" ہے۔"

"کیا یہاں کافی اور سٹیکس مل جائیں گے؟"

"بالکل مل جائیں گے۔ میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ مگر اس کی اصل رونق رات کو دیکھنے کے قابل ہوتی ہے جب ڈنر کے بعد نو جوان لوگ یہاں ڈرنگس کے لیے آتے ہیں۔ یہاں رات کو میوزک بھی ہوتی ہے۔ اگر وہاں جانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ آ جاؤ۔"

وہ اپنی چھڑی نو عمر لڑکوں کی طرح گھماتے ہوئے نائٹ کلب کی طرف چلے تو ہم بھی ان کے پیچھے چل پڑے۔ یہ نائٹ کلب کچھ اونچائی پر تھا اس لیے ہم سب کو چڑھائی پر چڑھنا تھا۔ ہم لوگوں کا تو سانس پھول گیا مگر وہ بے فکری سے چھڑی گھماتے ہوئے بہت اطمینان اور آرام سے ہمارے آگے آگے چلتے رہے۔

نائٹ کلب واقعی بہت خوبصورت مقام پر تھا۔ ہر طرف استنبول شہر کے سفید خوبصورت گھروں کی سرخ رنگ کی چھتیں بہت دلکش منظر پیش کر رہی تھیں۔ استنبول میں ہم نے یہ دیکھا کہ تمام گھر سفید یا آف وائٹ ہوتے ہیں اور سب کی ڈھلوان چھتیں سرخ رنگ کی ہوتی ہیں۔ کچھ فاصلے پر سمندر کا نیلگوں پانی بھی نظر آ رہا تھا جس میں مختلف سائز کی کشتیوں اور جہازوں کی آمد و رفت جاری تھی۔

وہ ایک میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے اور ہمیں بھی اشارے سے وہیں بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا۔ ہم لوگ اس حسین منظر کی رعنائی کو دیکھ رہے تھے اور اپنی بے ترتیب سانسیں درست کرنے کی کوشش میں تھے، وہ مسکرائے۔ "کسی تھک گئے؟" ان کی انگریزی کو سمجھنا کچھ مشکل ضرور تھا لیکن مطلب سمجھ میں آ جاتا تھا۔

وہ بولے "یہ نائٹ کلب اونچائی پر ہے۔ آپ لوگوں کو شاید پہاڑوں پر چڑھنے کی عادت نہیں ہے؟"

ہم تینوں نے سر ہلا کر ان کی تصدیق کی۔

کہنے لگے "مگر استنبول کے رہنے والوں کے لیے یہ کوئی مشکل نہیں ہے۔ کیا آپ ٹورسٹ ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"کس ملک سے آئے ہیں۔"

"پاکستان سے!"

وہ بے اختیار کرسی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "ویکم ویکم، پاکستان۔ برادر پاکستان۔" انہوں نے ہم تینوں سے ہاتھ ملایا۔ رخساروں کو چوما تو نہیں مگر بہت پیار سے تپ تپایا۔

"میں کافی پوچوں گا۔ اور آپ؟"

"ہم بھی کافی پیتے گے۔"

"یہ کافی میری طرف سے ہوگی۔" وہ شوخی سے آنکھیں جھپک کر مسکرائے۔

ہم لوگوں نے بھی انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ایک خوش شکل لڑکی مسکراتی ہوئی کمر میں سفید اپرن پہنے ہماری طرف آئی اور بڑے صاحب سے ترکی میں بات کرنے لگی مگر اس کی نظریں ہم لوگوں کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

بڑے صاحب نے چار کافی لانے کا آرڈر دیا اور ہم لوگوں کے بارے میں بتایا جس کا اندازہ ہمیں لفظ "پاکستان" سن کر ہوا۔

لڑکی خوشی سے مسکرائی۔ "یو ویکم۔"

"تھینک یو۔"

وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ بٹ صاحب پہلو بدل کر رہ گئے۔

"مجھے آپ سے بڑی ہمدردی ہے بٹ جی! خان صاحب نے انہیں چھیڑا۔"

"کس لیے؟"

"لڑکی نے آپ سے ہاتھ ملایا نہ گلے لگایا۔"

بٹ صاحب شپٹا کر رہ گئے مگر خاموش رہے۔

بڑے صاحب ہم سے مخاطب ہوئے۔ "میرا نام ادغلان ہے۔"

ہم لوگوں نے بھی انہیں اپنے مختصر نام بتائے سوچا کہ اتنے لمبے انجی نام وہ بھلا کیا سمجھیں گے۔

وہ بولے "آپ کو پتا ہے کہ استنبول شہر سات پہاڑیوں پر پھیلا ہوا ہے۔"

"نہیں۔ ہمیں معلوم نہیں۔"

"دیکھو گے۔ چلو گے پھر گے تو سڑکوں اور گلیوں میں اونچے چڑھتے اترتے ہوئے آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

بٹ صاحب نے ہم سے کہا۔ "یہ کیا بات ہے کہ دنیا بھر میں جہاں بھی جاؤ وہاں سات پہاڑیوں پر آباد شہر وہاں ضرور ہوتا ہے۔ ہمارے لاہور میں تو بس ایک مصنوعی چھوٹی سی شملہ پہاڑی ہے۔"

خان صاحب نے کہا "ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا اسلام آباد دس بارہ پہاڑیوں پر آباد ہے۔"

ادغلان صاحب بڑے زندہ دل اور خوش مزاج بزرگ تھے۔ ان کی عمر کا اندازہ لگانا تو مشکل تھا کیونکہ ترک ایک صحت مند قوم ہے۔ کھانے پینے کے شوقین اور ایک مضبوط نسل سے تعلق رکھنے والے۔ اس لیے وہاں بوڑھوں کی عمر کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

وہ اپنی چھڑی پر اپنی انگلی سے اس طرح کھیل رہے تھے جیسے کوئی دھن بجا رہے ہوں۔ ساتھ ہی وہ بہت مدہم آواز میں گنگنا بھی رہے تھے۔ ان کی نظریں سامنے آبنائے باسفورس کے نیلگوں پانی پر جمی ہوئی تھیں۔ ہم نے اندازہ لگایا کہ ترک سمندر سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کے مختلف روپ و رنگ کو لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔

خان صاحب نے پوچھا۔ "آفاق صاحب۔ آپ کا کیا خیال ہے بڑے صاحب کی کیا عمر ہوگی؟"

ہم نے کہا۔ "دیکھنے میں تو ساٹھ پینسٹھ کے لگتے ہیں۔ ممکن ہے اسی برس کے ہوں۔"

"ہمارے ہاں تو اس عمر میں لوگ خود کو بے حد ضعیف اور بوڑھا سمجھتے ہیں مگر دیکھو یہ کتنے زندہ دل اور خوش باش فخر آ رہے ہیں۔ سوٹ بوٹ، گلے میں بوٹائی، چمکتے ہوئے سیاہ جوتے۔ اس عمر میں بھی نو جوانوں کی طرح بنے ٹھنے نظر

جانبلاط

امراء کا ایک خاندان جو نسل کے اعتبار سے کُرد تھے اور ان کا مذہب دروزی تھا۔ یہ خاندان لبنان میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ لبنان میں ان لوگوں نے ایک جانبلاطی جماعت قائم کی۔ یہ لوگ دسویں صدی ہجری۔ سولہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں علاقہ کلیس میں نمودار ہوئے۔ اس خاندان کے مشہور ناموں میں سے ایک نام جانبلاط بن قاسم الکردی کا ہے۔ (نو سو اسی ہجری۔ پندرہ سو بہتر عیسوی) جو ابن عربی نام سے مشہور تھا۔ عثمانی ترکوں نے اسے اپنی طرف سے کلیس کی سباج کا حاکم مقرر کیا۔ اس نے وہاں پر قزاقی کا سبب باب کیا اور قبرص جزیرے کی فتح میں حصہ لیا۔ اس کے بیٹے حسین (1013ھ۔ 1604ء) نے حلب سے وہاں کے والی نصوص پاشا کو نکال باہر کیا۔ چونکہ حسین نے ایران کے خلاف مہم میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا اس لیے اسے دان کے مقام پر پھانسی دے دی گئی۔ اس کا بیٹا علی عثمانی مورخین کا جانبلاط اوغلو تھا۔

علی بن حسین۔ (م 1020ھ۔ 1611ء) حسین کے بعد اس کا بیٹا علی کلیس کا حاکم بنا جس نے حلب میں بغاوت برپا کر دی اور شام میں اپنی حکومت کی توسیع کا کام کیا۔ اس نے حماسے اونہ تک ایک آزاد "امارت" قائم کر لی اور سلطان کو خراج دینا بند کر دیا، اپنے نام کا خطبہ پڑھوانا شروع کر دیا۔ اس نے تیس ہزار سے زائد فوج بھرتی کی۔ لیکن 1016ھ۔ 1607ء میں ارج کے مقام پر سلطان کی فوجوں نے اس پر غلبہ پالیا تو اس کے چچا کی سفارش پر سلطان نے اسے معاف کر دیا۔ اور دستور کی فوجی قیادت اس کے سپرد کی۔ تو وہ نئی چریوں کے ساتھ لڑائی میں شریک ہو گیا اور بعد میں بلغراد بھاگ گیا اور آخر کار 1020ھ 1611ء میں اس کو قتل کر دیا گیا۔ لیکن کلیس پر حکمرانی جانبلاط ہی کی رہی۔ علی بن حسین کے بعد جانبلاط خود بھی سلطان کے وفادار رہے۔ علی کا ایک بھتیجا مصطفی ولایت روم ایلی کا۔ "بے" مقرر کیا گیا۔

مرسلہ: عارف حسین کردیزی، ملتان

آ رہے ہیں۔“

بٹ صاحب نے فوراً شعر پڑھ دیا۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے

مردہ دل تو جینے سے بیزار ہوتے ہیں

ہم نے کہا ”بٹ صاحب یا تو آپ صحیح شعر پڑھا

کچھ یا پھر اس کا مطلب نثر میں بیان کر دیا کچھ۔ شعروں

کے ساتھ آپ کچھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔“

”اب میں نے کیا کر دیا ہے۔“

”آپ نے دوسرے مصرعے کا کباڑہ کر دیا۔ یہ شعر

یوں ہے۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے

مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

”آپ مطلب تو سمجھ گئے نا؟“

”وہ تو سمجھ گئے مگر.....“

”شاعر کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے

وہ سننے والا سمجھ جائے۔“

یہ ایک مسٹر ادغلان ہم سے مخاطب ہوئے۔ ”آپ

لوگ کون سی زبان بول رہے ہیں۔“

ہم نے انہیں بتایا کہ یہ اردو ہے۔ اس میں ترکی

زبان کے بھی بے شمار الفاظ ہیں۔ عربی، فارسی، ہندی، پشتو،

پنجابی۔“

”میں سمجھ گیا۔“ وہ بات کاٹ کر بولے ”یہ سب

زبانوں کی کاک ٹیل ہے۔“

”جی ہاں۔ آپ درست سمجھے۔“

خان صاحب بولے ”میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا

ہوں۔“

”کیوں نہیں۔“

”آپ ترک ہیں۔ ترکوں کی بہت پرانی اور عظیم

تاریخ ہے۔ دیکھنے میں آپ لوگ یونانی لگتے ہیں، ورازد،

مضبوط جسم، چہرے کے ناک نقش بھی ویسے ہی ہیں۔“

وہ مسکرائے۔ ”ہم لوگ یونانی نہیں دراصل منگول

ہیں۔ ہمارا تعلق ترک قبیلے سے ہے۔ منگولیا سے باہر نکلے تو

ترک مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ کئی ملکوں کے رہنے

والے ترک کہلاتے ہیں، وسطی ایشیا میں ترکستان ہے، سرقد

اور ازبکستان میں بھی ترک آباد ہیں۔ جن مغلوں نے

ہندوستان فتح کیا وہ بھی ترک نسل سے ہی تعلق رکھتے

تھے۔ وسطی ایشیا کے علاقے پر عرصہ دراز تک ترکوں کی

حکومت رہی ہے۔ ازبکستان میں بھی ترک آباد ہیں

ترکمانستان جو وسط ایشیا میں واقع ہے۔ یہاں بھی ترک

ہیں۔ اس علاقے میں پچاس فیصد ترک آبادی ہے جو ترکی

زبان بولتے ہیں۔

ترکوں کی نسل کے لوگ یورپ کے ملکوں میں بھی

ہوئے ہیں۔ آپ تو جانتے ہوں گے کہ عثمانیہ ایمپائر کے

میں ترک یورپ کے کئی ملکوں کو فتح کرتے ہوئے آئیں

تک پہنچ گئے تھے جہاں انہیں پہلی شکست کا مزہ چکھنا پڑا۔

شکست ہی دراصل یورپ میں ترکوں کے زوال سبب بنی

تھی۔ اس کے بعد ترک افواج پیچھے ہٹتے ہٹتے یورپ سے

واپس چلی آئیں مگر اپنی نسل کی نشانیاں وہاں چھوڑ آئے

اب وہ لوگ ترکی زبان نہیں بولتے مگر وہ ہماری ہی نسل

ہے۔“

”آپ صحیح کہتے ہیں۔ ایک زمانے میں ترکوں نے

یورپ مشرق وسطیٰ کے بہت بڑے علاقے فتح کر لیے

تھے۔“

مسٹر ادغلان نے فخر سے سراونچا کیا اور بولے۔ ”ہم

ترک ایک بہادر قوم ہیں جو کسی سے نہیں ڈرتے۔ آج کے

زمانے میں بھی ترک بڑی سے بڑی طاقت سے بھی نہیں

ڈرتے۔ عثمانیہ ایمپائر ختم ہونے کے بعد ترکی اب اپنی اصلی

حدود میں سمٹ گیا ہے لیکن ترکوں کی خودداری اور غیرت

مندى آج بھی اسی طرح ہے۔“

ادغلان بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔ ترک وہ قوم ہے

جو کوئی نا انصافی اور حق تلفی برداشت نہیں کرتی۔ سوویت

یونین کے عروج کے زمانے میں بھی مشترکہ سرحدوں پر ترک

فوجی روسیوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے تھے۔

سوویت یونین نے آدھے سے زیادہ یورپ پر اپنا تسلط

جھالایا تھا مگر ترکوں کی سرحد عبور کرنے کی انہیں بھی جرات

نہیں ہوئی۔ قبرص پر سلطنت عثمانیہ کا تسلط تھا۔ جب سلطنت

زوال پذیر ہوئی تو یونان نے قبرص پر قبضہ کر لیا۔ قبرص کی

آبادی میں 70 فیصد یونانی اور 30 فیصد ترک ہیں۔ ترکوں

کا دعویٰ یہ تھا کہ اس جزیرے پر دونوں قومیں مل جل کر رہ

سکتی ہیں مگر یونان اس پر رضامند نہیں تھا۔ وہ قبرص کو یونان

کی ملکیت تصور کرتا تھا۔ آبادی کے تناسب سے قبرص کی

حکومت پر مشترکہ حکومت ان کے لیے ناقابل قبول تھی۔

قبرص پر اپنا قبضہ جمانے کے لیے یونان نے قبرص میں اپنی

فوجیں اتار دیں۔ یونان ایک یورپی اور عیسائی ملک ہے

جسے امریکا سمیت تمام یورپی ملکوں کی حمایت حاصل ہے لیکن

ترکی نے اس حرکت کو اپنی حق تلفی قرار دیتے ہوئے اپنے

جنگی بحری جہاز قبرص کی طرف روانہ کر دیے۔ امریکا نے

بہت سفارتی دباؤ ڈالا لیکن ترکوں نے اس کی پروا نہیں کی۔

امریکا اور ساری دنیا جانتی تھی کہ ترکی اپنے موقف سے

دستبردار نہیں ہوگا۔ لہذا اور میان میں پڑ کر یونان کو قبرص سے

نہیں بلانے پر مجبور کر دیا۔ قبرص کا تنازعہ آج تک جاری

ہے۔ ترکوں نے حد بندی کر کے اپنے مقبوضہ علاقے میں

ترکوں کی حکومت قائم کر لی۔ اقوام متحدہ نے اس کے خلاف

قرارداد منظور کی لیکن ترکی اپنے موقف پر قائم ہے۔ ترک وہ

قوم ہے جو کسی سے خوفزدہ نہیں ہوتی جسے وہ جائز اور اپنا حق

سمجھتے ہیں اس سے کسی قیمت پر بھی دستبردار نہیں ہوتے۔

جب امریکی صدر بش نے عراق پر حملہ کیا تو ترکی سے

جنگی ہوائی جہازوں کے ترک سرحد سے گزرنے کی اجازت

چاہی۔ حکومت نے یہ مسئلہ پارلیمنٹ میں پیش کر دیا جس

نے امریکی ہوائی جہازوں کو اپنی فضا سے گزرنے کی

اجازت دینے سے انکار کر دیا حالانکہ امریکا نے اس کے

غرض 32 ارب امریکی ڈالر ادا کرنے کی پیشکش کی تھی لیکن

ترکی حکومت اس سے من نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس ہمارے

صدر نے امریکی دھمکیوں سے ڈر کر توقع سے زیادہ شرائط

تسلیم کر لیں اور دہشت گردی کے خلاف امریکی جنگ میں

اتحادی بن گئے اس فیصلے کے خوفناک نتائج پوری قوم آج

تک بھگت رہی ہے۔ بے شمار جانی و مالی قربانیوں اور

تقصیبات اٹھانے کے باوجود امریکا آج بھی پاکستان سے

نت نئے مطالبات کرتا رہتا ہے۔ پاکستانی علاقوں پر ڈرون

حملے کرتا رہتا ہے مگر ہم زبانی احتجاج کرنے کے سوا کچھ نہیں

کر سکتے۔ ذرا سوچئے کیا امریکا یہ سلوک ترکوں سے کر سکتا

تھا؟ امریکا کی یہ شہرت ہے کہ وہ پہلے ڈراتا ہے اور جو نہیں

ڈرتا اس سے خود ڈر جاتا ہے۔

کافی آگئی تھی اور بہت گرم اور لذیذ تھی۔

ادغلان صاحب نے دریافت کیا۔ ”اور کیا کیا دیکھا

آپ نے استنبول میں؟“

”ابھی تو کچھ نہیں دیکھا۔ ہم آج ہی تو آئے ہیں۔

اس سے استنبول دیکھنے کے لیے نکلیں گے۔“

”آپ کے ہوٹل سے آپ کو ساری معلومات مل

جائے گی یا پھر آپ کا بیڈ والا نور لے لیں۔“

”جی ہاں۔ یہی سوچا ہے۔“

ادغلان صاحب کی انگریزی ایسی تھی کہ انگریز تو سمجھ

ہی نہیں سکتے مگر ہم اندازے سے ان کا مطلب سمجھ لیتے

تھے۔

کافی ختم ہوئی تو ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور

اجازت چاہی۔ وہ مسکرائے اور سر ہلانے لگے۔ ”اللہ کو

منظور ہوگا تو پھر ملاقات ہوگی ورنہ گڈ بائی۔“

”مگر آپ۔ یہاں اکیلے بیٹھیں گے؟“

”اکیلا کیوں۔ سامنے باغیچہ جو ہے۔ میں اس

سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔ اس نے ہماری تاریخ کے بہت

سے دور دیکھے ہیں۔ یہ مجھے پرانی کہانیاں سناتا رہتا ہے۔

میں بھی اس کو اپنی کہانیاں سناتا ہوں۔ شام ڈھلے گی تو کلب

میں رونق ہو جائے گی۔ نوجوان میوزک سنیں گے۔ ناچیں

گے، گائیں گے۔ میں انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا رہوں گا۔“

جب ہم لوگ نیچے اتر رہے تھے تو ویٹریس کافی کے

برتن سینے آگئی۔ ہم لوگوں کو ہاتھ ہلاہلا کر اور مسکرا کر الوداع

کہتی رہی۔

”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ بٹ صاحب نے

سوال کیا۔

”فی الحال تو ہم ہوٹل جا رہے ہیں۔ کچھ دیر آرام

کریں گے۔ گپ شپ کریں گے۔ ہوٹل کا جائزہ لیں گے۔

ڈونر کباب کھا کر سو جائیں گے۔“

”اور صبح اٹھ کر ہم شیو کریں گے۔ غسل کریں گے،

کپڑے تبدیل کریں گے۔ ناشتا کریں گے۔“

”اور پھر پچہ ہم نے پوچھا۔

”اور پھر سوچیں گے کہ کیا کریں۔“ خان صاحب

نے جواب دیا۔

”بھئی پیدل چلنے کا کوئی ارادہ نہ کرے۔ ہم تاکسی

میں جائیں گے۔“ بٹ صاحب نے جھانپ لیتے ہوئے کہا۔

خان صاحب بیڑاری سے بولے۔ ”بٹ صاحب

آپ جب کرتے ہیں انہونی والی بات ہی کرتے ہیں۔ بھئی

ہوٹل جانے کے اور بھی طریقے ہیں۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً، ہم بس میں بیٹھ کر جاسکتے ہیں۔ کسی کوچ میں

جاسکتے ہیں اور پھر یہاں ٹرام بھی تو چلتی ہے۔“

”ارے ہاں اور یہاں کی ٹرام بھی بہت اچھی ہے۔

مجھے یاد آیا۔ کراچی میں اتنی اچھی ٹرام چلتی تھی۔ سستی بھی

تھی۔ اتنے آہستہ چلتی تھی کہ چلتی ٹرام پر سوار ہو جاؤ اور

جہاں چاہیں آرام سے ٹرام سے اتر جائیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کراچی میں ٹرام کیوں بند کر دی انہوں نے؟

”اس لیے کہ ٹریفک بہت زیادہ ہو گیا تھا۔“ خان صاحب نے کہا۔

”ٹریفک تو استنبول میں بھی بہت زیادہ ہے بلکہ کراچی سے زیادہ ہے۔“

”مگر یہاں لوگ ٹریفک کے اصولوں کی پابندی کرتے ہیں۔ تیز دار اور شائستہ ہیں۔ ہمارے شہروں کی طرح بھاگ بھاگ اور حکم پیل نہیں کرتے۔“

”ٹرام ہمیں کہاں سے ملے گی۔“

”بھائی ٹرام کوئی چھوٹی سی چیز تو نہیں ہوتی۔ سڑک پر خود ہی نظر آ جائے گی۔ ورنہ کسی سے پوچھ لیں گے۔“

”کچھ دور چلے تو بس بھی نظر آگئی اور ٹرام بھی۔“

”اب بولو۔ بس میں چلیں یا ٹرام میں؟“

”پہلے یہ تو معلوم ہو کہ ہمارے ہوٹل کون سی نمبر کی ٹرام کی جاتی ہے۔“

”ہم ٹرام کے اسٹاپ پر کھڑے تھے اور ہر ایک سے پوچھ رہے تھے۔“ یو اسپیک انگلش؟“

”مگر ہر ایک سے انکار میں جواب مل رہا تھا۔“

”اب کیا کریں؟“

”بیچے سے کسی نے ہمارے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور ایک مردانہ آواز نے پوچھا۔“ پوچھ سکتا ہوں کیا پرابلم ہے؟“

”پلٹ کر دیکھا تو ایک دیسی صاحب کوٹ پتلون پہنے کھڑے تھے، نظریں ملیں تو مسکرائے۔“

”میرا نام شعیب ہے۔ شعیب مرزا۔ سہارنپور کا رہنے والا ہوں اور آپ؟“

”ہم تو لاہور سے آئے ہیں۔ وہیں رہتے ہیں۔“

”بہت تعریف سنی ہے لاہور کی۔ میرے پنجابی دوست تو کہتے ہیں کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔“

”تو پھر آپ پیدا کیوں نہیں ہو جاتے؟“ خان صاحب نے پوچھا۔

”وہ ہنسنے لگے۔“

”بٹ صاحب بولے۔“ مرزا صاحب۔ مذاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کو ہمارا دعوت نامہ ہے۔ پاکستان آئے تو لاہور ضرور آئیں اور ہمارے مہمان بن کر رہیں۔ آپ کو

اچھی طرح لاہور دکھائیں گے تاکہ آپ اچھی طرح ہو جائیں۔“

شعیب مرزا نے ایک قہقہہ لگا یا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مسکرانے یا ہنسنے کے قابل نہیں ہیں۔ قہقہہ مار کر ہنسنے اور ایسا بھی نہیں ہے کہ بعض لوگوں کی طرح محض حلق سے آواز نکال کر ہنستے ہیں۔ وہ دل سے ہنستے ہیں ان کے قہقہے بہت جاندار ہوتے ہیں۔ لیجیے ہم تو یوں بیان کر رہے ہیں جیسے یہ آج ہی کی بات ہے اور وہ ہمارے سامنے قہقہہ مار رہے ہیں۔ اس سے یہ تو اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک خوش مزاج انسان ہیں بعد میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ان کی دلچسپ باتیں اور زندہ دلی دیکھ کر بٹ صاحب نے ان سے کہا تھا۔ ”مرزا صاحب آپ بہت زندہ دل ہیں بالکل زندہ دلان لاہور کی طرح۔“

وہ بولے۔ ”ارے صاحب۔ میں نے زندہ دلان لاہور کے بارے میں پڑھا ہے، وہ تو بہت بڑے لوگ تھے۔ نامور شاعر، مصنف، دانشور، میں تو ان کے مقابلے میں مشت خاک ہوں۔“

”مشت خاک“ ایسا لفظ ہے جو عام طور پر نہیں بولا جاتا۔ یہ ایک ترکیب عموماً اشعار میں استعمال کی جاتی ہے کچھ وقت ساتھ رہنے کے بعد معلوم ہوا کہ شعیب مرزا بہت نستعلیق قسم کی اردو بولتے ہیں اور مشکل کتابی الفاظ اپنی گفتگو میں استعمال کرنے کے عادی ہیں۔

خان صاحب نے پوچھا۔ ”مرزا صاحب آپ نے بے مشکل اردو کہاں سیکھی؟“

”ارے صاحب۔ آپ بھول رہے ہیں کہ میں اہل زبان جامعہ ملیہ اور علی گڑھ یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ ہوں۔ آپ یہ فرمائیے کہ آپ لوگوں کا مسئلہ کیا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کا قصد کدھر کا ہے؟“

”ہم تو اپنے ہوٹل جانا چاہ رہے تھے۔ بس یا ٹرام کے ذریعے۔ مگر ہمیں یہ معلوم نہیں کہ ہمارے ہوٹل کی طرف کون سی نمبر کی بس یا ٹرام جائے گی؟“

”پہلے تو آپ یہ فیصلہ کریں کہ بس کے ذریعے جا چاہتے ہیں یا ٹرام کے؟“

”ہمارے لیے تو دونوں ایک جیسی ہیں۔ دراصل ٹیکسی کے پیسے بچانا چاہتے ہیں۔“

”یہاں بس سروس اور ٹرام سروس بہت اچھی ہے۔ چھوٹی دیکھیں بھی مل جاتی ہیں۔ پھر ٹیکسی پر پیسا خرچ کرنا

کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کے ہوٹل کا نام؟“

”ہم نے ہوٹل کا نام بتایا۔“

”میں بھی اسی طرف جاؤں گا۔ مگر مسالہ بازار سے ہو کر۔“

”مسالہ بازار؟“

”جی ہاں۔ اسپاٹس بازار۔“

”مگر مسالہ تو ہر دکان سے مل جاتا ہے۔ اسے خریدنے کے لیے اسپاٹس بازار جانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”وہاں سستامل جاتا ہے۔ اور پھر وہاں اور بھی بہت سی کام کی چیزیں سستے داموں مل جاتی ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو بہت جلدی نہ ہو تو اس طرف سے ہو کر چلیں گے۔ ویسے بھی باہر سے آنے والے سیاح استنبول کا مسالہ بازار ضرور دیکھتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ استنبول کا مسالہ بازار بھی دیکھ لیتے ہیں۔“

”جیسے کہ ہمارے لاہور میں اکبری منڈی ہے۔“

خان صاحب بولے۔ ”اکبری منڈی میں اور بھی کھانے پکانے کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ یہ بازار تو صرف مسالہ بازار ہے۔“

”ہم نے کہا۔“ جب ہم سری لنکا گئے تھے تو کینڈی جاتے ہوئے ہمیں مسالہ والا باغ بھی دکھا تھا۔“

”مسالہ باغ۔“

”جی ہاں۔ اس باغ میں ہر قسم کے مسالہ کے پودے اور درخت ہیں۔ باغ کے پاس پہنچتے ہی مسالوں کی خوشبو سے بھوک چمک اٹھتی ہے۔ اس باغ کو بہت خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔ مختلف مسالوں کے لیے الگ الگ حصے ہیں۔ یہاں سے دکاندار اور تاجر تھوک کے بھاؤ مسالے خرید کر لے جاتے ہیں۔“

اس وقت ایک جدید خوبصورت چمکتی ہوئی ٹرام بھی آئی۔ مسافر اترے اور کچھ اس میں سوار ہو گئے جن میں ہم بھی شامل تھے۔ یہ ٹرام اندر سے بھی بہت خوبصورت اور صاف ستھری تھی۔ دروازے کے پاس اور چھتوں کے کنارے ایک ترکی زبان میں کچھ اشتہار بھی لگے نظر آئے۔ شعیب مرزا نے یہ بتایا کہ یہ مسافروں کو خبردار کرنے کی ہدایات ہیں۔

”کیسی ہدایات؟“

”مثلاً یہ کہ ٹیکس چوری نہ کریں۔ یہ بہت سنگین جرم ہے۔ جعلی چیک نہ جاری کریں۔ یہ بھی جرم ہے۔ آپ کی ساکھ خراب ہو جائے گی اور نہ آپ کو کوئی کرائے دار رکھے گا۔ کوئی چیز آپ خرید نہ سکیں گے، یوں سمجھئے کہ آپ کا ریکارڈ خراب اور زندگی برباد ہو جائے گی۔ کوئی بینک آپ کا اکاؤنٹ نہیں کھولے گا۔ آپ کو ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں ملے گا۔“

”ہم نے کہا۔“ ہمارے ملک میں تو لوگ بے خوف و خطر یہ سب کام کرتے ہیں اور معزز بھی کہلاتے ہیں۔“

”ہمارے ملک میں بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ ان جرائم کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔“ شعیب مرزا نے کہا۔

”ہم ٹرام کی آرام دہ سیٹ پر بیٹھ گئے مگر ذہن۔ کئی سال پہلے کراچی کی ٹراموں کی طرف چلا گیا۔ وہ ٹرامیں جدید انداز کی نہیں تھیں۔ دونوں طرف سے سوار ہونے اور اترنے کا راستہ تھا۔ یہ ٹرام گھنٹی بجاتی ہوئی چلتی تھی اور اس کی رفتار اتنی کم ہوتی تھی کہ چلتی ٹرام میں سوار ہونا اور اس سے اترنا بہت آسان تھا۔ ٹرام کے پورے سفر کا کرایہ اس زمانے میں ایک آنے یا ڈیڑھ آنے تھا۔ جہاں جس جگہ سے سوار ہوں اور چاہے جس جگہ اتر جائیں۔ یہ بالکل کھلی سی ٹرام ہوتی تھی۔ بس صرف سر پر ایک چھت ہوتی ہے۔ باقی ہر طرف سے کھلی ہوئی۔ اس ٹرام میں بیٹھ کر بہت لطف آتا تھا۔ کراچی کی ٹھنڈی ہوا، سڑک کے نظارے۔ مسافروں کی گپ شپ کئی لوگ تو بھاگتے ہوئے مسافر دوستوں سے باتیں کرتے جاتے تھے۔ سڑک کے درمیان میں ٹرام کی چھوٹی سی پٹری ہوتی تھی۔ ٹرام کے دونوں کناروں پر انجن ہوتا تھا۔ فرض کیجیے اگر آپ کیمائڈی جا رہے ہیں تو انجن ڈرائیور سامنے کھڑا ہو کر ٹرام چلاتا تھا۔ اگر واپسی کا سفر کرنا ہے تو دوسری طرف جا کر ڈرائیور انجن اشارت کر دیتا تھا۔ یہاں اتنی کھلی جگہ ہوتی تھی کہ دو چار مسافر بھی اس میں کھڑے ہو سکتے تھے۔ ٹرام چلانے کے لیے کسی مہارت کی ضرورت نہیں تھی۔ ٹرام اشارت کی اسٹیرنگ سنبھال کر کھڑے ہو گئے۔ ٹرام اپنی تنگ سی پٹری پر چلتی رہتی تھی۔ اس کا ٹریک یعنی پٹری ریل کی پٹری سے کم ہوتا تھا۔ فرق یہ تھا کہ ٹرین کی پٹری اوپر کو اٹھی ہوتی ہے اور ٹرام کی پٹری نیچی لوہے کی تالی کی طرح کچھ گہری ہوتی تھی۔ کراچی کی سڑکیں بہت کشادہ تھیں۔ ٹریفک اس زمانے میں برائے نام ہی ہوتا تھا۔ کراچی میں موٹر سائیکلیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔

زمانے میں حجاب پہنے خواتین نظر نہیں آتی تھیں کیونکہ حکومت کی طرف سے اجازت نہ تھی۔ اس کے بعد وقت کے ساتھ جوتہ دلیاں ہوئیں ان کے بارے میں بھی آپ کو بتائیں گے چونکہ ہم نے ہر بار استنبول کو مختلف رنگ میں رنگا ہوا دیکھا۔

”یہ رہا ہمارا ہوٹل۔“ بٹ صاحب نے ہوٹل کے بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”بٹ صاحب۔ آپ بلا وجہ اپنے الفاظ ضائع نہ کیا کیجئے۔ خصوصاً کسی دوسرے ملک میں۔ جس کو بھی اللہ نے آنکھیں دی ہیں وہ دیکھ سکتا ہے کہ یہ سامنے والی عمارت ایک ہوٹل ہے۔“

”ہوٹل تو آپ نے اچھی جگہ لیا ہے۔“ شعیب مرزا نے کہا۔ ”شہر کی رونق بھی ہے اور ٹرانسپورٹ کی سہولت بھی ہے۔“



SOLE DISTRIBUTOR
of U.A.E

WELCOME BOOK SHOP

JASOOSI SUSPENSE PAKEEZA SARGUZASHT

P.O.Box 27869 Karama, Dubai Tel: 04-3961016

Fax: 04-3961015 Mobile: 050-6245817

E-mail: welbooks@emirates.net.ae

Best Export From Pakistan

WELCOME BOOK PORT

Publisher, Exporter, Distributor

All kinds of Magazines, General Books and Educational Books

Main Urdu Bazar, Karachi Pakistan

Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax: (92-21) 32638086

Email: welbooks@hotmail.com

Website: www.welbooks.com

کراچی جا کر ٹیکسی کو روکتے ہیں تو وہ وضع دار ٹیکسی ڈرائیور ہمیں یاد آجاتے ہیں۔ دیکھا آپ نے خیال بھی کیا چیز کسی وقت بھی آپ کے دماغ میں آسکتا ہے۔ یہ دنیا کی حیرتیں چیز ہے۔ اس کی رفتار روشنی کی رفتار سے بھی بہت زیادہ تیز ہوتی ہے۔ آپ نے بھی کبھی آزمایا ہوگا کہ لاہور میں بیٹھے بیٹھے ایک لمحے میں آپ کا خیال لندن، نیویارک، جڑیں اور روم پہنچ جاتا ہے۔ پھر لمحہ بھر میں سری لنکا یا ہانگ کانگ پہنچ کر وہاں کی باتیں آپ کو یاد دلاتا ہے، اس سے زیادہ تیز رفتار اور کیا چیز ہوگی۔ البتہ آج سائنس کی ترقی کے زمانے میں ای میل اور موبائل کے ذریعے آپ خیال کی رفتار سے ہی اپنی بات دور دراز علاقوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ انسان کو زمین پر اللہ کا خلیفہ یوں ہی تو نہیں کہا جاتا۔ وہ اللہ کے ہر راز کو جاننے کی جستجو کرتا ہے اور بہت حد تک اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ وہ کائنات کے کئی رازوں کو جان چکا ہے لیکن 99 فیصد رازوں سے آج بھی ناواقف ہے۔ دیکھیے۔ کس طرح بات سے بات نکلتی ہے۔ الف لیلہ کی داستان میں بھی کچھ یہی ہوتا رہا جس کی وجہ سے وزیرِ زادی کی جان بخشی ہوئی رہی۔

شعیب مرزا کا مشورہ تھا کہ ہوٹل جانے سے پہلے ہم اگر مسالہ بازار دیکھ لیں تو کیا حرج ہے؟

بٹ صاحب نے یہ سن کر برا سامنہ بنایا۔ ان کا کہنا تھا کہ کچا مسالہ دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے مسالہ تو اس وقت ہی مزہ دیتا ہے جب کھانے کے اندر پکایا گیا ہو۔

خان صاحب نے یہ نکتہ اٹھایا کہ مسالے کو گرم مسالہ کیوں کہا جاتا ہے۔ ٹھنڈا مسالہ کیوں نہیں کہا جاتا ہے۔ یہ سوالات ہم نے پہلی بار سنے تھے اس لیے ان کا جواب دینے کے لیے تحقیق اور معلومات حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔

شعیب مرزا کا اصرار تھا کہ وہ ہمارے ہوٹل تک ہمیں چھوڑنے جائیں گے۔ بٹ صاحب کا اصرار تھا کہ ہمیں اس کیلئے ہی جانے دیں تاکہ ہم کو بھی کچھ تجربہ حاصل ہو۔ اس طرح انکی پکڑ کر کسی شہر میں گھومنا تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی بچہ بزرگ کی انگلی پکڑ کر چلتا ہے۔ شعیب مرزا کا کہنا تھا کہ یہ تو اخلاق کا تقاضا ہے کہ وہ ہمیں ہوٹل تک چھوڑ کر آئیں۔

گرام سے اتر کر ہمیں دوسری سڑکیں عبور کرنی تھیں جس کے بعد ہم ہوٹل پہنچ جاتے۔ موسم بے حد گرم بلکہ رومانہ گھبراتا تھا۔ ماحول بھی بہت دلکش تھا۔ استنبول کی سڑکوں پر اس

انہوں نے ٹیکسی ایک پیٹرول پمپ پر روک دی اتر کر اسے بتایا کہ کتنا پیٹرول ڈالنا ہے۔ انی دیر میں پمپ کا ایک وردی پوش ملازم نمودار ہوا جس نے ٹیکسی تمام شیشے کپڑے سے صاف کر دیے۔ وہ ایک مہذب تھا۔ ہر پیٹرول پمپ پر پیٹرول ڈلوانے والوں کی کا پمپ کا اسٹاف کبے بغیر ہی صاف کر دیا کرتا تھا۔

ہم دل میں سوچ رہے تھے کہ یہ کیا بات ہے کہ آپ ٹیکسی (اور اب رکشا) لیتے ہیں تو ڈرائیور کی پیٹرول پمپ پر گاڑی کھڑی کر کے پیٹرول کیوں ڈلواتا ہے۔ سواری کو بٹھانے سے پہلے اسے معلوم نہیں ہوتا کہ پیٹرول ڈلوانا ضروری ہے اور مسافروں کے سوار ہونے سے پہلے ہی پیٹرول کیوں نہیں ڈلواتا؟ اور پھر کرائے کے حساب پیسے بھی سواری ہی سے لے کر دیتا ہے۔

چند منٹ میں پیٹرول ڈلو کر فارغ ہو گئے۔ بٹ صاحب نے ہم سے پیٹرول کے پیسے بھی وصول نہیں کیے خاموشی سے شیردانی کا دامن جھاڑ کر ٹیکسی میں بیٹھ کر پڑے۔

حسن اسکوائر پہنچ کر ہم نے ایک جگہ ٹیکسی رکوائی۔ کو دیکھا تو ڈیڑھ روپے یا پونے دو روپے کا بل بنا تھا۔ نے ایک روپیہ اور ریزنگاری ان کے حوالے کی۔ دل توچ تھا کہ انہیں ٹپ بھی دیں مگر ان کی شخصیت سے مرعوب ہمت نہیں پڑی۔ بل ادا کر کے ہم چل پڑے تو بٹ صاحب نے آواز دی۔ ”سینے؟“

ہم رک گئے۔ سوچا شاید ٹپ کا تقاضا کریں گے۔ بڑے صاحب ہمارے پاس آئے۔ ان کے ہاتھ میں دو ٹپ تھیں۔ انہوں نے وہ دو آنے ہماری طرف بڑھا دیے۔

ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ بولے ”میاں جب ہم پیٹرول ڈلو کرے تھے تو چل رہا تھا۔ وہ آپ کا وقت تھا۔ اس کے پیسے ہم نہیں لے گے یہ دو آنے رکھ لیجئے۔“

ہمارے کچھ کہنے سے پہلے وہ دو ٹپ کا سکہ ہمارے ہاتھ میں دے کر ٹیکسی میں سوار ہو کر یہ جا، وہ جا۔ ٹیکسی (اور رکشا) والوں کو ٹپ ہم تو دیا ہی کرتے تھے مگر یہ پہلا اور آخری موقع تھا جب ایک ٹیکسی ڈرائیور ہمیں ٹپ دی تھی۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا اور کیسے لوگ تھے غالباً 1961ء یا 1962ء کا ذکر ہے مگر آج بھی جب

موٹر رکشا کا اس وقت تک رواج نہیں ہوا تھا۔ صرف پہلے رنگ کی ٹیکسیاں چلتی تھیں جو میٹر کے حساب سے کرایہ وصول کرتی تھیں۔ پیٹرول بھی سستا یعنی ڈیڑھ پونے دو روپے میلن تھا۔ اس لیے کافی فاصلے کا کرایہ بھی عموماً ایک روپے سے کم ہی ہوتا تھا۔ آنے دو آنے، چار آنے، آٹھ آنے اور ایک روپے کے سکے چلتے تھے۔ اگر ٹیکسی ڈرائیور کو دو آنے ٹپ دی جائے تو وہ بہت خوش اور شکر گزار ہوتا تھا۔

ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ممکن ہے پہلے بھی سنا چکے ہوں۔ ہمیں ایک بار کلفٹن روڈ سے حسن اسکوائر جانا تھا جہاں ہم اپنی بھانجی کے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک گزرتی ہوئی ٹیکسی کو اشارہ کیا، وہ فوراً رک گئی۔ اس وقت ٹیکسی والا نہ کوئی سوال کرتا تھا نہ ہی یہ جواب دیتا تھا کہ میں اس طرف نہیں جاؤں گا۔

ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر ہم اس میں سوار ہو گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے گردن موڑ کر ہمیں دیکھا اور پوچھا۔ ”کہاں جائیے گا۔“ ”حسن اسکوائر۔“

کوئی جواب دیے بغیر ٹیکسی ڈرائیور نے کار اشارت کر دی۔ ہم نے ان کا جائزہ لیا تو عجیب خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ وہ بچپن ساٹھ سال کی عمر کے ایک بزرگ تھے۔ ڈاڑھی تقریباً سفید ہو چکی تھی۔ سر پر جناح کیپ، جسم پر شیردانی، بہت ہی معقول اور شائستہ شخصیت کے مالک تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم نہیں ہوتا تھا۔ مختلف چوراہوں اور اہم سڑکوں پر سفید یونیفارم پہنے ٹریفک کے سپاہی کھڑے ہاتھ کے اشارے سے ٹریفک کنٹرول کرتے تھے۔ گردن میں ایک ڈوری کے ساتھ سیٹی بھی لٹکی ہوتی تھی۔ یہ سیٹی اشد ضرورت کے وقت بجائی جاتی تھی اور اس کی آواز سن کر سارا ٹریفک تھم جاتا تھا۔ کیا محال جو کوئی ٹریفک کا ٹریفک کی ہدایت پر عمل نہ کرے۔

حسن اسکوائر جاتے ہوئے ہم کراچی کی کشادہ خوبصورت اور اہم سڑکوں سے گزر رہے تھے۔ معزز صورت کے ٹیکسی ڈرائیور ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر خاموشی سے ٹیکسی چلا رہے تھے۔

سندھی مسلم سوسائٹی کے نزدیک ایک پیٹرول پمپ دیکھ کر وہ بولے ”میاں، اگر اعتراض نہ ہو تو میں پیٹرول ڈالوں۔“

”جی ہاں، ضرور۔“

ہم نے کہا۔ ”ہوٹل ہم نے خود نہیں لیا۔ کسی نے ہمیں دلا یا ہے۔ ہمیں تو کسی ہوٹل میں جگہ ہی نہیں مل رہی تھی۔“
 ”بلکہ ہوٹل ہی نہیں مل رہا تھا کیونکہ ہوٹلوں کے نام ترکی میں لکھے ہوئے تھے۔“ خان صاحب نے اضافہ کیا۔

ہوٹل میں داخل ہوئے تو استقبال پر ایک سفید بالوں اور سیاہ مٹھنوں والے بزرگ تشریف فرما تھے۔ قریب گئے تو معلوم ہوا کہ صرف ان کے بالوں کا رنگ سفید ہے ورنہ وہ بزرگ نہیں ہیں۔ شاید 45 یا 50 سال کی عمر ہوگی۔

ہمیں اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر وہ بہت دوستانہ انداز میں مسکرائے۔ ”خوش آمدید“ بٹ صاحب نے جاتے ہی سوال کیا۔ ”یو اسپیک انگریز؟“

انہوں نے انگلیوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لعل لعل“ یعنی تھوڑی تھوڑی۔ خان صاحب نے بٹ صاحب سے کہا ”اب ان کی انگریزی کا امتحان لینے نہ بیٹھ جانا۔“

بٹ صاحب نے ان کے سامنے ہاتھوں سے یوں اشارہ کیا جیسے تالا کھولتے ہوئے چابی گھماتے ہیں۔ ”روم نمبر؟“ انہوں نے پوچھا۔

”ہم نے کمروں کے نمبر بتائے۔ انہوں نے اپنے پیچھے رکھی ہوئی چھوٹی سی خانے والی ریک سے ہماری چابیاں نکال کر ہمارے حوالے کر دیں۔

ہم نے شعیب مرزا سے کہا۔ ”بھائی، آپ کافی پیے بغیر نہیں جائیں گے۔“

وہ بولے ”آپ لوگ تھکے ہوئے ہیں۔ آج ہی استنبول آئے ہیں۔ اس لیے آرام کیجیے۔“

بٹ صاحب بولے۔ ”وعدہ کیجیے کہ کل بھی ملیں گے؟“

”ارے صاحب کل تو میں صبح کا ناشتا بھی آپ کے ساتھ ہی کروں گا۔“

”بہت خوب۔ مگر کچھ دیر تو رک جائیے تاکہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں۔“

وہ مان گئے اور ہم لابی میں صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ”دیکھیے بھائی صاحب ہم تو پاکستانی ہیں۔ اس وقت یورپ سے آرہے ہیں اور اپنے ملک جانے سے پہلے ترکی دیکھنے آئے ہیں۔“

”کتنے دن ٹھہریں گے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”دس دن۔“

شعیب مرزا نے۔ ”دس دن میں تو آپ پوری استنبول بھی نہیں دیکھ سکتے۔ سارا ترکی دیکھنے کے لیے تو کم از کم زیادہ وقت چاہیے ہوگا۔“

”اللہ کو منظور ہوا تو دوبارہ آجائیں گے۔“

پھر ہم سب نے بتایا کہ ہم لوگ پاکستان میں کرتے ہیں۔

شعیب مرزا حیرت سے سنتے رہے پھر بولے ”آپ تو عجیب لوگ ہیں۔ یہ انجینئر ہیں، یہ زمیندار ہیں۔ آپ ساز اور ڈائریکٹر ہیں۔ آپ تینوں اکٹھے کیسے ہوئے؟“

ہم نے کہا۔ ”دراصل ہم تینوں کا مزاج اور فطرت ایک دوسرے سے ملتا ہے۔ پاکستان میں ہم ایک ہی شہر میں رہتے ہیں۔ اکثر ملتے رہتے ہیں۔ ملک سے باہر بھی گئے۔“

”پہلے۔ اب آپ بھی اپنے بارے میں بتائیے۔“

”میرا نام شعیب مرزا ہے۔ میں ایک ملٹی ٹیکسٹائل کمپنی میں کام کرتا ہوں جو مجھے کبھی کسی ملک اور شہر میں تو کبھی کسی اور ملک میں بھیج دیتی ہے۔ میں استنبول میں ایک سال سے تعینات ہوں۔ ترکی کے بارے میں گھوم پھر کر بہت کچھ جان گیا ہوں۔“

”آپ تو کام کے آدمی ہیں۔ مگر ہمارے ساتھ کبے گھومیں گے۔ آفس بھی جانا ہوگا۔“

”میں آفس سے چھٹی لے لوں گا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ایک بھی چھٹی نہیں لی ہے۔ آفس والوں کو بھی اعتراض نہیں ہوگا۔“

”آپ شادی شدہ ہیں یا کنوارے۔“

”کافی شادی شدہ ہوں۔“ وہ مسکرائے۔

”کافی سے کیا مراد ہے آپ کی۔“

”میں تین شادیاں کر چکا ہوں۔“

”ماشا اللہ۔“ خان صاحب بول پڑے۔ ”چوتھی کی کی کب پوری کریں گے؟“

”آپ غلط سمجھے۔ دراصل میری ایک شادی گھر والوں نے اس وقت کر دی تھی جب میں گیارہ سال تھا۔ ظاہر ہے جب بڑا ہوا تو ہم دونوں سمجھدار ہو چکے تھے۔ اس لیے یہ گڑیا گڈے کی شادی باہمی رضا مندی سے ہو گئی۔ دوسری شادی کی مگر بد قسمتی سے طلاق ہو گئی۔“

”قصور کس کا تھا؟“ خان صاحب نے پوچھا۔ ”آپ یا بھابی کا؟“

مصنف

شکیل ادریس

ایک باکمال مصنف کے لیے ضروری ہے کہ وہ قارئین کی سوچ کو لفظوں کا پیرہن دے اور اس نے یہی کیا، ایسے ایسے ناول تحریر کیے کہ لوگ اس کے ناول پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ دنیا کی بہت کم زبانیں ہیں جس میں اس کے ناولوں کا ترجمہ نہ ہوا ہو۔ مگر اس کی زندگی؟

ایک معروف مصنف کی سبق بھری داستان زیست



ریٹنی ریمینڈ 24 دسمبر 1906ء میں لندن، انگلستان میں کرسمس کے دن پیدا ہوا۔ وہ کرل فرانس ریمینڈ کا بیٹا تھا، جو برطانیہ کی نوآبادیاتی فوج میں مرجن تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا سائنس پڑھے اور سائنس داں بنے۔ انہوں نے بیٹے کو کنگز اسکول روچسٹر میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخل کرادیا۔ ریٹنی ریمینڈ کو سائنس سے شغف نہیں تھا، مگر اپنے والد کی خواہش کے احترام میں اس نے برصغیر کا رخ کر لیا۔ کلکتہ کے ایک میڈیکل کالج میں کرل فرانس ریمینڈ متعین تھے۔ اسی

کرنے کے بعد بادشاہت بھی نہیں رہی۔“

”بادشاہوں پر عروج اور زوال کا وقت آتا رہا۔ مگر آپ مغل ہونے پر قائم رہے۔ آپ کو تو علم غالب ترک نسل کے ساتھ مغلوں کے ذہن کی آمیزش بعد وہ بھی اپنے نام کے ساتھ مرزا غالب لکھا کرتے تھے۔“

”جیسے تو مرزا لکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ ہم پٹھانوں نے بھی ہندوستان پر حکومت کی ہے۔“

”آپ لوگ مل کر مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“

صاحب نے کہا۔ ”اس لیے کہ ہم بٹوں نے بھی ہندوستان پر حکومت نہیں کی۔“

”صبر کیجیے بٹ صاحب۔ کبھی آپ کی بھی اللہ سن لے گا۔“

صاحب نے کہا۔ ”اب یہ بتائیے کہ کل کہاں جاتا ہے؟“

”ہم نے کہا۔“ جہاں جہاں آپ لے جائیں گے۔“

بٹ صاحب بولے۔ ”میں تو سب سے پہلے دیکھوں گا۔“

”توپ نہیں۔ اس کا نام توپ کوئی ہے۔“

”خیر، ہے تو توپ کے نام سے مشہور۔“

”باسفورس کی سیر، تاریخی عمارتوں اور یادگاروں دیکھنا بھی ضروری ہے۔“

”شعب مرزا نے کہا۔“ فکر نہ کیجیے۔ استنبول دیکھنے کے لائق جگہوں کی کمی نہیں ہے۔ سالہ بازار چھت والا بازار بھی آپ کو دکھائیں گے۔ اس کو چھت بازار بھی کہتے ہیں اور گرینڈ بازار بھی۔ کل فہرست بنا کر کے مطابق عمل کریں گے۔ اب مجھے اجازت؟ مجھے ہمارے لیے آفس بھی جانا ہے۔“

”شوق سے جانیے اور کل شوق سے آئیے۔“

ناشتے پر آپ کا انتظار کریں گے۔“

”خدا حافظ! وہ ہم سب سے ہاتھ ملا کر رہے ہو گئے۔“

”ہم لوگ اپنے کمروں کی طرف چلے۔“

”شکریہ۔“

صاحب۔ آج آپ نے لا حول بہت کم پڑھی۔“

”اتنی جلد بازی نہ کیجیے۔ آج تو پہلا دن تھا۔“

”کل دیکھی جائے گی۔“

”ہم میں سے کسی کا قصور نہیں تھا۔ قصور ہم دونوں کے گھروالوں کا تھا۔ ان کی وجہ سے جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ آخر طلاق پر بات ختم ہوئی۔ ہم دونوں میاں بیوی کا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں تھا۔“

”ہم سب یہ سن کر چپ ہو گئے۔ ہمارے معاشرے میں عموماً گھروالے ہی اپنے بچوں کے گھر برباد کرنے کے ذمے دار ہوتے ہیں۔“

”شعب مرزا مسکرائے۔“ یہ تو تقدیر کے کھیل ہیں۔ تین سال پہلے میری تیسری بار شادی ہوئی ہے۔ اتفاق سے ملازمت کے سلسلے میں گھروالوں کے ساتھ بہت کم رہتا ہوں اس لیے گھریلو زندگی بہت خوشگوار ہے۔“

”مبارک ہو آپ کو۔ تو پھر بھابی سے کب ملائیں گے؟“

”آج کل وہ انڈیا گئی ہوئی ہیں۔ ان کی فیملی میں چند شادیاں ہیں۔ پندرہ بیس دن بعد ہی واپس آئیں گی۔“

”آپ کو ترکی تو آتی ہوگی؟“

”ہم نے ترکی کے بارے میں بہت کچھ پڑھا اور سنا ہے لیکن آپ جیسے تجربہ کار استنبول سے ہمیں کافی آسانی ہو جائے گی۔“

”یہ استنبول لے گیا ہے جیسے سنو لے۔“

”دیکھیں ہم لاہور والے لاہور سے، کھلاتے ہیں۔“

”استنبول والوں کو استنبول لے کہنے میں کیا ہرج ہے؟“

”بٹ صاحب نے وضاحت کی۔“

”شعب مرزا ہنسنے لگے۔“ آپ نے واقعی دلچسپ بات کی ہے۔ میں نے تو یہ سوچا تک نہیں تھا۔“

”مرزا صاحب۔ سوچنے کی عادت ڈال لے۔“

”یہ بتائیے کہ آپ لوگ مجھے مرزا صاحب کیوں کہتے ہیں؟“

”تو کیا پھر شیخ صاحب یا سید صاحب کہیں؟“

”صرف میرا نام لیں، شعب۔“

”ویسے آپ سچ سچ کے مرزا ہیں نا، یعنی مغل؟“

”جی۔ بزرگوں سے یہی سنا ہے مگر اب مغلوں والی کوئی بات نہیں رہی۔ ڈھائی سو سال ہندوستان پر حکومت

کالج میں اس نے داخلہ لے لیا تاکہ بیکشیر یا لوجی میں ڈپلومائے کے کیمپل یونٹ نے کالج میں ریمنڈ ریسرچ لیبارٹری بھی قائم کر رکھی تھی وہ اس کالج میں 1912ء تک پریسل بھی رہ چکے تھے۔

رینی ریمنڈ کا دل میڈیکل میں نہ لگا تو اس نے کالج چھوڑ دیا تب اس کے والد نے اسے بینک میں کلرک رکھوانا چاہا مگر اس نے انکار کر دیا، اس انکار سے گھر میں اختلافات جنم لینے لگے اور کچھ اذیت پیدا ہو گیا۔ اس لیے کہ وہ اپنے والد کا اگوتا بیٹا تھا اور خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ رینی ریمنڈ جب اٹھارہ برس کا ہوا تو اس نے گھر چھوڑ دیا اور سٹریٹن کی حیثیت سے بچوں کی انسائیکلو پیڈیا فروخت کرنے لگا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے دو برس کے دوران تقریباً ایک لاکھ دروازوں پر دستک دی مگر چند سو انسائیکلو پیڈیا ہی فروخت کر سکا۔ دو سال بعد اس نے ایک ہول سیلر کے ہاں ملازمت کر لی، جبکہ اس کی عمر بیس برس تھی۔ وہ دکان پر بیٹھ کر کتابیں فروخت کرنے لگا۔ کتابیں اس کا اوڑھنا بچھونا تھیں اور حقیقی معنوں میں کل کائنات۔ کتابوں کی دکان پر ملازمت کرنے سے اسے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ مطالعہ کا شوقین بن گیا اور اس کا رجحان لکھنے کی طرف ہونے لگا۔ اس نے مصنف بننے کا فیصلہ کیا اور دوسری جنگ عظیم کے دوران ہی لکھنے لگا۔

1941ء میں اس پر مقدمہ درج ہو گیا، اس نے ایک ناول جو ناول کم اور تاریخ زیادہ تھا اس میں جاشی لوگوں کی تجارت اور انہیں غلام بنا کر امریکا لے جانے کی سازش سے پردہ اٹھایا تھا۔ یہ بات برطانوی حکومت کو پسند نہیں آئی۔ اس پر اور اس کے پبلشر جبرالڈ پر سو سو پونڈ جرمانہ کر دیا گیا۔ رینی نے عدالت میں اپنا دفاع خود کیا اور اس زمانے کے بہترین لکھنے والوں، جن میں ایچ ای۔ بیٹس، جان بنجمن اور ریمنڈ چنڈلر شامل تھے، اس کے حق میں بیانات دیے۔ جس کے نتیجے میں وہ مقدمہ جیت گیا۔ تاہم حکومت کی ایما پر ناول ضبط کر لیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ مسلسل لکھتا رہا اور اس پر مقدمات قائم ہوتے رہے۔ چنانچہ تنگ آ کر اس نے اپنا انداز تحریر تبدیل کیا اور جرم و سزا کو اپنا موضوع بنایا۔ جرم کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے وہ یہ بتاتا ہے کہ اس زمانے میں اس نے جیمز ایم۔ کین کا ایک ناول ڈی پوسٹ میں آلوینز رنگز ٹو اس پڑھا تھا جس سے وہ از حد متاثر ہوا، لہذا اس نے بھی جرائم کو اپنے ناولوں کا موضوع بنانے کا

منصوبہ بنایا۔ کین کا یہ ناول 1934ء میں شائع ہوا اور مقبولیت حاصل کر گیا۔

دوسری جنگ عظیم بنی نوع انسان پر مسلط ہوئی تو اس نے 8 جون 1941ء میں رائل انٹرفورس میں ملازمت کر لی۔ اس کا عہدہ پائلٹ آفیسر تھا، جب اس نے ترقی کی تو 26 جون کو فلائنگ آفیسر ہو گیا۔ پھر 8 اکتوبر 1942ء میں فلائٹ لیفٹیننٹ اور پھر 1944ء میں اسکو اڈرن لیڈر ہو گیا۔ اسی اثنا میں اس نے انٹرفورس کا ایک میگزین ایڈٹ کیا اور اس میں متعدد کہانیاں بھی لکھیں، جو جنگ کے بعد 1946ء میں ایک مجموعے میں شائع ہوئیں۔ یہ جرم و سزا سے ہٹ کر پراسرار کہانیاں تھیں، جن میں دی مرر ان روم نمبر 22 بہت مشہور و مقبول ہوئی۔ اس مجموعے کو رائل انٹرفورس نے ہی شائع کیا تھا۔

1956ء میں وہ فرانس گیا اور اس کے بعد 1961ء میں اس نے سوئٹزرلینڈ میں بود و باش اختیار کر لی۔ وہاں وہ جینیوا کے شمال میں کورسیو کس کے علاقے میں رہتا تھا۔ کتابوں کے کاروبار اور انٹرفورس کے تجربات نے اسے کندن بنا دیا تھا اور جب اس نے مصنف کی حیثیت سے فکشن کی دنیا میں قدم رکھا تو اسے قدم جمانے میں کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ وہ اس دنیا میں آتے ہی جم گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران ہی اس کی دوستی میریل پینٹ سے ہوئی جو ان دنوں فی وی گانڈ کا ایڈیٹر تھا۔ اس نے میریل سے خواہش ظاہر کی کہ وہ امریکا کے بارے میں کچھ پڑھنا چاہتا ہے، اس کی مدد کی جائے۔ میریل چونکہ صحافی تھا، اس لیے اس کے پاس امریکا کے بارے میں بہت سا مواد تھا۔ وہاں کی ریاستوں کے نقشے، ریاستوں کی ثقافت اور تمدن۔ تاریخ اور جرائم کی دنیا کا احوال۔ مجرموں کے گروہ وہاں کیسے سرگرم عمل ہیں۔ رینی ریمنڈ نے اس سے بہت کچھ اکتساب کیا۔

1944ء میں اس کا پہلا ناول 'نو آرچڈ فار مس بلنڈش' شائع ہوا۔ اس وقت اس کی عمر صرف 23 برس تھی۔ حالانکہ یہ ناول ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوا۔ یہ ناول جنگ عظیم دوم کے خاتمہ سے ایک برس پہلے شائع ہوا تھا اور اس وقت کاغذ کی قلت تھی۔ چنانچہ یہ ناول اپنی طلب سے کم ہی شائع کیا گیا، یعنی پانچ لاکھ کی تعداد میں چھپا۔ پھر بھی یہ ناول گرم کیک کی طرح فروخت ہو گیا۔ پبلشر نے اس کا قلمی نام جیمز ہیڈلے چیز تجویز کیا، جو حقیقی نام پر حاوی ہو گیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ناول 1939ء میں چھ ہفتوں میں مکمل کیا تھا۔ جب ہیڈلے نے اسے ایک پبلشر مائیکل کوڈیا تو اس نے مسترد کر دیا۔ اس کے خیال میں یہ قابل اشاعت نہیں تھا۔ اس کی پیہم کوششوں سے چوتھے پبلشر کو اس میں کچھ دکھائی دیا اور اس نے ناول کی اشاعت کا فیصلہ کیا۔ اس پبلشر کمپنی کا نام جبرالڈ تھا اور اس کا تعلق لندن سے تھا۔

ناول کی اشاعت کے لیے دھوم مچادی والی اصطلاح استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس لیے کہ یہ ناول ہرپ کے کئی ممالک، شمالی امریکا، جاپان، کینیڈا اور حد یہ کہ روس میں ترجمہ ہو کر شائع ہوا۔ اسے زیادہ تر انٹرفورس کے خوانوں نے خرید کر پڑھا، اس لیے کہ ہیڈلے چیز کا تعلق انٹرفورس سے تھا۔ ناول کا پلاٹ ایک لکھ بچی کی لڑکی کے بارے میں ہے جسے بد معاشوں کا ایک گروہ اغوا کر لیتا ہے۔ وہ اس کے والد سے اتنا بھاری معاوضہ طلب کرتا ہے کہ جسے وہ ادا کرنے سے قاصر ہوتا ہے، لہذا پولیس سے مدد طلب کرتا ہے۔ جب بد معاشوں کے گروہ تک بات پہنچتی ہے تو وہ اس لڑکی مس بلنڈش کی آبرو ریزی کرتے ہیں۔ لڑکی باعزت، باوقار اور عالی مرتبت ہوتی ہے، اس لیے اپنی جان پر کھیل جاتی ہے اور خودکشی کر لیتی ہے۔

یہ ناول امریکا کے پس منظر میں لکھا گیا تھا، جبکہ ہیڈلے چیز اس سے پہلے کبھی امریکا نہیں گیا تھا۔ اس نے وہاں کی زبان کی خاص باتیں، محاورے اور اصطلاحات بہت غور سے پڑھی تھیں اور جب خود کو لکھنے پر آمادہ پایا تو یہ ناول تحریر کیا۔ ناول پر بہت سے تنقید نگاروں نے فحاشی کا الزام بھی لگایا اور اسے عوام الناس کی صحت کے لیے مضر قرار دیا۔

مشہور زمانہ مصنف جارج اورویل نے اس ناول کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کو جن مصائب کا سامنا رہا ہے اور جن عذاب سے وہ گزر رہا ہے ناول اس کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ یہ ناول کسی جاہل مصنف نے نہیں لکھا ہے، اسے ایک پڑھے لکھے اور تجربے کا شخص نے کاغذ پر منتقل کیا ہے۔ جس نے اپنے ناول میں کبھی بھی لفظوں کا بے جا استعمال نہیں کیا ہے۔ آپ کو اس کے اس کا ایک لفظ بھی کاٹ نہیں سکتے۔

ہیڈلے چیز کے اس ناول پر لندن کے ویسٹ اینڈ میں ڈراما پیش کیا گیا اور بعد میں 1948ء میں ہدایت کار ایڈلٹ آڈرچ نے فلم بھی بنائی۔

ہیڈلے چیز کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے امریکا اور

ابخازیہ

بحر اسود کے کنارے جارجیا کے اندر ایک خود مختار جمہوریہ۔ رقبہ 3320 مربع میل۔ آبادی 2001ء کی 6500,000، دارالحکومت سخی، 1810ء تک یہ علاقہ ترکی کے زیر تسلط تھا۔ 1991ء میں اس نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کیا تھا لیکن اسے تسلیم نہ کیا گیا۔

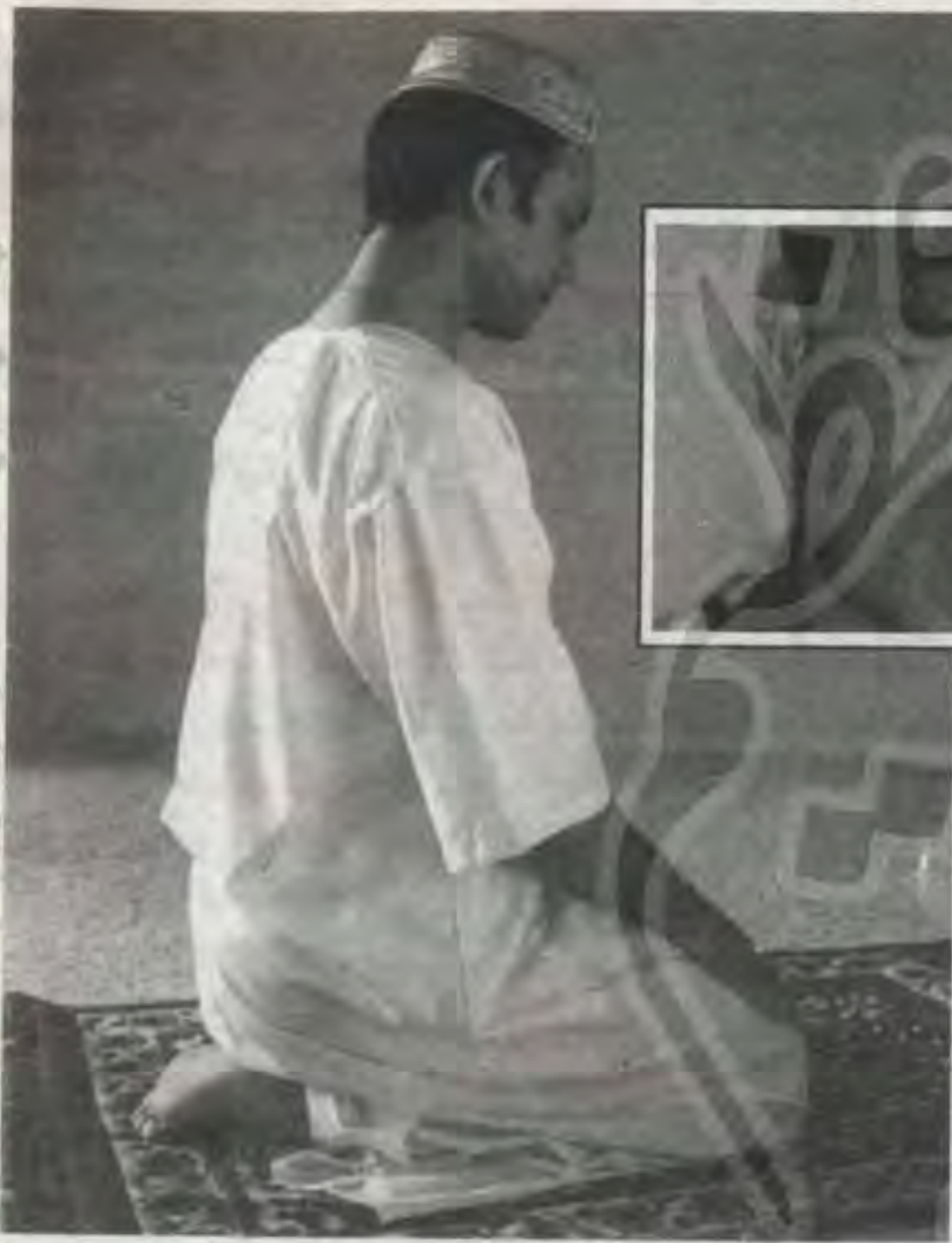
یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مارچ، اپریل 1989ء میں اس کے عوام نے جارجیا سے مطالبہ کیا کہ اسے آزاد کر دے تاکہ وہ بھی دوسری وسط ایشیائی ریاستوں کے عوام کی طرح آزادانہ زندگی گزار سکیں لیکن جارجیا کی حکومت نے تشدد کے ذریعے وہاں کے عوام کے مطالبات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، جس کے نتیجے میں بیس افراد ہلاک ہوئے۔

1993ء کے اواخر میں ابخازیوں کے ایک گروپ نے جارجیا پر حملہ کر دیا، انہیں روس کی حمایت حاصل تھی۔ اس کے نتیجے میں انہوں نے ابخازیہ کے بہت زیادہ حصے پر قبضہ کر لیا۔ تاہم روس کے تعاون سے 14 مئی 1994ء کو ابخازیوں اور جارجیا کے مابین ماسکو میں ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے تحت وقتی طور پر جنگ بند ہو گئی۔

مرسلہ: بشیم ناز، شیخوپورہ

برطانیہ دونوں کے پس منظر میں ناول لکھے ہیں، لیکن دونوں جگہوں کی ثقافت، مزاج اور زبان کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ برطانوی پس منظر کے ناول پڑھ کر قاری یہ محسوس کرتا ہے جیسے وہ برطانیہ میں بیٹھا ہے، جبکہ امریکی پس منظر کے ناول پڑھتے وقت لگا ہوں گے سامنے امریکا گھومنے لگتا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ اس نے کافی عرصہ بعد امریکا کی کچھ ریاستوں کو دیکھا وہاں کی سپر کی۔ اس نے کل 90 ناول، ایک ڈراما اور چند چھوٹی کہانیاں لکھی تھیں۔ 90 ناولوں میں سے اس کے 50 ناولوں پر فلمیں بنیں۔

وہ جن مصنفین سے متاثر تھا، ان میں ولیم فاکنر، جان ائین بک، جیمز ایم کین شامل ہیں۔ مشہور مصنف گراہم



حقیقی اسلام

صائمہ اقبال

اس نے اسلامی تعلیمات کی عملی تفسیر پیش کر کے پورے امریکا کو حیران کر دیا ہے۔ ہر اخبار و ٹی وی پروگرام میں اسی کا تذکرہ ہے کہ ایسے بڑے مسلمان 9/11 کے بعد یورپ و امریکا میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی جو آگ بھڑکی ہے اس کا وہ بھی شکار ہوا ہے مگر اس نے اپنے عمل سے اپنے دشمن کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی ایک چھوٹی سی کوشش نے امریکیوں کو اسلام کا مطالعہ کرنے اور مسلمانوں کے خلاف اپنے خیالات تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

امریکا سے درآئیک ایمان افروز واقعہ

ایک خاص نوع کا اطمینان تھا کہ ایسی حسین صبح کسی صدمے سے دوچار ہونا لگ بھگ غیر امکانی تھا۔ مگر وہ غلط تھے... غارت گری کا پہیہ چل چکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں امریکیوں کے خوابوں کی جنت... اُن کا خوبصورت

کتنی خوشگوار تھی وہ صبح۔ درختوں پر پرندے چہچہا رہے تھے۔ عمارتوں پر سنہری دھوپ دیک رہی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ شہری بھی روز کی طرح اپنے معمولات کی انجام دہی میں مصروف تھے۔ اُن کے چہروں پر

بھی بنی اور اس میں پیڑاؤٹول نے مرکزی کردار ادا کیا۔ جنرل کرسٹ کو جب معلوم ہوا کہ ہیڈلے چیز لے کر اپنے ایک ناول میں موضوع بنایا ہے تو اس نے ہیڈلے چیز پر مقدمہ قائم کر دیا، لیکن اسے ناکامی کا منہ دیکھ پڑا، عدالت نے ہیڈلے چیز کے فراہم کردہ ثبوت کی روشنی میں اسے باعزت بری کر دیا اور جنرل کرسٹ کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے کہ اخبارات میں اس کی کہانی بہت اہتمام سے شائع ہوئی اور اس پر انگلیاں اٹھائی گئیں۔

ہیڈلے چیز کے ناول بہت تیز رفتار ہوتے ہیں اور قاری اس کے واقعات میں گرفتار ہو کر ورق پر ورق پلٹ جاتا ہے اس طرح سے آخری باب تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ پیشگی کچھ توقعات وابستہ کر لیتا ہے کہ اب یوں ہوگا یا پھر یہ کہ مجرم قلاں ہوگا۔ مگر ہیڈلے چیز وہاں قاری کو چت کر دیتا ہے اور معاملہ اس کے برعکس نکلتا ہے۔ اس طرح سے قاری تحیر خیزی میں مبتلا ہوتا ہے اور تادیر ناول سے لطف اٹھاتا ہے۔ اس کے ابتدائی ناول جو جرائم پر مبنی تھے ان میں تشدد اور ایکشن کے سوا کچھ نہیں تھا، لیکن وہ معاشرے کے جن ناسوروں کی عکاسی کرنا چاہتا تھا وہاں اسی طرح کا ماحول درکار تھا، جو اس نے اپنے ناول میں پیش کیا۔

سرمایہ دارانہ ماحول کی عکاسی کرتے ہوئے اس نے اس طرح کے کردار وضع کیے تھے جو آن واحد میں مال دار ہونا چاہتے تھے۔ چنانچہ وہ کوئی لمبا ہاتھ مارنا چاہتے یا پھر کوئی بڑا فراڈ کر بیٹھتے، مگر جب قانون کا پھندا ان کی گردن پر تنگ ہونے لگتا تو وہ سوچتے کہ دولت حاصل کرنے کا یہ طریقہ غلط تھا اور اب جس دلدل میں وہ پھنس چکے ہیں اس سے نکلتا آسان نہیں ہے۔

اس کے ناولوں کی ہیروئن زیادہ تر خوب صورت ہوتی ہے، جو اپنے مقصد براری کے لیے قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ ہیڈلے چیز نے ان کرداروں کو امریکی معاشرے میں جھانک کر تلاش کیا تھا اور حسن خوبی سے پیش کر دیا تھا۔ اس کی کردار نگاری لا جواب اور لائق تعریف ہے۔

لندن اور امریکا میں اس کے ناول دیگجی سے پڑھے جاتے تھے اور لوگ ان کی اشاعت کے منتظر رہتے تھے، مگر اہل فرانس بھی اس کے شیدائی تھے اور اس کے ناول بڑی تعداد میں ترجمہ ہو کر وہاں سے بھی شائع ہوتے تھے۔ اس کے ناولوں کے ترجمے دنیا کی 32 زبانوں میں ہوئے۔

گرینی سے بھی اس کی خط و کتابت کافی عرصے تک جاری رہی۔ اس کے علاوہ چارلی چپلن سے بھی اس کی دوستی تھی اور وہ ہالی ووڈ کے اسکیٹڈل اور فراڈوں کو ڈسکس کرتے تھے۔

اس کے ناولوں پر عرصہ دراز تک یہ الزام عائد کیا جاتا رہا ہے کہ کش نگار ہے اور اس کے ناولوں کی عورتیں جنس کے معاملے میں بے باک ہوتی ہیں۔ ناولوں کی فروخت کو بڑھانے کے لیے اس کے پبلشر سرورق پر ایسے مناظر شائع کرتے تھے جن سے جنسیت کا پرچار ہوتا تھا۔ ناقدین نے اس کے لیے بھی ہیڈلے چیز کو مورد الزام ٹھہرایا، لیکن یقیناً اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ اپنے قلمی نام جیمز ہیڈلے چیز کے علاوہ اس نے ریمینڈ مارشل، ایمر وڈ گرانٹ اور جیمز ایل۔ ڈور چرٹی کے ناموں سے بھی لکھا۔

اس نے ایک کام یاب زندگی گزاری۔ اسے فوٹو گرافی کا شوق تھا اور وہ اوپیرا شوز بھی دیکھنے جایا کرتا تھا۔ اسے کلاسیکی موسیقی سے بھی شغف تھا۔ اس کا انتقال 6 فروری 1985ء کو کورسیوکس، سوئٹزرلینڈ میں ہوا، جب وہ 78 برس کا تھا۔ مرتے وقت اس کی بیوی سیلیویرے اس کے نزدیک تھی، جس سے 1932 میں اس کی شادی ہوئی تھی اور زندگی کے آخری لمحوں تک قائم رہی۔ ہیڈلے چیز کا اس سے ایک بیٹا تھا۔ ان کی رفاقت 53 برس تک قائم رہی۔ اس نے اپنی وصیت میں اسے اپنی نصف دولت کا حصہ دار بنایا اور لکھا کہ اپنی شریک حیات سیلیویرے کے لیے جو میری سیکرٹری، میری ترجمان اور میری باورچی تھی۔ جس نے معدے سے دل تک پہنچنے کا راستہ دریافت کر لیا تھا۔ میں اس کا احسان مند ہوں کہ اس نے 53 برس تک میری رفاقت کا دم بھرا۔

پیرس کے ایک بڑے اخباری نگار نے اس کی موت پر شذرہ لکھا کہ اس جیسا سنسنی خیز مصنف اب تک برطانیہ میں پیدا نہیں ہوا۔ اس کے ناولوں کے ہر باب کا آخری منظر پڑھ کر دل کی دھڑکن تیز ہو جایا کرتی تھی اور دماغ ہر دم یہ سوال کیا کرتا تھا کہ اب کیا ہوگا؟ بلاشبہ اس کا انداز نگارش ایسا ہے جس کی کوئی نقل نہیں کر سکتا۔ وہ کرائم فکشن اور سراغ رسانی میں اعلیٰ مقام رکھتا تھا۔

حقیقت میں وہ سچائی کا علمبردار تھا اور اپنے ناولوں کے ذریعے اس کا پرچار کرتا تھا۔ مثال کے طور پر اس نے ایک دیوانے جرمن جنرل کی کہانی سن کر اسے اپنے ایک ناول کا موضوع بنایا اور ٹائٹس آف دی جنرلز لکھا۔ ناول پر بعد میں فلم

شہر نیویارک جہنم میں تبدیل ہونے والا تھا۔ دو بلند و بالا عمارتیں زمین بوس ہونے کو تھیں، جن کے بلے سے جنگ کا پھنکارا ہوا غریت نمودار ہونے والا تھا۔

11 ستمبر 2001 کی وحشت ناک صبح تھی، جس نے دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ خصوصاً اُن امن پسند مسلمانوں کی زندگیاں تو ایک عذاب میں مبتلا ہو گئیں، جو آنکھوں میں سنے سجائے امکانات کی سرزمین پر آن بے تھے۔
ریس بھونیاں بھی اُن بد نصیبوں میں شامل تھا۔

☆☆☆

یہ 21 ستمبر کی جس زدہ دو پہر کا ذکر ہے۔ انسانی تاریخ کو منقسم کر دینے والے سانحے کو دس دن گزر چکے تھے۔ امریکا کے طول و عرض میں نفرت پھنکارنے لگی تھی، مگر ان باتوں سے بے پروا سائیکس سالہ ریس ڈیلاس کے ایک گیس انجین پر اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔

اُس خوش اخلاق اور وجہہ نوجوان کا تعلق بنگلہ دیش سے تھا۔ اُس نے 1974ء میں سلہٹ سے متصل قصبے کے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی۔ سلہٹ کیڈٹ کالج سے تعلیم حصہ کرنے کے بعد کچھ عرصہ بنگلہ دیشی فضا میں خدمات انجام دیں۔ پھر کمپیوٹر مینکالوجی کے میدان میں نام پیدا کرنے کے لیے امریکا چلا آیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ خوابوں کی سرزمین پر روشن مستقبل اُس کا منتظر ہے۔ اور ابتدا میں ظاہر ہونے والی علامات نے اُس کے یقین کو بڑی حد تک تقویت پہنچائی۔

لاکھوں افراد کی طرح ریس نے بھی گرین کارڈ کے لیے اپلائی کیا تھا اور 2000 لاٹری میں جن خوش نصیبوں کا انتخاب ہوا، گندی رنگت والا یہ نوجوان اُن میں شامل تھا۔ مخصوص امریکی انداز میں کہا جائے، تو یہ ایک شان دار آغاز تھا۔

نئی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد جس پر شکوہ شہر میں اُس نے قیام کیا، وہاں بھی رات نہیں ہوتی تھی۔

نیویارک ریاست کا مہنگا ترین شہر تھا، جس کی تیز رفتار زندگی جہد مسلسل کا تقاضا کرتی تھی اور ریس مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ وہ ارادوں کا پکا ایک محنت کش انسان تھا جو مصائب سے لڑنا جانتا تھا۔

زندگی کی گاڑی یونہی چل رہی تھی کہ 2001 کے اوائل میں اسے ایک دوست کی کال موصول ہوئی۔

”نیویارک چھوڑ دو بھائی، سیدھے ڈیلاس چلے آؤ۔“

ملازمت اور قیام کا انتظام میرے ذمے تھا۔ ”دوست نے کہا۔ ”یہاں تم جیسے محنت کشوں کے لیے امکانات کی بہتات ہے۔ درس گاہیں کسی طور نیویارک سے کم نہیں۔ تم کمپیوٹر مینکالوجی میں ڈگری کی خواہش بھی پوری کر سکو گے۔“

بات ریس کے دل کو لگی۔ وہ سامان سمیٹ کر ریاست ٹیکساس کے شمال مشرقی شہر کی جانب چل پڑا جو تیل کی پیداوار کے حوالے سے پوری دنیا میں شہرت رکھتا تھا۔

ڈیلاس میں ملازمتوں کی واقعی کمی نہیں تھی۔ بس ایک مسئلہ تھا۔ مقامی باشندے غیر ملکی کو قطعی پسند نہیں کرتے تھے۔

نیویارک چھوڑنے سے قبل ایک دوست نے اسے خبردار بھی کیا تھا۔ ”ڈیلاس والے ہم غیر ملکیوں کے بارے میں خاصی منفی رائے رکھتے ہیں۔ ذرا دھیان رکھنا۔“

مگر ریس کی مثبت سوچ، رجائیت پسندی اس تنبیہ کو زیادہ خاطر میں نہیں لائی۔ اس کے نقطہ نگاہ سے ڈیلاس ایک نرا امن شہر تھا۔ تھوڑے بہت مسائل تو ہر جگہ ہوتے ہیں، مگر مجموعی طور پر ماحول دوستانہ تھا۔ رہائشی اور تعلیمی سہولیات بھی نیویارک سے کم تر نہیں تھیں۔

ریس کو یہ شہر اتنا بھایا کہ اُس نے وہاں مستقل سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پر دیس آنے سے قبل اس کی منگنی ہو چکی تھی اور اُسے یقین تھا کہ یہ شہر نئے سفر کے آغاز کے لیے سازگار ہے۔ شادی کے بعد وہ یہاں ایک خوشگوار زندگی گزار سکتا ہے۔ ایسی زندگی جس کا اس نے خواب دیکھا تھا۔

مگر 9/11 کے سانحے نے اُس کے خوابوں کی زمین پر دراڑ ڈال دی۔

دہشت گردی کے اس بدترین واقعے کے ذمے داروں کا تعین ایک وقت طلب کام تھا، مگر تین ہزار شہریوں کی موت کا کرب سنبھالنے والی امریکی قوم میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کا جذبہ سننے لگا، جس کے سیاہ دھوئیں نے چند ہی روز میں ریاست کو لپیٹ میں لے لیا۔ قدامت پسند حلقوں کی جانب سے امریکا میں مقیم مسلمانوں کے خلاف جلوس نکالے جانے لگے۔ تشدد کی خبریں بھی موصول ہوئیں، مگر ریس نے اُن پر کان نہیں دھرا۔ امید کے مرہم سے اپنے خوابوں میں پڑنے والی دراڑ کو بھریا۔ روزمرہ کے معمولات جاری رکھے۔

اور اس دن بھی وہ اوور ٹائم کر رہا تھا... اس بات سے یکسر لاعلم کہ ایک جنوبی شہر میں دندناتا پھر رہا ہے۔

☆☆☆

ریس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔

وہنا آج خاصا مندا تھا۔ زیادہ بکری نہیں ہوتی تھی۔ کچھ دیر پہلے ساتھ والے ہیرسلون سے دو آدمی چپس ہو کر ایک دکان خریدنے آئے تھے، ورنہ تو وہ کھیاں ہی مار رہا تھا۔ ان کی آمد و رفت میں آنے والے طویل وقفوں کے باعث اُسے امید تھی کہ نماز جمعہ کی ادائیگی کا موقع مل جائے گا۔

ایک مارٹ کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ ریس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ایک گورا چٹا، صحت مند آدمی آنکھوں پر جھک پڑا۔ حائے تیز قدم اٹھاتا ہوا اُس کی سمت آ رہا تھا۔ اس کے بازوؤں پر بیٹھنے تھے اور چال بتا رہی تھی کہ وہ کتنے مس ہے۔ حلیہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ ایک جرائم پیشہ آدمی ہے۔

ریس کو ابھن محسوس ہوئی۔ وہ چونکنا ہو گیا۔ ویسے بھی علاقے میں جرائم کی شرح خاصی بلند تھی۔ چوری اور دکانی کے وارداتیں عام تھیں۔ ماضی میں کئی اچکے اُسے پہچانی شدہ فی وی، کمپیوٹر اور موبائل فون فروخت کرنے کی کوشش کر چکے تھے۔

یکدم ریس کی نظر اُس شخص کے ہاتھ میں موجود پستل پڑی۔

اُس نے گہرا سانس لیا۔ ”تو یہ ڈکیتی کا معاملہ ہے۔“ وہ ماضی میں بھی اس طرح تجربے سے گزر چکا تھا۔ چند روز قبل ایک شخص ہاتھ میں بندوق لیے مارٹ میں داخل ہوا تھا۔ ریس نے پہچان لیا کہ وہ بندوق کہیں سے اڑا لایا ہے اور اب اسے فروخت کرنا چاہتا ہے، مگر اس کے ارادے خاصے مختلف تھے۔ کاؤنٹر کے نزدیک آتے ہی اس نے بندوق ریس پر تان دی تھی۔ ”جھٹکے خالی کرو ورنہ میں تمہارا بھینجاڑا دوں گا۔“

ریس کو یقین تھا کہ آج بھی کچھ ایسا ہی ہونے والا ہے۔ جیسے ہی وہ آدمی نزدیک آیا، اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں سر؟“

جواب میں اُس آدمی نے کاؤنٹر پر پوری قوت سے مکا

پیغام واضح تھا۔ اُس نے فوراً درازیں خالی کر دیں، بندوق ڈھکی ہوئی رکھی۔ دراصل ڈکیتی کے خطرے کے تحت مارٹ میں زیادہ کیش نہیں رکھا جاتا تھا۔ ”یہ رہے“

آؤ بیٹے، پلیر بندوق نیچے رکھیں۔“

آؤ بیٹے، نوٹ پتلون کی جیب میں ٹھونس لیے۔ یہ فائر مہمیں کچھ تھیں، مگر حقیقتاً ایسا نہیں تھا۔

”تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟“ وہ پھنکارا... شراب کا بھبھکار ریس کے چہرے سے ٹکرایا۔ سوال عجیب نہیں تھا۔ قطعی نہیں۔ اکثر اُس سے یہ سوال پوچھا جاتا تھا۔ خصوصاً دس دن قبل پیش آنے والے سانحے کے بعد تو یہ تو اتار سے پوچھا جانے لگا تھا۔

ریس اس کا جواب دینے میں کبھی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ اکثر امریکیوں سے اس موضوع پر اس کی گفتگو رہتی۔ خاص کر ان دو پولیس اہلکاروں سے جو کھانے پینے کی اشیا خریدنے کے لیے اکثر مارٹ چلے آتے۔ ریس اسلام کے متعلق اُن کے سوالات کا بڑے مدلل انداز میں جواب دیا کرتا تھا۔ مگر ٹھیک اُس لمحے... سامنے کھڑے شخص کو اس کے جواب سے سروکار نہیں تھا۔

اس سے قبل کہ کوئی لفظ ریس کی زبان سے ادا ہوتا، ایک زور دھماکا ہوا۔

ریس کو لگا جیسے دُور کہیں فائر ہوا ہے۔ مگر اگلے ہی لمحے اُسے جھٹکا لگا۔ درد کا احساس جاگا۔ درد جو شدید تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہزاروں شہد کی مکھیوں نے اس کے چہرے پر دھاوا بول دیا ہو۔

لمحے کے ہزاروں حصے میں اُس نے اپنے قدموں کی سمت دیکھا، جہاں خون ہی خون تھا۔ پھر ہاتھ سر تک گئے، جہاں سے گرم سیال بہہ رہا تھا۔

خوف سے اُس کا دل بھر گیا۔ آنکھوں کے سامنے اپنے پیاروں کے چہرے گھومنے لگے، ماں باپ، بہن بھائی، دوست احباب... اور اُس کی منگیتر۔

”کیا موت کا پُرا سرا لہجہ آں پہنچا؟“ وہ لڑکھڑا گیا۔ حملہ آور تاحال موجود تھا۔ وہ اپنے شکار کی موت کا منتظر تھا۔ اُس کی نظریں ریس پر لگی تھیں، جو اپنا سر تھامے ڈمگ رہا تھا۔

اُس کی موجودگی نے زخمی ریس کو اس اندیشے میں دھکیل دیا کہ اُس پر دوبارہ حملہ ہو سکتا ہے۔

دل میں سرگوشی ہوئی۔ اُس نے اپنے شکستہ بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ اگلے ہی پل وہ فرش پر گرا ہوا تھا۔

اُسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ حملہ آور اُسے مردہ سمجھ کر دروازے کی سمت جا رہا تھا۔

وہ لمحے صدیوں کے مانند تھے۔ جو کچھ بیتا، ریس اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔



آئرش ری پبلکن آرمی

آئرلینڈ کے قوم پرستوں کا ایک جنگجو گروپ۔ اس کے قیام کا مقصد الشر کے بشمول متحدہ آئرلینڈ سوشلسٹ جمہوریہ کا قیام ہے۔ سن فن اس کی فوجی شاخ ہے۔ اسے مائیکل کالنز نے 1919ء میں قائم کیا تھا۔ منظم نے 1919ء سے 1921ء تک برطانیہ کے ساتھ کامیاب جنگ لڑی اسے 1939ء میں غیر قانونی تنظیم قرار دے دیا گیا تھا۔ 1968ء کے بعد اس کی کارروائیوں میں بڑی تیزی آگئی۔ 1970ء میں آئرلینڈ سے برطانوی باشندوں کا اخراج عمل میں آیا۔ 1974ء میں پارٹی کی پھر تقسیم عمل میں آئی۔ برطانوی حکومت نے آئی آر اے کی خفیہ سرگرمیوں سے مجبور ہو کر یکم مئی 1975ء کو 78 ارکان پر مشتمل ایک کنونشن طلب کیا تاکہ وہ ایسا آئین مرتب کر سکے جو شمالی آئرلینڈ کی اقلیت کے لیے بھی قابل قبول ہو۔ دس ماہ کے بعد یہ کنونشن 3 مارچ 1976ء کو ختم کر دیا گیا اور برطانیہ نے اعلان کیا کہ شمالی آئرلینڈ براہ راست اس کی عملداری میں رہے گا۔ 27 اگست 1979ء کو آئی آر اے نے ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو ہلاک کر دیا۔ 1980ء کے اختتام تک اسی تنظیم کی دہشت گردی سے 1800 افراد ہلاک ہوئے جبکہ 1980ء اور 1998ء کے مابین اس کی کارروائیوں سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد ہزاروں افراد پر مشتمل تھی۔

مرسلہ: امتیاز احمد، ملتان

پکا امریکی، جسے ڈیلاس کا میسر ہونا چاہیے۔

☆☆☆

وہ آنکھیں کھولنے سے قاصر تھا... زبان بے حرکت ہو چکی تھی... جبراً جواب دے چکا تھا۔

رئیس زندہ تھا، مگر یہ زندگی موت سے بدتر تھی۔ حملہ بے حد نزدیک سے کیا گیا تھا۔ 38 چترے اُس کے سر، چہرے اور آنکھ میں پیوست ہو چکے تھے، جنہیں نکالنا ایک طویل اور اذیت ناک عمل تھا۔

ہسپتال میں چند گھنٹے گزارنے کے بعد وہ آنکھیں کھولنے کے قابل ہو گیا اور تب اُس نے آئینہ دیکھا۔ ایک کرمیہ چہرہ اس کے سامنے تھا، جسے سوجن اور زخموں نے بگاڑ دیا تھا۔

صدے سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے اپنے رب کو پکارا۔ ”اے اللہ، مجھے میرا چہرہ لوٹا دے، میں ساری زندگی تیرا فرماں بردار رہوں گا، تیرے در پر حاضر ہوں گا، غریبوں کی مدد کروں گا۔“

ہسپتال جدید سہولیات سے لیس تھا، معالج قابل تھے، بھڑکی کی قوی امید تھی... مگر ایک رکاوٹ تھی۔

ریاست ایک حد تک ہی اُس کے علاج کا خرچہ اٹھا سکتی تھی۔ خرید خرچہ اسے خود ہی برداشت کرنا تھا، مگر یہ ممکن نہیں تھا... دیگر تارکین وطن کی طرح اس بنگلہ دیشی نوجوان نے بھی میڈیکل انشورنس نہیں کروائی تھی۔

حملے کے ایک ہی دن بعد اسے ڈسچارج کر دیا گیا۔ اور وہ گھڑے ہوئے چہرے اور شدید تکلیف کے ساتھ اُس بھونٹے سے کمرے میں لوٹ آیا جہاں نصب آئینہ اُسے بچپانے سے قاصر تھا۔

سرکار کی جانب سے ملنے والی ادویہ فقط ”آئی ڈی ایس“ اور ”مین کلرز“ تک محدود تھیں، جو نا کافی تھیں۔ چہرے میں پیوست لوہے کے ٹکڑے اُسے تکلیف دیتے تھے۔ کتنے اذیت ناک دن تھے وہ۔ عام انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ سیدھی کروٹ پر نہیں سو سکتا تھا۔ گلابھی شدید مہوڑ ہوا تھا۔ غذا نگھنے کا عمل اس کے لیے انتہائی کرب ناک سمیت ہوتا۔ مجبوراً اُس نے کھانا ترک کر دیا۔ علاج میں آنے والے وقتوں نے بینائی کو بھی شدید نقصان پہنچایا۔ دھیرے دھیرے دائیں آنکھ کی روشنی گھٹنے لگی۔

ایسے میں امید کی ایک کرن چمکی۔ ایک مقامی این جی او اے کی مدد کرنے کو تیار تھی۔ مگر روشنی کی یہ کرن جلد ہی

اپنے مقامی این جی او اے کی مدد کرنے کو تیار تھی۔ مگر روشنی کی یہ کرن جلد ہی

گیا۔ اُس کے ہاتھوں قتل ہونے والے دوسرے شخص کا ہندوستان سے جسے اُس نے 4 اکتوبر کو میسکیوٹ کے میں نشانہ بنایا۔ آنکھوں پر پڑے تعصب کے دینے پر باعث مارک یہ اندازہ ہی نہیں لگا سکا کہ جس شخص پر وہ داغ رہا ہے، وہ مسلمان نہیں، بلکہ ایک ہندو ہے۔ بدقسمت شخص کا نام ویٹوڈیوٹیل تھا۔ رئیس کے مانند ایک استور میں ملازم تھا، جہاں کلوز سرکٹ کیمرے تھے، جنہوں نے مارک کے بیہانہ اقدام کو محفوظ کر لیا اور فوج کے مدد سے پولیس قاتل تک پہنچی۔

مارک کو اپنے کیے پر کوئی ندامت نہیں تھی۔ پولیس چھڑکیاں پہنا رہی تھی، اُس کے ہونٹوں پر مسکراتی تھی۔ ایک خاص نوع کا اطمینان تھا۔ گرفتاری کے بعد اُس نے کئی ٹی وی چینلوں کو اپنے دے، جس میں اس نے اپنے مکروہ اقدام کو جب الوم انتہائی شکل قرار دیا۔ ”ایک سچے امریکی کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ان تمام عربوں کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دینا چاہیے۔“

”مگر جن افراد کو آپ نے نشانہ بنایا وہ تو عرب تھے؟“ رپورٹر نے سوال کیا۔

”میرے لیے ہر مسلمان عرب ہے۔“ اُس نے لگایا۔

مارک پر عکاس میں نافذ ہونے والے ہازہ اور ترین قانون کے تحت مقدمہ چلا گیا جسے دوسیاہ قام امر کے بیہانہ قتل کے بعد تشکیل دیا گیا تھا۔

جیوری کے سامنے بھی مارک نے یہی کہا کہ اقدام لاکھوں امریکیوں کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ ”اُسے کم سے کم سزا دی جائے۔“ مجھے یقین ہے کہ اُس کے عوام میرا ساتھ دیں گے۔“

مکروہ غلط تھا۔ عکاس نے سچ کے ساتھ کھڑے ہونے کا اصولی فیصلہ کیا۔ عدالت نے انصاف کے پورے کرتے ہوئے 2002 میں اس جنونی کو موت سزا دی۔

عدالتی فیصلہ بھی جنونی مارک کی آنکھیں نہیں کھول سزا سنائے جانے کے بعد اُس نے جیل سے اپنے دوست کو خط لکھا، جس میں کچھ یوں اپنے مکروہ خیال اظہار کیا:

”افسوس، عربوں کا قاتل جیل میں بیٹھا ہے۔ گولڈ میڈل سے نوازا جانا چاہیے تھا۔ میں سچا چھوٹا

”کیا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟“ خود سے سوال کیا۔ پھر نظر فرش پر پھڑپھڑے خون پر پڑی، جو اُسی کے بدن سے برآمد ہوا تھا، جس سے حدت اٹھتی تھی۔

یکبارگی یہ احساس جاگا کہ اگر اُس نے فوراً کچھ نہیں کیا تو موت کا عفریت اسے نگل لے گا۔ اُس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی اور حیرت انگیز طور پر اپنی کوشش میں کامیاب رہا۔

خون میں سے ہاتھ سے اُس نے دروازہ دھکیلا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے وہ ساتھ والے ہیئر سلون میں داخل ہوا۔ چہرہ آئینے میں دیکھا اور ایک چیخ ماری۔

چند منٹ قبل وہ جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس زندگی سے بھرپور نوجوان تھا، مگر اب... اُس کے سامنے خون میں لت پت انسانی چہرے سے محروم ایک بدروح کھڑی تھی۔ دیوانہ وار وہ باہر کی سمت دوڑا۔

سیلون میں موجود ملازمین سکتے میں تھے۔ جونہی انہیں ہوش آیا، وہ مدد کے لیے آگے بڑھے، مگر اس وقت تک رئیس سرک پر پہنچ چکا تھا، جس کے دوسرے کونے پر ایک ایسولیس کھڑی تھی، جس کا ڈرائیور آنکھوں میں حیرت لیے اُسے تک رہا تھا۔

اس نے اپنا سر تھام رکھا تھا... لیوں پر قرآنی آیات تھیں... وہ اپنے رب کو پکار رہا تھا... گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا... اور آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

رئیس پر حملہ کرنے والے جنونی کا نام مارک استورمین تھا۔ 31 سالہ وہ نشے کا عادی ایک بے روزگار انسان تھا۔ جرائم کی دنیا کا باسی، جس نے اُسے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ اور 9/11 کے سانحے نے اُس وچنی مریض کو ایک قاتل میں تبدیل کر دیا۔ مارک کے دل میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ اُس کی پیاری بہن اس سانحے میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔

اس خیال نے نفرت کو جنم دیا۔ اُس نے ڈیلاس میں مقیم عرب باشندوں سے اپنی بہن کا انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا اور پائل لے کر گھر سے نکل پڑا۔

اُس کا پہلا شکار وقار حسن نامی ایک پاکستانی تھا۔ ایک محنت کش، جسے مارک نے 15 ستمبر کو ہلاک کیا۔ اگلا حملہ اُس نے رئیس پر کیا، جو معجزاتی طور پر... بچ

اگلا حملہ اُس نے رئیس پر کیا، جو معجزاتی طور پر... بچ

ناامیدی کے بلیک ہول میں گم ہو گئی۔

اُس کی رہائش این جی او کے دفتر سے خاصی دور تھی اور ایسا کوئی نہیں تھا جو ٹریسٹ کے لیے اُسے روز وہاں لے جاسکے۔ مشکل کی اُس گھڑی میں ڈیلاس آنے کا مشورہ دینے والے دوست نے بھی منہ موڑ لیا تھا۔ جس مارٹ میں وہ ملازم تھا، اس کے مالک نے بھی پلٹ کر خبر نہیں لی۔

جب دردِ حد سے بڑھ گیا، اس نے قرضہ لے کر علاج کروانے کا فیصلہ کیا مگر بینک نے قرضے کی درخواست مسترد کر دی۔

اب اُس نے سرکاری طبی اداروں سے رجوع کیا جنہوں نے اس شرط پر مدد کرنے کا فیصلہ کیا کہ وہ ایک مخصوص وقت میں تمام بلز ادا کر دے گا، ورنہ ادارہ اُس کے خلاف قانونی کارروائی کا مجاز ہوگا۔

چہرے سے چہرے نکالنے کا عمل انتہائی اذیت ناک تھا۔ یہ بالکل ویسے ہی انجام پایا، جیسے برسوں قبل دندان ساز مریض کے منہ سے سڑا ہوا دانت نکالا کرتے تھے۔ مگر رئیس کے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ اُسے اس تجربے سے گزرنایا تھا۔

سب سے زیادہ تکلیف دینے والا لوہے کا ٹکڑا صین اُس کے ماتھے کے درمیان پیوست تھا۔ رئیس شیخ وقتِ نمازی تھا۔ دورانِ نماز جب کبھی وہ سجدے میں جاتا، اُسے تکلیف کا واضح احساس ہوتا۔ مگر اس تکلیف سے گھبرا کر اس نے نماز ترک نہیں کی۔

کبھی کبھار وہ سوچتا کہ وہ اتنے قریبی حملے میں بچ کیسے گیا، اصولاً تو اس کا بھیجا اڑ جانا چاہیے تھا؟ پھر اُسے اپنی ماں کی گہی ہوئی بات یاد آئی۔ ”بڑا مضبوط سر ہے تیرا۔ خدا اُسے سلامت اور بلند رکھے۔“

☆☆☆

جس روز مارک کو سزائے موت سنائی گئی، رئیس زندگی کے ایک مشکل موڑ پر کھڑا تھا۔

صحت یاب تو وہ بڑی حد تک ہو گیا تھا، مگر مالی حالت بہت پتلی تھی۔ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ بینک اکاؤنٹ خالی ہو چکا تھا۔ اسپتال کا وہ مقروض تھا، اس پر مستردِ اچھٹ سے بھی محروم ہونے والا تھا۔

کئی ماہ سے اس نے کرایہ ادا نہیں کیا تھا۔ مالک مکان اُسے نوٹس بھجوا چکا تھا۔

”کیا میں وطن لوٹ جاؤں؟“ نظریں کھڑکی پر تکی

تھیں جس کے باہر مایوسی کا کبرا تیر رہا تھا۔

یہ نسبتاً آسان تھا۔ کئی افراد امریکا میں قسمت آزمائی کرتے ہیں، مگر خوش بختی کی دیوی ہر ایک پر مہربانی نہیں ہوتی۔ جو سپنوں کی تکمیل میں ناکام رہے ہیں، وہ خاموشی سے واپس لوٹ گئے اور پھر... رئیس کا معاملہ تو مختلف تھا۔ اس پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ ایسا حملہ جس میں وہ بال بال بچا۔ اگر وہ لوٹ بھی جاتا تو ڈھاکا اُسے خوش آمدید کہتا۔ دوست احباب اُسے ناکام گردانے کی بجائے حوصلہ افزائی کرتے۔

سوچتے سوچتے آنکھوں کے سامنے ماں باپ کا چہرہ گھوم گیا، جنہوں نے ہر مرحلے پر، ہر محاذ پر اُس کا ساتھ دیا۔ جب اس نے امریکا آنے کی خواہش کا اظہار کیا، انہوں نے بلاچون و چرا اپنی تمام جمع پونجی اُس کے حوالے کر دی اور بدلے میں رئیس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس سفر سے کامیاب لوٹے گا۔

”کامیاب؟“ اُس نے دھیرے سے کہا اور منہ کڑوا ہو گیا۔ کمرے میں ایک سانولی، چمکھے عین نقش والی لڑکی کا چہرہ ابھرا اور یاسیت گہری ہو گئی۔

چند ہی روز قبل وطن سے یہ افسوس ناک اطلاع آئی تھی کہ اُس کی منگیت کے گھر والوں نے رشتہ توڑ دیا ہے۔

رئیس اس لڑکی سے محبت کرتا تھا، مگر وہ اسے قصور وار نہیں ٹھہرا سکتا تھا۔ موجودہ حالات میں تو اُسے خود کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ ایسے میں کسی اور کی زندگی کا سہارا بننا دیوانے کا خواب تھا۔

”نہیں، میں واپس نہیں لوٹ سکتا تھا۔“ بالآخر اس نے خود سے کہا۔ ”ڈیلاس ہی اب میرا گھر ہے۔“

کھڑکی کے باہر کبرا اچھلا تھا، جواسے بلارہا تھا۔

☆☆☆

سر سے چھت گئی تو تحفظ کا جو خفیف سا احساس تھا، وہ بھی ہوا ہو گیا۔

اس واقعے کے بعد وہ زیادہ وقت اپنے کمرے ہی میں گزارتا تھا۔ ایک خاص قسم کا خوف بس گیا تھا اُس میں۔ کبھی اس خوف کے ساتھ چلتا ہوا وہ اُس دلدلی زمین تک چلا جاتا جہاں انسان نفسیاتی مریض میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

اُس نے سرکاری اسپتال کے ایک ڈاکٹر سے رابطہ کیا جس نے اس کی پتا سننے کے بعد کسی اچھے ماہر نفسیات سے رجوع کرنے کا مشورہ دے ڈالا۔ ”تمہیں سائیکو تھراپی کی ضرورت ہے، نوجوان۔“

اس مشورے پر رئیس مسکرا کر رہ گیا۔ وہ ویسے ہی متروک تھا، مزید علاج کے پیسے کہاں سے لاتا۔

کمرے سے بے دخل کیے جانے کے بعد اب وہ کھانا تیار کرتا تھا۔ وہ جاڑے کا موسم تھا اور اسے دیگر بے گھر افراد کی طرح فٹ پاتھ پر اپنے دن کاٹنے تھے، بچپن پر سردرات گزرتی تھی، جہاں وہ بہ آسانی کسی جنونی کا نشان بن سکتا تھا۔

اس خوف کے باعث پہلی رات تو اُسے نیند ہی نہیں آئی اور وحشت کا یہ احساس آنے والی کئی راتوں تک قائم رہا۔

صرف ایک مقام تھا جہاں اُسے تھوڑا بہت سکون ملتا۔ مسجد۔ جہاں وہ اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو کر گڑ گڑاتا۔

نماز وہ باقاعدگی سے مسجد ہی میں ادا کیا کرتا تھا، جہاں اکثر ایسے افراد سے ملاقات ہو جاتی جو اُس کے لیے ہمدردی محسوس کرتے اور اس کی مدد کرنا چاہتے مگر رئیس کے لیے یہ عمل انتہائی ناگوار تھا۔

وہ ایک بڑھا کھٹا، مخنتی انسان تھا۔ اچھے گھرانے میں پرورش ہوئی تھی، بچپن ہی سے پریشان حال افراد کی مدد کرتا آیا تھا مگر اس ظالم سانچے نے خود اسے پریشان حالوں کے زمرے میں لاپھونکنا تھا۔

لے گہری کے ابتدائی دنوں ہی میں رئیس نے اندازہ لگایا کہ زندگی اس طرح نہیں گزر سکتی۔

”مدد کرنے والے آج ہیں، کل نہیں ہیں۔ اگر میں امت بار بیٹھا تو ہمدرد بھی ساتھ چھوڑ جائیں گے۔“ اس نے خود سے کہا۔ ”مجھے کچھ کرنا پڑے گا۔ یہی حالات کو قابلِ برداشت بنانے کا اکلوتا طریقہ ہے۔“

اُس نے ملازمتوں کی تلاش شروع کی مگر یہ سہل نہیں تھا۔ جب کوئی کمپنی یہ سنتی کہ وہ ہزاروں ڈالر کا مقروض ہے، اُس کی درخواست اٹھا کر روٹی کی ٹوکری میں پھینک دی جاتی۔

اُس نے قدم قدم پر ناکامیوں کا ذائقہ چکھا، مگر دکان کے ویلے امید کا چراغ روشن رکھا۔ رجائیت پسندی کے مصلح سہارے آگے بڑھتا رہا۔ بڑی کمپنی کا حصہ بننے کی خواہش خلقت و ریخت کا شکار ہوئی تو کوئی چھوٹی موٹی انڈسٹری کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

خوش قسمتی سے 2003 میں... اُسے ایک اطالوی انجنیئرنگ میں نوکری مل گئی۔

بڑھا کھٹا خاندانی نوجوان اب اسپرٹ باندھے گا بکوں سے لڑ لیا کرتا تھا، مگر رئیس کو اس بات کا غم نہیں تھا۔ اُسے

آئینہ سکندری

آئینہ اصل میں آہنہ ہے۔ چونکہ ابتدا میں اسے لوہے سے بنایا گیا تھا اس لیے اسے آہنہ کہا جانے لگا۔ مشہور ہے کہ سکندر اعظم نے درباری حکماء کو جمع کر کے کہا کہ ہم ایک ایسی چیز بنانا چاہتے ہیں جس میں ہر شے کا عکس نظر آسکے۔ حکماء نے مختلف معدنیات سے یہ چیز بنانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ آخر سکندر اعظم کے مشورے سے ایک لوہار نے فولاد کو اس قدر چلا دی کہ اس میں ہر چیز کا عکس نظر آنے لگا۔ اس میں اتنی کمی رہ گئی کہ لوہے کا ٹکڑا چوکھوٹا ہوتا تھا تو شبیہ چوکھوٹی نظر آتی تھی اور لمبوتر ہوتا تو لمبی۔ گول آئینہ بنانے میں یہ سب دقیق دور ہو گئیں اور ہر شے جوں کی توں نظر آنے لگی۔ جب آئینہ سکندر کی منشا کے مطابق تیار ہو گیا تو اس نے اس میں اپنی شبیہ دیکھی اور بہت بڑا جشن منعقد کیا۔ لیکن تاریخی اعتبار سے یہ خیال درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ فراعنہ مصر کے مقبروں سے کئی ہزار برس پہلے کے آئینے نکلے ہیں۔ شیشے کی دریافت کے بعد بہت عمدہ آئینے بننے لگے ہیں۔

مرسلہ: اظہر جاوید سرگودھا

اپنے دادا کی نصیحت یاد تھی۔ ”محنت میں عظمت ہے۔ کوئی کام چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔“

اور پھر ویر کا کام اتنا برا بھی نہیں تھا۔ روزانہ نئے نئے لوگوں سے ملنے کا موقع ملتا جس کے طفیل وہ خوف کے اُس منحوس احساس سے چھٹکارا حاصل کر سکتا تھا جو بدروح کی طرح راتوں کو اس کا تعاقب کرتا۔

دھیرے دھیرے ہی سہی، وہ اپنے کام سے لطف اندوز ہونے لگا۔ جھجک بھی جاتی رہی۔ خوف گھٹنے لگا۔

اُن ہی دنوں ایک مخلص نے اُسے ریڈ کر اس سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا۔ ”9/11 کے متاثرین کے لیے ایک فنڈ قائم کیا گیا ہے۔ تمہارے کیس کی جڑیں بھی اسی سانچے سے جڑنی ہیں، ممکن ہے وہ تمہاری مدد کر سکیں۔“

رئیس نے مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن مصائب اتنی جلدی جان چھوڑنے والے کہاں تھے۔

ریڈ کر اس انتظامیہ نے یہ کہہ کر اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا کہ وہ اُن کے کلبے کے تحت 9/11 کے متاثرین میں

نہیں آتا۔

”مجھے افسوس ہے مسٹر رئیس، ہم آپ کی مدد نہیں کر سکتے۔“ ڈیلاس میں تعینات ریڈ کر اس کے نمائندے نے کہا۔ ”ہاں، اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کی غذائی ضروریات پوری کر سکتے ہیں۔ دوپہر اور رات کا کھانا ہم...“

”شکریہ جناب۔“ رئیس نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اس کی ضرورت نہیں۔“

جب وہ ریڈ کر اس کے دفتر سے باہر نکلا، آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

☆☆☆

”مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔“ ڈاکٹر نے اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے تمہیں ہمت سے کام لینا ہوگا۔“

”میں مایوس نہیں ہوں۔“ رئیس نے گہرا سانس لیا۔

”بس تھوڑا پریشان ہو گیا تھا۔“

”ہمیں کوئی راستہ تلاش کرنا ہوگا۔“ ڈاکٹر نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔ وہ ایک سیاہ قام امریکی تھا اور مصائب میں گھرے اُس نوجوان کے لیے دوستانہ جذبات رکھتا تھا۔ وہ خود بھی ڈیلاس کے سفید فاموں کے تعصب کا شکار بن چکا تھا، اس لیے بہ خوبی جانتا تھا کہ اُس کا دوست کس مشکل سے گزر رہا ہے۔

”ایک طریقہ ہے۔“ بالآخر اس نے کہا۔ ”یکساں انتظامیہ نے جرائم کے شکار بننے والے افراد کی بھالی کے لیے ایک فنڈ قائم کر رکھا ہے۔ ممکن ہے وہ تمہارے میڈیکل بلز ادا کرنے کی پامی بھریں۔“

”کوشش کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔“ رئیس کو امید کی ایک کرن نظر آئی۔

اگلے ہی روز اُس نے ڈاکٹر کی مدد سے ضروری کاغذات تیار کر کے متعلقہ ادارے کو روانہ کر دیے۔

اب اُسے انتظار کرنا تھا، جو زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ جلد ہی ادارے کی انتظامیہ کی جانب سے جواب آ گیا۔ وہ اُس کے میڈیکل بلز ادا کرنے کے لیے تیار تھے!

اس روز رئیس نے مسرت کا انوکھا تجربہ کیا۔ ایسا تجربہ جسے وہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا، جیسے کاندھوں سے منوں بوجھ اتر گیا ہو۔

”مبارک ہو دوست۔“ ڈاکٹر نے اُسے فون کیا۔

”تمہیں قرض کے عذاب سے نجات مل گئی۔ میرے خیال میں تمہیں اس کامیابی کا جشن منانا چاہیے۔“

”ہاں۔“ رئیس نے جواب دیا۔ ”آج کا دن جشن کے لیے سازگار ہے۔“

کچھ دیر بعد وہ مسجد کی سمت بڑھ رہا تھا۔

☆☆☆

قرض سے جان چھوٹنے ہی زندگی اُس پر مہربان ہو گئی۔

وہی بینک جس کی انتظامیہ کچھ عرصے قبل اُس کی بات سننے کی بھی روادار نہیں تھی، نہ صرف رئیس کا نیا اکاؤنٹ کھولنے کے لیے تیار ہو گئی، بلکہ قرضے کی درخواست بھی قبول کر لی۔

”مسٹر رئیس، کریڈٹ کارڈ آپ کو چند روز میں مل جائے گا۔“ عیجر نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”شکریہ۔“ وہ مسکرایا۔

کچھ پیسے ہاتھ آئے تو سب سے پہلے رہائش کا انتظام کیا۔ ایک درمیانہ درجے کا اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا۔ پلے قسطوں پر کار خرید لی۔

زندگی دھیرے دھیرے اپنی ڈگر پر آ گئی۔ پیشہ ورانہ سفر میں بھی ترقی کے امکانات نظر آنے لگے۔

رئیس کی امریکا آمد کا بنیادی مقصد روشن مستقبل کی تلاش تھی جس کے لیے تعلیم شرط تھی، مگر مارک کی برہمیت و نشاندہ بننے کے بعد اُس کے شب و روز تاریکی میں اتر گئے تھے۔ جب حالات میں بہتری آئی، وہ پھر تعلیم کی جانب متوجہ ہوا۔

اُس نے ڈیلاس کے ایک کمپیوٹر اسکول میں داخلہ لیا اور خوش قسمتی سے اُسے کوئی فیس نہیں ادا کرنی پڑی۔ دراصل اسکول کا سربراہ ایک ایشیائی مسلمان تھا۔ مسجد میں رئیس کی اس سے اکثر ملاقات ہوتی تھی۔

”میں تم سے فیس نہیں لوں گا۔“ اُس نے دانا الفاظ میں کہا۔ ”اپنے مسلمان بھائی کے لیے میں اتنا کر ہی سکتا ہوں۔“

”مگر میں فیس ادا کر سکتا ہوں۔“ اُس نے احتجاج کیا۔

”مجھے اس کی ضرورت نہیں۔“ اُس نے آگے بڑھ کر ہوئے کہا۔ ”شرط فقط اتنی ہے کہ جو کچھ تم یہاں سے سیکھو اسے اپنے کسی مسلمان بھائی کو سکھاؤ گے۔“

اسکول میں اُس کی کئی قابل افراد سے ملاقات ہوئی۔

جن کے اشتراک سے اُس نے سافٹ ویئر ڈیزائننگ کے مشکل کام کا آغاز کیا۔

وہ ایک ایسا سافٹ ویئر بنانے کا متبعی تھا جو ریسٹورنٹ مالکان کو اپنی جانب متوجہ کر سکے۔

یہ آسان کام نہیں تھا۔ امریکا میں کئی بڑے سافٹ ویئر ہاؤس تھے، جو جدید خطوط پر استوار پروگرام تیار کر رہے تھے۔ ایسے میں ایک نا تجربہ کار شخص کے سافٹ ویئر کے لیے مارکیٹ میں جگہ بنانا خاصا مشکل تھا، مگر رئیس گزشتہ چند برسوں میں جو کچھ سہہ چکا تھا، اس کے سامنے مشکل بچ تھی۔

اس نے دن رات ایک کر دیے اور آخر کار اپنی قابلیت، مہارت اور قابل ساتھیوں کی معاونت سے ایک معیاری سافٹ ویئر تیار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

سافٹ ویئر تو بن گیا، لیکن اُسے مارکیٹ میں متعارف کروانا سہل نہیں تھا۔ تشہیر شرط تھی مگر اس کے ذرائع محدود تھے۔

سب سے پہلے اُس نے ایک کمپنی رجسٹرڈ کروالی۔ پھر ریسٹورنٹ اور ہوٹل مالکان سے رابطے شروع کیے۔

”ہماری کمپنی نے ایک نیا سافٹ ویئر تیار کیا ہے جو آپ کے لیے خاصا سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر آپ وقت دیں تو ہم پریزنٹیشن کے لیے آپ کے دفتر آ سکتے ہیں۔“

بڑے اداروں نے تو ایشیائی لہجے میں بات کرنے والے ایک غیر معروف کمپنی کے مالک کی ٹیلی فون کالز کو درخور اعتنا نہیں جانا مگر چھوٹے ریسٹورنٹس کی جانب سے مثبت ردعمل ملا۔

اس کا سافٹ ویئر واقعی معیاری تھا۔ پریزنٹیشن کے فوراً بعد وہ ریسٹورنٹس نے اُسے آرڈر دے دیا۔

گو انہوں نے سافٹ ویئر سستے داموں خریدا، مگر رئیس خوش تھا۔ اُسے یقین تھا کہ یہ ایک زنجیری عمل ہے، آج دو اداروں نے اُس کی پراڈکٹ خریدی ہے، کل چار ادارے اس میں دلچسپی ظاہر کریں گے۔ اور یوں یہ سلسلہ پھیلتا چلا جائے گا۔

قدرت واقعی اُس پر مہربان تھی، کیونکہ ایسا ہی ہوا۔ جلد ہی اُسے مزید آرڈرز مل گئے اور اس بار نسبتاً بڑے ریسٹورنٹس نے رابطہ کیا تھا۔ تبدیلی کا پہرہ چل چکا تھا۔

☆☆☆

2009ء کے وسط تک حالات سنبھل چکے تھے۔

آسمان (Sky)

جو کچھ افق سے اوپر ہے اور جہاں ہماری نظر جا کر ٹھہر جاتی ہے، اسے آسمان کہتے ہیں۔ موسمیات میں یہ لفظ عموماً موسم کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسے آسمان (مطلع) ابر آلود ہے۔ علم ہیئت میں اس کا اطلاق پورے کرہ فلكی یا اس کے اس حصے پر ہوتا ہے جو نظر آتا ہے۔ دن میں ”آسمان“ کے نیلا نظر آنے کی وجہ یہ ہے کہ سورج کی لمبی شعاعیں (سرخ اور زرد) تو فضائی ذرات میں سے گزر جاتی ہیں لیکن چھوٹی (نیلگوں) شعاعوں کو فضائی ذرات بالائی فضا میں منتشر کر دیتے ہیں۔

مرسلہ: ناہید تنہیم عباسی، دادو سندھ

کاروبار جم گیا تھا۔ گاڑی اور مکان کی قسطیں ادا ہو گئی تھیں، بینک میں بھی خاصی رقم جمع ہو گئی تھی۔ الغرض اپنے رب سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کا وقت آن پہنچا تھا۔

اُسے سفر کرنا تھا، ایک مقدس سفر، حج کی ادائیگی کے لیے جو اس کی زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدلنے والا تھا۔

رئیس کے والد تین بار خانہ خدا پر حاضری دے چکے تھے، تو اُس نے والدہ کو اس روحانی سفر میں شریک کرنے کا فیصلہ کیا۔

سرزمین حجاز پر قدم رکھتے ہی اُسے ایک خاص نوع کی لطافت کا احساس ہوا۔ اور جب وہ احرام پہنے خانہ کعبہ میں حاضر ہوا، اس احساس نے ایک ایسے روحانی تجربے کی شکل اختیار کر لی جسے الفاظ میں سمونا ناممکن ہے۔

وہ مقدس ترین زمین پر کھڑا تھا۔ اپنے رب کے حضور... آنکھوں میں نمی لیے، سر جھکائے۔

اُسے وہ دن یاد تھا، جب اُس پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ وہ غیر انسانی چہرہ جو اس نے آٹپنے میں دیکھا... اذیت کے ماہ و سال، جب اُس کے پاس علاج کے لیے پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی... سب یاد تھا اُسے۔

مگر وہ سب اب ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔ برا وقت بیت چکا تھا۔ خانہ خدا پر حاضری کے وقت احساسِ تشکر اُس کے سینے میں موجزن تھا۔

روضہ رسولؐ پر حاضری کے تو کیا ہی کہنے۔ خالص روحانی تجربہ تھا وہ۔ اور مسجد نبویؐ پر اترنے والی ایک خوبصورت شام اُس نے ایک انوکھا فیصلہ کیا۔ معاف کرنے کا فیصلہ۔

☆☆☆

ڈیلاس لوٹنے والا رئیس اُس شخص سے یکسر مختلف تھا جس نے چند ہفتے قبل ایک روحانی سفر کے لیے رختِ سفر باندھا تھا۔

ذہن ہر فکر سے آزاد تھا۔ یقین کی شمع دل میں روشن تھی۔ خدا اُس کا سا بھان تھا۔ اُسے تو بس اُن بد نصیبوں کی فکر تھی جو دیگر انسانوں کی نفرت کا شکار بن کر امید کی روشنی سے محروم ہو جاتے ہیں، مایوسی کی گھاٹی میں اتر جاتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ فکر بھی اُس شخص کی۔ جس نے اس کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔

وہ موت کے منتظر مارک اسٹورمین کو بچانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

دوست اس کا فیصلہ سن کر ششدر رہ گئے۔

”تم اُس جنونی کی جان بچانا چاہتے ہو... اُس نے لگ بھگ ہمیں قتل ہی کر دیا تھا؟“ ایک دوست نے کہا۔
”وہ گزشتہ نو برس سے جیل میں ہے۔“ رئیس نے آہستگی سے کہا۔ ”اپنے کیے کی کافی سزا بھگت چکا ہے۔“
اُس ضمن میں جب رئیس نے ڈیلاس میں مقیم ایک بنگلہ دہی قانونی ماہر سے رابطہ کیا، تو وہ بھی حیرت زدہ رہ گیا۔
”مگر اس کا مقصد کیا ہے؟“ اُس تجربے کا شخص نے سوال کیا۔

”وہ بھی میری طرح ایک انسان ہے۔“ رئیس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”بے شک اس نے جرم کیا اور اسلام مجرم کو سزا دینے کی حمایت کرتا ہے، مگر قرآن میں واضح لکھا ہے کہ مظلوم ظالم کو معاف کرنے کا بھی اختیار رکھتا ہے اور میں اُسے معاف کر چکا ہوں۔ ایسے میں اُسے جیل میں رکھنا اسلامی قوانین کے خلاف ہے۔“
”مگر اُس نے تم پر جان لیوا حملہ کیا تھا۔“ اس نے سمجھایا۔

”ہاں۔“ رئیس کی آنکھوں میں ماضی کی پرچھائیں لرزی، مگر جلد ہی اُس کی جگہ امید لوٹ آئی۔ ”میں نے بہت تکلیف برداشت کی۔ جن دواؤں کو اُس نے ہلاک کیا، ان کے خاندان بھی شدید عذاب سے گزر رہے۔ مگر جو بیت گیا،

ہم اسے تبدیل نہیں کر سکتے۔ مارک کی موت سے کچھ ماہ نہیں ہوگا، البتہ اُسے معاف کر کے، نئی زندگی دے کر اسلام کی حقیقی شہید امریکا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک مہم چلانا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے رئیس کے دلائل کے ساتھ ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ”تم یہ محاذ سنبھالو۔ میں قانونی معاملات دیکھتا ہوں۔ گو یہ خاصا پیچیدہ معاملہ ہے، اُسے دو شہریوں کو قتل کیا ہے۔“

اگلے چند روز رئیس نے قانونی شتوں کو سمجھنے میں مصروف کیے۔ انٹرنیٹ کے وسیلے ان پلیٹ فارمز تک رسائی حاصل کی جن کے ذریعے وہ اپنی بات عوام تک پہنچا سکتا تھا۔ ساتھ ہی فضا اکٹھا کرنے کی ایک مہم کا بھی آغاز کر دیا۔
حیرت انگیز منظر تھا وہ بھی۔ جس شخص نے اُس کی زندگی جہنم میں تبدیل کر دی، رئیس اُسے ہی بچانے کے لیے پیسے اکٹھے کر رہا تھا۔

شروع شروع میں ڈیلاس میں مقیم مسلم کمیونٹی متذبذب دکھائی دی مگر جب رئیس نے انہیں اپنے عقیدہ خواب سے آگاہ کیا، درگزر کی قوت کا احساس دلایا، رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے حوالے دیے تو ان کے خیالات بھی بدلنے لگے۔ ہم خیال لوگ اُس کے گرد جمع ہونے لگے، ایک ایسے مشن کے لیے جو معاشرے کی ریفورمری کرنے والا تھا۔ پھر ایک شام رئیس کو اپنے دوست کی کال موصول ہوئی۔

”ایک صاحب ہیں پروفیسر ریک ہیلبرین۔“ ساؤتھ میٹھڈسٹ یونیورسٹی سے وابستہ ہیں۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل امریکا کے چیئرمین رہ چکے ہیں۔ وہ فیکس میں موت کی سزا کے خاتمے کے لیے برسوں سے سرگرم ہیں۔ شاید وہ تمہاری کچھ مدد کر سکیں۔“

☆☆☆

”گو گزشتہ چند برسوں میں فیکس میں کرائم ریجٹ خاصا کم ہوا ہے، مگر آج بھی ہر سال 22 افراد کو یہاں کی عدالتیں سزائے موت سناتی ہیں اور یہ تعداد امریکا کی کسی بھی ریاست سے زیادہ ہے۔“

آنکھوں پر گہرے رنگ کی عینک چڑھائے، بھروسے بالوں والے پروفیسر ریک نے کافی کا گھونٹ بھرا۔
رئیس خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد پروفیسر کی آواز گونجی۔ ”میں تمہاری مدد کرنے کے لیے چاہتا ہوں۔“

”میں آپ کا ممنون ہوں۔“ رئیس نے فوراً کہا۔
”اس کی ضرورت نہیں تو جوان۔ تمہارا مقصد اتنا بلند ہے کہ اس سے وابستہ ہونا میں اپنے لیے اعزاز سمجھتا ہوں۔“
پروفیسر مسکرایا۔ ”اگرچہ کامیابی کا امکان بہت کم ہے، مگر ہمیں کوشش ضرور کرنی چاہیے۔“

”میں ہر کوشش کے لیے تیار ہوں۔ مسلم کمیونٹی ہے تعلق رکھنے والے کئی افراد میرے ہم خیال ہیں۔ ہم خاصی رقم اکٹھی کر چکے ہیں۔“

”یہ اچھا آغاز ہے مگر...“ پروفیسر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”فیکس کے مسلمانوں کے ساتھ تمہیں یہاں کے مقامی افراد کو بھی قائل کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں اس ضمن میں میڈیا ہماری مدد کر سکتا ہے۔ ڈیلاس مارننگ نیوز میں میرا ایک دوست ہے۔ میں اس سے رابطہ کرتا ہوں۔“

پروفیسر کے تعاون کی بدولت حج کے مقدس سفر سے لوٹنے کے ٹھیک 18 ماہ بعد... رئیس کو پہلی کامیابی ملی۔

”ڈیلاس مارننگ نیوز“ میں ایک مفصل رپورٹ شائع ہوئی جس میں رئیس کے خوابوں کا احاطہ کیا گیا تھا۔
اس آرٹیکل نے کھلبلی مچا دی۔ امریکا چونک اٹھا۔
”یہ کون شخص ہے، جو خود پر جان لیوا حملہ کرنے والے کی زندگی بچانے کی کوشش کر رہا ہے؟“ وہ آپس میں سوال کرنے لگے۔

”ایک بنگلہ دہی مسلمان جسے مذہبی تعصب کا نشانہ بنایا گیا۔“ کہنے والے نے کہا۔
”مگر وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟“ سوال کرنے والے کے لہجے میں حیرت تھی۔

”کیونکہ وہ معاف کرنے پر یقین رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کا مذہب یہی حکم دیتا ہے۔ یہی اس کے پیغمبر کی سنت ہے۔“
چند روز بعد نسبتاً بڑے اخبار میں رئیس کی بابت تفصیلی اسٹوری شائع ہوئی جس کے بعد سوشل میڈیا میں ایک بحث چل پڑی۔ ہزاروں انٹرنیٹ صارفین اُس کے رابطے میں آ گئے۔ وہ بار بار ایک ہی سوال کرتے۔ ”آپ اس شخص کو کیوں بچانا چاہتے ہیں جو انسانیت کا دشمن ہے؟“

ایک مقامی چینل کے رپورٹر نے بھی رئیس سے یہی سوال کیا، جس کے جواب میں اُس نے کہا۔ ”میرے ماں باپ اور اساتذہ نے مجھے یہی سکھایا ہے کہ ہمیں دوسروں پر تنقید کرنے کی بجائے اُن کا مسئلہ سمجھنا چاہیے۔ بدلہ لینے سے

جاوا

انڈونیشیا کا معاشی، سیاسی اور تہذیبی لحاظ سے ایک اہم مرکزی جزیرہ ہے جس کے مغرب اور شمال مغرب میں سمائرا ہے شمال میں بحیرہ جاوا اسے کالیمانتان سے جدا کرتا ہے۔ مشرق میں جزائر سوندا صغیر ہیں اور جنوب میں بحرہ ہند واقع ہے۔ اس کا رقبہ 48504 مربع میل ہے۔ جاوا کی وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف نظریات ہیں۔ مثلاً یہ کہ دوسری صدی عیسوی میں بظلموں نے اس جزیرے کو اپنی زبان میں جاوا بول لکھا تھا۔ سب سے قدیم مآخوذ جس میں جاوا کا لفظ پہلی بار ملتا ہے وہ یاقوت کی معجم البلدان ہے۔ جاوا انسانی آبادی کے قدیم ترین اماکن میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی تاریخ کا آغاز ہندوؤں کی آمد سے ہوتا ہے جو تجارت کے لیے اکثر یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ دوسری صدی عیسوی میں ان ہندو تاجروں نے یہاں پر اپنی نوآبادیاں قائم کر لیں جو بعد میں باقاعدہ ریاستوں کی شکل اختیار کر گئیں۔ چنانچہ جاوا میں ہندوؤں اور بدھوں کی بعض بڑی بڑی سلطنتیں بھی قائم ہوئیں۔ یہاں کی پہلی ہندو ریاست تروماکھی۔ جس کا پہلا ہندو راجا اچئی ساکا تھا۔ آٹھویں یا نویں صدی میں جاوا کے نصف جزیرے پر سماٹرا کی بدھ سلطنت سری وجایا کا قبضہ ہو گیا جس کا خاتمہ خاندان سلینڈرا کے ہاتھوں ہوا اس خاندان کے بعد یہاں خاندان ماترم کی حکومت رہی۔ جس کے بعد سلطنت کیدیری قائم ہوئی۔ 1693ء میں جاوا کی ممتاز ترین ہندو سلطنت جاپانت کا آغاز ہوا جس کا 1428ء میں مسلمانوں کے ہاتھوں خاتمہ ہوا۔ جاوا میں اسلام کی اشاعت کا کام چودھویں صدی کے اواخر اور پندرہویں صدی عیسوی کے اوائل میں ملاکا کے مسلمان تاجروں کے ذریعے ہوا۔ احمد آباد کے ایک تاجر اور صوفی بزرگ ملک ابراہیم (مولانا مغربی) جاوا میں پہلے مبلغ اسلام تھے۔ انہیں طلب میں بھی حد درجہ کمال حاصل تھا۔ انہوں نے گریک کے راجا کا علاج کیا جو صحت یاب ہونے کے بعد مسلمان ہو گیا۔ اس کا نام راوان رحمت رکھا گیا۔ اس طرح جاوا میں پہلی مسلمان حکومت قائم ہوئی۔

مرسلہ: سلطان احمد، فیصل آباد

اجتناب برتنا چاہیے، کیونکہ انتقام کی آگ انسان کے دل کو جلا دیتی ہے۔ میرا مذہب بھی مجھے یہی حکم دیتا ہے۔“

”مگر مذہبی تعصب ہی کی بنا پر تو آپ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا؟“

”جی ہاں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”مگر مارک کا یہ عمل اسلام کی یابت پائی جانے والی غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ اُسے اندازہ نہیں تھا کہ اسلام محبت اور سلامتی کا مذہب ہے۔ معاشرے سے ظلم مٹانے کے لیے عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ مارک کی زندگی بچانا بھی ایسی ایک کوشش ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ 9/11 کے سانحے کو جواز بنا کر کل پھر کسی مسلمان کو نشانہ بنایا جائے۔“

☆☆☆
بالآخر وہ دن آن پہنچا، جب رئیس نے حکومت فیکساس کو ایک خط روانہ کیا، جس میں اُس نے مارک کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کرنے کی درخواست کی۔
اُس نے لکھا۔ ”میں پرسیوں قبل مارک کو مغف کر چکا ہوں۔ تعصب کی وجہ سے وہ سچ اور غلط میں تمیز نہیں کر سکا۔ نفرت کبھی بہتری اور ترقی کا امکان پیدا نہیں کرتی۔ ممکن ہے، اس عمل سے معاشرے پر مثبت اثرات مرتب ہوں۔“

خط جلد ہی خبروں کی زینت بن گیا۔ رائے عامہ ہموار ہونے لگی، مگر ایک مسئلہ تھا۔ رئیس نے خط مئی 2011 میں روانہ کیا اور عدالتی حکم کے مطابق مارک کو فقط دو ماہ بعد، یعنی 20 جولائی کو موت کے حوالے کیا جانا تھا۔

یہ معاملہ رئیس کے لیے خاصا پریشان کن تھا۔ گو آج وہ خبروں کا موضوع تھا، مسلم کمیونٹی، سول سوسائٹی اس کے ساتھ کھڑی تھی... مگر وہ تاحال اپنے مقصد سے کوسوں دور تھا۔
وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

رئیس نے مارک کے وکلاء اور حکومتی آفیسر سے ملاقاتیں کیں، مگر دونوں ہی اس معاملے میں بے بس تھے۔ بالآخر وہ خود وکیل کی تلاش میں نکل پڑا۔

یہ ایک مشکل مرحلہ ثابت ہوا۔ کوئی اس کا کس لیے
کے لیے تیار نہیں تھا، کیونکہ شکست یقینی تھی۔

پھر اُس کی ملاقات خرم وحید نامی ایک قابل وکیل سے ہوئی، جس نے مقدمہ لڑنے کی ہامی بھر لی۔

خرم نے سزائے موت کے قانون کے خلاف برسرِ پیکار ایک سماجی تنظیم GRACE کے تعاون سے، متاثرین کے حقوق کے قانون کو بنیاد بناتے ہوئے کورٹ میں

درخواست دائر کر دی۔ مگر شاید بہت دیر ہو چکی تھی۔
ٹیکساس کا گورنر ریک پیری بھی مارک کی سزا ختم
کرنے کا حق میں نہیں تھا۔
”مسٹر ریکس میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا
ہوں۔“ اس نے اپنے خط میں لکھا۔ ”آپ کے مذہبی
نظریات نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ ہمیں واقعی آپ جیسے
انسانوں کی ضرورت ہے، مگر میں آپ کی درخواست پر عمل
نہیں کر سکتا۔ مارک اسٹورمین نے قانون توڑا ہے اور وہ
سزا کا حق دار ہے۔“

بہ ظاہر اس ناکامی کے بعد اُسے اپنی جدوجہد ترک کر دینی چاہیے تھی، مگر وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے مارک سے ملاقات کرنے کی درخواست دائر کر دی۔

جب ایک اخباری انٹرویو میں اس اقدام کا سبب دریافت کیا گیا، تو اُس نے کہا۔ ”وہ شخص گزشتہ نو برس سے موت کا منتظر ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس سے ملاقات کروں، اس سے زندگی اور محبت کے بارے میں گفتگو کروں۔ کیونکہ محبت انسان کو بدل دیتی ہے۔ وہ بھی ہماری طرح انسان ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اُسے دوسرا موقع ملنا چاہیے۔ میرے خیال میں اگر وہ رہا ہو گیا، تو لاکھوں امریکیوں کے لیے ایک اچھا استاد ثابت ہوگا۔“

اتنا کہہ کر اس نے گہرا سانس لیا۔ تاسف آنکھوں میں
 تر آیا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ میں اُس کے بارے میں ہمہ وقت
 سوچتا رہتا ہوں۔ رات کو سو نہیں پاتا۔ یہ بات مجھے اداس
 کر دیتی ہے کہ وہ موت سے فقط چند قدم دور ہے۔“

گوریس کو مارک سے ملاقات کا موقع نہیں ملا، مگر ایک
خبری نمائندہ جیل میں اس کا انٹرویو کرنے میں کامیاب
ہو گیا جو یہ جاننے کا متنی تھا کہ کیا واقعی محبت انسان کو بدل سکتی
ہے؟ کیا گوریس کی رحم دلی نے مارک کے اندر کے درندے کو مار
یا ہے؟

اُسے یقین تھا کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا۔
 پہلا سوال اُس نے اسی بابت کیا۔ ”مسٹر ہمیں آپ کی
 زندگی بچانے کی کوششوں میں مصروف ہیں، اُن کے بارے
 میں آپ کی کیا رائے ہے؟“

سوال سن کر مارک گہری سوچ میں اتر گیا۔ چہرہ
 اثرات سے عاری تھا۔ رپورٹر کی نظریں اس پر لگی تھیں، وہ
 گرفت انگیز جملوں کی توقع کر رہا تھا، ایسے جملے جو اُس کی
 رپورٹ سنسنی خیز بنادیں۔

علی پاشا جانیکی

(1720ء جولائی 1785ء) ایک صاحب
سیف اور خاندان "درہ بے" کا بانی تھا۔ والد کا نام احمد
آغا تھا جو قصر شاہی کا قبوچی باشی تھا۔ استنبول میں پیدا
ہوا۔ عہد جوانی میں اپنے بھائی سلیمان پاشا کے ہمراہ
جائیک گیا۔ بعد میں اپنے بھائی کی جگہ وہاں کا حاکم
مقرر ہوا اور محصل کے خطاب سے نوازا گیا۔ روس
اور ترکی کی جنگ کے دوران میں اسے متعدد بار لشکر کی
قیادت سونپی گئی۔ پہلے اس نے جارجیا میں خدمات
سرا انجام دیں بعد میں مولد دایا میں اس کا تقرر کیا گیا
جہاں اس نے روسیوں کے خلاف لڑائی میں خوب
شہرت حاصل کی اور اسے انعام کے طور پر وزارت کا
منصب سونپا گیا۔ 1774ء میں اس نے کریمیا کی مہم
کی قیادت کی۔ 1776ء میں قارص کا سپہ سالار
بنایا گیا۔ اسی دوران میں اس نے جائیک میں اپنی
حکومت کو خوب مضبوط کر لیا اور مشرق کی جانب اپنی
سلطنت میں توسیع بھی کی۔ 1771ء میں اسے
طر بزدن کا والی تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے چند سالوں بعد
اس نے سیواس اور راضی روم کو بھی اپنے مقبوضات
میں شامل کر لیا۔ اسے ایک بار پھر جنوری 1778ء میں
کریمیا کا سرعسکر اور ایک مہم کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔
لیکن یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے بعد اسے
پنے اناطولوی حریف چوہان اوغلی کے مقابلے پر آنا
پڑا۔ جس نے استنبول میں اس کے دشمنوں کے
کسانے پر اس پر فوج کشی کر دی تھی۔
1193ھ 1779ء میں علی پاشا کریمیا کی طرف فرار
ہو گیا اور وہاں کے خان شاہین گرامی سے پناہ کا
مطالب ہوا جس کے توسط سے اسے معافی مل گئی اور
دوبارہ بحال کر دیا گیا اسے وزیر کا منصب اور سابقہ
مقبوضات بھی دوبارہ مل گئے۔ 1190ھ 1776ء
میں علی پاشا نے حکومت کو ایک یادداشت پیش کی۔
میں میں روس میں ترکوں کی شکست کے اسباب بیان
کئے گئے تھے اور ان اصلاحات کی طرف توجہ دلائی
گئی تھی جنہیں اس وقت سلطنت میں نافذ کرنے کی
ضرورت ہے۔

مرسلہ: سلطان احمد خان، فیصل آباد

یالاخر مارک نے سراٹھایا۔ اُس کے لب وا ہوئے۔
 مسٹر ریس... واہ۔ وہ ایک متاثر کن شخصیت ہیں۔“
 مارک کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ مارک نے بات
 کی کوششوں نے میرا دل کھلادیا۔ انہوں
 کے متعلق ہماری رائے کتنی غلط تھی۔
 وہ ایک قابلِ تقلید انسان ہیں۔“

☆☆☆

بالآخر وہ دن آن پہنچا، جب مارک اسٹورمین کو موت
کے حوالے کیا جانا تھا۔ اُس کی زندگی کے چند ہی گھنٹے بچے
تھے اور دیکھ بے چہین تھا۔ وہ اپنے حملہ آور سے بات کرنا
چاہتا تھا۔

اس نے بیل خانے کا مبرڈ اٹل کیا۔ اپنا تعارف کروایا
 ہمارے سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔

”میں معذرت چاہتا ہوں سر۔“ آپ ریٹریل آواز میں
 ”مگر اس کی اجازت نہیں۔“

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ لائن لگتے ہی اس نے قسم
خاک و کھنکھار میں دیکھا کہ نمبر ڈائل کر دیا۔

ایں قیدیوں کی زندگی کم بند کرنے کے حوالے سے
تصویر دکھاتا تھا۔ کچھ عرصے قبل اُس نے مارک کے بارے میں
ایک فلم تیار کی تھی، جس میں اس کی شخصیت اور نظریات
پر روشنی ڈالنے والی تبدیلی کو موضوع بنایا تھا۔

لوں کرے ہیں۔ ائین نے یہ کہہ رفون کاٹ

دو لائن پر ہے۔

”کیسے ہو دوست۔“ کچھ دیر بعد مارک کی بھاری

میں نے دل سے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ میرا اعزاز لفظ تھا، تم تو پاکیزہ روح کے حامل ہو۔“

جولائی 2001ء کو اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔۔۔ پل

یہاں سے ریس نے اندازہ لگالیا کہ یہ آواز بدل
گیا ہے۔ فون کی دوسری طرف جو شخص ہے، وہ کوئی جنونی

اے نگہ لیا تھا... دیکھیں ناکام نہیں رہا تھا، اُس کے

”میں ٹھیک ہوں مارک۔ اور میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں



سچا عشق

اسیامہ عطاری

اس نے عشق کی خاطر تن من و اردیٹے اور یہ ثابت کر دکھایا کہ عشق صرف مشرق کی میراث نہیں، مغرب میں بھی جذبہ عشق میں قربانی پیش کی جا سکتی ہے۔

ایک ملکہ کے عشق کا مختصر تذکرہ

گرچہ یہ کہانی ایسی نہیں ہے کہ دو محبت کرنے والے ایک دوسرے سے مل نہ پائے ہوں لیکن یہ ایک ایسی عورت کی بے مثال پیار کی کہانی ہے جس نے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اپنے شوہر سے وفاداری اور محبت کی شدت کو زندہ رکھا۔ وہ تا عمر اپنے مرحوم شوہر کی موت کا سوگ مناتی رہی۔ مغرب کی زندگی میں ایسی کہانیاں بہت کم سامنے آتی ہیں۔

وکتور یہ ایک بہت زعمہ دل اور خوش رہنے والی لڑکی تھی۔ اسے زندگی کے ہر رنگ سے پیار تھا۔ وہ پینٹنگ کیا کرتی، چانوی بجاتی اور تلی کی طرح رقص کیا کرتی تھی۔ وہ جس محفل میں بھی جاتی، اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔

مارک اسٹورمین ایک بھرے چرے گھرانے کا تھا، رئیس نے اس کے گھرانے کی کفالت کی ذمہ داری اٹھانے کا اعلان کر دیا۔ یہی نہیں، مارک کے ہاتھ ہونے والے ٹیل اور وقار حسن کے خاندانوں کی دیکھ بھی وہ اپنی ذمہ داری گردانے لگا تھا۔

اُس کے پاس تاحال ایک خواب تھا اور میں تاحال ایک رفوگر کی ضرورت تھی۔

چھٹی والے دن وہ اپنی کار میں نئے علاقوں کی نکل جاتا۔ جہاں وہ طرح طرح کے لوگوں سے ملاقات انہیں درگزر کی روحانی قوت سے آگاہ کرتا۔ مجتہد اثرات برپا کر دیتا۔

مارک کی موت کے دو ماہ بعد اس نے اپنے انٹرویو میں کہا:

”شہر کی سڑکیں مارک اسٹورمین جیسے انسانوں بھری ہوئی ہیں۔ کیونکہ ہم نفرت میں گھرے ہوئے ہیں پر محبت سے پائی جاسکتی ہے۔“

☆ ☆ ☆
رئیس بھونیاں آج ڈیلاس میں مقیم ہے۔ ایک بین الاقوامی شخصیت بن چکا ہے، مگر اُسے خواہش نہیں، آرزو فقط پیغام محبت کو عام کرنا ہے، جس لیے وہ اپنی تنظیم ”World With Out Hate“

کے پلیٹ فام سے مصروف ہے۔ اخبارات بلا جھجک پر مجبور ہیں کہ رئیس ہی اصل مسلمان ہے جو اسلام کی گھر رہا ہے جبکہ کچھ لوگ نہیں چاہتے کہ... وہ یہ کام شاید انہیں ڈر ہے کہ اس طرح مغربی دنیا اسلام سے کرنے کی بجائے اسلام کی جانب راغب ہونے اور ان کا خواب ٹوٹ جائے گا جو مسلمانوں کو دہشت کے طور پر مشہور کر رہے ہیں۔

سامی خدمت کے میدان میں قدم رکھنا باوجود رئیس بھونیاں اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داری بھولا۔ اس کی زندگی میں توازن پایا جاتا ہے۔ ٹیکنالوجی میں وہ ایک قابل آئی ٹی ماہر کی شہرت رکھتا ہے، مگر سنجیدگی سے سوچتا ہے کہ سب کچھ بچ کر نفرت کے جنگ کو اپنی کل وقتی مصروفیات بنالے۔

کیا پتا مغرب کے سامنے اسلام کا حقیقی رخ کرنے والا یہ رفوگر اپنے خواب کے لیے ایسا کرے گا؟

☆ ☆ ☆
اس نے اپنے وکیل خرم وحید کی آواز سنائی دی۔ ”خرم، میں ایک تنظیم قائم کرنے کا خواہش مند ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے رجسٹر کرواؤ۔ اُس کا نام ہوگا... نفرت سے پاک دنیا۔“

”مگر... خرم کے لہجے میں تذبذب تھا۔“ اس کی کیا ضرورت ہے؟ میرا مطلب ہے کہ مارک تو مر چکا ہے۔“

”مگر نفرت باقی ہے۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”جس کے خلاف میری جدوجہد جاری رہے گی۔“

کہ میں تمہارے لیے دعا کر رہا ہوں۔ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے اور میں...“ اس کی آواز رندھ گئی۔ ”میں تم سے نفرت نہیں کرتا۔“

”شکر یہ دوست۔“ مارک کی آواز میں تشکر تھا۔ ”اب مجھے جانا ہوگا۔ تم سے بات کر کے اچھا لگا۔“

”سنو...“ رئیس نے تیزی سے کہا۔ ”میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے تمہیں کیوں معاف کیا۔ میرے اس عمل کا مقصد...“

لائن کٹ چکی تھی۔ رئیس نے کھڑکی سے باہر دیکھا، جہاں دھند چھا چکی تھی۔

اس مختصر گفتگو کے چند گھنٹوں بعد مارک کو زہر کا انجکشن دے دیا گیا۔

☆ ☆ ☆
”قاتل اپنے انجام کو پہنچا!“

اُس کے ہاتھ میں اخبار تھا، جس کا پہلا صفحہ مارک اسٹورمین کے عبرت ناک انجام کی کہانی بیان کر رہا تھا۔ اسی صفحے پر ایک تین کالمی خبر بھی تھی، ایک بنگلادیشی مسلمان سے متعلق۔ جس نے ایک عظیم خواب دیکھا۔

خبر کی سرخی تھی: ”امریکی مسلمانوں کا حقیقی نمائندہ!“

رئیس نے گہرا سانس لیا اور اخبار میز پر رکھ دیا۔ وہ گہری سوچ میں مستغرق تھا۔ مارک کا قصہ ختم ہو گیا تھا اور یہ ظاہر اس کی جدوجہد بھی۔

وقت خاموشی سے گزر رہا تھا۔ بالآخر وہ کھڑا ہوا۔ چال میں عزم تھا۔ وہ ایک فیصلہ کر چکا تھا، اپنی جدوجہد جاری رکھنے کا فیصلہ۔

اس نے ریسیور اٹھایا۔ کچھ دیر بعد دوسری طرف سے اسے اپنے وکیل خرم وحید کی آواز سنائی دی۔

”خرم، میں ایک تنظیم قائم کرنے کا خواہش مند ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے رجسٹر کرواؤ۔ اُس کا نام ہوگا... نفرت سے پاک دنیا۔“

”مگر... خرم کے لہجے میں تذبذب تھا۔“ اس کی کیا ضرورت ہے؟ میرا مطلب ہے کہ مارک تو مر چکا ہے۔“

”مگر نفرت باقی ہے۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”جس کے خلاف میری جدوجہد جاری رہے گی۔“

یہ ایک نیا سفر تھا، ایک انوکھا سفر، جس کا آغاز ایک خواب سے ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆
اس نے اپنے وکیل خرم وحید کی آواز سنائی دی۔ ”خرم، میں ایک تنظیم قائم کرنے کا خواہش مند ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے رجسٹر کرواؤ۔ اُس کا نام ہوگا... نفرت سے پاک دنیا۔“

”مگر... خرم کے لہجے میں تذبذب تھا۔“ اس کی کیا ضرورت ہے؟ میرا مطلب ہے کہ مارک تو مر چکا ہے۔“

”مگر نفرت باقی ہے۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”جس کے خلاف میری جدوجہد جاری رہے گی۔“

یہ ایک نیا سفر تھا، ایک انوکھا سفر، جس کا آغاز ایک خواب سے ہوا تھا۔

بازیگر

امجد رئیس

اس نے زندگی بھر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حیران کن کرتب دکھائے تھے۔ ہالی ووڈ کی فلم نگری میں اس کی جوڑ کا اسٹنٹ کرنے والا کوئی اور نہ تھا مگر جب موت کے بھیانک جبڑے اس کی طرف بڑھے، اس کا ہوائی جہاز کرش ہوا تو اس پر کیا گزری۔



واپس لاس اینجلس آ رہا تھا۔ تاریخ تھی 5 اگست، 1985ء۔ مائیک کے پرانے طرز کے جہاز کا نام "اشارڈسٹر" تھا۔ 28 سالہ مائیک رائن فضائی کرتب دکھانے کے علاوہ کار جمپنگ، فائٹ، سپن، کار چیزنگ کے اسٹنٹس کرتا تھا۔ وہ ایک نڈر اور حوصلہ مند شخص تھا۔ یہ خصوصیات اس کے پیشے کا لازمی حصہ تھیں۔ موٹن پکچر انڈسٹری کے علاوہ وہ ٹی وی کمرشلز میں بھی فن کا مظاہرہ کرتا تھا۔ اشارڈسٹر آٹھ سال پرانا تھا۔ رائن کو جو لطف اور تھل ایشارڈسٹر کے ساتھ اڑتے ہوئے محسوس ہوتی وہ دوسرے اسٹنٹس کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی تھی۔

وہ خطروں کا کھلاڑی تھا۔ جان کی بازی لگانا اس کا پیشہ..... ہالی ووڈ اور ٹی وی شوز میں اس کے لیے کام ہی کام تھا۔ کیونکہ وہ ایسے اسٹنٹ کرتا تھا جن کے بارے میں سوچ کر ہی ہینا آ جاتا ہے لوگ کہتے تھے کہ وہ موت کو دھوکا دینا جانتا ہے۔ وہ موت کے پیچھے بھاگتا ہے اور موت اس سے بھاگتی ہے لیکن اس بار وہ موت کے شکنجے میں پھنس ہی گیا..... عجیب بات تھی کہ اس مرتبہ وہ کسی اسٹنٹ میں مصروف بھی نہیں تھا بلکہ ایک عام ہوائی سفر پر تھا.....

28 سالہ مائیک - وہ ایئر شو میں حصہ لینے کے بعد

ایک جرمن شخص کا خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ برطانیہ والوں کے لیے یہ بات برداشت کے قابل نہیں تھی کیونکہ وہ اپنے شاہی خاندان کو مکمل انگریزی ہی دیکھنا چاہتے تھے۔

بہر حال ان مخالفتوں کے باوجود وکٹوریہ نے البرٹ سے شادی کر لی۔ یہ شادی بے انتہا کامیاب ثابت ہوئی۔ ان دونوں نے شوہر اور بیوی کی محبت کا حق ادا کر دیا۔

وہ ایک دوسرے کے ہو کر رہ گئے۔ ملکہ ہونے کے باوجود وکٹوریہ اپنے شوہر کی خدمت اپنا فرض سمجھا کرتی تھی۔ یہ کہن چاہیے کہ دونوں ایک دوسرے کا سایہ بن کر رہ گئے تھے۔

ان کے یہاں نواولا دیں ہوئیں اور ہر لمحہ ان کی محبت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے ہیں، والی مثال شاید ان دونوں ہی کے لیے تھی۔

پھر وہ تاریخ آگئی جب قدرت نے یہ فیصلہ کیا کہ محبت کی اس کہانی کو لازوال کر دیا جائے۔

1861ء میں البرٹ کا انتقال ہو گیا۔

اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ البرٹ کی موت کا وکٹوریہ پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ وہ گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے ایک طرف سے دنیا تیاگ دی تھی۔ اس نے سوگ کا سیاہ لباس پہن لیا۔

اس نے حکومتی معاملات میں حصہ لینا چھوڑ دیا۔ لوگوں سے ملنا بھی چھوڑ دیا۔ وہ ایک کمرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی جہاں وہ البرٹ کی تصویر کو سامنے رکھ کر، اسے دیکھ دیکھ کر رویا کرتی۔

پورے برطانیہ میں اس کی اس کیفیت کو تشویش کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ حکومت کے کام مشاخر ہونے لگے۔ بہر حال وزیراعظم بنجامن کیسبرائی میں ایک وفد نے وکٹوریہ سے ملاقات کر کے اس سے درخواست کی کہ وہ زندگی کے معاملات میں حصہ لے ورنہ بہت نقصان ہو جائے گا۔

اس کی افسردگی نے پوری قوم کو افسردہ کر دیا ہے۔ وکٹوریہ نے اس کی بات مان لی اور امور سلطنت میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔

وہ اپنے کمرے سے تین سال بعد باہر نکلی تھی۔ پوری قوم نے جشن منایا۔ ملکہ وکٹوریہ کا انتقال 1901ء میں ہوا اور پورے چالیس برسوں تک اس نے البرٹ سے اپنی وہ اس طرح نبھائی کہ ایک دن کے لیے بھی اس نے سیاہ لباس نہیں اتارا۔

تاریخ میں وقاداری کی ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

ایک تو وہ خود ہی اس قابل تھی اور دوسری بات یہ تھی کہ اس کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔

وہ برطانیہ کے بادشاہ ولیم چہارم کی بیٹی تھی۔ ولیم، وکٹوریہ کو بہت عزیز رکھتا تھا کیونکہ خود اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

وکٹوریہ ابھی زندگی کے نشیب و فراز سے گزر رہی تھی کہ سرشاہ ولیم کا انتقال ہو گیا۔ اس کی موت کے بعد رسم و رواج کے مطابق وکٹوریہ کو ملکہ برطانیہ کا تاج پہنا دیا گیا۔

اب اس کے لیے سب کچھ بدل کر رہ گیا تھا۔ اس پر اتنی بڑی سلطنت کی پوری ذمے داری آگئی تھی۔ وہ چونکہ شروع ہی سے ذہین اور معاملہ فہم تھی اس لیے اس نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ حکمرانی شروع کر دی۔

اب حسن کی دولت کے ساتھ ساتھ اس کے پاس اقتدار بھی تھا، عزت بھی تھی اور طاقت بھی۔ پورے برطانیہ میں اس کا احترام کیا جاتا کیونکہ وہ ملکہ تھی۔

سب کچھ ہونے کے باوجود اس کی زندگی کا ایک خانہ خالی تھا۔ اور وہ تھا محبت کا۔

محبت، جو ابھی تک اس کے قریب نہیں آ سکی تھی جبکہ سیکڑوں نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ ایک سے ایک دولت مند اور بلند مرتبہ لوگ اس کی ایک نگاہ کرم کے امیدوار تھے۔

اور ایسے میں اسے احساس ہوا کہ محبت تو اس کے قریب، بہت قریب ہے۔ اس نے بھی اس انداز سے البرٹ کو دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی ورنہ بہت پہلے اسے اپنے سوال کا جواب مل جاتا۔

پرنس البرٹ اس کا خالہ زاد تھا۔ اس کے باپ کا تعلق جرمنی کے شاہی خاندان سے تھا۔ وکٹوریہ کے لیے البرٹ نیا نہیں تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے، لیکن دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ استوار نہیں ہوا تھا۔

پھر ایک دن وہ لمحہ آ ہی گیا۔ جب ان دونوں کو احساس ہوا کہ شاید اسی کا نام محبت بے شیفہ ہے۔ ایک آگ سی ہے، سینے کے اندر لگی ہوئی۔

اپنی تاج پوشی کے ٹھیک تین سال بعد یعنی 1840ء میں وکٹوریہ اور البرٹ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو گئے۔ دونوں کی شادی ہو گئی تھی۔

البرٹ ایک مہذب اور انتہائی پر خلوص شخص تھا۔ وہ پیار کرنا اور نبھانا جانتا تھا۔ اسے اپنی ذمے داریوں کا بھی ہمیشہ احساس رہا تھا۔

ان دونوں کی اس شادی سے برطانیہ کے کچھ حلقے بہت ناراض بھی ہوئے تھے کیونکہ البرٹ خالص انگریز نہیں تھا بلکہ

ماہنامہ سرگزشت

اشارہ سٹر کھلے کاک پٹ کا ایک ٹوسٹر تھا۔ جو آج کے جدید طیاروں کے مقابلہ میں کافی قدیم دکھائی دیتا۔ 1985ء میں جب رائن نے اسے خریدنا تو اس وقت بھی وہ آٹھ سال پرانا تھا۔ یعنی ستر کے عشرے میں کہیں بنا تھا۔ بہر حال رائن اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا تھا۔

رائن چڑے کا، سیلٹ اور گولڈز پہنے ہوئے تھے۔ ہوا اس کے چہرے اور انجن کی غراہٹ اس کی سماعت سے ٹکر رہی تھی۔ 43 گیلن ایندھن کے ساتھ اشارہ سٹر ایک سو پندرہ میل فی گھنٹے کی رفتار سے پرواز کر رہا تھا۔ اسے ہر چار گھنٹے بعد ایندھن کی خاطر زمین پر اترنا پڑتا تھا۔

رائن کا منصوبہ دن میں بارہ گھنٹے کی پرواز کا تھا۔ دوسری شام اسے پھر ہالی ووڈ پہنچنا تھا۔ جیکسن، ٹینیسی سے ایندھن بھروا کر اس نے مس ہسی کو کراس کیا پھر روزن ول، آرکٹاس میں اڑا، اس کے بعد لیلک سٹی اوکلوہاما میں۔ یہاں رائن نے ایندھن بھروایا اور آئل چیک کیا۔

اگلی صبح اسے ٹیک آف کرنا تھا۔ موسم کی رپورٹ خوشگوار تھی۔ اسے فلائٹ پلان قائل کرنا تھا، تاہم رائن نے ضروری نہ جانا۔ اس نے بیشتر سفر طے کر لیا تھا اور آخری دن کو کاغذی کارروائی میں ضائع کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

سات بجے وہ ایک بار پھر فضا میں تھا۔ اشارہ سٹر کا رخ مغرب کی جانب تھا۔ رائن اوپن کاک پٹ میں سرور محسوس کر رہا تھا۔ وہ نیو میکسیکو کے صحرا پر سے گزر رہا تھا، دائیں جانب پرشکاف پہاڑ تھے۔ گرائٹس، نیو میکسیکو اس کا آخری پڑاؤ تھا۔ دوپہر سے قبل وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

گرائٹس کی فضا میں چھ ہزار پانچ سو فٹ کی بلندی سے وہ نو ہزار دو سو فٹ تک چلا گیا۔ کیونکہ بیسی ڈگری درجہ حرارت نے ہٹا کو تباہ ہلا کر دیا تھا۔ یہ ماحول جہاز کی کارکردگی میں خلل پیدا کر رہا تھا۔ ایئر سٹر کی انجن پاور درمیانی درجہ کی تھی۔ رائن نے سوچا کہ پہلی فرصت میں وہ اس کی ہارس پاور میں اضافہ کرے گا۔

کانٹی نینٹل ڈیوانڈ کو بحفاظت عبور کرنے کے لیے اسے دس ہزار تین سو فٹ تک بلند ہونا تھا۔ تاہم فضا کی تبدیلی شدہ حالت مشکل پیدا کر رہی تھی۔

رائن نے دائروں کی شکل میں بلندی میں اضافہ کرنا شروع کیا۔ وہ جنگل نما وادی کے سر پر کئی سو فٹ اوپر چڑھ گیا۔

ہوا کے ایک ان دیکھے ستون ہلکا جہاز کسی گھانڈر کی مانند تھا، نتیجتاً حرید کئی سو فٹ بلند ہو گیا۔ رائن نے دائرہ بنایا اور ایک

بار پھر ہوا کے مہیب ستون پر سوار ہو گیا۔

جب رائن نے تیسرا چکر لگایا تو بد قسمتی سے ہوا کے آئے دباؤ میں پھنس گیا۔ ہوا کی طاقت نے کمزور جہاز کو بڑی کھسی کی مانند دبوچ کر پھینکا۔

یوم، م، م، کی عجیب سی آواز آئی۔ جہاز کے پہلے "فیرک" اس طرح تھرایا جیسے ڈرم کا پردہ ڈرم بجاتے وقت تھرتھراتا ہے۔ اشارہ سٹر پہلے ہی ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ اس میں ہوا کی بے پناہ طاقت نے اسے بے بس کر دیا۔ رائن نے اسے اس طور پر جہاز کو سنبھالنے کی ہر ترکیب آزمائی لیکن اشارہ سٹر گرتے درختوں سے کچھ ہی اوپر رہ گیا۔

رائن نے آخری کوشش کے طور پر جہاز کو ناک کے کمرے کے فل تھرو ٹیگ آزمایا۔ لیکن وہ درخت کی چوٹیوں سے ٹکرائی اور پھلا گیا۔

کرتب آزمانے کا وقت گزر گیا تھا۔ ایک چارہ تھا کہ گرے تو جہاز پیٹ کے بل ہونا چاہیے۔ رائن کو امید تھی کہ اشارہ سٹر کو کھلے ہوئے پتے کی مانند اتار لے گا۔ اس نے اسٹیل مکمل پیچھے پھینچی اور بجلی کا نظام پوری طرح ختم کر دیا۔

جہاز اس کے منصوبے کے مطابق پیٹ کے بل زمین پر آیا۔ تصادم نے لینڈنگ گیسر توڑ دیا۔ جہاز پھسلتا ہوا پہاڑی پر مہیب پتھر سے ٹکرایا۔ رائن کا چہرہ انسٹرومنٹ ہینڈل سے ٹکرا کر فرش پھٹ گیا تھا اور رائن کے پیرز میں سے ٹکرائے تھے۔ ان کا ایک حصہ الگ ہو گیا، اس نے مرکزی فیول ٹینک کو بھی جا کر کے پسینہ کپار ٹنٹ میں پھینک دیا۔ 30 گیلن ایندھن نے رائن کو شرابور کر دیا۔ بے ہوش ہونے سے قبل اسے آخری خیال آیا کہ وہ جل کر مرے گا۔

کرتب ہوا کہ آگ نہیں لگی۔ دوبارہ ہوش میں آیا تو اس نے اپنی جسمانی حالت کا پہلے جائزہ لیا۔ ناک ٹوٹ گئی تھی اور ساتھ ہی دائیں کلائی بھی۔ ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ دائیں آنکھ کے نیچے گہرا زخم تھا۔ بائیں ٹانگ اور ٹخنہ ٹوٹ چکا تھا، خون جاری تھا۔ دائیں ٹانگ کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ تکلیف کی شدت نے اسے پھر بے ہوش کر دیا۔

دوبارہ ہوش میں آنے کے بعد اس نے کسی نہ کسی طرح اپنی ٹانگوں کو آزاد کرایا۔ بری طرح مجروح دائیں ٹانگ سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ کہیوں کے بل وہ شدید زخمی بدن کو کاک پٹ کے کنارے پر لایا اور جہاز کے نچلے دائیں بازو پر گر دیا۔ اس کی چیخ نکل گئی ایک بار پھر رائن ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ ڈیڑھ بجے اس کی آنکھ کھلی۔ کاک پٹ میں ریگ کراں

نے ریڈیو پر ہاتھ مارا، کچھ نہیں ہوا۔ رائن کو ELT (Emergency Locator Transmitter) کا خیال آیا۔ اسے بخوبی احساس تھا کہ وہ ایک ہولناک حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔

اس کی حالت ناگفتہ تھی۔ وہ ایک اسٹنٹ مین تھا، مضبوط جسم اور قوت ارادی کا مالک۔ عام آدمی اب تک مرچکا ہوتا۔ اس نے بدقت تمام ELT تلاش کیا اور نقاہت کے مارے پھر ہوش کھو بیٹھا۔

متعدد میٹینس کی غلطیوں کے باعث، ELT کی بیٹریاں پانچ سال سے تبدیل نہیں کی گئی تھیں۔ گویا اس کی موت کا اذیت ناک ڈراما مکمل تھا۔

☆☆☆

ای نوائے اسکاٹ ایئر لائنز کا ایئر فورس ریسکیو کوآرڈینیٹیشن سینٹر (AFRCL) سینٹ لوئیس کے مشرق میں تھا۔ وہاں کمپیوٹر کنٹرولڈ کلمونٹریٹر US کا ڈیجیٹل نقشہ ڈسپلے کر رہا تھا۔ یکا یک ایک ننھا سا سرخ نقطہ، نقشہ پر کراچی، نیو میکسیکو کے آس پاس قلعش کرنے لگا۔

انٹرنیشنل ہرج اینڈ ریسکیو سیٹلائٹ، ایڈوڈ ٹریکنگ سسٹم (SARSAT) کا سیارچہ مدار میں گردش کر رہا تھا جس نے ELT کا سگنل پکڑ لیا۔ کمپیوٹر نے سگنل کے قریبی علاقے کی نشاندہی کی اور نزدیک ترین پانچ ایئر پورٹس کے بارے میں بتایا۔ ڈیوٹی پر موجود آپریٹر نے تصدیق کے لیے مزید ڈیٹا کا انتظار کیا۔ کیونکہ ELT کے 97 فیصد سگنل غلط ثابت ہوتے ہیں۔

مکمل تصدیق 50 منٹ بعد موصول ہوئی۔ کئی ایئر لائنز نے ”ڈسٹر لیس“ سگنل وصول کر لیا تھا۔ کئی سو میل کا علاقہ تھا نیو میکسیکو اور ایروزینا کے مابین اور وسیع علاقے میں تلاش کا کام محنت اور استقامت کا متقاضی تھا۔ کیونکہ ELT کے سگنل کمزور اور غیر مستقل تھے۔ یہ سگنل ٹھیک جگہ تک پہنچنے میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ سگنل نے دواور سیٹلائٹس کو بھی ہٹ کیا تھا۔ بہر حال امدادی مشن کا آغاز کر دیا گیا۔

☆☆☆

بوسیدہ بیٹریوں نے خوش قسمتی سے کام کرنا شروع کر دیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ وہ کتنی دیر تک سگنل بھیج سکتی تھیں۔ رائن کا جسم لہولہاں تھا۔ بہتے ہوئے لہو سے اسے خطرہ تھا کہ کہیں وہ شاک میں نہ چلا جائے۔ اسے اپنے بدن کو گرم رکھنا تھا۔ وہ تکلیف دہ جدوجہد کے بعد کاک پٹ کے عقبی حصہ سے سلیپنگ بیک نکال لایا اور اس میں گھس گیا۔ اب تک اس نے ایک ہی

کامیابی حاصل کی تھی کہ چھ گھنٹے گزار دیئے تھے۔ دوسرا کرشمہ یہ ہوا کہ ELT کام کر رہا تھا۔

ایک اسٹنٹ مین حادثات کا نہ صرف شکار ہوتا ہے بلکہ وہ وحشی طور پر بھی اس کے لیے تیار رہتا ہے۔ تاہم اٹھائیس سالہ مارک رائن کی زندگی کا یہ شدید ترین حادثہ تھا جس میں جان بچ جانے کے امکانات انتہائی قلیل تھے۔ وہ جانتا تھا کہ جسم سے زیادہ اسے اپنے ذہن پر انحصار کرنا ہے۔ اُمید اور یقین کے کرشمائی نتائج سے وہ بخوبی آگاہ تھا۔ تاہم کتابوں میں اس قسم کی ہدایات بڑی سہل لگتی ہیں لیکن انسان جب بدترین حالات سے دوچار ہوتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ ذہن اور اعصاب کے ساتھ خیالات کو قابو رکھنا کس قدر دشوار کام ہوتا ہے۔ اکثریت محض دہشت اور مایوسی کے ہاتھوں تیزی سے موت کی دلدلی میں اتر جاتی ہے۔

اسٹنٹ مین ہونے کی وجہ سے اس کی وحشی تربیت قدرتی تھی۔ مہم جو افراد کو بھی یہ سہولت میسر ہوتی ہے اور وہ آخری سانس تک حکمت تسلیم نہیں کرتے ہیں۔

رائن کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ تاہم فضائی حادثات اپنی ہلاکت خیزی میں بدنام ہیں۔ یہ بھی کرشمہ ہی تھا کہ وہ اب تک زندہ تھا۔

شب کی تاریکی پھیل رہی تھی۔ سول ایئر پیٹرول (CAP) کا طیارہ نیو میکسیکو کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ اسٹیٹ پولس گرانٹس پہنچ گئی تھیں۔ انہوں نے الیکٹرونک ریڈنگ کے حساب سے ایک فرضی دائرہ بنایا۔ عملہ نے بتایا کہ سب سے مضبوط سگنل 9 میل کے فاصلے پر ہے گرانٹس کے جنوب میں۔ تاریکی میں انہیں ایک بڑے اور ناہموار رقبہ کو کھگانا تھا۔ ان کو نیشنل ایسٹ لوکیشن ٹیم (NELT) کی صلاحیتیں درکار تھیں۔ یہ والٹنٹیر ادارہ تھا جس میں تیس پیشہ ور ٹیکنیشن موجود تھے۔ وہ تمام فزکس اور انجینئرنگ کے پس منظر کے حامل تھے۔

رک گڈ مین ٹیم کا چیز مین تھا۔ اس نے بریفنگ لینے کے بعد بتایا کہ زمینی تلاش از حد دشوار ہے ایک فلائٹ پلین اور موٹر ELT ناگزیر ہے۔

NELT ٹیم کے پاس ہلکے وزن کے انشینا تھے جو انٹرفیرمیٹر کہلاتے ہیں۔ یہ ریڈیو ٹیلی اسکوپ کی مانند کام کرتے ہیں۔ انشینا لے جانے کے لیے دو افراد کو پیدل چلنا پڑتا ہے۔ انشینا کے ساتھ ایک طویل وائر فسلک ہوتا ہے۔ انشینا ساٹھ میل کی دوری سے ELT سگنل کو محسوس کر لیتا

ہے۔ بشرطیکہ صورتحال آئیڈیل ہو۔

علامہ ازیں ٹیم کی کارس، سگنل اسٹیشنر تکھ میٹرز، ریڈیو کمپیوٹرز کے لوازمات اور پورٹبل کمپیوٹر ساتھ تھے۔ گرانٹس کی والٹنٹیر، ریسکیو ٹیم اور مقامی ماؤنٹ ٹیلر میں NELT کے ساتھ شامل ہو گئے۔ یہ لوگ گروپس میں منقسم تھے۔ کچھ پیدل تھے اور کچھ کاروں پر۔ ریڈیو کے ذریعہ یہ افراد رابطہ میں تھے۔

NELT ٹیم ممبر ”باب کووان“ سے بھی رابطہ تھا۔ باب کووان ایلا مونس نیشنل لیب میں انجینئر تھا۔ وہ اپنے کمرے میں سگنل کے فاصلے پر شمال کی سمت موجود تھا۔ وہ کمپیوٹر میں پروجے ڈیٹا وصول کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ CAP پلین اور NELT کی ٹیم سے بھی بات چیت میں مشغول تھا۔ اس کا کمپیوٹر متواتر جائے حادثہ کے ELT سگنل سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ یہ ایک بھرپور آپریشن تھا جس میں انسان اور ٹیکنالوجی شامل تھے۔

☆☆☆

رائن رات میں سوتا جاگتا رہا۔ اس کے لیے موت کوئی نئی بات نہیں تھی، ایسا ہوتا تو وہ اس خطرناک پیشے سے ہٹ ہی نہ ہوتا۔ اسے ان کی فکر تھی جنہیں وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ دو برس قبل غرقابی کے ایک حادثہ میں اس نے اپنی گرل فرینڈ کو کھو دیا تھا۔ وہ زندہ رہتا چاہتا تھا تو اپنے والدین کی خاطر، اپنے دوستوں کی وجہ سے اچانک ایک خیال نے موت کے منہ میں بھی اسے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ وہ کوئی خطرناک سگنل کرتے ہوئے نہیں مر رہا تھا بلکہ عجیب بات تھی کہ ایک مہم سے سفر کے دوران موت کے جبروں میں پھنس گیا تھا۔

تازہ ہوا اور روشن ستاروں نے اسے پرسکون کر دیا پھر سے ایک ہرن دکھائی دیا۔ رائن اسے دیکھ کر حیرت انگیز طور پر ایمان محسوس کرنے لگا۔

☆☆☆

نصف شب گزر چکی تھی۔ باب کے کمپیوٹر نے ایک نکتہ کا اشارہ دیا جو جائے حادثہ سے محض ایک میل دور تھا۔ میدان عمل میں ہر گز داؤد دونوں ٹیمیں منزل سے قریب ہونے لگیں۔ رات کے سگنل بچ چکے تھے۔

باب ہدف کے قریب تھا۔ اس نے دائرہ مختصر کر دیا جو پیدل پارک کی حد میں تھا۔ NELT کی ٹیم مقامی لوگوں کے ہمراہ جائے وقوعہ سے قریب تھی۔ میٹرز پر ELT کے سگنل واضح ہوتے جا رہے تھے۔

چار بج کر بارہ منٹ پر کارسواروں نے گاڑیاں چھوڑ دیں۔ وہ جان گئے تھے کہ وہ منزل کے بہت قریب ہیں۔ چار بج کر پچیس منٹ پر رائن کی سماعت سے انسانی قدموں کی آواز نکلائی۔ اس نے چلانے کی کوشش کی۔ لیکن زبان سوکھے چمڑے کی مانند ہو رہی تھی۔ حلق میں کانٹے اگے تھے۔ آواز کی نالی تک خشک تھی۔

تقریباً اسی وقت دو افراد پیڈ لیب کے ساتھ نمودار ہوئے رائن نے سنا کہ ان میں سے ایک ریڈیو پر اطلاع دے رہا تھا۔

”ہم کامیاب ہو گئے ہیں، وہ زندہ ہے۔“

☆☆☆

سیالو جنرل اسپتال میں رائن حیرت انگیز طور پر مناسب حالت میں تھا۔ حالانکہ اس کی کئی ہڈیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ اس کے بدن کا 25 فیصد خون ضائع ہو چکا تھا۔ وہ ڈی ہائیڈریشن کا شکار تھا۔ اس کے دیگر زخم بھی شدید نوعیت کے تھے۔ اسے سینٹ جوزف کے اسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ آرٹھوپیدک سرجن ڈاکٹر گائے فوگل نے کیس لیا۔

کھال اور ہڈیاں جہاں سے الگ ہوئی تھیں وہاں تین تین انچ کے سوراخ تھے۔ دائیں ٹانگ کی ایڑی زمین سے رگڑنے کے باعث کھس کر چوتھڑوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ انفیکشن بڑھ گیا تھا۔ اس پائلٹ نے ڈاکٹروں کو ششدر کر دیا تھا۔ وہ جانفشانی سے اس کا علاج کر رہے تھے۔

ڈاکٹر فوگل نے کہا: ”سیدھے الفاظ میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس نے فرشتہ اجل کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔“

”ہم آپریشن روم میں تین ہفتوں کے دوران آٹھ مرتبہ گئے تاہم ایک بار بھی اسے شاک نہیں پایا۔“

”فوگل کی جگہ کوئی اور ہوتا۔“ رائن نے اعتراف کیا۔ ”تو وہ یقیناً میری ٹانگ کاٹ کر پھینک دیتا۔“

☆☆☆

آج رائن خاص قسم کے جوتے استعمال کرتا ہے کیونکہ اس کی ایک ٹانگ دوسری سے چھوٹی ہو گئی ہے۔ تاہم اس نے اپنے پیشے سے دستبردار ہونے سے انکار کر دیا اور واپس اسٹنٹ سرکل میں چلا گیا۔

پہلی فرصت میں اس نے ایک جہاز کرائے پر لیا اور اکیلا پرواز پر نکل گیا۔

”میں خود کو بتانا چاہتا ہوں کہ کچھ بھی نہیں بدلا۔“





سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف ربیر

73:45

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب..... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو پیشکاتا ہے، جذیوں کو مہمیز دینا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سراپوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ سو برا جو میرے دل کا حصہ تھی وہ میرے ہاتھ سے بے ہوش ہو کر رہ گئی اور میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ میں نے کاروبار شروع کیا۔ ایک روز مری سے واپس آتے ہوئے ناو علی کا کام سے ہو گیا پھر یہ نگرانی ذاتی اتالیق بن گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شاہی جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسم جیسے ہمارے دوست۔ پھر تو ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئی تھیں۔ میں دوبارہ وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکرا گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریف کیس آ گیا۔ جو شہلا کے ہاتھ میں تھا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں جائیز بریف کیس حاصل کر لوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکالے۔ فتح خان نے شہلا کو بلایا تھا۔ وہ مجھے یہ غلام بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ سہارا حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شاہی کے ہیرے تلاش کر کے دینے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شاہی کو لے کر پانچل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے میل کر کے ایمین کو بھی بلوایا۔ فتح خان کے آدمیوں پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ برٹ شاہی نے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شاہی کو گولی مار دی۔ مرتے وقت برٹ شاہی بڑبڑایا "ناترہ... کہتے... تم تو اسے برٹ شاہی کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگایا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے۔ ایک مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں نکل آیا۔ وہاں ایمین بھی میرے تھے۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کر دیا اور ایمین کو خودکش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ عبداللہ کی کوشش میں اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں نے اسے کال کر کے بریف کیس مانگا۔ اس نے بریف کیس دینے کے لیے ویران جگہ مقرر کی۔ ہم وہاں پہنچے اور بریف کیس لے کر چلے تو مجھے شک ہوا اور میں نے بریف کیس ڈھلان پر رکھ دیا۔ وہ مجھ سے پھٹ گیا۔ ہم واپس ہو رہے تھے کہ وسم کا فون آیا کہ سویرا کو فتح خان نے حویلی پہنچا دیا ہے۔ میں شہلا کے گھر کی تلاش لینے پہنچا تو باہر سے ہم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو اٹھارین آرمی کے تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل گیا۔ جب تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زرو کی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر بیوی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آنی کہ ایک کوشی میں ہم دھماکا۔ کوشی ناو علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی اس لیے ناو علی کوشی کی جانب توجہ دی تھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابری نامی شخص سے ملنے جا رہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ ہم دھماکا کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابری کو پکڑ لیں۔ صابری تو پکڑ میں آ گیا مگر شہلا نکل گئی۔ صابری نے بتایا کہ شہلا کالی کوشی میں ملے گی۔ ہم وہاں پہنچے تو آخری سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ موت وغیرہ کو حویلی بھیج دیا جائے۔ یہاں کا پٹر ہار کیا۔ جیسے ہی چوہر بلند ہوا اس پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ یہ کام فاضلی کا تھا، ہم نے اسے اغوا کر لیا۔ فاضلی قید میں تھا اور وسم اسے ہیروئن کا انکیشن لگا کر عادی بنا رہا تھا۔ میں عبداللہ سے ملنے ہوا تھا کہ ڈی ایس پی اکرم چشتی نے مجھے گرفتار کیا اور بے پناہ تشدد کے بعد مرشد کے ہاں پہنچا دیا۔ میں نے مرشد کو یہ غلام بنا کر وہاں سے لٹکا دیا تھا کہ فاضلی نمودار ہوا اور اس نے میرے سر پر وار کر دیا۔ چوٹ کی وجہ سے میرا سر گھوم رہا تھا۔ مجھے جو عقل سے عاری بنانے کا انکیشن لگا تھا وہ بے اثر ثابت ہوا مگر میں نے عقل سے عاری بنے رہنے کی اداکاری شروع کر دی۔ فاضلی نے مجھے اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو قید کر لیا تاکہ وہ مجھ پر نظر رکھ سکے۔ میں وہاں سے فرار ہونے لگا تو لیڈی ڈاکٹر ماری گئی۔ میں نے فاضلی کو زخمی کر دیا مگر وہ ہوش میں آتے ہی مجھے جیب سے کینے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے خود کو بچا لیا اور جنگل میں بھاگتا چلا گیا۔ وہ میرا پیچھا کرتا ہوا آیا تھا کہ کچھ لوگوں نے اس پر فائرنگ کر دی تھی کسی طرح سڑک تک پہنچ گیا اور گاڑی لانے کو فون کر دیا۔ پھر ہم نے ساتھیوں کی مدد سے اکرم چشتی کو اغوا کر لیا۔ اسے ہم ایذا دے رہے تھے کہ باہر سے آئی "پولیس"۔ ہم نے خفیہ کیمروں سے پولیس کی پوزیشن دیکھی پھر اکرم چشتی کی آنکھوں اور کان میں کیپٹل ڈال کر چپکا دیا پھر وہاں سے نکل گئے۔ پولیس نے ناو اور چشتی کو اس گھر سے برآمد کر لیا۔ راستے میں عبداللہ کے آدمیوں نے پولیس پر حملہ کر کے ناو کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ ہم اس سے نکل کر ہاتھ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خاندان بدوش لڑکی کو بچا لیا تھی وہ لڑکی مہر تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرو کی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھاگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرو کی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔

اب آگے بڑھیں

گولی کے بجائے پورا برسٹ چلا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی گولی مجھے نہیں لگی۔ بلکہ سڑک پر موجود فتح خان کے آدمیوں کے چلانے کی آواز آئی۔ کم سے کم ایک موت کا شکار ہوا تھا کیونکہ اس کی چیخ میں موت کا کرب تھا۔ فتح خان کی طرح چونکا تھا۔ اس کی توجہ چند لمحے کے لیے نیچے کی طرف ہوئی تھی اور اس موقع سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہوتی اور میں اس حق بننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ چٹان پر ٹکے ہوئے پیچھے کی جانب دوٹی جھاڑی اور فتح خان ایک دھاڑ کے ساتھ پیچھے لڑھک گیا۔ اسے ہوشیار ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اب نیچے سے کم سے کم تین چار خود کار ہتھیاروں کی آواز آرہی تھی۔ شاید میجر آدم کے پیچھے آدمی دیر سے یہی مگر بالآخر پہنچ گئے تھے۔ فتح خان کو دوٹی مارنے کے ساتھ ہی میں نے چھلانگ لگائی اور چٹان کے اوپر سے ہوتا دوسری طرف جا گرا۔ پاؤں میں چوٹ آئی تھی لیکن جان بچ گئی تھی کیونکہ فتح خان کے کسی ساتھی نے میری طرف فائر کیا تھا۔ گولی چٹان پر لگی تھی۔ زمین پر گرنے کے بعد میں فوری اٹھا نہیں تھا بلکہ لیٹا رہا اور اسی لمحے میری نظر درخت کے اوپر لگی تھی۔ میں دنگ رہ گیا تھا۔

مگر یہ عالم حیرت میں رہ جانے کا موقع نہیں تھا کیونکہ نیچے فتح خان اپنے آدمیوں سے چلا چلا کر کچھ کہہ رہا تھا مگر فائرنگ کے شور میں اس کی آواز سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ابتدائی چیخوں کے بعد کسی کی چیخ سنائی نہیں دی تھی۔ اب یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا جس طرح میں چٹان پھلانگ کر آیا تھا اسی طرح فتح خان یا اس کا کوئی ساتھی چٹان پر چڑھ کر فائر کر سکتا تھا۔ میں زمین پر لیٹے لیٹے کھسکا اور ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ میرا کھسکا کام آ گیا کیونکہ اسی لمحے فتح خان کا ایک ساتھی چٹان پر نمودار ہوا اور اس نے میری جھلک دیکھتے ہی برسٹ مارا تھا مگر درخت کے تنے کی وجہ سے میں محفوظ رہا۔ ساری گولیاں اس میں پیوست ہوئی۔ میں اسے دوبارہ برسٹ مارنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ عقب سے فائر ہوا اور وہ چٹان پر ہی اوندھے منہ گر گیا۔ اس کے سر سے خون کے ساتھ مغز بہہ نکلا تھا۔ میں نے فائر کرنے والے کے نشانے کی داد دی اس نے صرف ایک گولی چلائی تھی اور فتح خان کے آدمی کے سر میں سوراخ کر دیا۔

میرا اندازہ تھا کہ فتح خان کے تین آدمی مارے جا چکے تھے یا کم سے کم تارہ ہو گئے تھے اور اب اس کے ساتھ لڑائی تھی۔ حملہ کرنے والوں کا کوئی جانی نقصان ہوا تھا تو

میں اس سے بے خبر تھا لیکن ان کی طرف سے فائرنگ کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ فتح خان اور اس کے ساتھیوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔ فائرنگ کا یہ سلسلہ تقریباً پانچ منٹ جاری رہا اور پھر فتح خان کے آدمی چلا چلا کر ہتھیار پھینکنے اور زندگی کی بھیک مانگنے لگے۔ گویا انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تھا اور اب مقابلہ کرنا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ کسی نے بلند آواز سے کہا۔ "اپنے ہتھیار پھینک کر اور ہاتھ اوپر کر کے سامنے آ جاؤ۔"

فتح خان کے آدمیوں نے حکم کی تعمیل کی۔ فتح خان انہیں روکنے یا سزا دینے کے لیے موجود نہیں تھا۔ وہ مارا گیا تھا؟ میں نے احتیاط سے درخت کے پیچھے سے جھانکا تھا کہ اسی آدمی نے مجھے پکارا۔ "شہباز ملک سامنے آئیں۔ ہم میجر کے آدمی ہیں۔"

میں درخت کی آڑ سے نکل کر نیچے آیا تو مجھے سڑک پر فتح خان کے ہی دونوں آدمی سروں پر ہاتھ رکھ گھٹنوں کے بل بیٹھے نظر آئے جن کو میں دیکھ چکا تھا۔ جب کہ دو خاک و خون میں لتھڑے پڑے تھے۔ آرمی کی وردیوں میں ایک درجن مسلح افراد دکھائی دے رہے تھے۔ ایک کیپٹن آگے آیا۔ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "شہباز ملک۔"

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "کیپٹن اقبال حسن۔" میں نے پک اپ کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں میرے چار ساتھی ہیں جنہیں ان لوگوں نے یہ غلام بنالیا تھا۔"

"وہ محفوظ ہیں ایک شاید معمولی زخمی ہے۔" میں آس پاس دیکھ رہا تھا لیکن فتح خان کہیں نہیں تھا۔ میں نے کیپٹن اقبال کو اس کے بارے میں خبردار کیا اور اس نے فوراً اپنے آدمیوں کو چاروں طرف پھیل کر فتح خان کو تلاش کرنے کا حکم دیا۔ میرا اطمینان تشویش میں بدل گیا تھا۔ فتح خان کے بیچ نکلنے کا مطلب تھا کہ خطرے کی تلوار مستقل میرے سر پر لٹکتی رہے۔ میں نے کیپٹن کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کتنا خطرناک اور شاطر آدمی ہے۔ اگر وہ اکیللا رہ گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ فرار کی کوشش کرے گا بلکہ وہ کہیں آس پاس رہ کر ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔ مگر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ فتح خان کو عام مجرم سمجھ رہا تھا جو قانون کا سامنا ہوتے ہی فرار کے راستے تلاش کرتے ہیں۔ فتح خان کے بجائے اسے بریف کیس سے زیادہ دلچسپی تھی۔ "میجر صاحب نے کسی بریف کیس کا ذکر کیا تھا؟ جو مجھے اپنی تحویل میں لینا ہے۔"

”وہ بریف کیس میں نے اس چٹان کے خلا میں چھپایا تھا۔“ میں نے اوپر موجود چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ ”لیکن جب فتح خان کو یہاں لے کر آیا تو بریف کیس خلا میں نہیں تھا۔“

وہ چونکا۔ ”پھر کہاں گیا؟“

”فتح خان اسی بات پر مجھے شوٹ کرنے والا تھا لیکن آپ لوگوں نے بروقت مداخلت کی۔“

”ہمیں پہنچنے میں ذرا دیر ہوئی۔“ اس نے جواب دیا اور ریڈیو پر اپنے آدمیوں سے رپورٹ لینے لگا۔ وہ بڑی جھپوں میں آئے تھے اور اب یہ جھپیں یہاں آگئی تھیں۔ وہاں چار افراد تھے جو لاشوں کو دیکھ رہے تھے اور ایک آدمی فتح خان کے زندہ ساتھیوں کے سر پر سوار تھا۔ میں پک اپ کی طرف بڑھا جس میں میرے ساتھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک کے پاؤں میں گولی چھید کرتی گزر گئی تھی اور اس کے ساتھی اس کی مرہم پٹی کر رہے تھے۔ سب سے پہلے مشین گن بردار مارا گیا تھا ورنہ فتح خان نے اسے حکم دے رکھا تھا کہ کسی گز بڑی صورت میں ان چاروں کو چھلنی کر دے۔ میں نے خیریت دریافت کرنے کے بعد آہستہ سے انہیں کہا۔ ”تم خود کو میرا عام ملازم ظاہر کرو گے۔ اپنے بارے میں زیادہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ بايوڈیٹا درست بتانا۔“

”آپ بے فکر رہیں شہباز صاحب۔“ ان میں سے ایک اعتماد سے بولا۔ ”ہم جانتے ہیں ان کو کیا بتانا ہے۔“ میں پک اپ سے اتر کر کیپٹن اقبال کے پاس آیا وہ جیپ کے ریڈیو پر کسی سے بات کرتے ہوئے اسے رپورٹ دے رہا تھا یہ خاص زبان تھی جو ہر آدمی نہیں سمجھ سکتا ہے لیکن میرے دو بھائی آرمی میں تھے اور میں کسی حد تک یہ کوڈ ورڈز سمجھتا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ریڈیو کا مائک میری طرف بڑھا دیا۔ ”میجر صاحب۔“

دوسری طرف میجر آدم تھا۔ ”شہباز تم ٹھیک ہو؟“ ”میں ٹھیک ہوں۔ لیکن فتح خان ہاتھ سے نکل گیا۔“ ”اسے جہنم میں جھونکو، بریف کیس کا بتاؤ۔“ ”وہ میرے پاس ہے لیکن جب تک مجھے اعتماد نہیں ہوگا کہ فتح خان آس پاس نہیں ہے میں اسے نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔“ ”تم اس سے اتنا ڈر رہے ہو؟“ میجر آدم نے حیرت سے کہا۔

”کیونکہ اسے میں جانتا ہوں۔“ ”کہا۔“ اپنے آدمیوں سے کہو کہ میری بات نظر انداز کریں۔ وہ ایسا شخص ہے جسے موقع مل جائے تو وہ ایک میں بازی پلٹ دیتا ہے۔“

”اوکے میں کیپٹن سے کہتا ہوں وہ تمہارے ان کی تعمیل کرے گا لیکن وہ بریف کیس مجھے بھی چاہیے۔ بات اوپر تک جا چکی ہے تم سمجھ رہے ہو؟“ ”ہاں میں سمجھ رہا ہوں، تم اگر مزید آدمی روانہ کر دو تو اچھا ہے میرا خیال ہے یہ ایک درجن افراد نا کافی ہیں۔“ ”فکر مت کرو ایک دستہ اور روانہ ہو چکا ہے، دیر میں تم تک پہنچ جائے گا۔“ میجر آدم نے کہا۔ ”کیپٹن کو دو۔“

میں نے ریسیور کیپٹن کی طرف بڑھا دیا۔ وہ میری ہدایات سننے لگا۔ میجر سے بات کرنے کے بعد میں براہ راست ہو گیا تھا۔ میں نے فتح خان کے آدمیوں سے حاصل کی اسلحہ چیک کیا اور اس میں سے پہلے اپنے دونوں ہسٹول ان کا اضافی ایمونیشن نکال لیا۔ کیپٹن میرے پاس آیا تو نے اس سے کہا۔ ”یہ اسلحہ میرے ساتھیوں کو دے دو۔“

تک اضافی دستہ نہیں آ جاتا ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔“ کیپٹن اقبال نے سر ہلایا اور اپنے آدمیوں کو ہدایت دینے لگا۔ اسلحہ میرے ساتھیوں کو دے دیا گیا۔ میں نے انہیں آس پاس لگا دیا۔ میرے ذہن میں یہ خطرہ تھا کہ فتح خان کے پاس مزید آدمی نہ ہوں اور وہ ان کی مدد سے دوبارہ ہم پر قابو پانے کی کوشش کرے گا۔ بریف کیس کے لیے اتنا اہم تھا کہ اس کے حصول کے لیے وہ بے دریغ اپنے درجنوں آدمی کٹوا سکتا تھا۔ یہاں پڑی تین لاشیں اس کا ثبوت تھیں اور اسے اپنے بیچ جانے والے آدمیوں کی پروا بھی نہیں تھی۔ اس کی بلا سے وہ جہنم میں جاتے۔ آدمی ہماری پروا کہاں کرتا۔ میں اوپر آ گیا تھا اسی جگہ کے پاس جس کی جڑ میں بریف کیس رکھا تھا۔ چٹان کے خان کے آدمی کی لاش ہٹائی گئی تھی۔ مگر اس کا خون چٹان پر پھیلا ہوا تھا۔ مجھے افسوس ہوا تھا کہ دولت کی انسان کتنی بے دردی سے دوسرے کی زندگی داؤ پر لگا ہے۔ میں چٹان سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔

کیپٹن کے آدمی فتح خان کی تلاش میں تھے واپس آ گئے تھے اور اب اس جگہ کے گرد پھیل کر چلنے کی طرف نظر رکھے ہوئے تھے۔ کیپٹن شاید میری احتیاطی تدابیر

مطلبن نہیں تھا لیکن میجر سے احکام حاصل کر کے میری ہدایات پر پوری طرح عمل کر رہا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو جو کتنا کر دیا تھا۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی اور سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ تقریباً تین بجے ایک ٹرک نمودار ہوا اور یہ ملٹری ٹرک تھا۔ وہ آ کر ہمارے پاس رکا اور اس سے دو درجن مسلح سپاہی اتر کر چاروں طرف پھیل گئے اور مجھے خوشگوار حیرت ہوئی جب بڑے کے کپارٹ سے میجر آدم بھی اتر اٹھا۔ وہ گرم جوشی سے میرے سینے سے لگا۔ ”میری خواہش تھی کہ تم سے پھر ملاقات ہو۔“ ”کیونکہ قدرت نے یہ خواہش کس طرح پوری کی۔“ ”میں بھی تم سے پھر ملنا چاہتا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر چہ امید نہیں تھی کہ ملاقات ہوگی۔“ ”بریف کیس کہاں ہے؟“

میں نے اس کے آدمیوں کا معائنہ کیا اور ایک پھریرے جسم والے سپاہی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے ساتھ لے کر میرے ساتھ چلو۔“

ہم اسی چٹان کے پاس آئے اور میں نے سپاہی سے کہا۔ ”جوان اس درخت پر چڑھ جاؤ اور وہ دیکھ رہے ہو شاخوں میں چاندی جیسی چیز جھلک رہی ہے، وہ اتار لاؤ۔“ مستعد سپاہی تیزی سے شاخوں کو پکڑ کر اوپر چڑھ گیا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے وہ شاخوں تک پہنچ گیا اور اس نے وہاں رکھا بریف کیس اٹھا کر اپنی پشت پر ٹانگ لیا۔ اس کا وہ بیگ غائب تھا جس میں اسے حفاظت کے نقطہ نظر سے رکھا تھا اور اسی وجہ سے یہ نظر بھی آیا تھا جب فتح خان کے آدمیوں سے بچتے ہوئے چٹان کے دوسری طرف جھلانگ لگی تھی تب زمین پر پڑے ہوئے میری نظر شاخوں پر پڑی تھی اور وہاں مجھے بریف کیس کی جھلک دکھائی دی گئی۔ اس وقت بھی میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ چٹان کے خلا سے یہ درخت تک کیسے پہنچا۔ میجر آدم نے تعریفی انداز میں کہا۔ ”اچھی جگہ چھپایا تم نے اسے۔“

”میں نے تو اسے یہاں چھپایا تھا۔“ میں نے چٹان کے خلا کی طرف اشارہ کیا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ یہ وہاں کیسے گیا۔“ ”سپاہی نیچے آ گیا تھا اس نے کہا۔“ ”میں بتاؤں سر یہ وہاں کیسے گیا؟“

”تم جان گئے ہو؟“ میں نے دلچسپی سے کہا۔ ”جی صاحب ادھر بندر ہوتے ہیں درخت پر جگہ جگہ ان کے بال ہیں، ابھی وہ یہاں نہیں ہیں ورنہ بہت شور

مچاتے۔ کوئی بندر اٹھا کر لے گیا ہوگا اور اس نے شاخوں میں رکھ دیا۔“

”اس لحاظ سے بندر کا شکریہ ادا کرنا چاہیے ورنہ فتح خان بریف کیس حاصل کر لیتا اور پھر اسے لے کر غائب ہو جاتا۔“ میجر آدم خان پوری تیاری سے آیا تھا۔ ہم وہاں سے روانہ ہوئے لیکن کچھ دور گئے ہوں گے کہ قافلہ ایک نسجاً کھلی جگہ رک گیا۔ میں میجر کے ساتھ ایک جیپ میں تھا۔ میرے ساتھی اسی پک اپ میں سپاہیوں کے ہمراہ آ رہے تھے۔ میں نے میجر کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔ ”یہاں سے میں الگ جاؤں گا۔“

ہم نیچے اتر آئے۔ چند منٹ بعد آسمان پر ایک پرندہ نمودار ہوا اور بتدریج نیچے آنے لگا۔ ہیلی کاپٹر سے پہلے اس کا شور آیا۔ وہ یہاں لینڈ نہیں کر سکتا تھا لیکن سڑک سے چند فٹ اوپر ہوا میں معلق ہو گیا۔ میجر نے مجھ سے ہاتھ ملایا ”پھر ملیں گے اگر خدا نے چاہا تو۔“ ”دوست ہمارا کیا ہوگا؟“

”میں نے کیپٹن اقبال سے کہہ دیا ہے وہ تمہیں مری تک چھوڑ دے گا۔ یہ سب ان آفیشلی ہوا ہے۔“ میں نے سکون کا سانس لیا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں دوست ورنہ میرے سامنے آنے سے خاصی پیچیدگیاں ہو سکتی ہیں میرے لیے بھی اور حکومت کے لیے بھی۔“ ”اسی بنا پر تمہیں اس معاملے سے الگ رکھنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔“ وہ میرے گلے لگ کر بولا۔ ”اللہ حافظ برادر۔“

میجر آدم ایک بار پھر ہاتھ ملا کر ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھ گیا۔ اندر موجود افراد نے اس کی مدد کی اور اسے اندر بھیج لیا فوراً ہی ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہوا اور بلند ہوتا چلا گیا۔ ذرا دیر میں وہ غائب ہو چکا تھا۔ میرے سر سے ایک بوجھ اتر گیا تھا۔ کئی مہینے پہلے یہ بلا وجہ میرے سر پر گویا تھا بہر حال اب جلد چین کی امانت اسے مل جائے گی اور اس کے فوجی راز محفوظ رہیں گے، ہیلی کاپٹر کے جاتے ہی ہمارا قافلہ دوبارہ چل پڑا تھا۔ ٹرک ایک جگہ ہم سے الگ ہو گیا اور ہمیں سے دوسری جیپ بھی واپس چلی گئی۔ اس کے ساتھ پک اپ بھی تھی جس میں فتح خان کے زندہ اور مردہ آدمی تھے۔ میرے چاروں ساتھی جیپ میں آ گئے۔ اب کیپٹن اقبال کے ساتھ صرف ایک ڈرائیور تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”ہم آپ کو مری تک پہنچا دیں گے۔“ ”یہ تمہاری مہربانی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”نہیں جناب۔“ وہ احترام سے بولا۔ ”یہ ہمارا فرض ہے۔“

شام کے قریب ہم نے ایک جگہ رک کر دوپہر کا کھانا کھایا جو ٹھنڈا اور بد مزہ ہو چکا تھا لیکن پیٹ بھرنا تھا۔ مری اب کچھ دور تھا۔ سورج غروب ہوتے ہی ہم مری کے قریب پہنچ گئے۔ لینڈ سلائڈنگ صاف ہو چکی تھی اور سڑک پر ٹریفک چل رہا تھا۔ یہاں کینپن اقبال ہاتھ ملا کر رخصت ہوا۔ میں ایک بار پھر میجر آدم کا احسان مند تھا کہ اس نے مجھے فور دیا۔ ورنہ اصولاً تو انہیں بریف کیس کے ساتھ مجھے بھی تحویل میں لے لینا چاہیے تھا اور جب تک وہ بریف کیس کی طرف سے اطمینان حاصل نہ کر لیتے مجھے چھوڑنے کا جواز نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نے مجھے جانے دیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے ویم کو کال کی۔ وہ میری آواز سننے ہی بے تاب سے بولا۔ ”شہباز صاحب آپ ٹھیک ہیں نا؟“

”ہاں یار کام ہو گیا ہے، ہمارے ساتھی بھی بچ گئے ہیں اور بریف کیس بھی محفوظ ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”براہیہ ہوا کہ میرا موبائل فتح خان کے ہاتھ لگ گیا ہے اس لیے سب سے کھورالٹے کے نمبرز فوری طور پر ترک کر دیں۔“

”میں سب کو خبردار کرتا ہوں۔“

”ہم آرہے ہیں۔“ میں نے یہ بتانے سے گریز کیا کہ ہم کہاں ہیں۔ فتح خان ڈیوڈ شا کا چیلراہا ہے اور اس کے پاس وہ سارے گراور آلات تھے جو ڈیوڈ شانے اسے مہیا کیے تھے جن کی مدد سے اس نے کئی بار میرا سراغ لگایا تھا بریف کیس ہاتھ سے نکل جانے کے بعد وہ زخم خوردہ سانپ بن گیا ہوگا۔ مری آنے والی کئی گاڑیاں اب خالی واپس چارہی تھیں۔ ایک ہائی روف ہمیں مل گئی۔ ڈرائیور نے موقع سے فائدہ اٹھا کر مزہ مانگا کرایہ مانگا تھا۔ جب میں مان گیا تو اسے حیرت ہوئی تھی میرا خیال تھا کہ وہ نصف کرائے پر بھی مان جاتا لیکن میں نے بارگنگ نہیں کی اور وہ سارے راستے مجھ پر واری قربان ہوتا رہا۔ مگر میں نے پھر بھی احتیاطاً اسے فیض آباد کے شروع میں روک دیا اور جب وہ رخصت ہو گیا تو ہم دو ٹیکسیوں میں کوٹھی کی طرف روانہ ہوئے جہاں سب بے تابی سے ہمارے منتظر تھے۔ ٹیکسیاں رکتے دیکھ کر اندر کھلبلی مچی تھی کہ دشمن نے حملہ تو نہیں کر دیا ہے اور جب ایک ٹیکسی میں میرا چہرہ دکھائی دیا تو دوبارہ کھلبلی مچی۔ گیٹ کھل گیا لیکن ٹیکسیاں اندر لانے کے بجائے ہم نے

انہیں باہر سے ہی رخصت کر دیا۔ میرا ارادہ تو انہیں گلی کوٹے سے رخصت کرنے کا تھا لیکن دوسری ٹیکسی آگئی گئی اور اس میں سوار تینوں ساتھی اسے کوٹھی تک گئے۔ اس لیے مجبوراً مجھے بھی ان کے پیچھے جانا پڑا تھا۔ باہر ہی مل گیا۔ ”شکر ہے آپ محفوظ ہیں ورنہ میں پریشان تھا۔“

”یار ایسا ہوتا رہتا ہے، اب تو عادت ہو چاہیے۔“ میں ہنسا۔ ”پھنس گیا تھا لیکن اللہ کی مدد شامل رہی اور بازی میرے حق میں رہی۔ فتح خان پھرنا کام رہا۔ عبد اللہ تنہا رہا تھا۔ وہ میری آمد کی خبر پا کر بلکتے کپڑے پہن کر چلا آیا تھا۔ اس کے بالوں سے ابھی تک فک رہا تھا۔ وہ بھی یوں گلے ملا جیسے میں حج یا جہاد واپس آیا ہوں۔ ہم اندر آئے۔ میں نے انہیں مختصر اور سناٹی۔ کیونکہ میرا تھکن سے برا حال تھا اور میں غسل فرما کر کچھ دیر سونا چاہتا تھا۔ مگر ویم نے تجویز پیش کی۔ ”رات کھانے میں کچھ دیر ہے آپ کھانا کھا کر سوئیں ورنہ رات کو بھوک سے آنکھ کھل جائے گی۔“

مجبوراً اس کی بات ماننا پڑی اور اس بار انہوں نے سوالات کی مدد سے تفصیلات حاصل کیں۔ بریف کیس انہیں جنس کی تحویل میں جانے کا سن کر انہوں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ایک قصد تو ختم ہوا تھا۔ میں نے واش روم جانے سے پہلے ناور کا پوچھا۔ عبد اللہ نے کہا۔ ”وہ کہیں ہے کیونکہ الحال کوئی دوسری جگہ نہیں ہے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں امید ہے ایک دو دن میں کوئی دوسرا ٹھکانا بھی مل جائے گا۔“

”میں بھی دیکھ رہا ہوں یہ ضروری ہو گیا ہے۔“ وہم نے کہا۔

”تب تک غیر ضروری افراد کو چھٹی پر بھیج دو۔“ میں نے مشورہ دیا اور اپنے کمرے میں آیا۔ بیگ سے دو لباس نکال کر ہاتھ روم میں گھس گیا۔ بھاگ دوڑنے پر خراب کر دیا تھا۔ موسم معتدل تھا اس لیے عام پانی سے نہانے میں مزہ آیا تھا۔ شیو کر کے میں نے قلمیں بھی پھر دیں۔ سر کے بال چھوٹے تھے۔ لباس بدل کر سکون ملا۔ کھانے کی میز پر اکرم چشتی کے بارے میں نئی معلومات ملیں۔ ڈاکٹر زاس کی بینائی اور سماعت کی طرف سے مایوسی ظاہر کر رہے تھے۔ شاید اس کا علاج ہو جاتا لیکن دشمن خوری کے باوجود اس کی اتنی اوقات نہیں تھی کہ کسی تریاتی ملک جا کر علاج کے اخراجات برداشت کر سکتا۔ اس نے

آقاؤں کو اس سے اب کوئی دل چسپی نہیں ہوگی کیونکہ ایسے پولیس افسران کی کمی نہیں ہوگی جو اکرم چشتی کی جگہ لینے کے لیے بے تاب ہوں گے۔ کام کی اطلاع یہ بھی کہ عبد اللہ نے وہ انجکشن منگوا لیے تھے جو آدمی کو پانچ سال کا بچہ بنا دیتے ہیں۔ اس نے ایک ڈرگ ڈیلر سے یہ انجکشن منگوائے تھے اور اس نے ان کی ضمانت دی تھی۔ یہ خاصے مہنگے پڑے تھے لیکن عبد اللہ نے ان کی قیمت نہیں بتائی تھی۔ اس نے بتایا۔ ”میں کل صبح راجا صاحب کی کوٹھی کا سودا کرنے ہاؤں گا اسی دوران میں کوئی دوسری جگہ بھی دیکھوں گا۔“

اس کوٹھی میں گنجائش کم تھی اور ویم کے سارے آدمی یہاں مشکل سے ساتے اس لیے وہ ان کی چھائی کرنے چلا گیا۔ میں نے بیڈ روم کا رخ کیا اور بستر پر لیٹنے ہی آنکھ لگ گئی تھی۔ مجھے ندیم سے بات کرنے کا خیال آیا کہ مرشد کے دکھانے اس سے رابطہ کیا یا نہیں لیکن پھر یہ کام میں نے صبح تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ ایک تھکا دینے والے سفر اور بڑی کامیابی کے بعد میں کچھ دیر اس دنیا سے بے خبر رہ کر گزارنا چاہتا تھا۔ میری خواہش پوری ہوئی اور میں صبح تک بے خواب نیند سوتا رہا۔ سورج کی کرنوں کی چکا چوند نے مجھے بیدار کیا۔ کھڑکی کا رخ عین مشرق کی طرف تھا اور پردہ ہٹا ہوا تھا اس لیے سورج نکلا تو دھوپ براہ راست اندر آئی تھی۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کھولی اور صبح کی تازہ ہوا میں چند گہرے سانس لیے۔ موسم گرم ہو چلا تھا لیکن صبح کی ہوا میں خوشگوار خنکی تھی۔ میری توجہ سرہانے کی طرف مچی جہاں ایک موبائل فون رکھا ہوا تھا۔ میں نے اسے چیک کیا اس میں سب کے نمبرز ناموں سے فیلڈ تھے اور اس موبائل کا نمبر بھی تھا۔ میری نیند کے دوران کوئی اسے یہاں رکھ گیا تھا۔ میں نے سویرا کا نمبر ملا یا۔ اس کا نمبر برائے نام تھا اور فتح خان پہلے ہی اس نمبر سے واقف تھا۔ اس لیے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے کال ریسیو کی اور آہستہ سے بولی۔ ”ہیلو۔“

”السلام علیکم۔“ میں نے کہا تو اس کی آواز کھل اٹھی۔ ”کیسے ہیں آپ؟“ اس نے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ ”مجھے لگ رہا تھا آپ کہیں گئے ہوئے ہیں۔“

”ہاں میں گیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”کل فتح خان کا مجھے فون آیا تھا وہ بہت غصے میں تھا اور آپ کو دہکیاں دے رہا تھا۔“

”تم نے اس کی بکواس کیوں نہ کر دیتیں۔“

”میں نے یہی کیا، مشکل سے پندرہ سیکنڈ کی کال ہو گی اس دوران میں وہ بولتا ہی رہا۔ میں نے تو بعد میں موبائل بھی آف کر دیا تھا۔“

”تم نے ٹھیک کیا یہ بتاؤ کوئی نئی سم ہے تمہارے پاس؟“

”ہاں اب میرے پاس تین دوسری سم ہیں۔“

”تم نے نمبر دیکھ لیا ہے اس پر کال کرو اور اب یہ سم پھینک دو۔“

میں نے کال کاٹ دی چند منٹ بعد ایک اجنبی نمبر سے کال آئی۔ یہ سویرا کا دوسرا نمبر تھا میں نے کال ریسیو کی۔ ”تم کیسی ہو حویلی کے حالات کیسے ہیں؟“

”میں ٹھیک ہوں اور یہاں بھی سب ٹھیک ہیں۔“ اس نے چپک کر کہا اور پھر ہنسی۔ ”آپ نے کیا پیٹو بھیجے ہیں۔ انہوں نے تو گاؤں والوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔“

”مانی اور بیٹو.... بچے ہیں اور کام کے بچے ہیں۔ بیٹو کے بارے میں تو تم جانتی ہو۔ یہ مانی نیا اضافہ ہے۔“

”مانی نے پوری حویلی میں کیرے لگا دیئے ہیں۔ اب بابا اور گارڈز لپٹی جگہ بیٹھے بیٹھے ہر طرف نظر رکھ سکتے ہیں۔“ سویرا بتا رہی تھی۔ ”بابا کے باہر جاتے ہی یہ ہمارے پاس آ جاتے ہیں۔ جب بابا ہوں تو شرافت سے مردانے میں رہتے ہیں۔“

”سفیر، مونا اور سعد یہ کیسے ہیں؟“

”تینوں ٹھیک ہیں۔ سفیر بھائی کی وجہ سے مونا بہت خوش ہے البتہ سعد یہ اداس ہے۔“

”ہاں یہاں بھی ایک بندہ اداس ہے۔“ میں ہنسا۔

”آپ نہیں ہیں؟“ اس نے شوخی سے پوچھا۔

”میں بھی ہوں لیکن اس طرح نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”شاز یہ کا مسئلہ حل ہوایا نہیں؟“

سویرا جھینپ گئی پھر اس نے اٹک اٹک کر بتایا۔ ”ماں جی نے اسے کسی لیڈی ڈاکٹر کو دکھایا ہے۔ وہ ہمدرد عورت ہے غلط کام نہیں کرتی ہے لیکن جب اسے شاز یہ کے ساتھ ہونے والے ظلم کا پتا چلا تو وہ تیار ہو گئی۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”یعنی مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کچھ دن میں اسے یہاں واپس بلا لیں۔ اس کا باپ آئے گا تو اس کے حوالے کر دیں گے۔“

”وہ پھر اسے کسی جہنم میں جھونک دے گا۔“ سویرا نے دکھ سے کہا۔ ”میں اس کی کہانی سن کر کانپ گئی تھی۔ اس معصوم نے ذرا سی عمر میں کیا دیکھا اور سہا ہے۔ یہاں خوش ہے۔“

”مگر اس کا وارث اس کا باپ ہے۔“ میں نے سویرا کو یاد دلایا۔

”آپ کب آرہے ہیں۔“ اس نے موضوع بدل دیا۔
”میں معاملات سمیٹنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ جلد مجھ پر قائم مقدمات ختم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد میں کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہوں گا۔“

”اللہ وہ وقت جلد لائے۔“ سویرا بولی۔ اس سے کچھ دیر بات کی۔ پھر حویلی کے نمبر پر کال کر کے ماں جی اور دوسرے لوگوں سے بات کی۔ بابا بھی موجود تھے اور خوش تھے کیونکہ بہت دنوں بعد حویلی میں رونق آئی تھی۔ آپا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن شمی نے بہت دیر میرا سر کھایا تھا۔ مجبوراً اسے عتیق کے حوالے سے چھیڑا تو وہ فون چھوڑ کر غائب ہو گئی۔ اپنے پیاروں سے بات کر کے انسان کیسے ہلکا ہو جاتا ہے خاص طور سے جب وہ بہت دنوں سے ان سے دور ہو۔ یہ بات وہی جانتے ہیں جو اس دوری سے گزر رہے ہوں۔ کال بند کر کے میں نے ندیم کا نمبر ملایا۔ اس کے پاس میرا یہ نمبر نہیں تھا اس لیے اس نے بیزاری سے کہا۔

”کون ہے بھائی؟“
”تیرا ایک بھوکا پیاسا موکل.... جسے پھانسی سے پہلے ناشتا بھی نہیں ملے گا۔“

”تو....“ ندیم نے گالی دی۔ ”ابے تو مل جائے تو میں خود تجھے لٹکا دوں میری زندگی کے دشمن۔“
”لگتا ہے مرشد کے دکھانے رابطہ کر لیا ہے۔“ میں ہنسا۔
”ایک وکیل ہے اور بڑا اصرار وکیل ہے۔ یوں سمجھ لے کہ میرا بھی باپ ہے۔“

”تب تو تو ہونا وہ۔“ میں نے کہا۔
”کیا؟“ ندیم نے بے خیالی میں کہا اور جب بات سمجھ آئی تو اس نے مزید گالیاں دیں۔
”بس کر میرے گفتار کے غازی.... اس سے زیادہ بکو اس کی تو وہاں آکر شہید کر دوں گا۔ بہت پہلے کر چکا ہوتا لیکن تیرے بیوی بچوں کا خیال آتا ہے۔“

”بکو اس مت کرو وہ صبح شام میرے سر پر سوار رہتا ہے۔ اپنا سارا کام چھوڑ کر بیٹھا ہوں۔ دو موکل بھاگ گئے ہیں جن کے کیس کی پیشیاں رہ گئیں۔ آج دو اور بھاگ جائیں گے کیونکہ میں آج بھی عدالت نہیں جاسکوں گا۔“
”چل یار دل جمعی سے کام کر.... ایک بار میرے کیسوں سے چھٹکارا مل جائے تو دل بھر کر پریکٹس کرنا اور

دوسروں کو لوٹنا۔“ میں نے مشورہ دیا۔ ندیم نے کچھ دیر تک بک کرنے کے بعد بتایا کہ مرشد کا وکیل بھی اس سے کچھ کم تھا وہ معاملات کو توڑ مروڑ کر اپنے حق میں لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ فی الحال اس کی کوشش تھی کہ تصفیے میں مرشد سے زیادہ وقت لگے۔ میں نے کہا۔ ”رک جا ابھی میں مرشد سے بات کر لوں پھر اس سے ملاقات کرنا۔“

”دیکھ کر اگر تیرے پاس مرشد کی کوئی دھتھی رگ ہے تو اسے ذرا زور سے دبا اور اس حرامی کو پٹا ڈلوا۔ اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو اب تک کیس ری فائل کر چکا ہوتا۔“
”تو فکر نہ کر میں ابھی بات کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔
میں نیچے آیا تو ناشتا تیار ہو رہا تھا۔ وسیم اور عبداللہ ڈائننگ ٹیبل پر جادوئے خیال کر رہے تھے۔ وسیم نے اخبار میں کسی جگہ کا اشتہار دیکھا تھا۔ یہ راول چوک کے قریب کوئی جگہ تھی۔ عبداللہ کو جلدی تھی اس لیے وہ ناشتا تقریباً کر چکا تھا۔ اس نے وسیم سے کہا۔ ”میں فارغ ہو کر اس جگہ کو دیکھتا آؤں گا۔“

”مگر ہوشیار رہنا پھر کوئی افغان جیسا چکر باز نہ لگے۔“
جائے۔ میں نے ناشتے کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔
”آپ کی حویلی والوں سے بات ہوئی ہے۔“ وسیم نے کہا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا.... اوہ اچھا تم بھی کسی کو کال کر رہے ہو گے۔“
”ہاں میں سعدیہ سے بات کر رہا تھا۔“
”میں تو کہہ رہا ہوں تم بھی حویلی کا چکر لگاؤ۔ ابھی کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے جسے دیکھنا ضروری ہو۔“

وسیم نے سر ہلایا۔ ”میں بھی سوچ رہا ہوں لیکن کہیں انکل یہ نہ سوچیں کہ سب نے حویلی کا راستہ دیکھ لیا ہے۔“
”بابا بہت مہمان نواز ہیں اور تم لوگ مہمان نہیں ہو۔“
میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”بابا بہت خوش ہوں گے۔ تو اب بھی خوش ہیں کہ حویلی میں کتنی رونق ہے۔“

”ٹھیک ہے میں جاتا ہوں۔ میں نے اپنے تقریباً تمام آدمیوں کو چھٹی دے دی ہے۔ بس تین آدمی ہیں۔“
”یہ اچھا ہے، جب تک کوئی نیا ٹھکانہ ملے بھیڑ جتنی کم ہو اچھا ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”مجھے مرشد سے بات کرنی ہے اس کا وکیل معاملات کو الجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔“
”یہ کوشش وہ مرشد کی ہدایت پر کر رہا ہوگا۔“ وسیم نے یقین سے کہا۔ ”ورنہ اس کی اپنی اتنی جرأت کہاں کے خود سے

ایسا کوئی کام کر سکے۔“

”جب ہی مرشد سے بات کرنی ہے۔“ میں نے کہا۔ ناشتا کر کے چائے لے کر میں اوپر آیا وسیم میرے ساتھ ہی تھا۔ لیپ ٹاپ آن کر کے کال والی سائیٹ کھولی اور مانی کے اکاؤنٹ سے مرشد ہاؤس کا نمبر ملایا۔ اس کے منتظر سکرپٹری نے کال ریسیو کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس معمولی سے کام کے لیے سکرپٹری کا انتخاب کیوں کیا گیا تھا۔ اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

”کون بول رہا ہے؟“
”مرشد کا والد الہ دانی جہنم سے بات کر رہا ہوں۔ اسے یہاں بلانا ہے۔“

”شہباز صاحب۔“ اس نے بدستور محتاط انداز میں کہا۔
”مرشد کہاں ہے؟“
”ایک منٹ میں چیک کرتا ہوں۔“ اس نے کہا اور کال ہولڈ پر کر دی۔ کچھ دیر بعد مرشد کی آواز آئی۔

”شہباز....“
”نام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو میں کون ہوں۔“
”میں نے تمہاری بات مان لی ہے اور اپنے وکیل کو تمہارے وکیل کے پاس بھیج دیا ہے۔“

”ہاں وہ اپنا کام اچھی طرح کر رہا ہے۔“ میں نے طنز کیا۔ ”کیس ری فائل کرنے میں تاخیر کر رہا ہے۔“
”وہ اصل میں یہ قانونی مسائل ہیں اور میں ان سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔“ مرشد نے انجان بننے کی کوشش کی۔
”حالانکہ قانون کو تم جیسے لوگوں نے موم کی ناک بنا رکھا ہے اپنی مرضی سے اسے توڑتے مروڑتے رہتے ہو۔ مجھے بے وقوف مت بناؤ میں پہلے ہی خاصا بے وقوف ہوں۔“

مرشد نے دفاعی انداز میں کہا۔ ”اب تم کیا چاہتے ہو؟“
”مرشد کیس مجھ پر ہیں تم پر نہیں اور صلح تم چاہتے ہو میں نہیں۔ اس لیے ابھی اور اسی وقت اپنے وکیل سے کہو کہ وہ صرف میرے وکیل کی معاونت کرے اس کے کام میں مداخلت یا فیصلے نہ کرے۔“

”وہ ایسا نہیں کر رہا ہے۔“
”میری ابھی اپنے وکیل سے بات ہوئی ہے۔ وہ تمہارے وکیل کی حرکتوں سے بالکل خوش نہیں ہے۔ ظاہر ہے وہ تمہاری ہدایات کے برعکس تو کچھ نہیں کر رہا ہوگا اس لیے بہتر ہے تم خود اسے پٹا ڈال دو۔ دوسری صورت میں

میرے پاس کچھ آپشن اور بھی ہیں تم سمجھ رہے ہو نا؟“
”تم نادور کا حوالہ دے رہے ہو؟“

”میں نہیں جانتا کہ تم نادور کی بات کیوں کر رہے ہو لیکن تم میری بات سمجھ رہے ہو۔ مرشد تمہارے پاس دو دن ہیں۔ تم اپنے وکیل سے کہو کہ وہ ندیم کے کام میں کوئی مداخلت نہ کرے اور برسوں تک کیس لازمی ری فائل کر دیئے جائیں۔ میں تب تم سے فیصلہ کن بات کروں گا۔ امید ہے اگر معاملات درست سمت میں چلتے رہے تو ہم دونوں کے مسائل حل ہو جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے میں اپنے وکیل سے کہتا ہوں کہ وہ تمہارے وکیل کی ہدایت کے مطابق کام کرے۔“
”اور اس کے کسی کام میں ٹانگ بھی نہ اڑائے۔“

”ٹھیک ہے۔“ مرشد نے بادل نا خواستہ کہا۔ غالباً اس نے کبھی خود کو اتنا مجبور محسوس نہیں کیا ہوگا۔
میں نے اسے چھیڑا۔ ”شنا ہے تمہارا ایک خاص آدمی زخمی ہے اب اس کی حالت کیسی ہے؟“

”فاضلی ٹھیک ہے۔“ مرشد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
”ایک دو دن میں وہ چلنے پھرنے لگے گا۔“
”نہ.... نہ اس سے کبواتی جلدی کیا ہے اس بار اسے ہمیشہ کے لیے لٹانا ہے۔“

”شہباز اب اسے بھول جاؤ وہ کبھی تمہارے راستے میں نہیں آئے گا۔“
”مرشد وہ کتنے کی دم ہے جسے سو برس بھی تلکی میں رکھو تو وہ ٹیڑھی رہے گی اور فاضلی تو اتنا ٹیڑھا ہے کہ تلکی ٹیڑھی ہو جائے گی اور تم کہہ رہے ہو کہ وہ کبھی میرے راستے میں نہیں آئے گا۔“

”میں اسے سنبھال لوں گا۔“
”سنبھال لو گے۔“ میں نے معصومانہ حیرت سے کہا۔ ”وہ تمہارا ملازم ہے یا تمہاری اولاد ہے جو تم اسے سنبھال لو گے۔“

مرشد کو اپنی لاشعوری غلطی کا احساس ہوا۔ ”میرا مطلب ہے وہ میری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرے گا۔“

”یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ تمہارے آدمی تمہارے مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرتے ہیں۔ اس لیے اگر ان کی طرف سے کوئی کارروائی ہوئی تو وہ دراصل تمہاری طرف سے بھی جائے گی۔“ میں نے اسے خبردار کیا اور کال بند کر دی۔ وسیم غور سے سن رہا تھا کیونکہ میں نے لیپ ٹاپ کے اسپیکر آن کر

دیئے تھے۔ اس نے کہا۔

”مرشد خود کتے کی دم ہے یہ اتنی آسانی سے ماننے والا نہیں ہے۔“

”میں نے کل تک وارننگ دے دی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے یاد آیا ایک بار میں نے تم سے کہا تھا کہ مرشد خاندان کے دوسرے افراد کا پتا چلاؤ جن سے مرشد کی ٹھنی ہوئی ہے۔“

”اس کے چچا کے بیٹے ہیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”میرا خیال ہے تین یا چار بیٹے ہیں۔ مگر ان میں مرشد کا حریف ارشاد علی ہے۔ وہ اس کے چچا کا سب سے بڑا بیٹا ہے اور مرشد کے خلاف وہی سرگرم ہے۔“

”تب اس سے رابطہ کرنا چاہیے۔“ میں نے اس کے بارے میں معلوم کرایا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ مرشد کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ اتنا ہی خبیث اور سفاک انسان ہے۔ اس سے کسی قسم کا تعلق سوچ سمجھ کرنا ہو گا۔ ورنہ ایسا نہ ہو کہ بعد میں یہ مرشد کی جگہ سنبھال لے۔“ وسیم نے کہا۔ ”مرشد ایک آدمی ہے جب کہ ارشاد کے تین بھائی اور بھی ہیں اس لحاظ سے وہ مرشد سے زیادہ طاقتور ہو سکتے ہیں۔ فی الحال تو مرشد ان پر حاوی ہے کہ گدی اس کے پاس ہے اور اس کے اندھے مرید صرف اس کا اشارہ سمجھتے ہیں۔ ارشاد اور اس کے بھائی صرف آمدنی میں حصے دار ہیں۔“

”تب مرشد نے ان کا صفایا کیوں نہیں کر دیا؟“

”اس کی مجبوریاں ہیں۔ ارشاد اور اس کے بھائی اتنے کمزور بھی نہیں ہیں۔ دولت اور کرائے کے بد معاشوں کی ان کے پاس کمی نہیں ہے۔ درگاہ مرشد یہ سے کچھ ہی دور ان کی جاگیر ہے۔“

”مرشد کی اولاد ہے؟“

”بے شمار۔۔۔ جائز اولادوں کی تعداد ایک درجن ہے۔ اس کی تین بیویاں ہیں۔ اور فاضلی جیسے تو نہ جانے کتنے ہوں گے۔ لیکن اس کے بچے ابھی چھوٹے ہیں سب سے بڑا لڑکا شاید اسکول میں ہے۔“

”مرشد غالباً اس وقت کا انتظار کر رہا ہے جب اس کے بیٹے بڑے ہو کر اس کا دست و بازو بن جائیں تب تک وہ اپنے شریکوں کو چھوٹ دے رہا ہے۔“

”ممکن ہے لیکن اس وقت وہ پھنسا ہوا ہے اور شاید ہمارا کام بن جائے۔“

”کیا اس پر دباؤ بڑھانے کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتا۔“ میں نے کہا تو وسیم سوچ میں پڑ گیا۔

”کیا تو جاسکتا ہے مرشد اور اس کے چچا زادوں میں دشمنی بھڑکانی جاسکتی ہے۔“

”کوئی ڈراما کر کے۔“

”بالکل۔۔۔ مصنوعی حملہ کیا جاسکتا ہے جو گئے کہ خان پارٹی کی کارروائی ہے۔“

”بس تو اس پر غور کرو۔ ہمیں جلد از جلد کچھ کرنا چاہیے۔ مرشد پر ہتھ دباؤ بڑھے گا وہ صلح کی طرف متاثر ہوگا۔“

مجھے مہر اور کرٹل کا خیال آیا جنہیں ہم ایجنٹ آباد میں چھوڑ آئے تھے، وہاں کرٹل کو طبی امداد مل گئی ہوگی۔ میں نے آج کے اخبارات منگوائے اور کرٹل کے بارے میں ایک جگہ مختصری خبر مل گئی۔ عبدالرحمن نامی شخص کو ایجنٹ آباد کے اسپتال میں لایا گیا تھا وہ شدید زخمی تھا اور اسے کئی گولیاں لگی تھیں لیکن آپریشن کے بعد اس کی حالت بہتر تھی۔ فی الحال وہ پولیس کو بیان دینے کے قابل نہیں تھا اس کی بیوی کا کہنا تھا کہ وہ تفریح کرنے یہاں آئے تھے کہ نامعلوم افراد نے ان پر حملہ کر کے اس کے شوہر کو شدید زخمی کر دیا۔ بیوی کا کہنا تھا کہ ان کی کسی سے دشمنی نہیں ہے اور شاید یہ ڈکیتی کی واردات تھی۔ فائرنگ کے بعد ڈاکو بکھلا کر فرار ہو گئے۔ نے عقل مندی سے بیان دیا تھا۔ اس نے کہیں بھی ہمارا پتہ خان کا نام نہیں لیا تھا۔

مگر یہ خبر اخبار میں آگئی تھی۔ مہر اور کرٹل کے لیے مشکل ہو سکتی تھی کیونکہ فتح خان ان کا دشمن بنا ہوا تھا۔ وہ ان کے خلاف کارروائی کر سکتا تھا پھر پولیس کو کرٹل کی اصلیت بتا سکتا تھا۔ پولیس یا کوئی ایجنسی کرٹل کو گرفتار کر لیتی۔ وہ ایک غیر ملکی تھا اور بغیر کسی جواز کے پاکستان کی سرزمین پر تھا اور یہاں اس کی ذات سے کئی جرائم بھی وابستہ تھے جن میں سب سے سنگین جرم بھارتیوں کی مدد تھی۔ اس لحاظ سے کرٹل اب بھی شدید خطرے میں تھا۔ اگر اس کی اصلیت کھل جاتی تو ساری عمر جیل میں گزرتی یا وہ کسی نامعلوم قبر میں دفن ہو جاتا۔ اس کے ساتھ مہر بھی لیٹ میں آجانی۔ اگرچہ کرٹل نے مجھے دوبار بھارتیوں کے حوالے کیا یا کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود میں سمجھتا تھا کہ اس کا جرم اتنا سنگین نہیں تھا۔ وہ اصل میں بریف کیس حاصل کرنے آیا تھا۔

بریف کیس کا باب بند ہو چکا تھا اس لحاظ سے دیکھا

جائے تو کرٹل کا باب بھی بند ہو چکا تھا اور ہمیں اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ ہماری بلا سے وہ زندہ اور آزاد رہتا یا جہنم رسید ہو جاتا۔ مگر میں چاہتا تھا کہ وہ فتح خان کا شکار نہ ہو۔ بہر حال ابھی کرٹل کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنی حفاظت خود کر سکتا۔ میرا خیال تھا کہ ایک ہفتے سے پہلے اسے اسپتال سے چھٹی بھی نہیں ملے گی۔ اس کے زخم بھرنے اور توانائی بحال ہونے میں اتنا وقت تو لگتا۔ کل کی کارروائی کے بارے میں کسی اخبار میں کوئی خبر نہیں تھی حالانکہ اس میں تین افراد مارے گئے تھے اور دو گرفتار ہوئے تھے لیکن معاملہ ٹاپ سیکریٹ تھا اس لیے کسی اخبار میں خبر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ہم نے کچھ دیر آرام کیا پھر وسیم اور میں نے مل کر ایک سرساز اور لڑائی کی مشق کی۔ حویلی میں وسیم نے اپنے آدمیوں کے لیے ہاتھ ایک تربیتی پلان ترتیب دے رکھا تھا اور اس کے آدمی اور وہ خود بھی اس پر عمل کرتے تھے۔

عبداللہ سہ پہر میں آیا اور نہادھو کر کھانا کھانے چلا گیا۔ اس سے ملاقات چائے پر ہوئی۔ ”راجا صاحب کی کوٹھی کی فروخت کا کام شروع ہو گیا ہے۔ میں راول چوک والی جگہ بھی دیکھ آیا ہوں۔ لوکیشن اچھی ہے۔ سڑک سے زیادہ دور نہیں ہے اور آبادی سے ہٹ کر ہے۔ ایک چھوٹا سا فارم ہاؤس ہے، شاید ایک ہیکٹر رقبے پر ہوگا۔ اندر تین بیڈ رومز کی کوٹھی ہے۔ چاروں طرف گھنے اور اونچے درخت لگے ہیں جو پردہ پوشی کے لحاظ سے بہترین ہیں۔“

”کیا خیال ہے ہم بھی دیکھ کر آئیں؟“ وسیم نے کہا۔

”کوئی حرج نہیں ہے شام کے بعد جائے گا۔“ عبداللہ بولا۔ ”میں اسٹیٹ ایجنٹ کو کال کر دوں گا وہ کوٹھی دکھا دے گا۔“

”تم نہیں چلو گے؟“

”مجھے ابھی دوبارہ جانا ہے۔“ عبداللہ نے کہا۔ ”کل شاید راجا صاحب کے پاس جانا پڑے کیونکہ معاہدے پر سائن ان کے ہوں گے۔“

”بائی ایئر جاؤ گے۔“ وسیم نے پوچھا۔

عبداللہ نے سر ہلایا۔ ”سڑک سے آنے جانے میں بہت وقت لگ جائے گا۔ پارٹی جلد از جلد سودا فائل کرنا چاہ رہی ہے۔“

”سودا کتنے میں ہوا ہے؟“ وسیم نے پوچھا۔

”ایک ارب بیس کروڑ روپے میں۔“ عبداللہ نے

بتایا تو ہم حیران رہ گئے، میرے ذہن میں تھا کہ وہ جگہ قیمتی ہے لیکن اس کی مالیت ارب سے اوپر ہوگی یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔

”سچ مچ والا ارب جس میں سو کروڑ ہوتے ہیں۔“ وسیم نے نیم سنجیدگی سے پوچھا تو عبداللہ ہنسا۔

”ہاں وہی والا ارب۔۔۔ تمہاری آسانی کے لیے ایک سو بیس کروڑ روپے کی کوٹھی ہے یہ۔“

”اتنی قیمت کیوں جب کہ رقبہ بھی کوئی بہت زیادہ نہیں ہے شاید دو کنال کی ہوگی؟“ میں نے کہا۔

”ڈھائی کنال۔“ عبداللہ نے سچ کی۔ ”یہ اسلام آباد کے چند مہنگے ترین علاقوں میں سے ایک ہے۔ سمجھ لیں صرف پلاٹ کی مالیت ایک ارب روپے ہوگی۔“

عبداللہ کو دوبارہ جانا تھا اس لیے وہ مجھے اسٹیٹ ایجنٹ کا نمبر دے کر چلا گیا۔ مغرب کے قریب میں نے ایجنٹ کو کال کی اور عبداللہ کا حوالہ دے کر کوٹھی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے کہا کہ وہ آٹھ بجے ہمیں راول چوک پر ملے گا۔ ابھی سات بجے نہیں بجے تھے اور یہ جگہ زیادہ دور نہیں تھی اس لیے ہم آٹھ بجتے میں پندرہ منٹ پر روانہ ہوئے۔ مری روڈ کا آغاز فیض آباد سے ہی ہوتا ہے۔ یہ اسلام آباد سے ملی ایک چھوٹی سی آبادی ہے اور یہاں زیادہ تر کاروباری عمارتیں ہیں لیکن پیچھے عام آبادی بھی ہے۔ عبداللہ کی کوٹھی اسلام آباد کے نزدیک اسی آبادی میں تھی۔ احتیاطاً ہم نے اپنے حلیوں میں معمولی سی تبدیلیاں کی تھیں کہ اب تو یہ ہو گیا تھا کہ باہر نکلو تو کہیں نہ کہیں دشمن یا غیر متوقع حالات ٹکراتے تھے۔ کچھ ساز و سامان بھی ساتھ لے لیا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب ہم راول چوک پر تھے۔ وسیم کا ہم نام ایجنٹ وہیں ہمارا منتظر تھا۔

ہم نے اس سے رابطہ کیا۔ وہ نئے ماڈل کی لیانا کار میں تھا۔ ظاہر ہے جس پائے کا اسٹیٹ ایجنٹ تھا اسے اسی قسم کی گاڑی میں گھومنا چاہیے تھا۔ اس نے مجھ سے اور وسیم سے ہاتھ ملایا اور تعارف ہوا جو ہماری طرف سے بالکل غلط تھا۔ میں شیر نیازی تھا اور وسیم کمال خان۔ البتہ وہ وسیم احمد تھا۔ جوان آدمی تھا اور اس نے بڑا نفیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنی ظاہری شخصیت کا بہت خیال رکھتا تھا۔ زبان کا تو تیز تھا ہی ورنہ اسٹیٹ ایجنٹ کیوں کہلاتا۔ ”ایسا کریں میرے پیچھے آئیں۔“ وہ اپنی کار کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ”زیادہ دور نہیں ہے۔“

لیکن اس کا یہ زیادہ دور نہیں ہے صرف دو ڈھائی کلو میٹر کا ثابت ہوا۔ راول ڈیم والی سڑک سے ہم دائیں جانب مڑے اور کوئی ایک کلو میٹر بعد سڑک سے دائیں طرف ایک کچا راستہ کوئی سو گز دور کوٹھی تک گیا تھا۔ گیٹ پر چوکیدار موجود تھا۔ ہم نے گاڑیاں باہر ہی چھوڑ دیں۔ چوکیدار پٹھان تھا اور اس نے گلابی اردو میں ہم سے سلام دعا کی۔ وہ وسیم احمد کو جانتا تھا اس لیے اس نے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ چاروں طرف نام نہاد باغ میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یہاں سوائے بڑے درختوں کے اور کچھ نہیں تھا اور زمین پر گزشتہ خزاں کے سوکھے پتوں کا ڈھیر تھا۔ البتہ کوٹھی صاف ستھری اور بہترین حالت میں تھی۔ بس کہیں کہیں رنگ و روغن کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی لیکن اس کے علاوہ سب ٹھیک تھا۔

اندر داخل ہو کر وسیم احمد نے روشنیاں جلا دیں۔ اس دو منزلہ کوٹھی میں نیچے ایک بیڈروم کے ساتھ ڈرائنگ اور ڈائننگ روم تھا۔ پچن اس سے ہٹ کر تھا، اوپر دو بیڈرومز کے ساتھ ایک لاونج تھا۔ گھنے درختوں میں گھری ہونے کی وجہ سے کوٹھی باہر سے مشکل سے نظر آتی۔ اس لحاظ سے یہ اچھی جگہ پر تھی۔ وسیم احمد کوٹھی دکھارہا تھا اور خصوصیات بتا رہا تھا۔ سوئیس ساری تھیں مگر سامان نہیں تھا، ہمیں یہاں سب لانا پڑتا۔ اس کا کرایہ چوکیدار سمیت پچاس ہزار ماہانہ تھا۔ بغیر چوکیدار کے کرایہ پینتالیس ہزار ہو جاتا۔ ایک سال کا کرایہ ایڈوانس دینا پڑتا اور معاہدہ بھی ایک سال کا تھا اس سے پہلے مالک ہمیں خالی کرنے کو نہ کہتا اور نہ ہم چھوڑ کر جا سکتے تھے دوسری صورت میں ایڈوانس واپس نہیں ملتا۔ مجھے کوٹھی پسند آئی تھی لیکن میں نے وسیم احمد سے کہا۔ ”ہم فیصلہ کر کے بتائیں گے۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ خوشدلی سے بولا۔ ہم واپس ہوئے اور خلاف توقع خیر خیریت سے کسی مداخلت کے بغیر واپس گھر پہنچ گئے۔ وسیم کا خیال تھا کہ کوٹھی اچھی ہے لیکن ایک تو آبادی کے قریب ہے اور دوسرے تمام سہولیات سے محروم ہے جبکہ پہلے والی کوٹھی تمام سہولیات سے آراستہ تھی۔ مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا سارا سامان لانا پڑتا۔ جگہ اور کوٹھی وسیم اور مجھے پسند آئی تھی لیکن حتیٰ فیصلے سے پہلے عبداللہ سے مشاورت کر لینا مناسب سمجھا۔ یہ نواحی پنڈی کی طرف تھی جو اس جگہ سے زیادہ دور بھی نہ تھی اور محفوظ بھی تھی۔ دوسرے یہاں پانی، بجلی، فون اور گیس

سمیت تمام سہولتیں تھیں۔ مگر میں اتنی جلدی بھی نہیں تھی۔ راول ڈیم والی سڑک سے ہم دائیں جانب مڑے اور کوئی ایک کلو میٹر بعد سڑک سے دائیں طرف ایک کچا راستہ کوئی سو گز دور کوٹھی تک گیا تھا۔ گیٹ پر چوکیدار موجود تھا۔ ہم نے گاڑیاں باہر ہی چھوڑ دیں۔ چوکیدار پٹھان تھا اور اس نے گلابی اردو میں ہم سے سلام دعا کی۔ وہ وسیم احمد کو جانتا تھا اس لیے اس نے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ چاروں طرف نام نہاد باغ میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یہاں سوائے بڑے درختوں کے اور کچھ نہیں تھا اور زمین پر گزشتہ خزاں کے سوکھے پتوں کا ڈھیر تھا۔ البتہ کوٹھی صاف ستھری اور بہترین حالت میں تھی۔ بس کہیں کہیں رنگ و روغن کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی لیکن اس کے علاوہ سب ٹھیک تھا۔

”ڈی ایس بی صاحب نے اپنی بوٹی فصل کاٹ لی ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”سنا ہے کسی نے ان کی آنکھوں اور کان میں چپکنے والا سلوشن ڈال دیا ہے۔“ ندیم ہنسا۔ ”ساری خرابی آنکھوں میں بھی بے چارے کان بھی لپیٹ میں آگئے۔ خیر اب ڈی ایس بی صاحب شام اپنے کتے کے ساتھ ہوا خوری کے علاوہ اور کسی کام کے نہیں رہے ہیں۔“

”لیکن یار جب تک دوسرا انویسٹی گیشن آفیسر نہیں آتا گا معاملہ آگے کیسے بڑھے گا؟“ مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔ ”اس کی فکر مت کر۔ ابھی تو دو پارٹیوں کے درمیان تصفیے کا کیس ہے۔ پولیس بعد میں نئے شواہد کی بنیاد پر تیسرے خلاف ایف آئی آر کی واپسی کی درخواست کرے گی۔“

”ندیم، اصل اہمیت اسی کی ہے ورنہ فریٹوں کے درمیان تصفیے سے مجھے رہائی نہیں ملے گی۔“

”یار مجھے معلوم ہے۔“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ”ایک کام تو ہو جانے دے اگر بعد میں مرشد مکر بھی گیا تب بھی اس حرکت کی وجہ سے اس کا کیس کمزور ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے یار۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”میرا مشورہ ہے کہ اب تو منظر عام سے غائب ہو جائے کیونکہ یہاں رہے گا تو کہیں نہ کہیں پکے کرتارے گا اور پولیس کے ہاتھ آگیا تو سمجھ لے سارا کیس الٹ جائے گا۔“

”میں آرام سے ہی ہوں کوئی پکے نہیں کر رہا۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔ ”بھائی یہاں سے دفع ہو جا۔ خطرہ کیوں مول لے رہا ہے۔“

”اچھا میں سوچوں گا۔“ ”سوچوں گا نہیں سوچ اور اس پر عمل کر۔“ ندیم نے خبردار کیا۔ ”اگر مرشد ایک طرف صلح کر رہا ہے تو دوسری طرف وہ کوئی نہ کوئی سازش بھی کر رہا ہوگا۔ اس کی دیکھتی رگ تیرے ہاتھ میں ہے اس لیے وہ کیس تو واپس لینے پر مجبور ہے لیکن ساتھ ہی اس کی کوشش ہوگی کہ کسی طرح تو اس کے پولیس کے ہاتھ آجائے تو بازی اس کے ہاتھ میں آجائے گی۔ یہ کیس بھی کافی ہیں لیکن پولیس کے لیے تیرے خلاف نئے کیس بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔“

میں نے اسے یاد دلایا۔ ”باہر میں جائیں سکتا۔“ ”شمال میں کے ٹو سے جنوب میں بحیرہ عرب تک بہت جگہیں ہیں جہاں تو اپنی منحوس شکل چھپا سکتا ہے۔“ ندیم نے کہا۔ ”دیکھ اللہ اللہ کر کے یہ موقع آیا ہے اسے ذرا سی حثیت سے مت گنوا۔“

میں ندیم کی بات سے متفق تھا کہ یہ موقع بڑی مشکل سے آیا ہے لیکن میں یہاں سے جانے والی بات سے متفق نہیں تھا۔ اگر میں یہاں سے چلا جاتا تو میدان مرشد کے لیے خالی رہ جاتا اور صرف میری ذات تو نہیں تھی، اس میں دس مسئلے اور بھی تھے۔ میرے ساتھی تھے اور میرے دوسرے دشمن بھی تھے۔ نادر علی ہماری تحویل میں تھا، وہ اسی کوٹھی کے ایک کمرے میں بند تھا جہاں اس کی دیکھ بھال ہو رہی تھی اور ہر دوسرے دن ایک ڈاکٹر اسے دیکھنے آتا تھا اس کا بندوبست عبداللہ نے کیا تھا۔ مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں اور کس کی تحویل میں ہے؟ میں نے وسیم اور عبداللہ سے ندیم کی تجویز کے بارے میں بات کی اور اپنا خیال پیش کیا۔ وسیم نے کہا۔ ”ندیم ٹھیک کہہ رہا ہے لیکن آپ کا کہیں روپوش ہو جانا مسئلے کا حل نہیں ہوگا۔ آپ کی موجودگی کی اہمیت ہے جو مرشد کو تصفیے پر مجبور کر رہی ہے ورنہ وہ پھر کسی شرارت پر اتر آئے گا۔“

”ہاں اس کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔“ عبداللہ نے حمایت کی۔ ”آپ باہر آنے جانے میں احتیاط کریں لیکن روپوش رہیں۔ آپ نے کوٹھی دیکھ لی ہے اگر پسند آگئی ہے تو آپ وہاں قتل ہو سکتے ہیں۔“

”فی الحال تو وہاں کچھ نہیں ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”سارا سامان لے جانا پڑے گا۔ یہ بتاؤ کہ اسٹیٹ والا قابل اعتماد ہے؟“

”ہاں راجا صاحب کی جائیداد کا ایجنٹ یہی ہے۔ میرا اس سے پانچ سال سے تعلق ہے۔“

”ویسے ضروری نہیں ہے یہی کوٹھی لی جائے ہم اشتہار بھی دیکھ سکتے ہیں۔“

”اشتہار سے ڈر لگتا ہے کہ پھر کوئی نہ مکر جائے۔“ عبداللہ نے ہنس کر کہا۔

”ہر بار تو کوئی نہیں مکرے گا۔“ وسیم نے اسے گھورا۔ اتوار کے دن کئی اخبارات آئے تھے۔ میں اور وسیم وہ لے کر بیٹھ گئے۔ عبداللہ ایک دن پہلے بجلی کا پٹر پر جا کر راجا صاحب سے فروخت کے کاغذات پر سائن کرا آیا تھا۔ اسے آنے اور جانے میں دو گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا جب کہ سڑک کے راستے صرف جانے میں دس بارہ گھنٹے کا سفر بنتا تھا۔ خریدار کا وکیل عبداللہ کے ساتھ گیا تھا اور اس کے سامنے ساری کارروائی ہوئی تھی۔ صابر ترندی کا اشتہار دیکھنے کے لیے عبداللہ نے تمام اخبارات لگوا لیے تھے۔ مگر ابھی تک اس کی طرف سے اشتہار نہیں آیا تھا حالانکہ اب اس کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ ناواقف ہونے کی وجہ سے اب تک شمالی علاقے میں مہر کی تلاش میں پھر رہا ہوگا۔ میں نے اسے ایک مہینے کی مہلت دی تھی جس میں سے پندرہ دن گزر چکے تھے اور وہ آنے والے پندرہ دنوں میں لازمی رابطہ کرتا اس کے بعد میں شاز یہ کو اس کے حوالے کر سکتا تھا۔ یہ ظاہر تو وہ ہمارے پاس پر غماز تھی لیکن درحقیقت وہ ایک ذمے داری بن گئی تھی۔ سویرا نے ڈھکے چھپے الفاظ میں بتایا تھا کہ لیڈی ڈاکٹر نے شاز یہ کا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ میں اور وسیم شام کے وقت ایک سرساز سے فارغ ہو کر اخبارات کا کلاسیفائیڈ والا حصہ دیکھ رہے تھے۔ اچانک وسیم نے کہا۔ ”شہباز صاحب... ذرا دیکھئے گا۔“

میں سمجھا وہ کوئی اشتہار دکھا رہا ہے لیکن یہ خبر تھی جو اندر کے صفحے پر تھی اور یہ صفحہ کلاسیفائیڈ کے صفحے کے ساتھ تھا اس لیے وسیم کی نظر پڑ گئی۔ نو شہرہ پولیس کو جی ٹی روڈ کے ساتھ پوری میں بند لاش ملی تھی جس کی فی الحال شناخت نہیں ہو سکی تھی۔ شناخت کے لیے پولیس نے لاش کی تصویر شائع کرائی تھی۔ اس اخبار نے خبر کی اہمیت کے پیش نظر اسے اندر کے صفحے پر جگہ دی تھی۔ میں لاش کی تصویر دیکھ کر چونکا۔

منی 2013

181

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ مسرگزشت

منی 2013

180

ماہنامہ مسرگزشت

منی 2013

اگرچہ چہرے پر زخموں کے نشانات تھے لیکن پھر بھی صابر کا چہرہ پہچانا جا رہا تھا۔ مجھے دھچکا لگا تھا۔ کچھ دیر پہلے میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھ پر صابر کی ذمہ داری ختم ہوگئی تھی اور وہ آئے تو میں اس کی بیٹی اس کے حوالے کروں اور یہ خبر بتا رہی تھی کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”یار یہ صابر لگ رہا ہے۔“

”میں بھی اسی وجہ سے چونکا۔“ وسیم نے کہا۔ ”اگر یہ سچ صابر ہے تو اس کے قتل میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟“

”لازمی بات ہے مرشد کا ہاتھ۔“ میں نے سوچے ہوئے کہا۔ ”اے صابر کی تلاش ہوگی اور اس کے آدمیوں نے صابر کو تلاش کر لیا ہوگا۔“

”اگر صابر مرشد کے ہاتھ لگا ہوگا تو اسے پتا چل گیا ہوگا کہ آپ نے صابر کو مہر کی تلاش میں روانہ کیا تھا۔“

”ہاں یقیناً اسے پتا چل گیا ہوگا۔“

”تب مہر بھی خطرے میں ہوگی۔“ وسیم نے کہا۔

”مرشد نہیں جانتا کہ مہر کہاں ہے؟“

”دیکھئے اگر صابر پرسوں تک زندہ تھا تو لازمی بات ہے وہ یہاں واپس آتے ہوئے مرشد کے آدمیوں کے ہاتھ لگا ہے۔ اس لحاظ سے وہ مہر کے بارے میں بھی اپ ڈیٹ ہو سکتا ہے۔ اس نے قبیلے والوں کو پکڑا ہوگا اور انہوں نے صابر کو بتا دیا ہوگا کہ مہر واپس جا چکی ہے۔ اگر اس نے بھی اخبارات دیکھے ہوں گے تو کرنل والی خبر اس کی نظروں سے بھی گزری ہوگی اس کا مطلب ہے اسے مہر کا پتا ہوگا اور وہ مرشد کو بتا سکتا ہے۔ مرشد بریف کس کے چکر میں اسے اٹھوا لے گا۔“

وسیم کا تجزیہ قابل غور تھا لیکن اس سے بھی زیادہ قابل غور بات یہ تھی کہ ہم مہر کو پکڑنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے سوائے نیک تمنائیں کرنے کے۔ اگر ان کی تقدیر میں مرشد سے بچنا لکھا تھا تو وہ بچ جاتے ورنہ مارے جاتے۔ ویسے مجھے امید تھی کہ ہوش میں آتے ہی کرنل اپنے اور مہر کے تحفظ کا بندوبست کر لے گا وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ہر صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں اور کبھی بے بس نہیں ہوتے ہیں۔ صابر کے لیے دعائے مغفرت کے بعد ہمیں شاز یہ کا خیال آیا۔ میں نے کہا۔ ”سویرا کہہ رہی تھی کہ شاز یہ حویلی میں رہ جائے اس کی خواہش اس طرح پوری ہو گئی اب اس کا دنیا میں کوئی خونی رشتہ باقی نہیں رہا ہے۔“

”اس تک یہ خبر کیسے پہنچائی جائے؟“

”ابھی تو ضرورت نہیں ہے۔ کچھ عرصے بعد میں جی یا سویرا سے کہہ دوں گا وہ خود اسے بتا دیں گی۔“

”ہاں ابھی اسے ایک صدمہ اور برداشت کرنا ہے۔“ وسیم کا اشارہ اس کے مسئلے کی طرف تھا اور یہ ہر مرد کے لیے نہایت حساس اور نفسیاتی قسم کا مسئلہ ہوتا ہے۔

ابھی ذہنی لحاظ سے بکھری ہوئی ہوگی اور باپ کی موت کی اسے مزید بکھیر سکتی تھی۔ میں نے وسیم سے کہا۔

”پولیس تک صابر ترمذی کی شناخت پہنچا دیں۔“

چاہیے۔ ورنہ وہ اسے نامعلوم قرار دے کر دفن کر دیں گے۔

”میں عبد اللہ سے کہتا ہوں وہ یہ کام بہتر طور پر کرے گا۔“ وسیم نے سر ہلایا اور عبد اللہ کو کال کرنے لگا۔ اسے صابر کے بارے میں بتایا اور پھر پولیس کو انفارم کرنے کو کہا۔

دیر بعد ہم دوبارہ اصل کام کی طرف متوجہ ہوئے تھے کہ میرے موبائل کی بیل بجی۔ ندیم کی کال آ رہی تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو۔“

”یار میرے پاس ابھی کسی ارشاد علی کی کال آئی ہے۔“

”وہ خود کو مرشد کا چچا زاد بھائی کہہ رہا ہے۔“

”ہاں مرشد کا اس نام کا ایک چچا زاد ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا کہہ رہا تھا وہ؟“

”ایک تو کہہ رہا تھا کہ مرشد ہم سے دھوکا کر رہا ہے۔“

کیس ری فائل کرا کے وہ شبہا ز یعنی تجھے منظر عام پر آنا چاہتا ہے، تاکہ اچانک تیرا پتا صاف کر دے، میں نے کہا۔

”بسم اللہ خادم کیا کر سکتا ہے اس سلسلے میں....؟“

”تو ہبک رہا ہے۔“ میں نے اسے ٹوکا۔

”بس یار تجھ سے چھٹکارے کا سن کر جذباتی ہو گیا تھا۔ پر اپنے ایسے نصیب کہاں.... بہر حال دوسری بات اس نے یہ کہی کہ وہ تجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

”تو نے میرا نمبر دے دیا؟“

”یار میں شوہر ہوں گھاس نہیں ہوں۔“ ندیم نے ہنسنے لگا۔

”میں نے کہا۔“ میں نے کہا کہ سرکار شبہا ز تو عرصے سے مرشد کے سینکوں کی طرح غائب ہے، پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ آپ اپنا نمبر دیدیں اگر شبہا ز نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں اسے نمبر دے دوں گا۔“

”اس نے دے دیا؟“

”ہاں نوٹ کر لے مگر فوراً رابطہ مت کرنا ورنہ وہ مجھ سے ملے گا کہ میں تجھ سے مستقل رابطے میں ہوں۔“

”تیرا مطلب ہے اس کے پیچھے مرشد بھی ہو سکتا ہے؟“

”نہیں.... وہ اس کا حریف ہے تو کیا ہوا۔ وہ تجھے ممدی کا دشمن بھی بتا سکتا ہے اس صورت میں ارشاد اس کی مدد پر راضی ہو سکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے دیکھتے ہیں اسے بھی.... تو کل کیس ری فائل کر رہا ہے؟“

”ہاں سچ پہلا کام یہی کرنا ہے۔ اس کے بعد دیکھتے ہیں کیا صورت حال بنتی ہے اور ہاں اگر ممدی چستی کا جاں نشین آگیا ہے۔ کوئی ڈی ایس پی شیر شاہ ہے۔“

”یہ تو کراچی کی کباڑی مارکیٹ کا نام ہے۔“ میں نے کہا۔

”کچھ پتا ہے کس قسم کا آدمی ہے؟“

”یار تیرے کیس کے لیے جو بھی آئے گا وہ مرشد کا آدمی ہی ہوگا۔ اس سے خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے مگر میں معلوم کرتا ہوں اب ہر کوئی اگر ممدی چستی جتنا حرامی تو نہیں ہوتا ہے۔“

”مرشد کا آدمی تو ہوگا لیکن اپنے پیشرو کا حال دیکھ کر عبرت ضرور پکڑے گا۔“

”یار انسانوں کو پیر پیغمبر اور اولیا ٹھیک نہ کر سکے تیری میری اوقات کیا ہے۔“ ندیم نے کہا اور فون بند کر دیا۔ وسیم غور سے سن رہا تھا اور اس نے میری گفتگو سے اندازہ کر لیا تھا کہ ندیم نے کیا کہا ہے۔ پھر بھی میں نے اسے ندیم کی بات تفصیل سے بتائی۔ وسیم نے کہا۔

”اس کا امکان ہے کہ یہ مرشد کی چال ہو۔ مرشد کا حریف ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہمارا حلیف بن سکتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ ارشاد علی سچ کا مرشد کے خلاف ہماری مدد چاہتا ہو ہمیں اس معاملے میں خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہوگا۔“

”اگر وہ ہماری مدد بھی چاہتا ہے تو اس کے اپنے مقاصد ہوں گے اور وہ انہیں حاصل کرنے میں ناکام رہا تو پھر وہ بھی ہمارے دشمنوں کی صف میں شامل ہوگا۔“ وسیم نے خبردار کیا۔

”میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ مرشد سے کم خبیث اور سفاک نہیں ہے۔“

”ابھی اسے ایک طرف رکھتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”پہلے کیس والے کو دیکھتے ہیں کہ مرشد کوئی چکر تو نہیں چلا رہا ہے، اس کے بعد ارشاد علی سے بات کر کے بھی دیکھیں گے۔“

”یہ دیکھیں۔“ وسیم نے ایک اشتہار میری طرف

بڑھا دیا۔ ”چنڈی کے نواحی علاقے اسلام آباد ایکسپریس وے کے ساتھ ایک مکان بک رہا ہے۔ مین روڈ کے پاس ہے اور آس پاس کھیت ہیں۔“

اشتہار کے مطابق ایک کنال کے اس ایک منزل مکان میں چھ کمرے تھے۔ پانی بجلی اور گیس کی سہولت کے ساتھ تھا اور عین سڑک پر واقع تھا۔ قیمت چالیس لاکھ تھی لیکن کرائے پر بھی مل سکتا تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک لگ رہا ہے اسے بھی نوٹ کر لو۔ میرا خیال میں اسی طرف دیکھا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔“

”یہ ایک بنی گالا میں بھی بنگلہ ہے۔“ وسیم نے ایک اور اشتہار دکھایا۔

”تم آج ان کے مالکوں سے بات کر لو، ہم کل چل کر دیکھ لیتے ہیں۔“

”نہیں میں خود دیکھ لوں گا۔“ وسیم نے انکار کیا۔

”دن میں آپ کا باہر نکلتا ٹھیک نہیں ہوگا۔“

”بھائی میں گھر میں قید ہو کر نہیں بیٹھ سکتا۔“

”میرے خیال میں ندیم کا خدشہ درست ہے، مرشد کے آدمی آپ کو شد و مد سے تلاش کر رہے ہوں گے اور آپ ان کے ہاتھ آگئے تو سارا کیس خراب ہو جائے گا اس بار مرشد آپ کو پولیس کی تحویل میں دے دے گا اور جیل کے اندر آپ کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے میری بلکہ ہم سب کی درخواست ہے کہ آپ کم سے کم باہر نکلیں اور دن میں نکلنے سے قطعی گریز کریں۔“

عبد اللہ آنے والے دو دنوں تک کوشش کی فروخت کی آخری کارروائی میں مصروف رہا حتیٰ کہ قیمت راجا عمر دراز کے اکاؤنٹ میں منتقل ہوگئی۔ اس دوران میں وسیم نے ان تینوں جگہوں کو دیکھا۔ وسیم احمد کی دکھائی کوشش پہلے ہی منتخب کر لی تھی۔ اس کے علاوہ وسیم نے اسلام آباد ایکسپریس وے والا مکان بھی کرائے پر حاصل کر لیا۔ یہ کوئی دس بارہ کلومیٹر دور تھا اور اس کے آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی اور نہ ہی کھیت تھے۔ صرف جنگل تھا جس میں مقامی چرواہے اپنے جانور چراگئے آتے تھے۔ مکان پرانا اور ایک ٹیلے پر بنا ہوا تھا اور بہت کم کرائے پر مل گیا تھا۔ وسیم نے اس سے چھ مہینے کا معاہدہ کیا تھا اور کرایہ پیشگی دے دیا تھا۔ راول ڈیم روڈ والی کوشش کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ اس میں، مانی اور چند دوسرے لوگ رہیں گے۔ جب کہ دیکھی مکان میں وسیم اپنے آدمیوں کے ساتھ ڈیرا جمائے گا۔ مکانات کا

منی 2013ء

183

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماہنامہ سرگزشت

منی 2013ء

182

WWW.PAKSOCIETY.COM

سرے سے آغاز ہو جائے۔ تم نادر کو میرے حوالے کر دو۔“
”میں بتا چکا ہوں جس دن عدالت نے مجھ پر قائم کیس ختم کر کے مجھے رہا کر دیا اسی دن میں نادر کو تمہارے حوالے کر دوں گا۔“

”لیکن اس میں تو بہت دن لگ....“
”مرشد علی تمہارے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتی ہیں۔ دیر لگتی ہے عام آدمی کے لیے، عام طور سے انصاف ملنے سے پہلے اس کی عمر ختم ہو جاتی ہے۔ تم عام آدمی نہیں ہو اس لیے انصاف تمہارے لیے جلد ہو سکتا ہے بشرط کہ تم ایسا چاہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ انتظامیہ اور عدلیہ کے کام کے کرنے کی رفتار میں کیسے تیزی لائی جاتی ہے۔ تم چاہو تو یہ معاملہ مہینے سے بھی پہلے منٹ سکتا ہے۔“
”ایسا بہت مشکل ہے۔“

”پھر وہی بات، مشکل عام آدمی کے لیے ہوتی ہے تم جیسے لوگوں کی مشکلات تو خود آسان ہو جاتی ہیں۔ بہر حال اب یہ تم پر ہے کہ تم نادر کو کتنی جلدی حاصل کر لیتے ہو۔ ویسے میں تمہیں بتا دوں اب اس میں کچھ نہیں رہ گیا ہے وہ جسمانی طور پر ٹھیک ہے لیکن اندر سے مر گیا ہے اور جب آدمی اندر سے مر جائے تو باہر سے بھی وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہتا ہے ممکن ہے نادر خود تمہاری مشکل آسان کر دے اور تمہیں برادر کشی کے داغ سے بچالے مگر اس کے لیے تمہیں جو کرنا ہے بہت جلد کرنا ہے۔ اگر وہ ہمارے پاس مر گیا تو یقیناً تمہاری مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔“
”میں پوری کوشش کروں گا۔“

میں نے مرشد سے جو کہا تھا اس میں مبالغہ نہیں تھا۔ نادر ہماری قید میں بہت خاموش اور مرجھایا ہوا ہو گیا تھا۔ حالانکہ ہم اس کے علاج اور خوراک کا پورا خیال رکھتے تھے مگر وہ برائے نام کھاتا تھا اور اس کی صحت مستقل گر رہی تھی۔ وسیم نے مجھے خبردار کیا تھا کہ اگر معاملہ جلد نہ نمٹایا گیا تو اس کا بھی امکان ہے کہ نادر ڈھے جائے۔ وہ یا تو بیمار پڑ جائے گا یا براہ راست انتقال کر جائے گا۔ دونوں صورتوں میں ہم اس سے متوقع فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ میری ہدایت پر وسیم ڈاکٹر سے اسے ایکسٹرا ایلی منٹ دلوانے لگا تھا تاکہ اس کی اندر کی توانائی بحال رہے۔ میں نے ایک دو بار سوتے میں اس کا معائنہ کیا تھا وہ سچ سچ بہت کمزور اور صورت سے مظلوم دکھائی دے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی فرعون صفت آدمی تھا جو تکبر میں نعوذ

باللہ خود کو خدا سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اب بستر علالت پر سہاگے و بے چارگی کی تصویر بنالینا تھا۔ میرا دل چاہا کہ اس کی تسکین لوں اور اس کیپشن کے ساتھ کسی اخبار میں شائع کراؤں۔ ”یہ شخص جو بھی فرعون تھا۔“ میں شاید ایسا نہ کرتا لیکن میں نے اس کی کئی تصاویر لے لی تھیں۔

میں احتیاط کر رہا تھا اتنے دن سے باہر نہیں نکلتا۔ اپنے حلیے میں تبدیلی کے لیے سر کے چھوٹے بالوں کے ساتھ میں نے فریج کٹ رکھ لی تھی اور اس سے اوپر شیو ایک دو دن بڑھا کر رکھتا تھا اس سے میرے رنگ میں سیاہی مائل تاثر آتا تھا۔ نسبتاً گہرے رنگ کے فریم کی عینک لگا کر وہ تاثر خاصا مختلف نظر آتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ رات کے وقت اس حلیے میں کوئی بالکل پاس سے ہی مجھے شناخت کر سکے کر سکے ورنہ دور سے اور سرسری نظروں سے شناخت کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ یعنی اگر کوئی بیڈ لک نہ ہو تو میں محفوظ رہتا تھا۔ میرے ذہن میں ندیم کی وارننگ تھی اس کے بعد میں زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ کسی بھی بد احتیاطی کے نتیجے میں میرے کیس بگڑ جاتا اور میرے ساتھیوں کی کوششوں پر پانی پھر جاتا۔ شام کے وقت میں اور وسیم نکلے۔

ایاز پہلے ہی چا چکا تھا۔ اب اسے گاڑیوں کا کام کرنا تھا۔ وسیم کا خیال تھا کہ وہ حویلی سے جو گاڑیاں لائے تھے اب انہیں ٹھکانے لگا دینا چاہیے اور ان کی جگہ دوسری گاڑیاں لے لینی چاہئیں۔ کیونٹیکیشن وین مل گئی تھی۔ گزشتہ دن ہی وسیم نے اسے دیہی مکان میں شفٹ کیا تھا اس کا سارا سامان نکال لیا تھا جواب اس میں دوبارہ فٹ کرنا تھا۔ اب اس پر ہلکا سرمی رنگ کر دیا گیا تھا جو دن میں واضح نظر آتا لیکن رات کو یہی رنگ سیاہ ہو جاتا۔ اس سے دیکھنے والوں کو نفیوز کیا جاسکتا تھا۔ وسیم نے اپنے سارے آدمیوں کو بلانے کے بجائے ان دس افراد کو بلایا تھا جو عمر سے اس کے ساتھ تھے اور جن پر اسے پورا اعتماد ہو گیا تھا۔ ان میں سے چھ سات دیہی مکان میں رہتے اور وہ ایک طرف حویلی کا متبادل بن جاتا۔ تین چار کو بھی میں رہتے۔ اسلحہ اور تمام خاص چیزیں دیہی مکان میں رکھی جاتیں اور کوٹھی میں صرف ضرورت کی اشیاء اور بانی کا سیٹ اپ کام کرتا۔ اس کی وجہ سے ہمیں بہت آسانی ہو گئی تھی۔ خاص طور سے الیکٹرانک سیکورٹی اور انٹرنیٹ کے استعمال میں۔

ہم دیہی مکان پہنچے عبداللہ کی کوٹھی سے یہ جگہ تقریباً آدھے گھنٹے کی مسافت پر تھی اس لحاظ سے یہ حویلی سے بہت

بہتر تھی جہاں آنے جانے میں گھنٹے سے کم نہیں لگتا تھا۔ علاقہ ویران تھا اور آس پاس کچھ نہیں تھا۔ بلند جگہ ہونے کی وجہ سے مکان سے آس پاس کا منظر خاصی دور تک صاف دکھائی دیتا تھا۔ رات ہونے کی وجہ سے یہ منظر واضح نہیں تھا۔ یہاں بجلی تھی مگر گیس نہیں تھی۔ پانی کے لیے کن میں بورنگ کر کے موثر فٹ کی ہوئی تھی۔ مکان میں اچھے بڑے پختہ کمرے تھے۔ جو ایل کی صورت میں بنے ہوئے تھے۔ اس ایل کے سامنے سینٹ کی شیٹوں سے برآمدہ بنا ہوا تھا۔ ایک طرف لائن سے کچن، بڑا سا باتھ روم اور لیٹرین بنے ہوئے تھے۔ تینوں بہت اچھے اور ٹائٹلز سے آراستہ تھے۔ کچن میں ایل پی جی سلینڈر لگا ہوا تھا۔ مکان تعمیر کے لحاظ سے دیہاتی تھا لیکن صاف ستھرا اور رہائش کے لیے بہترین تھا۔

وسیم نے یہاں حویلی والا سیٹ اپ کیا تھا۔ تین کمروں میں فرش پر دبیز انڈرلے کے ساتھ قالین بچھالے تھے اور چوتھے کمرے کو اسلحے، سامان اور کنٹرول روم کے طور پر منتخب کیا تھا۔ دو کمرے خالی تھے، ان کا مصرف بعد میں تلاش کیا جاسکتا تھا۔ فی الحال ان کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں نگرانی کرنے والے آلات نہیں تھے۔ مانی آتا تو وہی آلات حاصل کرتا اور پھر انہیں لگاتا۔ کچن بہت بڑا تھا اور یہاں جہازی ساز کی تین چار پائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ جن پر پوری برات آرام کر سکتی تھی۔ پیپل اور نیم کے کئی بڑے درخت تھے جن کے تلے چار پائیاں پڑی تھیں۔ کیونکہ اب دن میں دھوپ قابل برداشت نہیں رہی تھی۔ اسی لیے گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے بہت جگہ تھی۔ وسیم کے سارے آدمی ابھی یہیں تھے۔ کوٹھی میں کوئی نہیں تھا۔ اسے مانی اور بیٹو کے آنے کے بعد دیکھا جاتا۔ ویسے خاصا سامان وہاں بھی پہنچا دیا تھا۔ وسیم کے آدمیوں میں سے کچھ رات کے کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہمارے آنے سے ذرا پہلے ایاز دو گاڑیاں لے کر چلا گیا تھا۔ وہ ان کا سودا کر کے اور دوسری دو گاڑیاں لے کر ہی واپس آتا۔ اب وسیم کے پاس صرف ایک کار تھی۔ ایاز کی جیب بھی اس نے فروخت کر دی تھی کیونکہ وہ بھی کئی بار نظروں میں آچکی تھی۔ حالانکہ اسے اپنی جیب بہت پیاری تھی اور اس نے اسے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

کھلی جگہ ہونے کی وجہ سے یہاں موسم خوشگوار تھا۔ رات کا کھانا کھا کر ہم چار پائیوں پر آ لیے۔ رات کے لیے وسیم نے دو آدمیوں کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔ یعنی رات بھر دو

افراد جاگ کر پہرہ دیتے۔ مکان کے گرد چار دیواری تھی لیکن یہ سات فٹ بلند تھی۔ وسیم نے باہر سے جائزہ لیا تو کئی جگہوں پر دیوار کے ساتھ پتھر مٹی جمع ہونے سے اس کی اونچائی پانچ فٹ رہ گئی۔ دن میں وسیم نے ان تمام جگہوں کو صاف کرایا تھا اور دیوار سے ملتا ہوا دیا تھا مگر دائیں طرف ابھی بھی خاصا ملتا پڑا ہوا تھا۔ دوسرے مرحلے میں دیواروں پر خار دار باڑھ لگائی جاتی۔ کمروں پر چھت تھی لیکن اوپر جانے کے لیے پختہ سیڑھی نہیں تھی۔ مگر بالٹس کی ایک سیڑھی تھی جس سے چھت پر چڑھا جاسکتا تھا۔ رات کو کسی قدر ٹھنڈ ہوئی تو ہم اٹھ کر اندر آ گئے۔ میں اور وسیم ایک کمرے میں سوئے تھے۔ اس کے آدمی دوسرے کمروں میں تھے۔ کرنے کو کچھ نہیں تھا اس لیے ہم مستقبل کی پلاننگ کرتے رہے۔ بارہ کے بعد مجھے نیند آ گئی تھی۔ رات کی وقت مجھے نیند میں لگا جیسے کوئی گڑبڑ ہے۔ میری آنکھ کھل گئی تھی۔ باہر کچھ بھاگ دوڑ ہو رہی تھی اور وسیم اپنی جگہ نہیں تھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ میں اٹھ کر دروازے تک آیا۔ کچھ لوگ مین گیٹ کے ساتھ موجود تھے۔

”کیا ہوا ہے؟“ میں نے برآمدے کی طرف آنے والے کو روکا۔

”جناب مکان کے باہر کچھ پر اسرار نقل و حرکت ہو رہی ہے۔“ اس نے سلیس زبان میں جواب دیا۔ ”کمانڈر نے سب کو الٹ کر دیا ہے۔“
وسیم کے دو آدمی سیڑھی لگا کر چھت پر چلے گئے ان کے پاس ٹائٹ وٹرن دور بین اور ٹینکس تھیں۔ وسیم خود گیٹ کے پاس موجود تھا۔ میں اس کے پاس آیا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“
”باہر سڑک پر دو گاڑیاں ہیں اور ان سے کچھ لوگ اتر کر مکان کے چاروں طرف پھیل رہے ہیں۔“ وسیم نے دھیمی آواز میں بتایا۔ ”ان کی تعداد کم سے کم آٹھ ہے۔“

”سچ ہیں؟“
”ابھی کچھ سچ سے نہیں معلوم، اوپر والے رپورٹ دیں گے تو اس سے پوزیشن واضح ہوگی۔“
”تم ایسا کرو کچھ اسلحہ نکال کر اوپر لے آؤ۔ کوئی دور مار ہتھیار ہو تو بہتر ہے۔“ میں نے سیڑھی کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ چھت اوپر سے سچ تھی اور کوئی کھڑا ہوتا تو دور سے صاف دکھائی دیتا۔ معمولی سی چار دیواری بھی نہیں تھی۔ وسیم کے دونوں آدمی دو الگ سمتوں میں رخ کیے لیے ہوئے تھے۔ میں بھی چھت پر آتے ہی لیٹ گیا جس طرح

ہمارے پاس رات کو دیکھنے والے آلات تھے اس طرح آنے والوں کے پاس ان کی موجودگی عین ممکن تھی۔ میں رینگتا ہوا ایک آدمی کے پاس پہنچا اور سرگوشی میں پوچھا۔

”کیا رپورٹ ہے؟“

”اس طرف تین آدمی ہیں جناب۔“ اس نے جوابی سرگوشی میں کہا اور اپنی ٹانٹ و ٹرن عینک اتار کر میری طرف بڑھادی۔ ”اسی طرف دیکھیں۔“

میں نے عینک لگا کر اس کی بتائی ہوئی سمت دیکھا تو مکان سے کوئی ڈیڑھ سو فٹ کے فاصلے پر تین افراد تقریباً ساتھ ساتھ دکھائی دیئے وہ دبے قدموں مکان کی طرف بڑھ رہے تھے اور ان کے ہاتھوں کی پوزیشن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ انہوں نے اسلحہ اٹھا رکھا تھا یعنی ہاتھوں کا انداز رانقل بدست تھا۔ یہ مکان کا دائیں طرف والا حصہ تھا۔ دوسرے آدمی کے مطابق عینک سمت بھی دو افراد موجود تھے لیکن وہ فاصلے پر رکے ہوئے تھے اور مکان کی طرف آنے کی کوشش نہیں کر رہے تھے۔ بائیں طرف دیوار کے ساتھ چھوٹی سی کھائی تھی اور اس طرف سے کسی کا اندر آنا بہت مشکل تھا۔ سب سے آسان دائیں طرف والی دیوار تھی۔ سامنے سے آنا آسان تھا لیکن کوئی بے خبری میں مشکل سے اندر گھس سکتا تھا۔ اس لیے آنے والوں نے آسان ترین راستہ اختیار کیا تھا۔ یہ کمروں کے پیچھے موجود دیوار تھی اس پر چڑھ کر وہ آسانی سے اندر کود سکتے تھے۔ وسم نے آہستہ سے کہا۔

”کیا خیال ہے یہ دشمن ہیں؟“

”کچھ کہہ نہیں سکتے۔“ میں نے جوابی سرگوشی کی۔ ”ویسے یہ جس طرح آرہے ہیں ایسا لگ رہا ہے جیسے ان کو معلوم ہے کہ مکان کے اندر آنے کا آسان راستہ کس طرف سے ہے۔“

وسم نے غور کیا اور بولا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، یہ اور کسی طرف سے پیش قدمی نہیں کر رہے ہیں صرف اسی طرف سے آرہے ہیں۔“

وسم ریڈیو لے آیا تھا اور اب اپنے آدمیوں سے رابطے میں تھا۔ وہ اسے آنے والوں کی پوزیشن سے آگاہ کر رہے تھے۔ ”سوال یہ ہے کہ اگر یہ دشمن نہیں ہیں تو اس طرح خاموشی سے آکر گھیرا ڈالنے اور ان تین افراد کی مکان کی طرف پیش قدمی کا کیا مقصد ہے؟“

”یہ تینوں آنے والے بتائیں گے۔“ وسم نے کہا اور اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگا کہ آنے والوں کا استقبال

کیسے کرنا ہے۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ شور مچا کر دیکھ کر یہ کام کرے تاکہ باہر والوں کو خبر نہ ہو۔ اس دوران میں آنے والے دیوار تک پہنچ گئے تھے اس لیے ہم کنارے سے پیچھے سرک گئے ورنہ وہ ہمارے سروں کے ہیو لے دیکھ سکتے تھے۔ محض میں روشنی تھی اور اس کا انعکاس یہاں تک آ رہا تھا۔ وسم کے آدمیوں نے اندر پوزیشن سنبھال لی تھی۔ آنے والوں میں سے ایک دیوار پر چڑھا اور اندر جھانکا۔ جب اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا وہ اندر اتر آیا۔ اس معاملے میں اس کی مہارت قابل تعریف تھی کہ اس کے آنے کی ذرا بھی آہٹ نہیں ہوئی تھی۔ اگر ہم پہلے سے ہوشیار نہ ہوتے تو یہ بھی نہیں چلتا کہ دشمن ہمارے درمیان آ گیا ہے۔ وہ کمروں کی عقبی دیوار کے ساتھ چلتا ہوا محض کی طرف آیا اور وسم کے سر پر کوئی چیز ماری اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ وہ اسے کھینچ کر محض میں لے گیا۔ اس دوران میں دوسرا دیوار پر چڑھ رہا تھا۔ وہ نیچے اتر کر دوسری طرف گیا اور وسم کے دوسرے آدمی کے پیچھے چڑھ گیا۔ اب تیسرا باہر موجود تھا اور اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ اس کا اندر آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ شاید صرف مدد کے لیے موجود تھا۔

آٹھ میں سے تین افراد اس طرف تھے اور دو عقب میں تھے جب کہ تین سامنے تھے۔ پکڑے جانے والے دونوں افراد مسلح نکلے تھے۔ پستول دونوں کے پاس تھا جب کہ ایک کے پاس چھوٹی لیکن جدید ترین رائفل بھی تھی۔ وسم نے پیچھے ہٹ کر اپنے آدمیوں کو تیسرے کے لیے ہدایات دیں اور اس کے نتیجے میں وسم کے دو آدمی دیوار تک گئے اور ایک نے اوپر چڑھ کر باہر موجود تیسرے فرد کو ہاتھ کی خفیف سی ”شش“ کر کے متوجہ کیا اور پھر ہاتھ کے اشارے سے اندر آنے کو کہا۔ وہ دہلی آواز میں بولا۔ ”احق میں اندر نہیں آ سکتا، سردار نے منع کیا ہے؟“

مگر وسم کا آدمی سردار کا نافرمان بنا اسے اشارہ کرتا رہا۔ مجبور ہو کر وہ دیوار کے پاس آیا اور جیسے ہی ذرا اوپر چڑھا وسم کے آدمی نے اس کے سر پر کچھ مارا اور اس سے پہلے کہ وہ واپس نیچے جاتا اسے پکڑ لیا اور پھر دوسرے کی مدد سے اسے بھی اندر کھینچ لیا۔ اب تین آدمی ہمارے قابو میں آ چکے تھے۔ میں نے وسم سے کہا۔ ”اب پیچھے موجود دونوں افراد کو بھی قابو کرنا ہے۔“

”اس کا طریقہ میں نے سوچ لیا ہے۔ ہمارے آدمی

پیچھے گئے تو یہ ہوشیار ہو جائیں گے اور پیچھے کا حصہ بہت نا ہوا رہے۔“

”طریقہ کیا ہے؟“

”ڈارٹ گن۔“ وسم نے سرگوشی کی۔ ”بے ہوشی کے بلٹ مارتی نہیں ہے زخم لگتے ہی آدمی صرف دس سیکنڈ میں اٹھا غفلت ہو جاتا ہے۔“

میں نے ٹانٹ و ٹرن سے پیچھے موجود افراد کا جائزہ لیا وہ ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر تھے لیکن یہ فاصلہ اتنا نہیں تھا کہ ایک کو بے ہوشی کا بلٹ لگتا تو دوسرے کو خبر نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ شکار بے ہوش ہونے سے پہلے گلا بھاڑ کر چلاتا تو مکان کے سامنے والوں تک بھی اطلاع پہنچ جاتی اور میں چاہتا تھا کہ وہ سب قابو میں آئیں کوئی فرار نہ ہو۔ اگر کوئی فرار ہو جاتا تو دوسروں کو لاسکتا تھا۔ اس لیے میں نے وسم کی ڈارٹ گن والی تجویز مسترد کر دی۔ ”تب کیا کیا جائے؟“

”ہم خود باہر جا کر ان کو قابو کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بہت دن ہو گئے ہیں ہاتھ پاؤں ہلائے ہوئے۔“

وسم کو تجویز اچھی لگی۔ ”لیکن جانیں گے کس طرف سے؟“

”دائیں طرف سے جہاں سے یہ آئے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”بلکہ اپنے کچھ آدمی سامنے والوں کے لیے بھی بھیج دو اگر وہ ان کو قابو نہ کر سکیں تو کم سے کم فرار بھی نہ ہونے دیں۔“

ہم نیچے آئے وسم نے اپنے تین آدمی بلائے اور انہیں سامنے والوں کے بارے میں ہدایت دینے لگا۔ ہم پانچوں اسی دیوار سے کود کر باہر اترے اور سب نے ٹانٹ و ٹرن لگا رکھی تھیں اس لیے ہمیں تاریکی میں بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ وسم کے آدمی سامنے والے حصے کی طرف چلے گئے اور ہم دونوں عقب کی طرف بڑھے۔ چھت پر موجود دونوں آدمی ریڈیو کی مدد سے ہمیں گائیڈ کر رہے تھے کہ دشمن کہاں تھا اور ہمیں کس طرف سے جانا چاہیے تھا۔ پانچ منٹ بعد وہ دونوں ہمارے سامنے تھے۔ وہ ایک بڑے پتھر کے دائیں بائیں دیک کر بیٹھے تھے۔ وسم نے اشارے سے مجھے بتایا کہ وہ ایک کو قابو کرے گا۔ میں نے سر ہلایا۔ وسم نے ایک پتھر اٹھا کر ان کے عقب میں اچھال دیا۔ وہ چونک کر پیچھے دیکھنے لگے۔ کچھ دیر دیکھتے رہے اور جب مزید کوئی آواز نہیں آئی تو وہ دوبارہ مکان کی نگرانی کرنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا انہیں اس لیے یہاں بھیجا گیا تھا کہ مکان سے کوئی پیچھے کی

طرف سے فرار کی کوشش کرے تو وہ اسے روکیں۔ انہیں پتا نہیں تھا کہ ان کی ایک ٹیم ہمارے قبضے میں آ چکی تھی اور اب ان کی باری تھی۔ وسم نے کچھ دیر بعد دوسرا پتھر اچھالا تو وہ واضح مشکوک ہو گئے۔ ان میں سے ایک دہلی آواز میں بولا۔

”اس طرف کوئی ہے۔“

”میں دیکھتا ہوں۔“ دوسرے نے کہا اور اٹھ کر جھکا جھکا اس طرف بڑھ گیا۔ پہلا بھی اسی سمت میں دیکھ رہا تھا اس لیے میں دبے قدموں اس تک پہنچا تو اسے کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس کی کپٹی پر کھڑی تھیلی ماری۔ وہ جھول کر گرا اور ساکت ہو گیا۔ میں نے احتیاطاً ایک ہاتھ اور مارا تاکہ کوئی کسر رہ گئی ہو تو وہ پوری ہو جائے۔ جیسے ہی میں اسے اٹھا کر پیچھے آیا وسم نے اس کی جگہ لے لی۔ اتنی دیر میں اس کا ساتھی واپس آنے لگا تھا اور جب تک اسے احساس ہوتا کہ اس کے ساتھی کی جگہ کوئی اور ہے وسم نے اسے قابو کر لیا تھا۔ اس نے اس کا پستول چھین لیا اور اسے نیچے گرا کر اس کا منہ دبا لیا۔ میں نے اس کی تلاشی لی اور اس کے پاس سے ایک خنجر اور پستول کے دو اضافی کلپ برآمد ہوئے تھے۔ وہ وسم کے نیچے پھل رہا تھا لیکن خود کو چھڑا نہیں پار رہا تھا۔ اس نے چادر اوڑھ رکھی تھی جو اصل میں کیوفلاج کے لیے تھی کیونکہ اس نے آف وائٹ رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور اسے چھپانے کے لیے اوپر سیاہ چادر اوڑھ لی تھی۔

ہم نے اس کی چادر اسی کے خنجر سے کاٹ کر اسے باندھا اور پھر منہ میں بھی کپڑا ٹھونس کر اوپر سے کپڑا باندھ دیا۔ آخر میں اس کی آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی گئی۔ اب وہ پارسل کے لیے تیار تھا۔ ہم ان دونوں کو اٹھا کر لائے اور دیوار پر سے اندر کر دیا۔ دوسری طرف وسم کے آدمیوں نے انہیں سنبھال لیا تھا۔ ہم اندر نہیں آئے بلکہ سڑک کی طرف بڑھے۔ کیونکہ اس طرف بھیجے جانے والے تین افراد کی رپورٹ یہ تھی کہ دونوں گاڑیوں میں دو دو افراد تھے اور وہ اندر تھے۔ قریب جائے بغیر ان پر قابو نہیں پایا جا سکتا تھا، اتفاق سے گاڑیاں اس طرح کھڑی تھیں کہ وہ زمین سے لگ کر جاتے تب بھی ان میں موجود افراد کی نظروں سے نہیں بچ سکتے تھے۔ میں نے وسم سے کہا۔ ”انہیں باہر لانے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔“

”کیا کیا جائے؟“

”تمہارے پاس بے آواز پستول ہے۔“

”ہاں لیکن وہ اندر ہے۔“

”منگوا لو۔“ میں نے مشورہ دیا تو وسیم واپس گیا اور پستول لے کر آگیا۔ اس کا نشانہ مجھ سے بہتر تھا اس لیے اس نے اتنے فاصلے سے ایک گاڑی کا پچھلا ٹائر برسٹ کر دیا کہ گولی چلنے کی خفیف سی آواز بھی گاڑیوں میں بیٹھے افراد تک نہ پہنچے۔ گولی چلنے کی آواز تو ہمیں بھی مشکل سے سنائی دی لیکن ٹائر برسٹ ہونے کا دھماکا اتنا بلند تھا کہ گاڑیوں میں بیٹھے افراد کے ساتھ ہم بھی اچھل پڑے تھے۔ چاروں فوراً گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ ان میں سے ایک بولا ”یہ کیا تھا؟“

”تیری....“ اس کی باقی بات ناقابل اشاعت تھی۔ ”دیکھ نہیں رہا.... ٹائر برسٹ ہوا ہے۔“

وہ آپس میں بک بک کرنے لگے۔ زبان اور گفتگو سے وہ نچلے طبقے کے جرائم پیشہ لگ رہے تھے۔ ان میں سے ایک خاموش تھا جو بعد میں ان کا سردار ثابت ہوا اس نے دھیمی آواز میں غرا کر کہا۔ ”یکو اس بند کرو.... یہ تینوں کہاں مر گئے ہیں اب تک گیٹ کیوں نہیں کھولا؟“

اس کا اشارہ یقیناً دائیں طرف سے آنے والوں کی طرف تھا۔ ان کا کام اندر اتر کر گیٹ کھولنا اور مکمل طور پر چھن یا کمروں میں موجود افراد کو قابو کرنا تھا۔ وسیم نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ تو مجھے معمولی قسم کے ڈاکو لگ رہے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے ویسے مرشد کے گرگے بھی اسی سطح کے ہوتے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے مگر اس صورت میں وہ اتنی خاموشی سے نہ آتے۔ سلطان راہی اسٹائل میں بڑکیں مارتے ہوئے آتے۔ انہیں پولیس یا کسی کا خوف نہ ہوتا۔ دوسرے وہ آٹھ نو بندے نہیں بھیجتا۔ وہ ہمیں اچھی طرح جانتا ہے، کم سے کم ڈھائی تین درجن چھٹے ہوئے بد معاش روانہ کرتا۔“

میں وسیم کی بات سے قائل ہوا۔ ”اگر یہ ڈاکو ہیں تو اس غریبانہ سے مکان میں کیا توقع لے کر آئے ہوں گے۔“

”ممکن ہے گاڑیوں سے سبھے ہوں کہ اندر اچھا خاصا مال مل جائے گا۔“

اس دوران میں سردار کی فکر مندی تشویش میں بدل کر وقفے وقفے سے اس کے منہ سے مغلظات کی صورت میں خارج ہو رہی تھی۔ وہ بے تکلفی سے اندر جانے والوں کے خاندان سے ناجائز رشتے قائم کر رہا تھا۔ بالآخر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے دو آدمیوں کو اندر جانے اور ان تینوں کی اطلاع لانے کا حکم دیا۔ وہ دائیں طرف سے روانہ ہوئے۔ وسیم نے اپنے آدمیوں کو ان کے بارے

میں خبردار کیا۔ ”انہیں بھی خاموشی سے قابو میں کرنا۔“ مگر وہ انہیں خاموشی سے قابو میں نہ کر سکتے تھے۔ ان میں سے ایک نے قابو کیے جانے کے دوران فریاد کی۔ ”ہائے ماں....“

الفاظ کی صورت میں یہ فریاد ہم نے مانگ سے نہ سنی لیکن ویسے یہ آواز سردار اور اس کے دوسرے ساتھیوں کی پہنچ گئی اور وہ فوری طور پر چوکنا ہو گئے۔ سردار نے کہا۔ ”آواز کیسی ہے مجھے گڑ بڑ لگ رہی ہے۔ جو....“

”.... اندر.... ہی پیٹھ جاتا ہے۔“ اس نے خالی جگہوں میں مرصع گالیاں فٹ کی تھیں اور لگ رہا تھا کہ اسے خاصی مشکل ہے۔ معمولی کوشش کے بعد یہ دو بھی قابو میں آ گئے تھے۔ اب باقی دو کو مار دھاڑ کے بغیر قابو میں کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی فائر نہ ہو۔ اگرچہ یہاں دور رس آبادی نہیں تھی لیکن اگر اس پاس کہیں پولیس گشت پر ہوئی اور فائر کی آواز سن کر آ جاتی تو ہم بلا وجہ مشکل میں پڑ جاتے اس لیے میری خواہش تھی کہ معاملہ خاموشی سے ختم ہو جائے۔ اس موقع پر وسیم کی سابق تجویز کام آئی اور ڈاکو گن کے دو بلٹ نے انہیں چونکا یا ضرور تھا لیکن اس سے کہ وہ کچھ سوچتے اور کوئی رد عمل ظاہر کرتے۔ خواب آور دوائے ان کے حواسوں پر قبضہ کر لیا اور یوں تمام کے تمام نو افراد ہمارے قابو میں آ گئے۔ خاص بات یہ تھی کہ انہوں نے اب تک ہم میں سے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ ہم انہیں اور ان کی گاڑیوں کو اندر لے آئے۔

ہم طے کر چکے تھے کہ ان میں سے کوئی ہم میں سے کسی کی صورت نہ دیکھنے پائے۔ اس لیے تمام نو افراد کو رسیوں سے باندھ کر ان کی آنکھوں پر کپڑا باندھ دیا تھا اور انہیں ایک کمرے میں ڈال دیا گیا۔ میں نے غور کیا ان میں سے چھ نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی اور صرف تین کے جسموں پر چٹون قمیض تھی۔ ان کے چہرے اور حلیے بتا رہے تھے کہ وہ اجڈ قسم کے جرائم پیشہ تھے اور شاید ان کا تعلق دیہات سے تھا۔ ان کے پاس سے اور گاڑیوں سے اچھا خاصا اسلحہ نکلا تھا۔ اس میں چار عدد دراز قلیں، دو مشین گنز اور ایک درجن پستول اور ریوالتور تھے۔ اسی حساب سے ایبونیٹیشن بھی تھا۔ مگر ان کے پاس سے کسی قسم کے بم نہیں ملے تھے۔ البتہ رقم موجود تھی..... لیکن کسی کے پاس کوئی شناختی چیز نہیں تھی۔ سردار کے پاس سے موبائل ملا تھا مگر اس میں نہ تو کوئی نمبر فیڈ تھا اور نہ ہی آنے جانے والی کالز کا کوئی ریکارڈ

تھا۔ اس لحاظ سے تو وہ چالاک لگ رہے تھے۔ گویا ان کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا تھا تو خود ان ہی سے ہو سکتا تھا۔ آٹھ بے ہوش تھے اور صرف ایک ہوش میں تھا اس لیے تفتیش کا آغاز اس سے کیا گیا۔ پہلے وسیم کے ایک آدمی نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور دوسرے نے اسے ہینگ بیگ کی جگہ استعمال کیا۔ وہ اچھا خاصا ہاکس تھا۔ ایک درجن کے کھا کر ہوش والے کا حال برا ہو گیا تھا۔ منہ میں ٹھنسنے کپڑے کی وجہ سے وہ فریاد بھی نہیں کر سکتا۔ اسے چھوڑا تو وہ آٹے کی بوری کی طرح نیچے لڑھک گیا۔ وسیم نے آگے آ کر اس کے بالوں کو پکڑ کر اسے دوبارہ کھڑا کیا اور بدلے لہجے اور آواز میں بولا۔ ”تم سمجھ گئے ہو کہ کن لوگوں کے قبضے میں ہو۔ جس طرح ہم تمہیں آسانی سے قابو میں کر سکتے ہیں اسی آسانی سے تمہیں مار کر یہاں اس پاس دفن بھی کر سکتے ہیں۔“

اس نے سر ہلایا اور ناک سے آوازیں نکالیں وہ کچھ بولنا چاہتا تھا۔ وسیم نے اس کے منہ پر بندھا کپڑا اتار دیا اور پھر منہ میں ٹھنسا کپڑا بھی باہر کھینچ لیا۔ وہ ہانپنے لگا۔ اس نے لکھیا کر کہا۔ ”رب کے لیے مجھے نہ مارو۔“

”شکر ادا کرو کہ تمہیں بالکل ہی نہیں مار دیا۔“ وسیم نے اسے تھپڑ رسید کیا اور یہ ایسا تھپڑ تھا کہ اس کی نکیر پھوٹ گئی، ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔ ”کوشش کرنا مجھے غصہ نہ آئے ورنہ سب کو گولی مار کر ایک ہی جگہ دفن کر دوں گا۔ تم لوگوں کی جرات کیسے ہوئی میرے گھر میں گھسنے کی۔“ وسیم کا لہجہ ڈرانے والا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ لرز گیا تھا۔

”ہمیں معاف کر دیں جی۔“

”تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟“

”ہم جی جیدا کے آدمی ہیں۔“

وسیم نے غلطی کی اور اسے باتوں سے بتا دیا کہ وہ سب پکڑے گئے ہیں اگر اسے یہ تاثر نہ دیا جاتا تو وہ زیادہ ڈرتا۔ بہر حال اب بھی وہ تعاون پر آمادہ دکھائی دے رہا تھا۔ وسیم نے اس بار چالاک سے کام لیا۔ ”تمہارا سردار ہے جیدا؟“

”جی وہ باہر موجود تھا۔“

”اب وہ بھی اندر ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”جیدا کیا کرتا ہے؟“

اس نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ ”آپ نہیں جانتے جیدا تو اس سارے علاقے میں مشہور ہے۔ لوگ اس کے نام سے کانپتے ہیں۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”شاہنواز جی۔“ اس نے کہا۔

آفریدی

پاکستان کی شمال مغربی سرحد پر آباد افغان آزاد قبائل میں سے ایک قبیلے کا نام، افغانستان اور پاکستان کی سرحد کے درمیان آباد ہے اس کی آٹھ شاخیں ہیں، سب سے مشہور ڈاکٹیل ہے۔ ان کا علاقہ پہاڑی ہے جہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کا گزارہ درہ خیبر سے گزرنے والے قافلوں کو لوٹنے پر تھا۔ سلطنت انگلیش کو ان کے خلاف دس مرتبہ تادیبی جنگ لڑنی پڑی۔ حکومت پاکستان نے ان کی اصلاح کی طرف موثر قدم اٹھایا ہے۔ اب ان کے نوجوان پاکستانی افواج میں بھرتی ہوتے ہیں اور تعلیم و دستکاری کو بھی فروغ دیا جا رہا ہے۔

مرسلہ: سلیم آفریدی، دہلی

”جیدا اور تم لوگ کیا کرتے ہو؟“

”ہم ڈاکو ہیں جی۔“

”یہاں کیا کرنے آئے تھے؟“

وہ ہچکچایا پھر اس نے جواب دیا۔ ”ہمیں سردار لایا تھا اسے معلوم تھا کہ یہاں کیا کرتا ہے۔“

میرا خیال تھا کہ وہ زیادہ ہی انجان بن رہا تھا۔ یہ بات وسیم نے بھی محسوس کی اور اسے کچھ دیر کے لیے پا کر کے حوالے کیا۔ مزید ایک درجن کے کھا کر شاہنواز چلانے اور بلبلانے لگا تھا۔ ”ہائے.... ہائے.... اوئے مینوں نہ مار.... ہائے اوئے رہا.... بس کر ظالما۔“

مگر ظالما اس وقت رکا جب وسیم نے اسے اشارہ کیا۔ شاہنواز کی حالت اب اتنی خراب ہو گئی تھی کہ کئی منٹ تک وہ بولنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ وسیم نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اب تم سمجھ گئے ہو کہ کسی سوال کا جواب نہ دینے یا جھوٹ بولنے کی کیا سزا ہو سکتی ہے۔“

میں نے مداخلت کی۔ ”اتنا کھڑاگ پالنے کی کیا ضرورت ہے۔ گولی مارو اور پیچھے کہیں دفن دو کون پوچھنے آئے گا۔ یہ معمولی درجے کے اچکے ہیں ان سے کیا پوچھنا؟“

”نہیں جی میں بتاتا ہوں۔“ اس نے بوکھلا کر کہا۔ ”ہم.... ڈاکا مارنے آئے تھے۔“

”ڈاکا مارنے آئے تھے اور اس غریب سے مکان میں؟“

”خبر نے بتایا تھا کہ یہاں پیسے والے لوگ آئے ہیں۔“
 ”اور تم لوگ دوڑے چلے آئے۔“ وسیم نے
 استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”یہ نہیں سوچا کہ واپسی کیسے ہوگی؟“
 میں نے وسیم کو اشارہ کیا اور ہم باہر آئے۔ ”مجھے لگ
 رہا ہے یہ اب بھی پورا سچ نہیں بول رہا ہے۔ ان سے الگ
 الگ پوچھ کر پتہ چلے گا اور یہ کام صبح سے پہلے کرنا ہے۔“
 ”آپ کے ذہن میں کوئی بات ہے؟“
 ”ہاں اگر انہیں کسی نے بھیجا ہے تو ہمیں جلد از جلد
 یہاں سے نکل جانا ہوگا۔“

وسیم سمجھ گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں سے ان سب
 کو ہوش میں لانے کو کہا۔ ان کے پاس ایونیا تھی۔ انہوں
 نے اسے استعمال کیا تو چند منٹ میں سب ہوش میں آگئے
 تھے۔ سردار اور اس کا ساتھی کسی قدر مشکل سے ہوش میں
 آئے تھے کیونکہ وہ دوا کی مدد سے بے ہوش کیے گئے
 تھے۔ ان کو باری باری لے جا کر دوسرے کمرے میں
 سوالات کیے گئے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ ان میں سے کوئی
 بھی پوری بات نہیں بتا رہا تھا۔ ایک بات کا اقرار سب کر
 رہے تھے کہ وہ ڈاکو تھے اور یہاں ڈاکا مارنے آئے تھے لیکن
 اس کے علاوہ سب نے کوئی نہ کوئی جھوٹ بولا تھا۔ ایسا لگ
 رہا تھا کہ سب کوئی نہ کوئی ایسی بات چھپا رہے تھے جو ان کا
 مشترکہ مقصد تھا۔ میں نے وسیم سے کہا۔ ”وقت نہیں ہے ان
 سے اگلوانے کے لیے ڈراما کرنا پڑے گا۔“

”آپ کے پاس کوئی پلاٹ ہے؟“
 ”ہاں ایک پلاٹ ہے۔“ میں نے کہا پھر وسیم کو اپنے
 پلاٹ سے آگاہ کیا۔ اسے پلاٹ پسند آیا تھا اور اس نے چند
 ترامیم تجویز کیں جو میں نے منظور کر لیں۔ میں اور وسیم
 کمرے میں آئے وسیم بولا۔ ”تم لوگ پورا سچ نہیں بول رہے
 ہو اس لیے تمہارے لیے سزائے موت کا فیصلہ ہوا ہے۔
 صرف ایک موقع ہے جان بچانے کا اور وہ ہے پورا سچ۔“
 ”تم ہمیں نہیں ڈرا سکتے۔“ جیدا سردار نے جیداری
 سے کہا۔

”اچھا پہلے تم سے کرتے ہیں۔“ وسیم نے کہا اور
 اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور انہوں جیدا کو بازوؤں سے پکڑ
 کر اٹھا لیا۔ وہ چل رہا تھا اور شور شرابا کرتے ہوئے
 دھمکیاں دے رہا تھا کہ وہ کیا کرے گا۔ مگر اس کی دھمکیاں
 منجھکے خیز تھیں۔ ان سب کی آنکھیں بند تھیں اس لیے وہ
 صرف سن سکتے تھے۔ وسیم کے اشارے پر اس کے آدمی جیدا

کو مکان کے عقبی حصے میں لے آئے اور وسیم نے ہلر
 سے کہا۔ ”کلمہ شریف پڑھ لویا چاہو تو اپنے گناہوں کی
 معافی مانگ لو۔“
 سردار اب گالیاں بھی دے رہا تھا۔ وسیم نے اس
 کے سر کے پاس پستول سے فائر کیا تو اس نے اسکی طرف
 جیسے سچ گولی لگی ہو اس سے زیادہ اسے مہلت دی۔
 کیونکہ وسیم نے ساتھ ہی پستول کی نال اس کے سر پر
 اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے وہیں چھوڑ کر ہم واپس آئے
 جیدا کے باقی ساتھیوں کی حالت خراب تھی۔ ایک تو فائر
 بھی ہو گیا تھا اور اس نے قالین گندہ کر دیا تھا۔ وسیم نے
 سے کہا۔ ”یہ کیا قالین بچانے کے لیے اسے باہر لے کر
 مارا تو انہوں نے اس طرح گندہ کر دیا۔ باہر نکالو
 حرامیوں کو۔“

وسیم کے آدمی انہیں کھینچ کر باہر لے آئے۔ اس
 پوچھا۔ ”کوئی پچھتا چاہتا ہے یا سب کا کام تمام کروں۔“
 ”میں بتاتا ہوں۔“ وہ تڑپ کر بولا جس نے قالین
 گندہ کیا تھا۔

”چپ کر سو روئے ختم۔“ جیدا کا نائب پتھر
 بولا۔ ”مرنے سے ایسا ڈر لگتا ہے تو ماں۔۔۔۔۔“
 وسیم نے اس کے منہ پر ٹھوک ماری تو اس کا جملہ اوجھ
 رہ گیا تھا۔ وسیم نے دھاڑ کر اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”اب
 اس سو را کو لے چلو۔“

”ہاں لے چلو۔“ نائب بولا۔ وہ سچ جیدا را آدمی تھا
 وہ خود کھڑا ہو گیا اور اسے مکان کے عقبی حصے میں لا کر دی
 ڈرایا کیا گیا۔ ہم واپس آئے تو باقی پارٹی سچ بولنے کا فیصلہ کر
 چکی تھی۔ مگر ہم ان پر اعتبار نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہیں
 باری باری الگ لے جا کر پوچھ گچھ کی اور اگلے ایک گھنٹے
 میں صورتِ سال واضح ہو گئی۔ اس بار انہوں نے سچ ہی بولا
 تھا۔ قصہ یہ تھا کہ جیدا اور اس کا گروہ لوٹ مار کرتے تھے۔
 ان کا علاقہ یہاں سے آگے تھا مگر کبھی کبھی وہ پٹدی بھی
 آجاتے تھے۔ یہ مکان انہوں نے خاصے عرصے سے باز رکھا
 تھا اور ایک دو بار یہاں کرائے دار آئے تو انہوں نے انہیں
 بھگا دیا۔ دراصل یہ مکان ان کا اڈہ تھا۔ وہ عقبی سمت سے
 یہاں آمد و رفت کرتے تھے۔ اصل وجہ جس کے لیے سردار
 اور اس کے نائب نے ”جان دینا“ گوارا کی۔ وہ یہ تھی کہ
 انہوں نے یہاں لوٹ کا مال چھپا رکھا تھا۔ یہ سن کر ہم حیران
 رہ گئے تھے۔

معین میں جہاں نیم لگے تھے وہاں زمین کچی تھی اور
 انہوں نے زمین میں ایک مضبوط قسم کا دھاتی ٹرنک دبا رکھا
 تھا۔ تقریباً نصف سینٹی میٹر موٹی فولادی چادر کا یہ ٹرنک ایک
 لکڑی کی پٹی میں رکھا تھا تاکہ اسے ٹرنک نہ لگے۔ پہلے آدمی
 کے بیان سے ہم سمجھے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے جان بچانے
 کے لیے لیکن جب دوسرے اور تیسرے نے بھی اس کے
 بیان کی تصدیق کی تو ہمیں یقین آ گیا۔ ہماری قسمت دیکھیں
 کہ خفیہ ٹھکانہ تلاش کیا تو وہ ڈاکوؤں کا ڈیرہ نکلا۔ وسیم اور
 میں نے الگ جا کر میٹنگ کی۔ ”یہ تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔“
 ”اس کے باوجود ہمیں یہ جگہ چھوڑنی پڑے گی۔“ وسیم
 نے کہا۔

میں نے سر ہلایا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو کیونکہ ان
 لوگوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ آٹھ افراد کا قتل بہت مشکل کام ہے
 ایک دو ہوتے تو سوچا جاسکتا تھا اور انہیں چھوڑ دیا تو ہم غیر
 محفوظ ہو جائیں گے۔“

وسیم جھنجھلا گیا۔ ”اپنی بھی کیا قسمت ہے، ابھی آکر
 بیٹھے بھی نہیں تھے کہ یہ نازل ہو گئے۔ اب یہاں سے بھی جانا
 پڑے گا۔“

”مجبوری ہے دوست۔“ میں نے اس کے شانے پر
 ہاتھ رکھا۔ ”یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے کہ ہم بے خبری میں شکار
 نہیں ہوئے ورنہ یہ ہمیں کہاں چھوڑتے۔“
 ”تب کیا خیال ہے ہم بھی ان کے ساتھ وہی سلوک
 نہ کریں؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم جرائم پیشہ نہیں ہیں اس
 لیے ان کے ساتھ وہ سلوک نہیں کر سکتے۔“

”تب کیا کریں انہیں ایسے ہی چھوڑ دیں کیا؟“
 ”ایسے ہی نہیں چھوڑیں گے ان کی وجہ سے ہمیں یہ
 جگہ چھوڑ کر جانی پڑے گی اس لیے انہیں اس کا خلیا زہ بھگتنا
 پڑے گا۔“ میں نے کہا۔ ”انہوں نے جو مال دبا رکھا ہے وہ
 ہم لے جائیں گے۔“

وسیم خوش ہو گیا۔ ”یہ ٹھیک ہے ہمارے لیے تو یہ حلال
 بھی ہوگا۔“

وقت کم تھا اس لیے ہم تیزی سے حرکت میں
 آئے۔ سب نے اپنے چہرے نقابوں سے چھپائے اور پھر
 ان کی آنکھوں سے پٹیاں اتاریں۔ یہ دیکھ کر ان کا صدمہ
 سے برا حال ہو گیا کہ سردار اور اس کا نائب زندہ تھے۔ بلکہ
 او خوفزدہ بھی تھے کہ اب وہ دونوں انہیں نہیں چھوڑیں

گے۔ جس کا پیشاب خطا ہوا تھا اس نے ہم سے کہا۔ ”تم نے
 دھوکا دیا۔“

”تو کیا شرافت سے پیش آتے تم جیسے ڈاکوؤں
 سے۔“ وسیم نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

”سردار مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ اس نے
 کہا۔ ”بلکہ ہم میں سے کسی کو نہیں چھوڑے گا۔“

”یہ تم لوگوں کا آپس کا معاملہ ہے۔“ وسیم نے
 لا پرواہی سے کہا۔ ”اب اٹھو اور زمین کھودو۔“

زمین کھودنے کے آلات بھی وہی لائے تھے ورنہ
 ہمارے پاس کہاں تھے۔ لکڑی کا بکس زمین میں دو فٹ کی
 گہرائی میں تھا۔ مٹی بہت سخت نہیں تو بہت نرم بھی نہیں تھی۔
 بہر حال تین آدمیوں نے مل کر آدھے گھنٹے میں زمین کھود
 ڈالی۔ لکڑی کا بکس دوبائی تین فٹ کا تھا۔ اس پر پلاسٹک کور
 بچھا تھا تاکہ یہ اوپر سے آنے والی نمی سے محفوظ رہے اور
 تالے پر باقاعدہ پلاسٹک چڑھا کر اسے دھاگے سے سیل کیا
 گیا تھا اس لیے بکس اور تالا دونوں صاف ستھری حالت میں
 تھے۔ اس کی چابی سردار کے پاس ملی بلکہ اندر موجود لا کر کی
 جانی بھی اس کے اور نائب کے پاس ہی تھی یہ دو چابیوں سے
 کھلنے والا لاکر تھا۔ بکس کا ڈھکن کھولا تو لا کر سامنے آ گیا۔ یہ
 بالکل صاف ستھری حالت میں تھا کیونکہ اندر بھی پلاسٹک
 شیٹ بچھائی گئی تھی جو لا کر کوئی اور مٹی سے محفوظ کر رہی
 تھی۔ چابیاں لگا کر اسے کھولا تو جب ہم نے اندر جھانکا تو
 ہماری اپنی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔

لاکر ڈھائی فٹ چوڑا، پونے دو فٹ لمبا اور کوئی دو
 فٹ ہی گہرا تھا۔ یہ پورا لاکر تقریباً اسی فیصد سونے کے
 زیور رات اور کرنسی کی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ کرنسی نیچے تھی
 اس پر گتے کی ایک شیٹ تھی اور پھر اوپر سونے کے زیورات
 بھرے ہوئے تھے۔ ان کا وزن کسی طرح دس بارہ کلو گرام
 سے کم نہیں تھا۔ یہ میں خالص سونے کا وزن بتا رہا
 ہوں۔ ورنہ کھوٹ، پتھر گینے اور ڈوریاں وغیرہ ملا کر وزن
 بیس کلو گرام سے بھی زیادہ لگ رہا تھا۔ وسیم نے
 کہا۔ ”میرے خدا ان لوگوں نے تو بہت لوٹ مار کی ہے۔“
 ”پتا نہیں کتنے غریبوں کو ان کی ساری عمر کی جمع پونجی
 سے محروم کر دیا ہوگا اور نہ جانے کتنی عورتوں سے ان کا زیور
 لوٹا ہوگا۔“

ایک کھدائی کرنے والے نے حسرت سے
 کہا۔ ”پانچ سال سے جمع کر رہے تھے۔ سردار نے کہا تھا

کہ دس سال میں سب کروڑ پتی ہو جائیں گے۔“ اس نے خضبناک نظروں سے سردار کی طرف دیکھا۔ ”بس ضرورت کا لیتے تھے۔“

میرا خیال تھا کہ سردار انہیں بیوقوف بنا رہا تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں کوئی ٹارگٹ بنا رکھا تھا جب وہ پورا ہو جاتا تو وہ باقی سب کو مار دیتا یا دھوکا دے کر ایسا غائب ہوتا کہ وہ اسے تلاش ہی کرتے رہ جاتے۔ میں نے بھی بھڑپور نکال کر دیکھا۔ اس میں بہت اچھا والا زیور بھی تھا یعنی بھاری اور کئی تولے کا بنا ہوا اور ایسی معمولی چیزیں بھی تھیں جو شاید ایک گرام کی بھی نہ ہوں۔ اتنی ہلکی چیز کوئی غریب عورت ہی پہن سکتی تھی۔ سویرا، ماں جی، بھائی، آپا اور سنی کے پاس کوئی زیور چاہے وہ اتنی ہی کیوں نہ ہو تولے سے کم کا نہیں تھا۔ میرا سینہ بوجھل ہو گیا۔ ان ڈاکوؤں نے نہ جانے کتنے گھروں کے خواب اجاڑے ہوں گے۔ وہ اتنے سفاک اور بدکردار تھے کہ انہوں نے معمولی سی چیز بھی نہیں چھوڑی تھی۔ پھر مجھے اور وسیم کو غصہ آنے لگا۔ ہمارا رد عمل دیکھ کر کھدائی کرنے والے تینوں ڈاکوؤں کی حالت خراب ہونے لگی۔ ان میں سے ایک بولا۔ ”ہمارا قصور صرف اتنا ہے کہ ہم سردار کے کہنے پر چلتے تھے۔“

”بکواس کرتے ہو۔“ وسیم نے اسے لات ماری۔ ”اگر سردار کہتا اپنی ماں کو لوٹ لو تو کیا تم ایسا ہی کرتے۔ تم سب برابر کے شریک ہو اور اس قابل ہو کہ تمہیں قتل کر کے اسی گڑھے میں دفن کر دیا جائے۔“

وہ سمجھے کہ وسیم کا ارادہ سچ ایسا ہی کرنے کا ہے، وہ چلانے اور معافی مانگنے لگے۔ وسیم کے آدمیوں نے انہیں دوبارہ باندھ دیا۔ ان سب کو ایک خالی کمرے میں ڈال دیا۔ ان کاموں میں صبح ہو گئی تھی۔ وسیم کے آدمیوں نے روانگی کی تیاری شروع کر دی اور طے ہوا کہ ابھی ہم کوٹھی پر جائیں گے۔ گاڑیاں نہیں تھیں۔ پینٹنگ کے بعد دو آدمی کوئی چھوٹا ٹرک لینے گئے۔ وسیم نے انہیں ناشا لانے کو بھی کہا تھا کیونکہ کچن کا سامان بھی پیک ہو گیا تھا۔ ایک گھنٹے بعد وہ ایک شہر ورٹرک کے ساتھ ناشتے میں حلوہ پوری اور چھوٹے لے آئے۔ باری باری سب نے ناشا کیا اور اس دوران میں ٹرک پر سامان بھی لوڈ کرتے رہے۔ ایک گھنٹے بعد جب سورج کسی قدر بلند ہو گیا تو ٹرک اور دوسری گاڑیاں روانہ ہو گئیں۔ سب سے پہلے لاکر نکال لیا تھا اور گڑھے کو مٹی سے پُر کر دیا تھا۔ اس پر اس طرح سے سوکھے پتے بکھیر دیئے کہ

کسی کو کھدائی کا شک نہ ہو۔ آخر میں وہاں صرف میں اور وسیم رہ گئے تھے۔ میں نے وسیم کو روک لیا تھا۔ اس نے بیچنے کی پوچھی لیکن عبداللہ کو کال کر کے روانگی کا بتا دیا اور پھر اس سے کہا کہ وہ کوٹھی پر آ کر لاکر لے جائے۔ اس کی چابیاں وسیم کے پاس تھیں۔ جب سب چلے گئے تو اس نے پوچھا۔ ”ہم کیوں رکے ہیں؟“

”مجھے اب بھی شک ہے کہ انہوں نے پوری بات نہیں بتائی ہے۔ اس قسم کے ڈاکو کسی قسم کی مدد کے بغیر آزادانہ نہیں پھر سکتے ہیں۔“

”یہ تو لازمی بات ہے ان کو کسی نہ کسی ہا اثر آدمی کی مدد حاصل ہوگی۔“

”میں یہی دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کے پیچھے کون ہے۔“

”کیا اس سے کوئی فائدہ ہوگا؟“ وسیم نے کہا۔ ”نہیں تو ارادہ ہے ان کو یہیں بندھا چھوڑ کر چلا جاؤں مجھے پیاسے مر جائیں۔“

”نہیں یار ہم ایسی سفاکی نہیں دکھا سکتے۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہو سکتا ہے کوئی فائدہ ہو ہی جائے۔“

”کرنا کیا ہے؟“

ڈاکوؤں کی دونوں گاڑیاں یہاں موجود تھیں۔ ان کا سارا اسلحہ ہمارے قبضے میں آ گیا تھا۔ ”ہم انہیں آزاد ہونے کا موقع دیں گے اور پھر پیچھا کر کے دیکھیں گے کہ وہ کہاں جاتے ہیں۔“

وسیم نے کسی قدر غور کے بعد سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے یہ کر کے دیکھتے ہیں۔ ویسے مجھے اس بے چارے مالک مکان کا خیال آ رہا ہے ہم تو چلے جائیں گے بعد میں وہ مشکل میں نہ پڑ جائے۔“

”اس کا کیا قصور ہوگا۔ اس نے مکان کرائے پر دیا اب اسے کیا معلوم کہ ہم کیسے لوگ تھے۔ وہ سچ بول کر اپنی جان بچالے گا۔“

”ہم ڈاکوؤں والے کمرے میں آئے اور وسیم نے ان سے کہا۔ ”تمہاری خوش قسمتی کہ ہم نے تمہارے قتل کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔ ہم یہاں سے جا رہے ہیں تمہارا مال کے کر، ہمیں تلاش کرنا بے کار ہے کیونکہ ہم نے سامنے آئے بغیر یہ مکان کرائے پر لیا تھا۔ اس کے باوجود تمہارا دل چاہے تو شوق سے تلاش کرنا۔“

وسیم نے ان میں سے ایک کے ہاتھوں کی بندش کی قدر نرم کر دی۔ وہ کوشش کرتا تو پانچ دس منٹ میں خود کو آزاد

کر سکتا تھا۔ یہ کام کرتے ہی ہم وہاں سے نکل گئے۔ سڑک پر آ کر ہم نے گاڑی کچھ آگے لے جا کر جنگل میں کھڑی کر دی۔ یہ سڑک سے نظر نہیں آ رہی تھی اور خود ایسی جگہ آگے جہاں سے مکان پر نظر رکھ سکتے تھے۔ ان کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے ایک خیال یہ بھی تھا کہ انہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے لیکن اس میں یہ قیامت تھی کہ پولیس مالک مکان کو پکڑتی اور وہ وسیم کا صورت آشنا تھا۔ اگرچہ وسیم نے اسے جو شناختی کارڈ دکھایا تھا اور کاپی دی تھی وہ جعلی تھا۔ وسیم کو اس کا دکھ تھا کیونکہ بقول اس کے، مالک مکان نہ صرف صورت سے شریف نظر آتا تھا بلکہ درحقیقت بھی بہت شریف تھا۔ اگر پولیس اس سے پوچھ گچھ کرتی تو خطرہ تھا کہ پولیس کا خیال ہماری طرف جاسکتا تھا۔ دوسرا خطرہ خود یہ ڈاکو تھے۔ ہم نے ان کا سارا مال چھین لیا تھا اور اگر ان کی پشت پر کوئی ہا اثر شخص ہوتا تو وہ یقیناً ہمیں تلاش کرنے کے لیے اس کا سپہارا لیتے۔ ہمارے لیے بلاوجہ کی ایک مشکل کھڑی ہو جاتی۔ وسیم نے کہا۔ ”فرض کریں ایسا ہی ہو کہ ان کے پیچھے کوئی ہا اثر آدمی ہو اور وہ اس کی مدد سے ہماری تلاش شروع کریں تو ہمیں کیا کرنا ہوگا۔“

”تب ہم اس شخص کو وارنٹک دیں گے کہ وہ اپنے آدمیوں کو باز رکھے ورنہ اسے نقصان ہوگا۔ بہر حال اب یہ ہمارے لیے اندھا تیر نہیں رہیں گے۔ ہم جب چاہیں گے ان کی گردن تاپ سکتے ہیں۔“

بندھے ہوئے کو آزاد ہو کر نکلنے میں ہمارے اندازے سے زیادہ وقت لگا تھا۔ وہ آدھے گھنٹے بعد گاڑیوں میں باہر نکلے اور مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔ میں اور وسیم گاڑی کی طرف لپکے۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور وسیم نے اوپری خانہ کھول کر دو در بین سنبھال لی۔ اس طرح ہم خاصے فاصلے پر رہتے ہوئے بھی ان کا تعاقب کر سکتے تھے۔ ہم سڑک پر آئے تو وسیم نے کہا۔ ”وہ آگے جا رہے ہیں۔“

گاڑیاں مجھے نظر نہیں آ رہی تھیں لیکن وسیم کوئی چار فٹ اوپر تھا اور اس کے پاس دور بین تھی اس لیے اس نے گاڑیاں دیکھ لیں۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ وہ دائیں بائیں مڑ نہیں گئی تھیں یہ اسلام آباد ایکسپریس وے تھی اور دائیں بائیں متعدد سڑکیں اس سے نکل رہی تھیں۔ دونوں طرف نئی نئی کالونیاں آباد ہو رہی تھیں اور اب پنڈی شہر اس طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ پنڈی جلد فیصل آباد کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ملک کا تیسرا بڑا شہر بن جائے

گا۔ پہلے اور دوسرے نمبر پر ظاہر ہے کراچی اور لاہور ہیں۔ وسیم کے پاس موجود دور بین چھوٹی لیکن خاصی طاقتور تھی۔ اس سے میل بھر کے فاصلے سے آدمی کو شناخت کیا جا سکتا تھا۔ گاڑیاں خاصی تیز رفتاری سے جا رہی تھیں۔ اچانک وسیم نے اطلاع دی۔

”وہ بائیں طرف مڑ رہی ہیں۔“ مجھے اس سڑک تک پہنچنے میں تین چار منٹ لگے۔ اس وقت بھی وہ گاڑیاں میری نظر میں نہیں تھیں لیکن وسیم دور بین سے انہیں نظروں میں رکھے ہوئے تھا۔ اس نے کسی قدر تشویش سے کہا۔ ”میرا خیال ہے یہ مرشد کے علاقے کی طرف جا رہے ہیں۔“

اس علاقے میں وہی چوروں ڈاکوؤں کا سب سے بڑا سر پرست ہے۔ ممکن ہے ان کا اس سے یا اس کے کسی چیلے چچے جاگیر دار سے تعلق ہو۔ مگر کوئی مزید آدھے گھنٹے بعد دونوں گاڑیاں درگاہ مرشدیہ میں داخل ہوتی دیکھی گئیں تو میں اور وسیم دنگ رہ گئے تھے۔ ان لوگوں کا تعلق مرشد سے لگے گا یہ ہم نے سوچا ہی نہیں تھا اور شکر ہے وہ اپنا مال لینے آئے تھے۔ اگر ہمیں پہچان کر آتے تو اس طرح نہ آتے اور ہم مارے نہ بھی جاتے تو مشکل میں پڑ جاتے۔ بہر حال اب وہ جا کر مرشد کو یہ کہانی سناتے اور عین ممکن ہے اس کا شاطر ذہن ہماری طرف جاتا اور وہ ہماری تلاش شروع کر دیتا۔

میں نے وسیم سے کہا۔ ”اب مجھے وہ کوٹھی بھی محفوظ نہیں لگ رہی ہے۔ وہ اس جگہ سے کتنی دور ہے ممکن ہے اب مرشد کے آدمی اسٹیٹ ایجنٹوں کو ٹولنا شروع کر دیں۔“

وسیم بھی فکر مند ہو گیا تھا۔ اس کا خطرہ تھا۔ یہ بات سامنے آتی کہ کوٹھی ہم نے لی ہے تو مرشد کے گرگے وہاں دھواوا بولنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”وسیم اپنے آدمی لگا دو ان لوگوں کی مزید نگرانی کی جانی چاہیے۔“

وسیم نے سر ہلایا۔ ”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“

یہاں موبائل سٹیل نہیں تھے۔ ہم پیچھے آئے جہاں موبائل سٹیل دستیاب تھے۔ وسیم نے کال کر کے اپنے دو بائیک سوار بلوا لیے۔ وہ آدھے گھنٹے میں آگئے تھے۔ وسیم نے انہیں ڈاکوؤں کی گاڑیوں کے نمبر اور دوسری تفصیلات بتائیں۔ ”ان کا ہوشیاری سے تعاقب کرنا ہے اور دیکھنا ہے کہ وہ کہاں جاتے ہیں خاص طور سے ان کے ٹھکانے کا پتا چلانا ہے۔“

ان کو ڈیوٹی پر لگا کر ہم لوٹ آئے تھے۔ جب کوٹھی پہنچے تو وسیم کے آدمی سارا سامان وہاں سیٹ کر چکے

مابنامہ سرگزشت

195

WWW.PAKSOCIETY.COM

194

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے۔ عبد اللہ آکر لا کر لے گیا تھا۔ وسم نے اپنے آدمیوں کو پوری طرح ہوشیار رہنے کا حکم دیا اور ہم عبد اللہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ ان سارے چکروں میں دوپہر ہو چکی تھی اور ہمیں بھوک لگ رہی تھی۔ اتفاق سے کھانا تیار تھا اور فرمائش پر فوراً ہی لگا بھی دیا گیا۔ کھانے کے دوران عبد اللہ ہم سے پوچھتا رہا۔ وہ بھی حیران تھا۔ ”کیا قسمت ہے؟ جہاں جاتے ہیں دشمن پہلے سے موجود ہوتا ہے۔“

”مگر روشن پہلو بھی تو دیکھو کہ ہمیشہ فتح کرا جاتے ہیں اور اللہ دشمن کو نقصان ہوتا ہے یا اس کے منصوبے ہمارے علم میں آ جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بلکہ یہاں سے تو بہت بڑا فائدہ ہو گیا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ عبد اللہ نے سر ہلایا۔
”کاش کہ پہلے پتا چل جاتا کہ وہ مرشد کے آدمی ہیں۔“ وسم نے کہا۔ ”ان کو جانے نہ دیتے مار کرو ہیں دفن کر دیتے۔“

”مرشد کے آدمی اس قابل بھی ہیں۔“ عبد اللہ نے اس کی تائید کی حالانکہ وہ مار دھاڑ سے ذرا کترانے والا آدمی تھا۔ مگر مرشد اور اس کے گروگوں کے معاملے میں وسم کا ہمنوا بن جاتا تھا۔ ایاز ابھی تک گاڑیوں کے چکر میں تھا۔ وہ ٹیکسلا چلا گیا تھا وسم نے اسے بھی کال کر کے انفارم کر دیا تھا کہ کہیں وہ غلطی سے مکان کی طرف نہ چلا جائے۔ اب وہ کوٹھی کی طرف ہی جاتا۔ اس نے دونوں گاڑیاں فروخت کر دی تھیں اور دو گاڑیاں لے لی تھیں۔ اس کے ساتھ وسم کا آدمی بھی تھا۔ وہ شام تک سارے معاملات نمٹا کر واپس آتا۔ وسم ابھی تک مجھ لایا ہوا تھا۔

”شہر میں رہنے میں یہ مسئلہ ہے۔ حویلی اور اس سے پہلے فارم ہاؤس میں ہم نے کتنا عرصہ سکون سے گزارا۔ بلکہ فارم ہاؤس کو تو خود چھوڑ کر آئے تھے۔ کیونکہ وہ آبادی سے دور تھے۔“

”دور تو یہ بھی تھے بس قسمت کی بات ہے۔“ عبد اللہ بولا۔
”یار عجیب ناشکرے ہو۔ دولت سے بھرا لا کر مل گیا ہے، اب مزے سے جو جگہ چاہے خرید لو۔“

عبد اللہ نے کہا۔ ”مری کے بارے میں کیا خیال ہے وہاں آدمی آرام سے سب کی نظروں سے محفوظ رہ سکتا ہے اور جب ضرورت ہو تو آسانی سے یہاں آ سکتا ہے۔“

”چلو اس طرف بھی دیکھتے ہیں۔“ وسم نے کہا۔ ”لیکن پہلے لا کر دیکھتے ہیں۔“

لا کر اوپر میرے کمرے میں رکھا تھا۔ رات زیادہ سو نے کا موقع نہیں ملا تھا اور اس وقت پیٹ بھر کر کھالیا تھا اس لیے کچھ سستی آرہی تھی۔ میں بستر پر دراز ہو گیا اور وسم عبد اللہ کے ساتھ مل کر لا کر کھول کر بیٹھ گیا۔ لا کر خود بھی خاصا وزنی تھا۔ بہ قول عبد اللہ کے ایک من سے کم نہیں تھا اور اب ہی اس کے اندر وزن تھا۔ بڑی مشکل سے تین افراد اسے اوپر لے کر آئے تھے۔ عبد اللہ ایک سفید پلاسٹک شیٹ لے آیا اور انہوں نے پہلے سونے کے زیورات نکال کر اس پر ڈھیر کیے۔ پھر نیچے سے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں۔ یہ ساری پانچ سو ہزار اور پانچ ہزار کی گڈیاں تھیں اور گڈیوں کی تعداد ڈھائی تین سو سے کم نہیں تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ڈاکوؤں میں اتنا اتفاق کیسے ہو گیا کہ انہوں نے اپنی ساری دولت ایک ہی جگہ رکھی تھی اور جگہ بھی سب کے علم میں تھی۔ یہ جتنی بڑی مالیت کا سونا اور رقم تھی ایسا لگ رہا تھا انہوں نے سب اسی لا کر میں چھپا دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس ڈاکو نے جگہ کہا تھا کہ انہوں نے جتنا کمایا تھا وہ سب اسی جگہ چھپا دیا تھا۔ یقیناً ڈاکوؤں میں ایسا تھا اور آپس میں اعتماد بھی تھا کہ کوئی دھوکا نہیں دے گا۔

عبد اللہ کے پاس حساس الیکٹرانک ترازو تھا۔ وہ ترازو اور کچھ نوک دار اوزار لے آیا۔ اس دوران میں کوٹھی کا منتظم شاہ جی کافی لے آیا تھا۔ عبد اللہ نے اسے بھی کام پر لایا۔ وہ زیورات کی ڈوریاں الگ کر رہا تھا۔ وسم اور عبد اللہ گننے نکال نکال کر خالی زیور ترازو پر رکھتے جا رہے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا رفتہ رفتہ وزن بڑھ رہا تھا۔ ایک کلو گرام پھر دو کلو گرام، پانچ کلو گرام، دس کلو گرام اور جب آخری زیور بھی اس پر رکھا تو کل وزن سترہ کلو گرام سے اوپر جا چکا تھا۔ شاہ جی بیزار تھا اس لیے کام ختم ہوتے ہی وہ رخصت ہو گیا۔ اس نے اتنے ڈھیر سارے سونے اور دولت میں بھی کوئی دل چسپی نہیں لی تھی۔ عبد اللہ نے اس کے بارے میں بتایا تھا کہ ایک حادثے میں اپنے بیوی بچوں کو گنوانے کے بعد دنیا سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ معمولی کھانا اور پہنا تھا اور اپنی تقریباً ساری خواہ راہ خدا میں بانٹ دیتا تھا۔ وسم نے کہا۔ ”لیس جناب سترہ کلو گرام گولڈ ہے۔“

”اس میں سے کھوٹ نکال دو تو شاید مشکل سے دس کلو گرام بچے گا۔“ میں نے کہا۔ ”ہمارے ہاں عام طور سے جو سونا بانیس کیرٹ کہہ کر بیچا جاتا ہے اس میں اصل سونا اٹھارہ کیرٹ ہوتا ہے۔ اگر اسے خالص کر لیا جائے تو یہ

چھپس تین فیصد کھوٹ ہوگا۔“

”کھوٹ کا پتا کیسے چلے گا؟“

”بہت آسانی سے۔“ عبد اللہ نے کہا۔ ”ہم سونا چھلکا کر خالص حالت میں لے آئیں گے اور اس کے ڈالے بنا کر فروخت کر سکتے ہیں۔“

اس وقت سونا کوئی پینتالیس ہزار روپے کا دس گرام تھا یعنی پینتالیس لاکھ روپے کا ایک کلو گرام۔ وسم نے حساب لگایا۔ ”اگر دس کلو گرام خالص نکل آیا تو صرف سونا ہی ساڑھے چار کروڑ روپے کا ہے۔“

”یہ رقم بھی میرے حساب سے تین کروڑ سے زیادہ کی ہے۔“ عبد اللہ نے گڈیوں کی طرف اشارہ کیا۔

”مرشد کا ایک اور تحفہ، ابھی تو اس کا پہلا مال بھی خرچ نہیں ہوا۔“ میں ہنسا۔ وسم نے سر ہلایا۔

”لیکن اس میں سے بڑی تیزی سے خرچ ہو رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس کے بعد کیا کریں گے۔“

”آپ غیریت کی باتیں نہ کریں۔“ عبد اللہ نے کسی قدر خفگی سے کہا۔ ”کیا میں نہیں ہوں۔“

”کیوں نہیں ہو یا۔۔۔۔۔“ میں نے اس کی دل جوئی کی۔ ”رقم کی تو بات ہی نہیں ہے، اصل چیز تمہارا اور دوسرے لوگوں کا خلوص ہے۔“

وسم نے اسے کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ ”ناراض کیوں ہوتا ہے بھائی۔۔۔۔۔ بس یہ دولت چیز ہی ایسی ہے کہ آدمی پا کر تھوڑا بہک جاتا ہے۔“

عبد اللہ یاروں کا یاد تھا وہ ناراض ہونے والا آدمی ہی نہیں تھا۔ اس لیے فوراً مان گیا۔ اس نے وسم کے ساتھ مل کر گڈیاں گنی اور مالیت نکالی تو جواب تین کروڑ بارہ لاکھ آیا تھا۔ رقم والا سوٹ کیس بھی یہیں تھا۔ طے ہوا کہ اس کی رقم بھی لا کر میں منتقل کر دی جائے۔ کیونکہ سوٹ کیس ایسے ہی پڑا رہتا تھا۔ اگرچہ عبد اللہ اور وسم کے تمام آدمی قابل بھروسہ تھے لیکن کسی کے ایمان کی آزمائش کیوں کی جائے؟ اس لیے سوٹ کیس کی رقم بھی اسی میں منتقل کر دی گئی اور لا کر کو کمرے کے کونے میں دیوار کے ساتھ سیٹ کر دیا گیا۔ کافی لمبا کرینڈاڑ گئی تھی۔ اس لیے میں نیچے آ گیا۔ عبد اللہ نے بھی آدمیوں کی چھاننی کی تھی۔ اس لیے اب صرف تین ملازم تھے اور اس کے علاوہ خاص آدمیوں کی تعداد چھ تھی۔ ڈنر کے دوران ایاز آ گیا تھا۔ وہ کھانے میں شامل ہو گیا اور کھانے کے دوران میں اکن نے رپورٹ دی۔

”ایک تقریباً نئے ماڈل کی مینیکس ہے۔ مارکیٹ سے پچاس ہزار۔۔۔ کم میں مل رہی تھی۔ دوسری پجارو ہے تین سال پرانی اور سیاہ شیشوں والی۔ اس کی بھی کنڈیشن بہت اچھی ہے۔ اس قسم کی گاڑیوں میں نقل و حرکت آسان ہوتی ہے کیونکہ پولیس یا چیکنگ کرنے والے کم روکتے ہیں۔“

ایاز پانچ لاکھ روپے لے کر گیا تھا اس نے اس میں سے بھی ڈیڑھ لاکھ بچا لیے تھے۔ ڈنر کے بعد وہ وسم کے ساتھ چلا گیا کیونکہ وسم نے اس سے مزید گاڑیوں کی بات کی تھی اور اگلے دن ان کو دوبارہ مارکیٹ جانا تھا۔ حویلی میں موجود بانیس وہیں رہ گئی تھیں۔ نکلنے سے پہلے ان کی نمبر پلیٹس اتار لی تھیں اور انجن اور چیس نمبر رتی سے گھس دیے تھے۔ ان کی مدد سے پولیس سراغ نہیں لگا سکتی تھی۔ وسم نے عارضی طور پر دو بانیس حاصل کی تھیں لیکن اسے اپنے رائڈر دستے کے لیے اچھی بانیس کی ضرورت تھی۔ وہ بہت کارآمد ثابت ہوتے تھے۔ خاص طور سے نگرانی اور خاص مشن کے لیے۔ ان کے لیے طاقتور اور بہترین بانیس کی ضرورت تھی۔ پہلے بھی بانیس ایاز نے لی تھیں۔

اگلے دن وسم کے آدمیوں نے ڈاکوؤں کا ٹھکانا کھوج لیا تھا۔ وہ درگاہ مرشدیہ کے پاس ہی ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے مگر ان کا ڈیرہ گاؤں میں نہیں تھا بلکہ گاؤں سے کسی قدر ہٹ کر تھا اور گاؤں والے ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ ان میں سے پانچ چھ تو آس پاس کے رہنے والے تھے اور دو اسی گاؤں کے تھے۔ سب جانتے تھے کہ وہ مرشد کے خاص آدمی ہیں اس لیے سب ان سے ڈرتے تھے۔ پولیس والے بھی انہیں جھک کر سلام کرتے تھے۔ انہوں نے بیشار وادائیں کی تھیں اور اس دوران میں انہوں نے کئی افراد کو قتل بھی کیا تھا۔ مگر ان کے خلاف بھی ایف آئی آر نہیں گئی۔ اگر کسی نے کوشش کی تو نہ صرف اسے منہ کی کھانی پڑی تھی بلکہ پولیس نے الٹا اسے اندر کر دیا تھا۔ اب لوگ ڈرتے تھے اور ان کے سامنے آنے سے گریز کرتے تھے۔ ظاہر ہے مرشد کی اندھیر نگری میں سارا راج ہی چوہٹ تھا۔

یہ معلومات تشویش ناک تھیں۔ وہ مرشد کے بہت قریبی لوگ تھے اور پولیس بھی ان کی ہمنوا تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ مالک مکان رکڑے میں آیا ہوگا اور اس سے ہمارے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی ہوگی۔ وسم اور اس کے آدمی ہوشیار تھے۔ عبد اللہ نے اسٹیٹ ایجنٹ سے بات کر لی تھی

کہ اگر کوئی اس کے پاس ہمارے بارے میں پوچھتا ہوا آئے تو اسے صاف انکار کر دینا ہوگا۔ اس نے عبداللہ کو یقین دلایا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ وسم اس کے باوجود مطمئن نہیں تھا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ شہری آبادی سے دور ہی کہیں ٹھکانا بنائے گا اور اس مقصد کے لیے اس نے تلاش شروع کر دی تھی۔ جب سے جیدا اینڈ کوکا مرشد سے تعلق سامنے آیا تھا تب سے وسم زیادہ فکر مند تھا۔ اس لیے بھی کہ جیدا اور اس کے ساتھی اپنی دولت کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا کر ہمیں تلاش کر سکتے تھے اور ان سے دور رہنا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ ہم خاصی حد تک محفوظ تھے لیکن وسم کو مالک مکان کے بارے میں فکر تھی۔

حویلی میں مانی اور بیو سے بات ہوئی۔ وہ اب اداس تھے اور واپس آنا چاہتے تھے۔ جب کہ سویرا کہہ رہی ہے کہ ان لوگوں کا یہاں بہت دل لگا ہے اور سادی کا کہنا تھا کہ مانی کا کچھ زیادہ ہی لگ گیا ہے۔ بیو نے کہا۔

”شوہی ہم کو یہاں بہت مزہ آیا ہے۔۔۔ آپ کا پایا صاحب بہت اچھا ہے۔ انہوں نے ہم کو بیٹا بنا لیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اب میں حویلی میں رہوں گا۔“

”صرف پایا اچھے لگے، ماں جی، آپا جی اور سویرا بھی تو ہیں۔“

”سب بہت اچھا ہے۔ ماں جی اور سویرا آپ کے بارے میں بہت پوچھتا ہے۔“

”تو رہو وہاں اور مزے کرو، اتنا دیدی لوگ مل گیا ہے اور سب پکانے کا ماہر ہے۔“ وسم نے اسے چھیڑا۔

”یہاں سارے بے دید ہیں اور کھانا جانتے ہیں پکانا نہیں۔۔۔ اب تو سفیر بھی حویلی میں رہے گا۔“

”نہیں اب ہم واپس آئے گا بہت دن سے آپ لوگوں سے دور ہے۔“ بیو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”اچھا دیکھتے ہیں۔“ میں نے اسے ٹالا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ ابھی وہ اور مانی حویلی میں رہیں۔ پھر مانی سے بات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ اس دوران میں اس نے نہ صرف حویلی کی پوری طرح الیکٹرانک سیکورٹی کر دی ہے بلکہ بابا اور وہاں موجود افراد کو آلات کے استعمال کی تربیت بھی دی ہے۔

”شوہی بھائی اب ہم واپس آجائیں؟“ مانی نے بھی کہا تو مجھے حیرت ہوئی تھی۔ کیونکہ سعدیہ کے مطابق اس کا دل لگ گیا تھا۔

”کیوں بر خوردار اطلاعات تو کچھ اور ہیں کہ واپسی کا ارادہ نہیں ہے۔“

”وہ سادی باقی ہیں نا۔“ مانی جھینپ گیا۔ ”میں نے بھائی کا دوسرا ایڈیشن ہیں۔ وہاں انہوں نے جینا حرام کیا، اور یہاں یہ بھی ہیں اس لیے تو میں واپس آنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے مگر ابھی حالات مناسب نہیں ہیں۔“

”جیسے ہی کوئی مناسب جگہ ملے اور وہاں سیٹ لپے تو تمہیں بلا لیں گے۔“

”کوئی بات نہیں جہاں آپ ہیں وہاں ہم بھی رہ لیں گے۔ اتنی عجلت نہیں کرو۔ ابھی آرام سے رہو۔“ میں نے کہا۔ میں سمجھ رہا تھا شاز یہ میں دل چسپی کے ساتھ لیکن مانی شہر کا رہنے والا تھا اور شہر میں رہنے والوں کے ایک حد سے زیادہ گاؤں میں رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چاہے وہاں ان کو کتنا ہی آرام کیوں نہ ملے مگر وہاں ان سے بات کرنے کا مقصد بھی ان کو روکنا تھا۔ ابھی یہاں ان کی ضرورت نہیں تھی اور وہ چین سے بیٹھنے والے بھی نہیں تھے۔ ان دونوں کے باہر کے کھانوں کا چسکا تھا۔ زیادہ باہر گھومنا یا غیر متعلقہ افراد کی آمد و رفت خطرے سے خالی نہیں تھی۔ فارم ہاؤس میں شام کھانے کی چیزیں ڈیلیور کرنے والے آ رہے ہوئے تھے۔ وہ جی ٹی روڈ پر ایک ایسی جگہ تھا جہاں آس پاس کوئی گھر بھی نہیں تھا لیکن یہ عین شہر تھا اور یہاں اس قسم کی آمد و رفت ٹھیک نہیں تھی۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ مانی اور بیو یا کوئی بھی فرد حویلی سے بغیر حفاظت کے نکلے۔ ان کا اکیلے آنا بھی درست نہیں تھا اس لیے میں نے ان کو منع کر دیا۔ وسم اپنے کام نمٹا لیتا تو ان کو لینے کے لیے آدی بھیج سکتا تھا۔

فی الحال اس کے آدی جیدا گروپ اور درگاہ مرشدیہ کی نگرانی کر رہے تھے۔ وسم نے بائیکس حاصل کرنے کے بعد چار آدی لگا دیے تھے اور وہ بارہ بارہ گھنٹے کی شفٹ میں ڈیوٹی دے رہے تھے۔ ہمارے مکان چھوڑنے کے تیسرے دن رپورٹ آئی کہ جیدا کے آدی کسی شخص کو اغوا کر کے اپنے گاؤں والے ڈیرے پر لائے ہیں۔ میرے ذہن میں فوراً خیال آیا تھا کہ کہیں وہ بے چارہ مالک مکان نہ ہو۔ اب وہ اس سے اپنے طریقے سے پوچھ گچھ کرنا چاہتے ہوں گے۔ ظاہر ہے وہ کسی کے کہے پر اعتبار کرنے والے لوگ نہیں تھے۔ اگر وہ مالک مکان تھا تو اس کی عافیت خطرے میں تھی اور ہم اسے بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے

تھے۔ صرف دعا کر سکتے تھے کہ وہ خیر خیریت سے رہے اگرچہ یہ راز مشکل ہی لگ رہا تھا۔ وسم نے یقین سے بتایا تھا کہ مکان کا مالک اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اور صرف دو بار اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کا شناختی کارڈ جعلی تھا اور وسم کی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ پھر اس نے سادہ پیشوں والی عینک لگا لی تھی۔ وہ وسم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا کہ مکان کس کو دیا تھا۔ شام کو وسم آیا تو پریشان لگ رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”کیا ہوا فکر مند لگ رہے ہو؟“

”شہباز میں نے تصدیق کر لی ہے جیدا کے آدمیوں نے مالک مکان کو اٹھا لیا ہے۔ مجھے خطرہ ہے وہ نکل کر کے اسے مار نہ دیں۔“

”ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

”ہم کر سکتے ہیں لیکن۔۔۔۔۔ کیونکہ اس سے ہمارا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے کرنا نہیں چاہتے ہیں۔“ وسم نے رخ لہجے میں کہا۔ ”شہباز صاحب میرا ضمیر مطمئن نہیں ہے۔ وہ عام آدمی ہے اور بیوی بچوں والا ہے۔ اس کی تمنائیاں ہیں جو اپنے باپ سے بہت محبت کرتی

ہیں۔ جب میں اس سے مکان کی بات کر رہا تھا تو مستقل ان کے فون آرہے تھے۔“

وسم بہت مضطرب لگ رہا تھا میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”اگر تم چاہتے ہو تو ہم اسے بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں لیکن کیا یہ اس کے ساتھ مزید دشمنی نہیں ہوگی۔ فرض کرو ہم اسے ابھی چھڑا لیتے ہیں لیکن بعد میں اسے کون بچائے گا۔ یہ تو ایک طرح تصدیق کرنے والی بات ہوگی کہ اس کا ہم سے تعلق ہے۔“

”یہ سب بعد کی بات ہے شہباز صاحب میری چسپی حس کہہ رہی ہے کہ وہ بہت سفاک لوگ ہیں اور پھر ان کی اتنی بڑی دولت کچھ نہیں گئی ہے اس کی واپسی کے لیے انہیں دس لوگوں کو قتل کرنا پڑے تو وہ یہ بھی کر سکتے ہیں۔“

”یعنی ہمیں ایکشن کر کے اسے وہاں سے نکالنا ہوگا؟“

”بالکل اور یہ مرشد کے لیے ایک دھچکا بھی ہوگا اسے اپنے اہم بندوں سے محروم ہونا پڑے۔“

”میں نے سوچا۔“ اگر یہ مرشد کے خاص آدمی ہوئے تو یقیناً اس کے لیے دھچکا ہوگا ورنہ اسے آدمیوں کی پرواہ نہیں ہوتی ہے۔“

”اگر یہ اس کے خاص آدمی نہ ہوئے تو اور اچھی بات

نسخہ سپر پاور

ملاؤں لا علاج اور خوف زدہ حضرات کیلئے عظیم سرمایہ طاقت

جسمانی اعصابی اور خاص کمزوری شوگر، بلڈ پریشر کی وجہ سے پریشان مریض زندگی میں ایک بار اسے ضرور استعمال کریں اور تمام عمر فرٹ رہیں

نوٹ نسخہ سپر پاور: سونے، چاندی یا قوت، زمرہ، عقیق

مرجان اور ہیرے جواہرات کا مرکب ہے جو کہ بہت قلیل مقدار میں تیار ہوتا ہے لہذا یہ بازار سے نہیں ملتا صرف ہمارے ہاں ہی دستیاب ہے۔ آپ خود ملیں یا گھر بیٹھے فون کر کے وی پی پارسل منگوائیں

کورس 15 دن صرف 2500 روپے

پتھری گردہ مثانہ یا پتہ میں ہوا نشاء اللہ

موتی پاپا: جسم کی فائو جی بی پتہ بن کر خراب ہو جانے کی

ریٹ بن کر نکل جائے گی۔

کورس 20 دن صرف 1500 روپے

گیس ٹریبل: سینے کی پلن تیزابیت، دماغی قبض، پیٹ سخت ہونا

معدے کے دھم اور انتڑیوں کے دھم کا کامیاب علاج

کورس ایک ماہ صرف 1200 روپے

بلخشاہ روڈ نزد اڈا الیائی قصہ شہر

حکیم عالم شیرکھل

0345-6397367, 0300-4280816

ہے۔“وسیم نے کہا۔“اس طرح اس کا شک ہماری طرف نہیں جائے گا۔ ہمیں اب دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

”ٹھیک ہے اب یہ بتاؤ کہ اس کی مدد کیسے کرنی ہے؟“

”اسے وہاں سے نکالنا ہے اور ان لوگوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔“وسیم نے کہا۔“یہ کام آج رات کرنا ہے ورنہ شاید کل تک وہ زندہ نہ رہے۔“

”میں بھی چلوں گا۔“

”نہیں میرا خیال ہے میں اور ایاز چار بندوں کے ہمراہ آرام سے یہ کام کر لیں گے۔“

”مجھے پانچواں شمار کرلو۔“میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وسیم کو مجبوراً راضی ہونا پڑا تھا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ ہم نصف رات کو وہاں پہنچیں گے اور پھر موقع دیکھ کر کارروائی کریں گے۔ وسیم نے مکان دیکھا ہوا تھا۔ اس نے کاغذ پر خاکہ بنا کر دکھایا۔ ”یہ احاطہ ہے۔۔۔ سمجھ لیں کہ کوئی سوٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا ہے۔ تین طرف کھیت ہیں اور چوتھی طرف ایک جو ہڑ ہے جس میں بھینسیں نہانی ہیں اور گاؤں کا گندہ پانی اسی میں آکر گرتا ہے۔ جو ہڑ کے ساتھ سفیدے اور پیری کے درختوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا جھنڈ ہے۔ یہ جھنڈ ہمارے کام آسکتا ہے کیونکہ بعض درختوں کی شاخیں احاطے کی دیوار تک چلی گئی ہیں۔“

”اندر کی کیا صورت حال ہے؟“ میں نے خاکے پر غور کیا۔

وسیم نے درختوں والی دیوار کے ساتھ کمرے بناتے ہوئے کہا۔ ”اس طرف کمروں کی قطار ہے، پھر اس سے مخالف سمت میں دوسری قطار ہے۔ لمبائی بتائی ہے کہ کمرے اچھے خاصے ہیں۔ پھر اس سمت میں لائن سے شاید لیٹرین غسل خانہ اور پکن کا چھپرہ ہے۔ اس میں تندور بھی لگا ہے۔“

”ملازم بھی ہیں وہاں؟“

”ہاں دن میں دو افراد آتے ہیں، اسی گاؤں کے ہیں۔ وہ شاید کھانے پکانے اور صفائی ستھرائی کا کام کرتے ہیں۔ وہ صبح سویرے آتے ہیں اور سات بجے تک چلے جاتے ہیں۔“

”ان کے علاوہ کوئی مستقل آتا جاتا ہے؟“

”دو دن پہلے دو عورتیں آئی تھیں اور ان کا تعلق یقیناً اس بازار سے تھا۔ وہ رات بھر وہاں رہیں اور صبح گئی تھیں۔“

عبداللہ کو پتا چلا تو اس نے مخالفت کی۔ ”یہ تو آئیل مجھے مار کھنے والی بات ہوگی۔“

”نہیں ہوگی یار اور پھر اُمید ہے کہ کام رٹنا نہ جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے بھی ان کا تعلق مرشد سے ہے اس لیے ہم تیل مارنے جا رہے ہیں۔“

عبداللہ چپ ہو گیا۔ ”آپ کی مرضی مگر صرف ایک بندے کی خاطر۔۔۔“

”یار وہ ایک بندہ نہیں ہے۔“ وسیم نے تیل کے حوالے کیا اور اب وہ مصیبت میں ہے تو میں اسے کس طرح سکتا۔ ہم نے اسے نہیں بتایا کہ ہم کون ہیں اور ہماری کیسے لوگوں سے ہے اب اس پر ہماری وجہ سے آفت آئی ہے تو ہم اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔“

عبداللہ راضی نہیں تھا مگر اس نے محسوس کیا کہ فیصلہ کر چکا ہے اس لیے وہ چپ ہو گیا۔ ایاز کو بھی پریشان شام کو ڈنر کے بعد نکلے تھے۔ عبداللہ نے ساتھ چلنے کے لیے اصرار کیا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ ”تم یہاں ہونا ضروری ہے۔ یہاں نادر بھی ہے اور بہت سی رقم بھی۔“

”ٹھیک ہے۔“ عبداللہ نے سر ہلایا۔ ”لیکن مجھے رابطہ رکھیں گا۔ کوئی بھی مشکل ہوئی تو میں آدھے گھنٹے میں آ جاؤں گا۔“

”یہ ٹھیک ہے تم بیک اپ تیار رکھنا ہم روانہ ہوں۔“

پہلے تمہیں اطلاع کر دیں گے۔“ وسیم نے اس سے کہا۔ لیکن اس وقت ہمیں خیال نہیں آیا کہ جیدا کے ٹھکانے آس پاس موبائل سگنل نہیں تھے۔

☆☆☆

کوشی پر خاصی گہما گہمی تھی۔ کیونٹیلیشن وین اور ایاز کی لائی نئی گاڑیاں آچکی تھیں اور ان کے ساتھ چند دنوں میں خاصا سامان بھی کوشی میں لایا گیا تھا۔ ایک کمرے کو تقریباً لاؤنج میں بدل دیا گیا تھا وہاں بی وی اور ڈش ریسیور تھا۔ طرح کے انڈور کھیلوں کا سامان تھا۔ ڈرائنگ روم سولے کمر تھا جہاں وال ٹو وال کارپٹ بچھا ہوا تھا۔ نیکے اور کھانے کے کمرے۔ وسیم کا بیڈ روم اوپر تھا اس میں بھی قالین تھا۔ بیڈ روم ایاز کے حصے میں آیا تھا۔ وسیم نے پہلے ہی اپنے آدمیوں کو تیار ہونے کا حکم دے دیا تھا۔ وہ تیار تھے اور اب اپنے اسلحے اور دوسرے آلات کی دیکھ بھال میں لگے ہوئے تھے۔ سب نے چست سیاہ لباس پہن رکھے تھے اور ہر ایک پر ایسی سیاہ ٹوپیاں تھیں جنہیں کھینچا جاتا تو وہ چہرے پر نقاب

پہن جاتیں۔ میں نے اور وسیم نے بھی ایسا ہی لباس پہنا۔ میں نے رات کی مہم کے لحاظ سے ہلکا ڈنر کیا تھا۔ پھر گرین ٹی پی لیا۔ اس سے ذہن چاک و چوبند رہتا۔ وسیم سوچ رہا تھا کہ میں نے پوچھا۔ ”لائن آف ایکشن کیا ہوگا؟“

”احاطہ بہت بڑا ہے اور کمرے بھی زیادہ ہیں اس لیے جس کا استعمال بیکار ہوگا۔ خاموشی سے اندر داخل ہونا ہوگا اور جو پہرے پر ہوا اسے ٹھکانے لگانا ہوگا۔“

وسیم کا مطلب واضح تھا۔ میں نے ہنچکا کر کہا۔ ”کیا یہ مناسب ہوگا؟“

”بالکل جناب ان لوگوں کا تعلق مرشد سے ہے اور وہ ان کا کردار سامنے ہے۔ یہ ڈاکو ہیں اور انہوں نے صرف دولت مندوں کو ہی نہیں غریبوں کو بھی لوٹا ہے۔ کتنے ہی افراد قتل کیا ہے۔“

ایاز بھی آگیا تھا اس نے وسیم کی تائیدی۔ ”میں اس قسم کے مجرموں کو اچھی طرح جانتا ہوں جناب۔۔۔ یہ درندوں سے بدتر ہوتے ہیں۔ صرف مال نہیں لوٹتے اور ہانسی نہیں لیتے ہیں بلکہ جہاں جاتے ہیں وہاں عزتیں بھی لوٹ لیتے ہیں۔ مال کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ جان پر بھی صبر آ جاتا ہے پر عزت کا کوئی بدل نہیں ہوتا۔ پورا گھر برباد کر دیتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”اس صورت میں ہم سب کے پاس بے آواز پستول ہونے چاہئیں۔ تاکہ شور نہ ہو۔“

”صرف پستول ہی نہیں لنگھوں پر بھی سائلنسر ہوگا۔“ وسیم نے سر ہلایا۔ ”اس مشن کے لیے خاص طور سے چیک ساختہ ایوزی گننگز نکلائی ہیں۔ ہتھیار بہت شاندار ہیں۔“

کچھ دیر بعد وسیم کا ایک آدمی ہمارا مطلوبہ اسلحہ لے آیا۔ اس میں تین عدد سائلنسر لگے پستول اور تین عدد چھوٹی ایوزی گننگز تھیں۔ اسرائیل نے ان کی نقل تیار کی ہے جو مارکیٹ میں ایوزی کے نام سے دستیاب ہے۔ ہر ہتھیار کے ساتھ دو عدد فائل میگزین بھی تھے۔ آپس میں رابطے کے لیے مختصر سے ریڈیو تھے جو صرف کان پر فٹ آ جاتے تھے۔ یہ وسیم نے حال ہی میں حاصل کیے تھے۔ اس سے پہلے جو ہیڈ سیٹ تھے ان کا ریسیونگ سیٹ الگ سے جیب میں رکھنا پڑتا تھا۔ کیونکہ وہاں پر لائٹ تھی اس لیے نائٹ وژن کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر احتیاطاً تیار کی کے گلاسز جیسے نائٹ وژن عینکیں سب کے پاس تھیں کہ کہیں تاریکی سے واسطہ پڑے تو ان سے کام چلا لیں۔ مشن کے لیے وین کے بجائے ہیلکس اور

موٹر سائیکلوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ دو بانک سوار پہلے سے وہاں موجود تھے اور دو ہمارے ساتھ جاتے۔ ہیلکس میں وسیم اور ایاز ہوتے۔ ڈرائیونگ ایاز کے سپرد تھی۔

بارہ بجے ہم کوشی سے نکلے۔ موسم کسی قدر سرد مگر خوشگوار تھا۔ امید تھی کہ اس موسم میں کوئی باہر سونے کی کوشش نہیں کرے گا لیکن ہم ہر صورت حال کے لیے تیار تھے۔ وسیم کا اندازہ تھا کہ وہاں آٹھ سے دس افراد سے سامنا ہو سکتا ہے۔ بارہ بجے کے بعد اگر پہرہ ہوا تو دو سے زیادہ افراد نہیں ہوں گے اور کیونکہ یہ ظاہر ان کو کسی سے خطرہ نہیں ہے اس لیے وہ بھی اتنے چوکس نہیں ہوں گے۔ ہم آسانی سے ان پر قابو پا سکتے تھے۔ ایک بار ہم اندر داخل ہو جاتے تو پھر ہمیں کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ بیس منٹ بعد ہم اس جگہ کے قریب تھے، ایاز نے خاصی تیز ڈرائیونگ کی تھی۔ ورنہ کوئی اور ہوتا تو آدھا گھٹنا لگتا۔ قریب آتے ہی وسیم نے اپنے آدمیوں سے رابطہ کیا جو درگاہ مرشدیہ کی نگرانی کر رہا تھا وہ بھی اب جیدا اگر روپ کے ٹھکانے کے پاس آگیا تھا۔ ایک سامنے والی طرف تھا اور دوسرا عقب میں کھیتوں کے ساتھ ایک جھنڈ میں روپوش تھا اور وہیں سے نگرانی کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ ہیڈ سیٹ کی ریخ میں نہیں تھے اس لیے وسیم ایک بڑا ریڈیو ساتھ لایا تھا۔ اس کی مدد سے دور موجود افراد سے بھی رابطہ کیا جاسکتا تھا۔ ہیڈ سیٹ آپس میں سوگزی کی ریخ میں کام کرتے تھے۔ اس سے زیادہ ریخ پر یہ کام نہیں کرتے تھے۔ تازہ ترین رپورٹ لے کر وسیم نے ہمیں بتایا۔ ”دو گھنٹے پہلے دو عورتیں آئی ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے اندر سب جاگ رہے ہوں گے؟“ میں نے تشویش سے کہا۔

”امکان یہی ہے۔“ وسیم معنی خیز انداز میں بولا۔ ”لیکن ان میں سے دو تین مصروف بھی ہوں گے۔“

ایاز ہنسا۔ ”باقی کو ہم مصروف کر دیں، جہنم کی طرف مارچ میں۔“

نگرانی کرنے والے اپنی جگہ رہتے۔ کام ہم پانچ افراد کو ہی کرنا تھا۔ ہیلکس اور ہائیکس ایسی جگہ چھوڑیں جہاں ہم آسانی سے واپس آ سکتے تھے۔ عین ممکن تھا ہمیں غلط میں فرار ہونا پڑتا۔ ایاز کے لیے فیصلہ ہوا کہ وہ باہر رہے گا اس نے احتجاج کیا۔ ”باہر کیوں؟“

”تاکہ ہماری طرف سے سگنل ملتے ہی ہیلکس احاطے کے پاس لاسکو، ہمیں ایک بندے کو بھی لے کر جانا

ہے اور امکان ہے وہ اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہیں ہو گا۔“ وسیم نے سمجھایا۔

”او کے پاس۔“ ایاز نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”میں سوچ رہا تھا بہت دنوں بعد کچھ شغل رہے گا۔“

”ممکن ہے تمہاری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔“ وسیم نے کہا۔ ”مگر تمہارا اصل کام ڈرائیونگ ہے، کسی بھی ہنگامی صورت حال میں ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکالنا ہوگا۔“

”کوئی اور یہ کام اتنی اچھی طرح نہیں کر سکتا ہے۔“

میں نے کہا، اور ہم سب نیچے اتر آئے۔ طے ہو گیا تھا کہ میں، وسیم اور اس کے دو آدمی درختوں کی مدد سے اندر اتریں گے اور پھر موقع مل دیکھ کر کارروائی کریں گے۔ جو ہڑ کے پاس سے گزرتے ہوئے درختوں تک آئے۔ بیری اور سفید کے درخت آپس میں اس طرح مل گئے تھے جیسے ایک دوسرے کو سہارا دے رہے ہوں۔ بیری پر چڑھنا ممکن نہیں تھا ورنہ ہم سب خراشوں کے ساتھ دوسری طرف اترتے۔ اس کے لیے سفید کے درخت ہی مناسب تھا۔ ایک سفید دیوار سے کوئی پانچ فٹ کے فاصلے پر لگا تھا لیکن اس کا ایک دو شاخہ دیوار کے نزدیک گیا تھا۔ یہ کچی مٹی کی مدد سے بنائی کوئی نو دس فٹ اونچی اور شاید فٹ بھر موٹی دیوار تھی۔ وسیم نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا اور وہ اوپر چڑھ گیا اس نے دیوار کے نزدیک جا کر ایک رسی باندھ کر نیچے لٹکائی اور دوسرا آدمی رسی کی مدد سے اوپر گیا۔ اس نے اندر جھانکا اور آہستہ سے بولا۔

”اس طرف کوئی نہیں ہے یہ کمروں کے پیچھے خالی جگہ ہے۔“

”نیچے اتر جاؤ۔“ وسیم نے اسے حکم دیا۔ وہ نیچے اتر گیا۔ درخت پر موجود ساتھی نے رسی واپس کھینچ کر ہماری طرف کھینچی اس بار میں گیا میرے بعد وسیم بھی نیچے آ گیا۔ البتہ درخت پر موجود ساتھی کو وہیں چھوڑ دیا۔ جو ہمارے ساتھ اندر آیا تھا اس کا نام حبیب تھا۔ یہاں اندھیرا تھا مگر سامنے والی طرف سے اتنی روشنی آ رہی تھی کہ کام چل رہا تھا۔

کھڑکیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس طرف چار کمرے تھے۔ یہ ساری پرانی طرف کی گول سلاخوں اور لکڑی کے پنوں والی کھڑکیاں تھیں اور خوش قسمتی سے تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ ورنہ کوئی جھانک کر دیکھتا تو ہم صاف دکھائی دیتے اور فوراً ہی وہ ہمارے استقبال کو دوڑتے۔ وسیم نے اشارے سے مجھے پیچھے کی طرف جانے کو کہا اور خود اپنے

ساتھی کے ہمراہ اگلے حصے کی طرف بڑھا۔ میں نے کھڑکی کے پاس سے گزرتا تو کچھ گھبراہٹ سے کوئی اتفاقاً بھی کھڑکی کھول سکتا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ میں نے کھڑکی کے نیچے سے گزر رہا تھا کہ اچانک وہ کھلی اور کھٹک کر بلغم تھوکا۔ میں دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ بلغم مجھ پر نہیں گرا۔

”او.... جلدی آتا.... ابھی دوسروں کو بھی خبر ہے۔“ ایک بوجھل نسوانی آواز نے بتایا کہ اس کمرے میں کیا ہو رہا تھا۔ آدمی نے کھڑکی بند کی اور واپس چلا گیا۔ میں آگے سرکا اور عقبی حصے کی طرف جھانکا۔ دیوار کے کونے سے جھانک کر دیکھا۔ اس طرف کچھ آگے دیوار کے غسل خانہ اور اس سے آگے باورچی خانے کا چھپرہ تھا۔ آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”وسیم اس طرف کوئی نہیں ہے۔“

”سامنے گیٹ کے ساتھ دو بندے بیٹھے ہیں۔“ وسیم نے آگاہ کیا۔ ”پنی رہے ہیں مگر یہاں سے فاصلہ زیادہ ہے۔ گولی درست جگہ نہیں لگی تو دوسرے ہوشیار ہو سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے میں ان کو اس طرف بلاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں لیٹرین کی چھت پر کھنکھنکوں گا۔“

میں نے زمین سے ایک چھوٹا سا کنکر لیا۔ میرا ہاتھ آواز ان دونوں تک پہنچانا تھا اگر بڑا کنکر لیتا تو آواز ان کمروں میں بھی جاسکتی تھی۔ لیٹرین اور غسل خانے کی چھت ٹین کی تھی اور جب کنکر اس پر گرا تو آواز میری توقع سے بلند آئی تھی۔ وسیم نے اطلاع دی۔ ”انہوں نے سن لی ہے اور اب ایک اس طرف جا رہا ہے۔ جیسے ہی وہ لیٹرین والے حصے میں آئے آپ اس کا کام تمام کر دیں۔ یہ کام ایک ساتھ کرنا ہے۔“

”او کے۔“ میں نے جواب دیا اور ساٹھسٹرا لگا پستول نکال لیا اور اس طرف آنے والے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ کچھ دیر بعد نمودار ہوا۔ اس کے شانے پر سیون ایم ایم رائفل لٹک رہی تھی اور وہ تجسس نظروں سے لیٹرین اور غسل خانے کی طرف دیکھ رہا تھا پھر اس نے پوچھا۔

”اوئے اندر کون ہے؟“

میں نے اس کے سر کا نشانہ لیا اور وسیم نے کہا۔ ”ریڈی ٹوشوٹ۔“

”میں بھی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تین تک گولی گا.... ایک.... دو تین۔“

اس کے تین کہتے ہی میں نے گولی چلا دی۔ تقریباً تین فٹ کے فاصلے سے یہ ذرا مشکل نشانہ تھا مگر گولی ٹھیک گئی اور وہ بغیر آواز نہ نکالے گر گیا۔ آواز اس کی رائفل کے گرنے سے آئی تھی لیکن یہ اتنی نہیں تھی کہ اندر موجود افراد سن کر ہنک جاتے۔ اگر کسی نے سنا بھی تھا تو توجہ نہیں دی۔ میں دوڑا اور اپنے شکار کو کھینچ کر عقبی کئی میں لے آیا۔

تقریباً اسی وقت وسیم نے بھی یہی کام کیا۔ اس کا شکار بھی ہاتھ سے مر گیا تھا۔ وسیم نے کہا۔ ”آپ محض تک آئیں۔“

میں دیکھ کر اس کا دل ہلکا ہوا محض تک آیا وسیم اور اس کے ساتھی پہلے کمرے کے دروازے کے سامنے تھے۔ وسیم نے آہستہ سے اسے کھولنے کی کوشش کی اور وہ کھل گیا۔ وہ ایک دم اندر گیا تو میرا دل ایک لمحے کو رک گیا تھا اندر کوئی ہوتا تو وہ وسیم پر گولی چلا سکتا تھا مگر پھر اس نے کہا۔ ”کلیئر۔“

”تیسرے کمرے میں ایک مرد اور ایک عورت ہیں۔“ میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”تب اس کمرے کو نہیں دیکھنا ہے۔“ وسیم نے جواب دیا اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔ ”اسے کسی دوسرے کمرے میں رکھا گیا ہوگا۔“

دوسرا کمرہ ابھی خالی تھا اور اس کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ اب آخری کمرہ گیا تھا۔ وسیم اس کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک طرف سے میں اور دوسری طرف سے وسیم کا آدمی اسے محفوظ رہے تھے۔ ابھی وہ اس کے دروازے تک پہنچا تھا کہ اچانک سامنے والی لائن سے ایک کھڑکی سے رائفل کی نال باہر نکلی اور اس سے پہلے میں وسیم کو خبردار کرنا نال شعلے اگلنے لگی تھی۔ میں نے رائفل اتاری اور کھڑکی کی طرف بڑھ کر مارا فوراً ہی رائفل غائب ہو گئی تھی لیکن اس سے پہلے وہ دس بارہ گولیاں چلا چکی تھی۔ میں نے وسیم کو پکارا۔ کیونکہ اب میں دیوار کی اوٹ میں تھا۔ اس نے بھینچی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔“

مگر وہ ٹھیک نہیں تھا میں نے جھانک کر دیکھا تو وہ کمرے کے دروازے کے عین سامنے ڈھیر دکھائی دیا تھا۔ میری رائفل بے آواز تھی لیکن دوسری رائفل کے شور نے سب کو ہوشیار کر دیا تھا۔ اب سب اندر ہی اندر چلا رہے تھے اور ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا ہے لیکن کوئی کمرے سے باہر آنے کو تیار نہیں تھا۔ وہ سب گھاگ جراثیم پیشہ تھے۔ ہنگامی حالات میں بھی اپنے اعصاب قابو

میں رکھتے تھے۔ میں نے حفظ ماتقدم کمروں کی طرف ایک برسٹ چلا یا اور وسیم کی طرف دوڑا۔ وہ دیوار سے ٹکا بیٹھا تھا اور اس کی دائیں ران سے خون بہہ رہا تھا۔ اس دوران میں اندر موجود افراد نے اسے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ کسی نے شاٹ گن سے فائر کیا تو گولی اس کمرے کے دروازے پر لگی جس کے ساتھ وسیم بیٹھا ہوا تھا۔ گولی نے دروازہ میں سوراخ کر دیا اور مجھے فوری خیال آیا۔ دروازے کے باہر تالا پڑا تھا میں نے پستول سے کٹڈی کے آس پاس کئی فائر کیے اور بالآخر وہ ٹوٹ گئی۔ میں نے دروازہ اندر دھکیلا اور وسیم کی جیکٹ کا کلر تھام کر اسے گھسیٹ کر اندر لے آیا۔ دیوار کی آڑ میں آ کر ہم کسی قدر محفوظ ہو گئے تھے۔ اس دوران میں حبیب دیوار کی آڑ سے سامنے والے کمروں کی طرف فائرنگ کر رہا تھا۔ اس سے بھی ہماری بچت ہوئی ورنہ ہم سامنے تھے اور ہمیں آرام سے شوٹ کیا جاسکتا تھا۔

ایاز بار بار پوچھ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے میں نے اندر آ کر اسے بتایا۔ ”ہم ٹریپ ہو گئے ہیں۔ میں اور وسیم ایک کمرے میں ہیں۔ وسیم زخمی ہے۔“

اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ ہم کمرے میں اکیلے نہیں تھے وہاں ایک کونے میں کوئی شخص بیٹھا تھا کیونکہ اندر روشنی نہیں تھی اس لیے اندر آتے ہی احساس نہیں ہوا تھا۔ میں نے پستول کا رخ اس کی طرف کیا تو وہ جلدی سے بولا۔ ”مجھے مت مارو میں ان کا ساتھی نہیں قیدی ہوں۔“

”یہ مالک مکان ہے۔“ وسیم نے آہستہ سے کہا۔ اس کی طرف سے اطمینان کے بعد میں نے ایاز سے کہا۔ ”ہمیں یہاں سے نکالنا ہوگا لیکن کوئی اندھا قدم مت اٹھانا۔ ابھی دشمن کی طاقت کا درست اندازہ نہیں ہے۔“

وسیم نے حبیب سے پوچھا۔ ”تم کہاں ہو؟“

”میں گیٹ والی سمت ہوں۔“

”ٹھیک ہے وہیں رہو اور اگر کوئی خطرہ محسوس ہو تو واپس چلے جانا۔“

”نہیں۔“ ایاز کی آواز آئی۔ ”ہم آپ کو چھوڑ کر واپس نہیں جائیں گے۔“

میں نے وسیم کے زخم کا معائنہ کیا۔ گولی ران کے اندر تھی لیکن اس نے ہڈی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ میں نے خون روکنے کے لیے اپنا رومال کس کر زخم پر باندھ دیا۔ اس سے خون بہنے کی رفتار میں کمی آئی تھی لیکن وسیم کو طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ہم بھلت

میں نے وسیم کے زخم کا معائنہ کیا۔ گولی ران کے اندر تھی لیکن اس نے ہڈی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ میں نے خون روکنے کے لیے اپنا رومال کس کر زخم پر باندھ دیا۔ اس سے خون بہنے کی رفتار میں کمی آئی تھی لیکن وسیم کو طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ہم بھلت

میں نے وسیم کے زخم کا معائنہ کیا۔ گولی ران کے اندر تھی لیکن اس نے ہڈی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ میں نے خون روکنے کے لیے اپنا رومال کس کر زخم پر باندھ دیا۔ اس سے خون بہنے کی رفتار میں کمی آئی تھی لیکن وسیم کو طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ہم بھلت

میں نے وسیم کے زخم کا معائنہ کیا۔ گولی ران کے اندر تھی لیکن اس نے ہڈی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ میں نے خون روکنے کے لیے اپنا رومال کس کر زخم پر باندھ دیا۔ اس سے خون بہنے کی رفتار میں کمی آئی تھی لیکن وسیم کو طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ہم بھلت

میں جس مہم کو آسان سمجھ کر آئے تھے وہ اتنی آسان بھی نہیں تھی۔ یہ یقیناً جلد بازی اور ناقص پلاننگ تھی جس کی وجہ سے ہم یہاں ٹریپ ہو گئے تھے اور باہر دشمن مورچہ بند تھا۔ اب وہ اتنی آسانی سے ہمیں یہاں سے نکلنے کی اجازت نہ دیتا۔ کمروں کی طرف سے رہ رہ کر پستول، شاٹ گن اور رائفل کا سنگل فائر ہو رہا تھا اور گولیاں دروازے میں سوراخ کرتی گزر رہی تھیں۔ دروازے کے عین سامنے کھڑکی تھی۔ میں پہلے فرش سے لگ کر دائیں طرف گیا کیونکہ یہ کمرہ آخر میں تھا اس لیے دروازے سے گزرنے والی گولیاں زیادہ تر بائیں طرف آ رہی تھیں۔ مالک مکان بھی اسی طرف بیٹھا ہوا تھا۔ قریب آنے پر مجھے پتا چلا کہ اس کی حالت خراب تھی۔ وہ پھٹے ہوئے کپڑوں میں تھا اور یہ کپڑے جاہل جانوں سے آلودہ تھے۔ نیم تاریکی میں اس کے چہرے کے زخموں کے نشانات دکھائی دے رہے تھے باقی جسم کا نہ جانے کیا حال تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا: ”ہم تمہیں چھڑانے آئے ہیں۔“

وہ چونکا۔ ”تم کون ہو؟“

”جلد تمہیں پتا چل جائے گا۔“ میں نے کہا اور خطرہ مول لے کر کھڑکی کے پاس گیا۔ اس کے پٹ کھولے جو مستقل بند رہنے سے جام ہو گئے تھے اور خاصی مشکل سے کھلے۔ اس پر بھی خاصی موٹی سلاخیں تھیں اور انہیں توڑنا تقریباً ناممکن تھا۔ اسٹیل بلیڈ کی آری مل جاتی تب بھی ایک سلاخ کاٹنے میں تقریباً آدھا گھنٹہ لگ جاتا۔ جب کہ وہ بھی نہیں تھی۔ حبیب نے کہا: ”یہ لوگ کمروں کے پیچھے آگئے ہیں اب دیوار کی اوٹ سے مجھ پر فائرنگ کر رہے ہیں۔“

”تم پیچھے گلی میں آ جاؤ۔“ وسیم نے اسے حکم دیا اور پھر ایاز سے پوچھا: ”تم کیا کر رہے ہو؟“

”میں اور اسماعیل دیوار کے ساتھ ہیں۔“

میں نے کہا: ”ہم سامنے سے نہیں نکل سکتے ہیں اس کمرے کے پیچھے کھڑکی ہے۔ اگر کسی طریقے سے اس کی سلاخیں نکال دی جائیں تو ہم باہر نکل سکتے ہیں۔ ہم جس شخص کے لیے آئے تھے وہ بھی یہاں موجود ہے۔“

”میں کچھ کرتا ہوں۔“ ایاز نے کہا۔ ”آپ ان لوگوں کو روکیں اور صحن میں نہ آنے دیں۔“

میں نے کہا: ”اسماعیل سے کہو کہ وہ گلی کا دوسرا سرا سنبھال لے ورنہ وہ لیٹرین والی سمت سے گھوم کر اس طرف بھی آ سکتے ہیں۔“

اسماعیل اندر آ گیا تھا۔ میں واپس دروازے پر آیا۔ اس دوران میں ان لوگوں نے صحن میں چلنے والی روشنیاں فائرنگ کر کے گل کر دی تھیں۔ اسے کمرے کی روشنیاں وہ پہلے ہی بجھا چکے تھے۔ یہ ان کی احتیاط تھی لیکن ایک لحاظ سے انہوں نے ہمارا کام آسان کیا تھا۔ میں نے ٹائٹ وژن نکال کر پیمانی لی۔ یقیناً ہمارے ساتھیوں نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔ فوراً ہی مجھے سامنے کمروں کے دروازوں اور کھڑکیوں کے ساتھ روشنی دکھائی دینے لگے۔ وہ چھپے ہوئے تھے لیکن کچھ بکھرے ہوئے تھے اور یہ سامنے کے چاروں کمروں کے تھے۔ تشویشناک طور پر ان کی تعداد ہمارے انداز سے زیادہ تھی۔ ان چار کمروں میں کم سے کم دس افراد تھے۔ جب کہ دوا مارے گئے تھے اور دو ہمارے برابر کمرے میں محصور تھے۔ ان کی طرف سے ابھی تک کوئی رد عمل سامنے نہیں آیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ غیر مسلح تھے۔ وہ خاموش بیٹھ کر موقع کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے حبیب اور اسماعیل کو ان کے خطرے سے خبر دلائی۔

”ٹائٹ وژن سے یہ دکھائی دے رہے ہیں۔ اب نشانہ بنانے کی کوشش کرو۔“ میں نے کہا۔

”شوٹ ٹوکل؟“ حبیب نے تصدیق چاہی۔

”احتمالاً باتیں مت کرو۔“ وسیم غرایا۔ ”کیا اب وقت ہم کوئی میچ کھیل رہے ہیں۔“

”سوری کمانڈر۔“ حبیب نے جلدی سے معذرت کی۔ اس دوران میں میں نے سامنے والے کمرے میں موجود کھڑکی کے پٹ کے ساتھ لگے ہوئے کانٹا لیا اور ایوزی کا مختصر برسٹ مارا۔ یہ کارگر رہا کیونکہ دوسری طرف سے ایک چیخ سنائی دی اور ہیولہ غائب ہو گیا۔ وہ مراعات تب بھی زخمی ضرور ہوا تھا۔ میں دل ہی دل میں حساب لگاتا تھا کہ اگر دو عورتیں تھیں تو باقی ایک درجن مرد تھے اور میں سے دو مارے گئے تھے ایک زخمی تھا اور ایک براہ راست کمرے میں تھا۔ گویا سامنے والے کمروں میں آٹھ افراد تھے اور یہ تعداد کم نہیں تھی۔ کیونکہ وہ سب جیسے جیسے جرائم پیشہ اور اسلحے کے استعمال سے اچھی طرح واقف تھے۔

فائرنگ سے پتا چل رہا تھا کہ ان کے پاس اسلحے اور پوزیشن کی کمی بھی نہیں تھی۔ حبیب اور اسماعیل بھی ٹائٹ وژن کی مدد سے انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ہماری طرف سے ایک کارگر فائر کے بعد وہ سب محتاط ہو گئے تھے اور اب محفوظ آڑ میں تھے۔

”جناب میں اندر آنا چاہتا ہوں۔“ ایاز کی آواز آئی۔ ”میں کچھ چیزیں لایا ہوں کھڑکی میں راستہ بنانے کے لیے۔“

میں نے پوچھا: ”باہر کون دیکھ رہا ہے۔“

”میں نے سمیر اور کریم کو بلا لیا ہے۔ ایک سامنے ہے دوسرا ہماری والی پوزیشن پر ہے۔“

”ٹھیک ہے آ جاؤ لیکن محتاط رہنا۔ گولیاں دروازے سے گزر کر کھڑکی تک آ رہی ہیں۔“

”میں خیال رکھوں گا۔“ ایاز نے کہا اور ایک منٹ بعد کھڑکی کے سامنے نمودار ہوا۔ میں نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔ تاکہ گولی اس طرف آئے تو پٹ سے گزر کر آئے۔ ایاز نے ایک بھاری ہتھوڑا اور چیمنی اٹھار کھی تھی۔ اس نے کونے والی سلاخ پر چیمنی رکھ کر ہتھوڑے سے ضربیں لگانا شروع کیں۔ سلاخیں سینٹ کی چوکھٹ میں پیوست تھیں۔ اگر یہ لکڑی ہوتی تو کام آسان ہو جاتا۔ مگر سینٹ اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹی۔ یہ پرانی دیوار تھی لیکن نہایت مضبوط تھی۔ میں ایاز کی جدوجہد دیکھنے کے بجائے سامنے نظر رکھنے کے لیے آ گیا۔ اسماعیل اور حبیب کو بھی محتاط رہنے کو کہا۔ وسیم فی الحال کچھ نہیں کر سکتا تھا اس کا خون بہنا بند ہو گیا تھا اس لیے وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ یہاں موبائل سنگل نہیں تھے بلکہ ان کے لیے درگاہ مرشدیہ کے پاس جانا پڑتا تھا۔ حبیب اور اسماعیل کی موجودگی ضروری تھی۔ جب کہ کریم اور سمیر کا بھی اپنی جگہ رہنا ضروری تھا۔ لازمی بات تھی جس طرح ہم کسی سے رابطہ نہیں کر سکتے تھے اسی طرح جیڈ اینڈ کمپنی کسی سے رابطہ کر کے مدد طلب نہیں کر سکتی اس کے لیے یہاں سے نکلنا ضروری تھا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے کریم سے کہا۔

”عقب کا خیال رکھنا کوئی دیوار پھلانگ کر فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔“

”میں دیکھتا ہوں۔“ کریم نے کہا اور اس طرف گیا اور فوراً ہی فائرنگ کی آواز آئی کریم نے بتایا۔ ”دو دیوار سے گولے تھے میں نے دونوں کو اڑا دیا ہے۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ درگاہ مرشدیہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی شاید دو یا ڈھائی کلومیٹر کے فاصلے پر تھی اور اگر وہ وہاں تک پہنچ جاتے تو مدد لانے میں چند منٹ بھی نہیں لگتے اور ہم گھیرے میں آ جاتے۔ وسیم نے آہستہ سے کہا: ”آپ کے ذہن میں بروقت خیال آیا۔“

”بس اچانک آ گیا۔ تین اطراف ہم نے کور کر رکھی ہیں لیکن وہ عقب سے آسانی سے فرار ہو سکتے ہیں۔ بروقت خیال آ گیا ورنہ وہ نکل جاتے تو دس منٹ کے اندر مدد دلا سکتے تھے۔“

دو افراد کے مارے جانے سے ان لوگوں کا حوصلہ پست ہوا تھا اور انہوں نے پھر کوشش نہیں کی بلکہ اس طرف بھی فائرنگ روک دی تھی اب سناٹے میں صرف ہتھوڑا چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ ایاز پوری قوت صرف کر رہا تھا۔ اس کے باوجود دیوار ٹوٹنے کی رفتار سست تھی۔ دس منٹ بعد میں نے جائزہ لیا تو مشکل سے چند انچ گہرا سوراخ ہوا تھا اس رفتار سے کم سے کم دو سلاخیں نکالنے میں کئی گھنٹے لگ جاتے۔ وسیم نے کہا: ”ہمیں ہینڈ گرنیڈ استعمال کرنا پڑے گا۔“

”نہیں اس میں خطرہ ہے اس کمرے میں کوئی آڑ نہیں ہے۔“ میں نے تجویز رد کر دی۔ ”ہم انتظار کر سکتے ہیں۔ ایاز اب تم حبیب کو دیدو۔“

ایاز پسینے میں شرابور تھا اور اس کے ہاتھ سے ہتھوڑا پھسل رہا تھا۔ حبیب نے اس کی جگہ سنبھالی اور دیوار کاٹنے لگا۔ ایاز اس کی جگہ چلا گیا تھا۔ وسیم اپنی جگہ بیٹھے جھول رہا تھا کبھی کبھی اس کا سر آگے ڈھلک جاتا تھا۔ مسلسل خون بہنے سے وہ کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ یہاں کہیں پانی بھی نہیں تھا لیکن ایاز باہر سے آتے ہوئے پانی کی بوتل لے آیا اور میں نے وسیم کو پانی پلایا تھا۔ اس کے باوجود ہر گزرتے لمحے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ میں نے زخم کا معائنہ کیا خون رس رہا تھا۔ رومال مکمل طور پر خون سے بھیگ گیا تھا۔ ایاز نے اپنا رومال دیا تھا میں نے وہ بھی زخم کے اوپر باندھ دیا۔ وسیم کو فوری طبی امداد کی ضرورت تھی اور اس کے لیے یہاں سے نکلنا لازمی تھا۔ حبیب زیادہ بہتر انداز میں کام کر رہا تھا۔ ایاز اس کو کرتا اس لیے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ حبیب کا اطمینان اس سے بہتر تھا اس لیے وہ رے کے اور تھکے مسلسل ہتھوڑا چلا رہا تھا اور اس نے پانچ منٹ میں ایک سلاخ نکال لی۔ اسے زور لگا کر الگ کیا اور پھر نیچے چھینچ کر الگ کر دیا۔ ہر سلاخ کے درمیان پانچ انچ کا فاصلہ تھا اور

بیت بازی

قارئین

نسیم اختر..... لاہور

اب اُٹھیں، تنہائی بولی
دس بجتے ہیں دفتر جائیں
قمر لڑماں..... بکھلا ہٹ ٹاؤن
اجنبی لگتا ہے سارا منظر
اُف خدا جانے کہاں ہیں ہم لوگ
(محمد سعید قاسمی ڈالوال کا جواب)

ارشاد نسیم..... سرگودھا

اسے بار آور کروں گی میں اک دن
جو شاخ کہن ہے شجر ہوئی ہے
سلیم کامریڈ..... کھاناں
اے جان انبساط تجلی دہائی ہے
آ جا کہ لٹ چلے ہیں ستاروں کے قافلے
آصف راٹھور..... جہلم

اس دور میں تعلیم ہے امراض ملت کی دوا
ہے خون فاسد کے لیے تعلیم مثل نیشتر
(اظہار ارتضیٰ منڈی بہاؤ الدین کا جواب)

نسیم حیدر ناز..... مظفر گڑھ

اوروں کے چاک قسمت ہم نے رفو کیے تھے
اور سی سکے نہ اپنا افسوس چاک تقدیر
محمد عنایت الدین..... بھکر

اٹھ گئی انسانیت دنیا سے انساں مٹ چکا
کچھ سہارا دیجئے راہِ عمل پر لائیے
ذیشان علی ذیشان..... کوٹ سیداں

اذاں دو قمر کعبہ دل میں جا کر
شب تار گزری سحر ہو گئی ہے
شائستہ زریں..... شیخوپورہ

ایسے بھی ہو چکے ہیں محبت میں اتفاق
میرے بھی مختصر وہ رہے ہیں کبھی کبھی
(عقیقہ یاسمین لاہور کا جواب)

نسیم نگار..... لڈن دہاڑی

یہ زندگی یہ زیت کا قانونِ ہفت رنگ
اہل نظر کے واسطے اک عالم خیال
رانا محمد سجاد..... مظفر گڑھ
یوں تو میں ہنس پڑا ہوں تمہارے لیے مگر
کتنے ستارے ٹوٹ گئے اک ہنسی کے ساتھ
(سعید احمد چاند کراچی کا جواب)

محمد نور الہی..... کراچی

یوں تو گل لاکھوں کھلیں گے تجھ پہ اے شاخِ چمن
وہ کہاں جو گل بہارِ جانفزا دکھلا گیا
فصح الدین..... ارباب پور

یہ مصلحت ہے کہ وہ ہم سے دور رہتے ہیں
بے ہوئے ہیں کہاں ہم کسی کو کیا معلوم
(نواز شکریم پشاور کا جواب)

مرزا ہادی بیگ..... حیدر آباد

اس کا نہیں ملال ہمیں وہ نہیں ملا
یہ رنج ہے کہ ہم اسے حاصل نہیں ہوئے
فریدہ حسنین..... ملتان

انداز ہو بُھو تری آوازِ پا کا تھا
دیکھا نکل کے گھر سے تو جھوٹا ہوا کا تھا
(نگہت نسیم لاہور کا جواب)

ارباب خان..... پشاور

پاکیزگی عشق کے عنوان ہزار ہیں
ہے اب بھی نا تمام حیا داستانِ عشق
نصرت جاوید..... منڈی بہاؤ الدین

پانی تھا آگ گرمی روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی
(محمد عقیل چٹھہ کا جواب)

سلیم کامریڈ..... کھاناں

اس سے کیا فائدہ رزمین لہادوں کے تلے
روح جلتی رہے، گھلتی رہے، پڑمر رہے

کیسے آئے گا۔ ہم کسی نہ کسی طرح دیوار پار تو کرالیں گے
لیکن اس میں پیچھے سے حملے کا خطرہ ہے۔
”یہی بات میرے ذہن میں آئی تھی۔ اس کا کیا
ہو سکتا ہے۔“

”حبیب کے پاس گریڈ ہے وہ دیوار اڑا دے۔
نے قابلِ عمل حل پیش کیا۔“

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ میں خوش ہو گیا۔ ”امید ہے
بڑا سوراخ ہو جائے گا کہ ہم اس سے بہ آسانی گزر
سکے۔ لیکن تم لوگ ذرا پیچھے ہٹ جاؤ۔“

حبیب اور اسماعیل کمرے میں آگئے اور حبیب نے
گریڈ کی پن کھینچ کر اسے کچھ آگے دیوار کے
پھینکا۔ ایک خوفناک دھماکا ہوا اور دیوار کا یہ حصہ ہی زمین
ہوس ہو گیا۔ جب غبار اور دھواں چھٹا تو مجھے دیوار میں
سوراخ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ پہلے میں اور مالک مکان
نکلے۔ پھر اسماعیل اور حبیب نے وسیم کو سہارا دے کر کمرے
سے باہر نکالا اور پھر خود بھی نکل آئے۔ میں نے وسیم کو
پراٹھا لیا اور ان دونوں سے کہا۔ ”مجھے کور دو۔۔۔ کوئی راستہ
میں آئے تو اسے بے دریغ اڑا دینا۔“

مگر اپنے چار ساتھیوں کے مارے جانے کے بعد ان
کی ہمتیں پست ہو گئی تھیں اور کوئی ہمارے راستے میں نہیں
آیا تھا حد یہ کہ تیسرے کمرے میں موجود جوڑے نے بھی
سادھ لیا تھا۔ ہم بہ حفاظت سوراخ سے گزر کر باہر آگئے۔
ایاز ہیلکس پاس ہی لے آیا تھا اس نے عقبی دروازہ کھولا
تھا۔ میں وسیم کے ساتھ اندر گھس گیا۔ اسماعیل اور حبیب
پیچھے کھلی جگہ چڑھ گئے تاکہ کسی طرف سے مزاحمت نہ ہو تو وہ
فوری جواب دے سکیں۔ ہمارے بیٹھتے ہی ایاز نے گاڑی
چلا دی۔ میں نے کریم اور سمیر سے کہا۔ ”تم بھی پیچھے
آؤ۔۔۔ اگر کوئی تعاقب کرنے کی کوشش کرے تو اس کی گاڑی
کونا کارہ کر دینا۔“

ہم سڑک تک آئے تھے کہ درگاہ مرشدیہ والی سمت
سے تیز روشنیاں نمودار ہوئیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کیڑی
گاڑیاں آرہی ہوں۔ میں نے ایاز سے کہا۔ ”جلدی نکلو
خیال ہے دشمنوں کو مدد آگئی ہے۔“

مگر جب ایاز نے گاڑی کا رخ پنڈی کی طرف کیا
سامنے سے بھی دو گاڑیاں نمودار ہوئی تھیں۔ ہم دونوں طرف
سے گھر گئے تھے۔

(جاری ہے)

نصف انچ موٹی سلاخ تھی گویا اب گیارہ انچ کا خلا بن گیا تھا
لیکن ہم اس سے نہیں گزر سکتے تھے۔ دوسری سلاخ نکالنا
لازمی تھا۔ حبیب اب دوسری سلاخ کے نچلے حصے میں
سینٹ کاٹ رہا تھا۔ اپنا کام نصف کر کے اس نے تھوڑا اور
چھینی اسماعیل کو دے دیا اور خود اس کی جگہ سنبھال لی
تھی۔ میں نے سمیر اور کریم سے گاؤں والوں کا ردِ عمل
پوچھا۔ کریم نے کہا۔

”اس طرف مکمل خاموشی ہے بلکہ جن گھروں میں
روشنیاں تھیں اب وہاں اندھیرا ہے۔“

اس کا مطلب تھا کہ گاؤں والے مداخلت نہیں
کرتے۔ اس دوران میں مالک مکان بالکل خاموش بیٹھا تھا
نیم تاریکی میں اس کے خدو خال واضح نہیں تھے۔ جب ہم
اندر آئے تو وہ خوفزدہ ہوا تھا لیکن اب پرسکون تھا۔ اب تک
مجھے اس کا نام بھی نہیں معلوم تھا۔ حالانکہ وسیم نے متعدد بار
اس کا ذکر کیا تھا لیکن ہر بار اسے مالک مکان ہی کہا
تھا۔ اسماعیل نے زیادہ تیزی سے کام کیا اور دوسری سلاخ
کی سینٹ چند منٹ بعد کاٹ دی تھی۔ یہ سلاخ زیادہ مضبوط
تھی اس لیے میں نے بھی اسماعیل کی مدد کی اور بالآخر اسے
موڑ کر نکالنے میں کامیاب رہے تھے۔ اب خلا تقریباً پونے
دو فٹ کا تھا اور ہم کسی قدر کوشش کے بعد اس سے نکل سکتے
تھے۔ ایاز نے کہا۔

”میں گاڑی لینے جا رہا ہوں۔ جب تک میں نہ آؤں
آپ لوگ کمرے سے مت نکلے گا۔“

میرا بھی یہی خیال تھا کیونکہ کمرے سے نکل جانے کی
صورت میں دشمن کو موقع ملتا اور وہ محن میں آسکتا تھا۔ یہاں
سے نکلنے کے لیے اسے کمرے میں روکنا ضروری تھا۔ میں
نے کھڑکی سے باہر نکل کر تجربہ کیا۔ میں اور مالک مکان اس
سے آسانی سے نکل سکتے تھے جب کہ تقریباً بے ہوش وسیم کو
مشکل پیش آتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ نو دس فٹ اونچی
دیوار پر کیسے چڑھے گا عام حالات ہوتے تو شاید چڑھ بھی
جاتا لیکن پیچھے دشمن تھے اور یہ بات یقینی تھی کہ وہ ہمارے
پیچھے آتے۔ اس پر مجھے خیال آیا اور میں نے حبیب سے
کہا۔ ”احاطے میں موجود گاڑیوں کے ٹائر اڑا دو۔“

اس نے احاطے میں کھڑی ایک جیب اور ایک پک
اپ کے ٹائر اڑا دیے اور اب وہ آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں
کر سکتے تھے۔ جو خیال مجھے آیا تھا وہی ایاز کو بھی آیا وہ چند
منٹ میں ہیلکس لے آیا تھا اور اس نے مجھ سے کہا۔ ”وسیم

ناصر سید..... فیصل آباد

وہ دیکھ شام کے بستر پہ گر گیا سورج
بدن سے پھوٹ رہی ہے تکان کی خوشبو
ابر یزگل..... ہنگو

وظیفوں اور انعاموں کی دعوت تھی مگر عسرت
ہم اپنی شاعری کا رنگ درباری نہ کر پائے
آفتاب گل..... چارسدہ

ویرانیوں کو اوڑھ کے سوئے ہوئے ہیں آج
جب تک مکس تھے گھر میں تو گھر جاگتے رہے
اظہر خان..... فیصل آباد

وائے ناداتی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو
(اکبر حسن چیچہ وطنی کا جواب)

ناصر حسین سید..... لاہور

یہ حادثہ کا تلامم یہ زمانہ ظالم
غم سے بھڑکے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتا ہے
انیس حیدر..... شیخوپورہ

یقین آنے کو تو آجائے ان کے عہد و پیا کا
مگر چشم بت وعدہ شکن کچھ اور کہتی ہے
عباس حسن..... میانوالی

یہ میکدہ ہے یہاں کس کو ہوش ہے پیارے
تو پہلے خود تو سنبھل مجھ کو ہوشیار نہ کر
ظہیر عباس..... لڈن وہاڑی

یقین ہے لے گیا ہوگا وہ اپنے گھر مجھ کو
میں چھوڑ آیا تھا کل رات خود کو میلے میں
(نہال اصغر مظفر گڑھ کا جواب)

ملیحہ فاطمہ..... کورنگی کراچی

یاد میں کس کس کی اشک خوں نہ برسانا پڑے
کیسی کیسی ہستیاں اس خاک میں آباد ہیں
آسٹر رندھاوا..... کراچی

یہ بارِ عشق ہے اے ناتوانِ عشق
یہ بار اٹھ گیا تو کوئی بار پھر نہیں
(ضیاء تنسیم، ساہیوال کا جواب)

نازش نوید..... ملتان

آ وطن کی خاک سے ذرہ بنائیں آفتاب
آ چمن کی ہر کھلی سے اک چمن پیدا کریں
آفتاب احمد..... واہ

اہل ہنر تو سو گئے کٹوا کے اپنے ہاتھ
اور پتھروں میں ان کے ہنر جاگتے رہے
احمد صدیق..... کوٹ مٹھن

اک نظر میں اس نے مجھ سے کر لیے اتنے سوال
میں بھی کیا کرتا کہ بس نظریں جھکا کر رہ گیا
جاوید چانڈیو..... لاڑکانہ

اپنا کوئی آنے کو ہو پردیس سے جب بھی
خود کو ہی سر راہ بچھا دیتی ہیں آنکھیں
(تنسیم ضیاء کا جواب)

بشیر احمد بھٹی..... بہاولپور

آپ کو اس نے خاک میں ملا دیا
”دانہ خاک میں مل کر گل گلزار بنتا ہے“
اثر ہمدانی..... ملتان

ادھر سے آئے کوئی راہرو تو یہ پوچھیں
چراغ کیوں نہ جلے کل مرے قبیلے میں
(عباس ملتان، ملتان کا جواب)

مرزا فرحان بیگ..... حیدر آباد

اب تم مرے بنو نہ بنو اختیار ہے
تقدیر نے مجھے تو تمہارا بنا دیا
اقبال فرید..... کراچی

اہل دانش عام ہیں کیا اب ہیں اہل نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایام

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا
ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔
اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان
کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مد نظر رکھ کر
ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش کے اس مفروضے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھیجیے۔ درست جواب بھیجے والے پانچ قارئین کو ماہانہ ماحصر سب سے بہتر مسپینس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہانہ ماحصر پیکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ”یک مٹی سرگزشت“ کے عنوان تلے مفروضہ انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپردِ ذاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 مئی 2013ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1898ء میں یوپی کے ایک شہر میں پیدا ہوئے۔ نسلِ اہمٹھان تھے۔ غصے کے تیز تھے مگر شاعری میں جواب نہ تھا۔ زندگی بھر غزل نہ کہی۔ الفاظ سے خوب کھیلے تھے۔ پاکستان آئے تو گروہ بندی کا شکار ہو گئے۔ ایک رسالے نے ان کی مخالفت میں خاص نمبر نکالا۔ آپ بیتی لکھی تو وہ بھی متنازع ٹھہری۔ پاکستان میں ہی انتقال ہوا۔

علمی آزمائش 89 کا جواب

بانو قدسیہ 1928ء میں فیروز پور (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئیں۔ کینر ڈکالچ لاہور سے ریاضی اور معاشیات میں بی اے اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اردو کیا، چلڈرن کپلیکس لائبریری کی ایگزیکٹو ممبر اور پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ کی رکن رہیں۔ ایک بڑے افسانہ نگار کی شریک حیات بنیں۔ خود بھی ریڈیو اور ٹی وی کے لیے بے شمار ڈرامے اور سیریز تحریر کئے، سورج کبھی، چہار چمن، اہل کرم، تم گرتیرے لیے، اک تیرے آنے سے پہلے، بزدل، یہ جنوں نہیں تو کیا ہے، منزل بہ منزل، فٹ پاتھ کی گھاس، باٹ بسیرا، تحریریں مشہور ہوئیں۔ حکومت نے تمغہ امتیاز دیا۔

انعام یافتگان

1۔ ارشد علی، ڈیرا امراں جمالی 2۔ انیس حیدر، کراچی 3۔ زاہد حسن، لاہور

4۔ نوشین ارتضیٰ، لاہور

5۔ کشور کمال، کوئٹہ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے راحیلہ رفیق، وجاہت وکیل، عثمان خان، شاہد آفتاب، نصرت حیدر، شمیم احمد، سمیع عزیز، ذوالفقار احمد خان محمد علی شاہ، آسٹر رندھاوا، نعمہ اقبال رضوی، ارم اقبال رضوی، محمد علی شاہ، فرزانہ پروین، انصار حسین، بعین احمد، سردار حسن صدیقی، عطیہ نورین، نیاز خانچی، بختیار شاہ، عارفہ سلطانہ، خالد عثمانی، کہکشاں تبسم، عروسہ انوار، سنبھل جیس، عروج عالم، سید عزیز الدین، عنایت مسیح علی احمد، رجب علی مرزا، نجم الدین حیدر، نصرت فاروقی، نعیم احمد، انعام خان، افتخار حسن، وجاہت علی، کاوش اختر، تنویر حسین زیدی، نواز علی شاہ، نعمہ اقبال رضوی، ناصر افروز، ممتاز الحسن، وجاہت شاہ، انصار حسین، قائم علی، ابرار احمد، نجم الدین حیدر، حکیم اللہ نعیمی، منور علی، ملک سرفراز گل، کاشف حیدر، جاوید علی، مظفر حسن، پیام فاروقی، ناظم پاشا، کائنات فاطمہ، خالد خان۔ لاہور سے صائمہ عمران، مسرت اسلم ملک، نعمان حیدر، کاشف

میرزا فرحت، بول ایم بی اسلم، ابرار الحسن، قدیر اللہ، ناصر فاروق، کاوش نسیم، کاشان صدیقی، الدین آراکین، گل زیب، پروین ضیائی، عمار اختر، ارشد علی، احمد علی مشرق، ممتاز الحسن، عقیل سندھو، نعمان اشرف، خالد فاروقی، ارباز خان، اکرم صدیقی، ابرار احمد انعام، تابش عطاری، نیاز احمد ملک، برق ضیائی، الد علی، احمد بشیر، نعیم مرزا، حدیقہ اشرف، ملک واحد الحق، ابرار احمد، ناز خان، ہما جیس، جمیرا خاتون، ممتاز الحسن، زبیر اسلم، تابش حسین، ابن مقبول جاوید صدیقی، ڈاکٹر غلام یاسین، ڈاکٹر سعادت علی خان، شیراز ملک، ڈاکٹر غلام یاسین، ناصر جہا، راہ پندی سے رضوان احمد ہاشمی، ابن مقبول جاوید صدیقی، ڈاکٹر غلام یاسین، ڈاکٹر سعادت علی خان، شیراز ملک، ڈاکٹر غلام یاسین، ناصر جہا، شمیم فاروق آرکلی، صادق حسن، تر جس علی، بخت خان، زبیر شاہ اشرفی، خاقان خان، زویا بخاری، سید محمد تقی، تنویر الحسن، صفدر شیرازی، سرین اشرف، کائنات بانو، رانا فتح یاب، زاہد عباسی، تجرات سے خالد پرویز (سرائے عالمگیر)، اسلام آباد سے نیو فرشتا، احمد خالد، ممتاز، انور یوسف زئی، برکت اللہ، ممتاز احمد، کشور جہاں، توصیف احمد، صدیقی الرضی، نعمت اللہ خان، خضر حیات عباس، نیاز اللہ، شاہین شفاق، سعید اختر، روم ممتاز، انور یوسف زئی، شہناز فیضی، محمد متین، بشیر فاروقی، محمد شہزاد، بیدری اکرم، ملتان سے محمد عینی معین، نورین انشان، محمد بلال اقبال، محمد سعید چشتی، نورین انشان، ایاز سومرو، زندان خان، حکیم اللہ چغتائی، ذیشان ملک، فرحت مغیر، قدوس بخش، سعیدہ جمال، فاضلی خان اچکزئی، لبنی ظہیر، رضوانہ اختر، اللہ دتہ، محمد عتیق، فرزانہ ملک، زینب چوہان، قدوس بخش، جہلم سے ارباز خان، ملک سرفراز، ندیمہ امتیاز، فیصل آباد سے محمد زاہد، عبدالعزیز (سندری) شوکت علی چاند، قمرینہ (چک جھمرہ)۔ جھنگ سے فرحت بیگ۔ گوجرانوالہ سے نسیم شاہ۔ چکوال سے رمضان ونو، ارشد حسین۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان تنک، مسرت انسانی۔ منڈی بہاؤ الدین سے خرم جہانزیب۔ کوئٹہ سے حبیب احسن، ناصر چنگیزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت بابر، خاقان چنگیزی، راؤ رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، قاتل سید پوری، تقی چنگیزی، نگار، صالح بشیر، نصرت چنگیزی۔ سرگودھا سے انعام اللہ انعام، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن، نادر شاہ، حیات خان، فصیح الزماں، عظمی اکملی نوانہ، خلیق الزماں، خضر حیات، ثمینہ کوثر لطیف۔ شجاع آباد سے حسن علی زیدی، نعیم اللہ نصیر جنونی۔ خانیوال سے طارق شہزاد، سید ایشام اشرف مشہدی۔ حیدر آباد سے مرزا ہادی بیگ، احمد انصاری، بابر خان، طلحہ یاسین، دعا زہرا۔ میرپور خاص سے مجاہد علی ایس ہنسی۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ پاک پتن سے زاہد علی خان۔ ساہیوال سے سرفراز ملک۔ حاصل پور سے نعمان ادریس۔ جہلم سے ندیمہ امتیاز۔ بہاولپور سے قاضی عدنان احمد، جمیرا کوکب واسطی، آمنہ ملک۔ بہاولنگر سے امتیاز شیخ، معظم علی (پشیاں)۔ اوکاڑہ سے اظہر الدین، سعید احسن محمود، نعمان بشیر، صاحب خان، راجا احسن، ملک صفدر، اظہر الدین۔ ہری پور سے خورشید احمد (کھلاہٹ)۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد خواجہ، آصف ملک، اقرار الحسن، مہ جیس فلک، نصرت مرزا، محمد رضا، احتشام اسلام الدین، ارباز ملک، لیاقت علی، ضامن رند، ظہیر فرحانی۔ انک سے خالد چوہدری، زبیر اللہ خان، فیض اختر، ثناء جبران، خورشید اختر، زبیر اللہ مروت فاطمہ ملک، سرفراز گل، ثناء اللہ، فرحت بابر، زمان، سعید بھٹی، ثار فرار، سید اختر، سعید خان، شیخ ثناء، زبیر اللہ مروت، اکرم خان۔ سرسہ سے عظمت علی رحمت علی۔ حافظ آباد سے نعمان حسن خان، فرحت جان، خالد جاوید، شیریں فاطمہ، نسرین رانا، محمد عقیل چٹھہ، محمد ابراہیم، محمد صدیق ستری۔ نواب شاہ سے عزیز حسن، ارم شاہ، عزیز الدین۔ شہر سلطان سے سنجیدہ احمد، بازغ بخاری، ارشد حسن، نوید انصاری، عباس علی، ارباب خان، راجا یونس۔ میرپور آزاد کشمیر سے کاشف حسین، نعمان سلطان، کمال احمد کمال، احسن بھٹ، نصرت خان، یونس ایاز۔ چکوال سے محمد جہانگیر۔ میانوالی سے نعمان نیازی (حلقہ گنگ) احمد علی فوٹی، ایاز علی رند، ملک سرفراز، خیر الدین کھر، ضامن خان اشرفی، بھکر سے حسن چنگیزی، غازی شاہ، شاہد حسن خان، نیاز احسن، زاہد اسلم چٹھہ، ملک سرفراز، منکیر، زبیر شاہ، تقی بخش۔ منڈو آدم سے فاطمہ عباسی، نیاز ملک، خالد خان جوانا، ناصر بھکیو، نیاز عباس۔ کمالیہ سے محمد کمال، ذیشان مجاہد، ناصر ملک، فہد حسن، ابرار الحق، ثار علی، نعیم عثمانی، فردوس بشیر، ابرار خان اعظم، ظہیر الدین۔ لیہ سے شباب الاسلام، شجاعت خان، راجا ابرار، سردار توفیق، انصار حسین، مالک حسن ملک۔ گولارہی سے ارشد خان، شاہ جمال سے فہد مشتاق۔ نارووال سے انعام احسن کمالی۔ مردان سے ابرار خان۔ تربیلہ ڈیم سے حسن بیگ، نعیم اللہ فاروقی۔ نوشہرہ سے فضل محمد۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے سرفراز احسن، صفدر حسن، جواد حسین بھٹی، خالد خان، ناصر انعم، ابرار حسن زئی۔ ڈیرہ غازی خان سے احمد علی واصف احمد۔ لیہ سے فاروق اعظم۔ پشاور سے غازی توفیق، مظہر حسین، مانک اسلم، نوید ملک، نسیم نیاز احمد، خالد کنول، وقار احمد، قیصر حسن، توفیق الاسلام، افضل میو، ثناء وقار، منہال زیدی، ایشام رضا خان، نعیم شیرازی، فخر السلام، سردار علی میمنگل، فرقان اختر، نسیم اچکزئی، بینش ملک، نسیم فردوس، نادر خان، اشرف حسن زئی، گل خان، ارباب خان، جویریہ، بلکشن خان، نعیم الحسن، فرقان اختر، نواز، اطہر نواز، شمیم فاروقی، ضیاء الحق، اطہر شاہ، ضیاء الحق، جمال شاہ، فراست خان، نوید نعیم، اصغر طوری، بلکشن، محمود اچکزئی، نذرانہ شاہ، ارباب خان، دردانہ شاہ، نسیم نیازی۔ زیر آباد سے نعیم اکبر۔ چشتیاں سے معظم علی۔ مردان سے نصیر خان۔ ممالک غیر سے علاء خان احمد انصاری (جرجی) عارف خان (جدہ سعود) حافظ تصدق بشیر الہندی (سلطنت اومان)۔ فہد فاروق (نوکیو جاپان)۔

گوئی محبت

جناب معراج رسول
سلام مسنون!

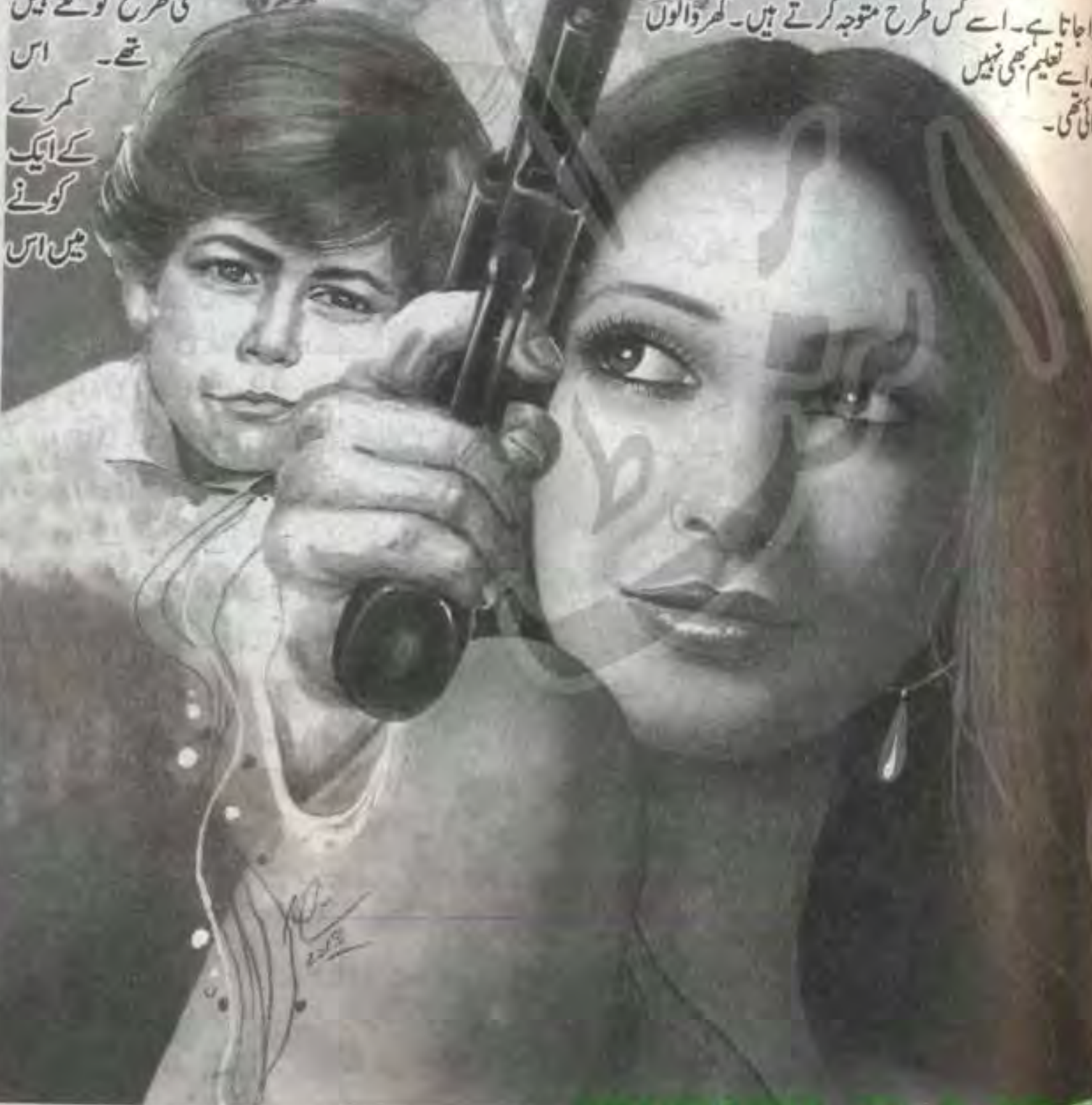
ایک دلچسپ واقعہ آپ کی خدمت میں ارسال ہے۔ اخبارات میں اس واقعہ کو بہت ہلکے انداز میں پیش کیا گیا ہے لیکن واقعہ ایسا سبق بھرا ہے کہ اسے کہانی کی شکل میں پیش کرنے سے قارئین ضرور محظوظ ہوں گے۔ ایک گونگے نوجوان کے بھی سینے میں دل ہوتا ہے لوگ یہ کہیں بھول جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے تو اس نے پانسا پلٹ دیا۔ منظر امام (کراچی)

وہ دیکھ سکتا تھا، سن سکتا تھا، سوچ سکتا تھا، لیکن بول نہیں سکتا تھا۔ جب گرمی کی دوپہر پریشان کرنے لگتی تو وہ محلے کے درمیان میں سگے درخت کے نیچے سے اٹھ کر اپنے گھر کے دروازے پر آ جاتا۔ دو چار بار کی دستک کے بعد اس کے لیے دروازہ کھول دیا جاتا۔ دروازہ کھولنے والی یا تو اس کی ماں ہوتی یا اس سے دو سال بڑی بہن جو اس پر اس طرح حکم چلایا کرتی تھی جیسے وہ اس کا ملازم ہو۔ ”آگیا کم بخت۔“ اس کی ماں زور سے چلائی۔ ”کہاں سے آوارہ گردی کر کے آ رہا ہے۔ خدا تجھے غارت کیوں نہیں کر دیتا۔“ وہ ہاتھ کے اشارے سے کچھ سمجھانے کی کوشش میں غول غاں کرتا۔۔۔ رہ جاتا۔ اس وقت اس کے دونوں بڑے بھائی ذیشان اور نعمان اس کی طرف خونخوار نگاہوں سے دیکھتے۔ اس کے پورے خاندان میں ایسا کوئی نہیں تھا۔ کسی میں کوئی جسمانی خامی نہیں تھی۔ اس کے گونگا ہونے کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ عمر آگئی جس عمر میں بچے بولنا سیکھ جاتے ہیں۔ لیکن وہ سوائے ایں اور آں کے اور کچھ نہیں بول سکتا تھا۔ اس کے والدین کو جب اس کی طرف سے تشویش ہوئی تو وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ سنایا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ آپ کا یہ بچہ نہیں بول سکے گا۔ یہ گونگا ہے۔“ یہ خبر گھروالوں پر بجلی بن کر گری تھی۔

بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ کھانے پینے کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا۔ وہی دیا جاتا جو دوسرے بہن بھائیوں سے بچا جاتا کرتا۔ وہ بلبل کر رہ جاتا۔ اس آں کر کے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتا۔ لیکن اسے جھڑک دیا جاتا۔ ”جا، ایک طرف جا کر بیٹھ جا۔ جب دیکھو بھوک لگی رہتی ہے۔ کم بخت تو پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گیا۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر وہ بول نہیں پاتا تو اس میں اس کی کیا قصور ہے؟ اس نے تو کبھی خواہش نہیں کی ہوئی کہ خدا اسے گونگا نہ کرے۔ شاید خدا اس سے ناراض تھا۔ اسے یہ تو اندازہ تھا کہ خدا ہے۔ جس نے تمام دنیا کو پیدا کیا ہے۔ جو سکھوں کو پالنے والا ہے۔ جو سب کو رزق دیتا ہے۔ لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس خدا کو کس طرح پکارا جاتا ہے۔ اسے کس طرح متوجہ کرتے ہیں۔ گھر والوں نے اسے تعلیم بھی نہیں دی۔

وہ دیکھا کرتا کہ اس کے بھائی بہن اسکول اور کالج جایا کرتے ہیں۔ صاف ستھرے کپڑے پہن کر، ہاتھوں میں کتابیں لے کر۔ لیکن اس کے لیے کبھی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ جب اس کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ وہ اپنے اس گوشے میں جا کر لیٹ جاتا جو اس کے لیے کمرے کا کام دیا کرتا۔ یہ گوشہ سیرھیوں کے نیچے بنا ہوا ایک اسٹور نما کمرہ تھا۔ کبھی اسے کٹھ کباڑ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس میں سلمان کے لیے ایک پلنگ بچھا دیا گیا تھا۔ یہ کمرہ ہی اس کے لیے پوری کائنات تھی۔

اس نے اس کمرے کی دیواروں پر اخبارات سے کاٹی ہوئی تصویریں چپکار رکھی تھیں۔ یہ اداکاروں اور کھلاڑیوں کی تصاویر تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو آپس میں باتیں کرتے تھے۔ تقریریں کرتے تھے۔ گانے گاتے تھے۔ یہ لوگ اس کی طرح گونگے نہیں تھے۔ اس کمرے کے ایک کونے میں اس



کا ایک بکس تھا، ٹین کا بنا ہوا، اس بکس میں اس کے کپڑے ٹھہنے ہوئے ہوتے۔ اس کے کپڑوں پر بھی استری کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی کیونکہ وہ گونگا تھا۔ ایک ٹا کارہ عضو، جس کو آگے چل کر کچھ بھی نہیں کرتا تھا۔ جبکہ اس کے بھائیوں اور بہن کے لیے دنیا کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ان پر خدا کی خاص مہربانیاں تھیں کہ جس نے انہیں بولنے کی قوت عطا کی تھی، جبکہ وہ اس صلاحیت سے محروم تھا۔

☆☆☆

رضوانہ کو وہ مخصوص لڑکا بہت اچھا لگتا تھا۔ شرمایا شرمایا سا۔ اس کے اپنے محلے میں رہنے والا۔ رضوانہ اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی تھی۔ اس نے محلے میں دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ اس لڑکے سے اس کا اور کوئی تعلق نہیں تھا۔ رضوانہ نے ابھی گریجویشن کیا تھا۔ اس کے گھر والے چاہتے تھے کہ اس کی شادی کر دی جائے لیکن اس نے انکار کر دیا تھا۔ ”نہیں، ابھی نہیں۔ ابھی مجھے مزید تعلیم حاصل کرنی ہے۔ میں ماسٹر کرنا چاہتی ہوں۔“

”اس میں تو دو سال ہیں اور اس دوران تم کیا کرو گی؟“

”کسی اسکول میں جاب کر لوں گی۔“

گھر والے بھی خاموش ہو گئے۔ ابھی رضوانہ کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ سال دو سال انتظار کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ اگر اسکول میں ملازمت کر لیتی تو اس کی تنخواہ سے اس کا جینز جمع ہو سکتا تھا۔

ہمارے یہاں کی لڑکیوں کے ساتھ یہی ہوا کرتا ہے۔ ایسی بے شمار لڑکیاں ہوں گی جو اپنا کٹواں خود ہی کھود کر اپنے لیے پانی نکالا کرتی ہیں۔ یہ سفید پوش گھرانوں کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ مڈل کلاس گھروں سے تعلق رکھنے والیاں۔ امیر گھرانوں کی لڑکیوں کو اتنی محنت کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ ان کے پاس ویسے ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اور انتہائی غریب گھرانے اس قسم کے تکلف میں نہیں پڑتے۔ ان کے لیے جو ہے وہی ٹھیک ہوتا ہے۔ پر اہم صرف مڈل کلاس کی ہوتی ہے۔

ہر شعبے میں ان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ سفید پوش ایک تکلیف دہ علامت کی طرح ان کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ رضوانہ کو لڑکا اچھا لگا کہ وہ بہت شرمیلا تھا۔ ایک دن

جب وہ رضوانہ کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا تو اس نے کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ شاید اسے بہت شرم ہوئی تھی۔ وہ اپنا گھٹنا تھام کر گرا رہا تھا۔

رضوانہ اس کی مدد کے خیال سے جلدی سے اس کے پاس آ گئی۔ ”کیا ہوا۔ کیا زیادہ چوٹ آئی ہے؟“ رضوانہ نے پوچھا۔

”آں“ اس نے رضوانہ کی طرف دیکھ کر ایک عجیب سی آواز نکالی۔ اور اس وقت رضوانہ کو احساس ہوا کہ وہ بول نہیں سکتا۔ وہ گونگا ہے۔ اس نے اشاروں کی مدد سے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اس دوران وہ لڑکا آں اور گرا رہا تھا۔ پھر اپنا گھٹنا سہلاتا لنگڑاتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ رضوانہ کو اس سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔

اتنا پیارا سا لڑکا۔ اور بے چارہ بولنے سے مجبور نہ جانے کیا کہہ رہا ہوگا۔ اس کی زندگی کس طرح گزرتی ہوگی۔

اس نے ایک دن اپنے محلے کی ایک عورت سے پوچھا۔ ”خالہ، میں نے ایک دن اس گلی میں ایک گونگے بچے کو دیکھا تھا کون ہے وہ؟“

”ارے، تم نے اسے پہلے نہیں دیکھا۔“

”نہیں خالہ۔“

”بیٹی، وہ اسی محلے کے آخری گھر میں رہتا ہے۔ عورت نے بتایا۔“ ذاکر صاحب کا بیٹا ہے۔ اس کے دو بھائی اور ایک بہن بھی ہیں۔ لیکن وہ تینوں بالکل ٹھیک ہیں، جبکہ یہ بے چارہ گونگا پیدا ہوا ہے۔“

”ویسے بہت مہذب معلوم ہوتا ہے۔“

”ہاں، بے چارہ بہت اچھا ہے۔ اس سے کوئی کام بولو، بھاگ کر کر دے گا۔ سب سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ کسی کو پریشان نہیں کرتا۔ لیکن اس کے گھر والوں کا سلوک اس کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔“

”ایسا تو نہیں کرنا چاہیے خالہ۔ اس قسم کے لوگ تو زیادہ ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں۔“

”میں تو دیکھا کرتی ہوں تا۔ اس کے ساتھ بالکل سوتیلوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔“ اس عورت نے بتایا۔

”نہ اس کے کھانے کا خیال نہ اس کی تعلیم کا۔ بے چارہ اس یوں ہی ایک گلی سے دوسری گلی میں گھومتا پھرتا ہے۔“

اس وقت رضوانہ کی استانی والی ہمدردی اور حساسیت دار ہو گئی۔ ”یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی خالہ، تم مجھے اس کے

لے چلنا۔“

”وہ کیوں۔“

”میں اس کے گھر والوں کو سمجھانے کی کوشش کروں گی کہ وہ اس بے چارے کو گونگے بہروں کے اسکول میں داخلہ دلوائیں۔ آج کل تو ایٹھل لوگ تعلیم حاصل کر کے بہت کارنامے کر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ لے چلوں گی۔“ عورت نے کہا۔ ”میں تو خود بھی اس بے چارے کو دیکھ دیکھ کر افسوس کرتی رہتی ہوں۔“

☆☆☆

وہ ایک بے رحم انسان تھا۔ اس کے ماتحت کام کرنے والے اسے ٹھیک کہا کرتے تھے۔ وہ خود بھی ٹھیکہ مخاطب کیے جانے پر بہت خوش ہوتا تھا۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کا اصل نام کیا ہے۔ کہاں سے آیا ہے۔ اس کی قومیت کیا ہے۔ اس کی اپنی زبان کیا ہے۔

وہ صرف ٹھیکہ تھا۔ بے رحم ٹھیکہ۔ جو اس کے بچے میں پھنس جائے اس کا ٹکنا محال ہوتا تھا۔

ٹھیکہ کا اپنا ایک گروہ تھا۔ یہ گروہ لوٹ مار کی وارداتوں میں ملوث تھا۔ پورا کام بہت سائنسی اور منظم انداز سے کیا جاتا۔

کچھ کارندے ایسے ہوتے تھے جو صرف دیکھا کرتے۔ مخبر کے فرائض انجام دیا کرتے۔ جو آکر ٹھیکہ کو بتاتے کہ فلاں کے پاس اتنی دولت ہے یا فلاں کے گھر میں اتنا سونا مل سکتا ہے۔

ان کارندوں کی ڈیوٹی اس کے بعد ختم ہو جاتی۔ اس کے بعد دوسرے کارندے بلائے جاتے۔ یہ وہ لڑکے ہوتے جو واردات کے وقت راستوں کی نگرانی کیا کرتے۔

اگر وہ یہ دیکھتے کہ ٹھیکہ کے کارندے جس مکان میں داخل ہوئے ہیں اس مکان کو پولیس نے گھیرنا شروع کر دیا ہے یا محلے والوں کو پتا چلا گیا ہے اور انہوں نے باہر جمع لگا لیا ہے تو ایسی صورت میں یہ دوسرا گروپ اندھا دھند ہوائی فائرنگ شروع کر دیتا۔

فائرنگ کے بعد بھگدڑ مچ جاتی اور اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مکان میں موجود لوگ بھی فرار ہو جاتے۔ ایک گروہ وہ ہوتا جو جائے واردات سے کچھ فاصلے پر گاڑیاں لیے کھڑا رہتا۔ وہ گاڑیاں اشارت ہی رکھی جاتی

تھیں تاکہ فوری طور پر فرار ہو جاسکے۔

اس گروہ کے لوگ عام طور پر اس طرح کے کپ یا ٹوپیاں پہنا کرتے کہ ضرورت کے وقت وہ نقاب بھی بن جاتے تھے۔ ٹھیکہ اپنے کارندوں کو تربیت بھی مختلف انداز سے دیا کرتا تھا۔

اس وقت بھی ایک نوجوان اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ آج اس نوجوان کو پہلی بار کسی واردات کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ ٹھیکہ کی چھوٹی چھوٹی بے رحم نگاہیں اس نوجوان پر جمی ہوئی تھیں۔

”تو تیار ہے نا۔“ ٹھیکہ نے اس سے پوچھا۔

”جی، جی ہاں۔“ نوجوان نے ہکلاتے ہوئے بتایا۔

”ہوں۔“ ٹھیکہ نے ایک گہری سانس لی۔ ”مجھے معلوم ہے نا کہ تیرا ٹارگٹ کیا ہے۔“

”جی ہاں۔ جی ہاں۔ مجھے اس مکان میں داخل ہونا ہے۔ اس کا دروازہ میرے لیے پہلے سے کھلا ہوا ملے گا۔“

”ہاں، اس گھر میں کام کرنے والی ملازمہ ہمارے ہی گروہ کی ہے۔“ ٹھیکہ مسکرا کر بولا۔ ”تیرے لیے وہی دروازہ... کھول کر رکھے گی۔ آگے بٹا، آگے کیا کرے گا۔“

”آگے؟“ نوجوان کچھ ہچکچا گیا تھا۔ ”آگے وہی کروں گا، جس کا آپ حکم دیں گے۔“

”فرض کر۔ اگر گھر والوں نے تجھے گھیر لیا تو۔“

”تو پھر کسی طرح وہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔“

نوجوان نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ ٹھیکہ مسکرا دیا۔ ”تو ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔ اب جا، باہر تیرے لیے گاڑی تیار ہے۔“

نوجوان دو آدمیوں کے ہمراہ لرزتے قدموں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے جانے کے بعد ٹھیکہ نے اپنے ایک خاص آدمی سے کہا۔ ”یہ تم لوگ کس کو اٹھا کر لے آئے ہو۔ اس قسم کے بزدل لوگ ہمارے کام کے نہیں ہوتے۔ سمجھے۔“

”جی سمجھ گیا صاحب۔“

ٹھیکہ باس، سردار یا سرد وغیرہ کہلانے کی بہ نسبت صاحب کہلوانا زیادہ پسند کرتا تھا۔

”جب سمجھ ہی گئے ہو تو یہ بھی سمجھ لو کہ اب اس کی واپسی نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ یہ جس وقت گاڑی سے اتر کر مکان کی طرف جائے، اس کا کام ختم کر دینا ہے۔“

”ایسا ہی ہوگا صاحب، تم اطمینان رکھو۔“

سلمان جانتا تھا کہ اس لڑکی میں اور خود سلمان میں آسمان زمین کا فرق ہے۔
جب سلمان کو چوٹ لگی تھی اور وہ لڑکی اس کا حال پوچھنے اس کے پاس آئی تھی تو اس وقت سلمان کو وہ بہت اچھی لگی تھی۔

وہ پہلی لڑکی تھی، جس نے اتنے قریب آکر اس کا حال پوچھا تھا۔ اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد بھی کہ وہ گونگا ہے، بول نہیں سکتا اس لڑکی نے اس کا مذاق نہیں اڑایا تھا۔ بلکہ سلمان کو اس کی آنکھوں میں اپنے لیے ہمدردی اور پیار کے جذبات محسوس ہوئے تھے۔ بالکل پہلی بار۔ ایک بار اس کے مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ لڑکی پھر اسے مل گئی۔

وہ ہاتھ میں شاہنگ بیک لیے اپنے گھر کی طرف جارہی تھی۔ سلمان کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ سے اس کے گھٹنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیسے ہو۔ چوٹ کا کیا حال ہے؟“

سلمان نے اس آں کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور اشارے سے بتایا کہ اب وہ ٹھیک ہے۔
”تم پڑھنے نہیں جانتے۔“ لڑکی نے پوچھا۔

اس کا یہ سوال سلمان کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ اس لڑکی نے اشارہ کیا کہ وہ وہیں کھڑا رہے۔ پھر سامنے اپنے مکان میں داخل ہو گئی۔

سلمان سمجھ گیا تھا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ چند ہی لمحوں بعد وہ مکان سے باہر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ اس نے کتاب دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ”تم پڑھنے نہیں جانتے۔“

اس بار سلمان نے اس کی بات سمجھ لی تھی۔ اس نے غوں غاں کرتے ہوئے سمجھایا کہ وہ نہیں جانتا۔ اس کے بھائی اور بہن جایا کرتے ہیں۔

رضوانہ نے... ہمدردی کے اظہار میں اپنی گردن ہلائی۔ ”کوئی بات نہیں۔ میں تمہارے گھر والوں سے بات کروں گی۔ میں ایک ایسے اسکول سے واقف ہوں جہاں تم جیسے گونگے اور بہرے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔“

سلمان کی سمجھ میں کچھ آیا یا نہیں آیا۔ لیکن وہ اتنا ضرور جان گیا تھا کہ یہ لڑکی دوسروں سے مختلف ہے۔ وہ اس کا

مذاق نہیں اڑا رہی۔ بلکہ اس کے ساتھ ہمدردی کر رہی ہے۔ وہ بہت اترایا اترایا سا گھر میں داخل ہوا تھا۔ گھر کا وہی ماحول تھا۔ سلمان سے بے زار، کسی نے اسے واپس آتے دیکھ کر اس کا استقبال نہیں کیا تھا بلکہ ماتھے پر ہاتھ کواری کی لکیریں واضح ہونے لگی تھیں۔

لیکن سلمان کو اب ان کی پروا نہیں تھی۔ اسے برا نہیں لگ رہا تھا۔ یہ لوگ چاہے اس کا خیال کریں یا نہ کریں۔ اس دنیا میں کم از کم ایک ہستی تو ایسی تھی جس نے اس کا خیال کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہمدردی کی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں آکر اپنے بوسیدہ بستر پر لیٹ گیا۔ کھانے کا وقت ہو گیا تھا لیکن کسی نے اسے بلائے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

کسی نے نہیں پوچھا تھا کہ وہ کیسا ہے۔ کہاں گیا تھا، کہاں سے آرہا ہے۔ شاید اس گھر کو اس کی ضرورت ہی نہیں تھی یا ان کی نگاہوں میں اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

بہت دیر بعد اس کی ماں ایک ٹرے میں کھانا لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ ٹرے رکھ کر واپس جانے لگی تھی کہ سلمان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”کیا بات ہے۔“ ماں سمجھ گئی تھی کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔

اس نے دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر کی طرف اشارہ کر دیا۔ یہ تصویر اسکول جاتے ہوئے بچوں کی تھی۔ اس نے یہ تصویر بھی کسی اخبار سے کاٹ کر ایک دیوار پر چپکار رکھی تھی۔
”اچھا سمجھ گئی۔ تو اسکول جائے گا۔“ ماں نے کہا۔

”ہاں۔“ اس نے اپنی گردن ہلا دی۔

ماں کے تیور اچانک بدل گئے۔ ”چل دفان ہو۔ ایک تو گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ اتنی مشکلوں سے تو تینوں کو پڑھایا جا رہا ہے۔ اوپر سے تجھے بھی اسکول بھیج دیں۔ کون اٹھائے گا تیری مہنگی پڑھائی کا خرچ۔ اور تو پڑھ لکھ کر کون سا تیر مار لے گا۔ جا نہیں مزدوری ڈھونڈ۔ کوئی کام سیکھ لے۔“

سلمان سب سمجھ گیا کہ اس کی ماں کیا کہہ رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ اس کی ماں بک بک کرتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی تھی۔

سلمان نے اس کے جانے کے بعد دیوار پر گھونے برسائے شروع کر دیے۔ بے بسی کے انتہائی احساس میں وہ

یہی کیا کرتا تھا۔

☆☆☆

شکجہ بہت برا تھا، بہت بے رحم۔ لیکن اس کے کچھ اصول بھی تھے۔ وہ امیر گھرانوں کی لڑکیوں کو تادان کے لیے اغوا بھی کرایا کرتا، لیکن جنسی زیادتی اور عورت کی توہین کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس سلسلے میں اس کے احکامات بہت سخت تھے۔

اس وقت ایسا ہی ایک مقدمہ اس کے سامنے لایا گیا تھا۔

ان لوگوں نے شہر کے ایک پوش علاقے سے ایک لڑکی کو اس وقت اغوا کیا تھا جب وہ ایک پُراسٹور سے نکل کر پارکنگ ایریا کی طرف جا رہی تھی۔

شکجہ کے آدمی اس لڑکی کو اسلحے کے زور پر اٹھا کر اوڑے پر لے آئے تھے۔ وہ لڑکی بے انتہا خوفزدہ تھی۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

”بیٹھ جا لڑکی۔“ شکجہ نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”پریشان نہ ہو، تجھے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ نام بتا اپنا۔“ لڑکی بہت دیر تک کچھ بولنے یا بتانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ شکجہ کے اشارے پر اسے پانی کا ایک گلاس دے دیا گیا۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے پانی کا گلاس تھام لیا تھا۔

”بے فکر ہو کر پانی پی لے۔ اس کے بعد اپنے بارے میں بتانا۔“

”میرا نام ارم ہے۔“ لڑکی نے پانی پی لینے کے بعد بتایا۔

”اور تیرے باپ کا کیا نام ہے۔“

”میرے ڈیڈ کا نام عادل ہے۔ عادل شیراز۔“ اس نے بتایا۔ پھر رونے لگی۔ ”خدا کے لیے جانے دو مجھے۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ میرے گھر والے بہت پریشان ہو رہے ہوں گے۔“

”ہاں ہاں بھیج دوں گا تجھے، یہ بتا، تیرا باپ کیا کرتا ہے۔“

”ڈیڈ کی اپنی ایک فرم ہے۔ کلیئرنگ فار ورڈنگ کی۔“ لڑکی نے بتایا۔

شکجہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”واہ، پھر تو تیرا باپ تیرے بدلے پچاس ساٹھ لاکھ دے ہی سکتا ہے۔“

”ہاں ہاں مل جائیں گے۔ میرے ڈیڈ دے دیں

گے۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔“ اس لڑکی پر ایک ہدائی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ”خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ جانے دو مجھے۔ میرا چھوٹا بھائی میرے لیے رورہا ہوگا۔“

”ہاں ہاں چلی جانا۔ چل اپنا موبائل نکال۔ اپنے باپ کا نمبر ملا کر اس سے میری بات کرا۔ جلدی!“

لڑکی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے ڈیڈ کا نمبر ملا لیا۔ دوسری طرف اس کا باپ ہی تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی آواز سن کر تڑپ اٹھا تھا۔ ”بیٹا کہاں ہو تم؟“

”ڈیڈ۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ آپ بات کریں۔“

شکجہ نے موبائل لڑکی کے ہاتھ سے لے لیا۔ ”ہاں بھائی، بات سنو۔ تمہاری بیٹی ہمارے قبضے میں ہے۔ سنو رہو، ہم نے اس کو پارکنگ سے اٹھایا ہے۔ اس کی گاڑی غزالی روڈ پر مل جائے گی۔ صرف پچاس لاکھ، پچاس لاکھ اور اپنی بیٹی کو لے جاؤ اور ہاں، دوسرے فون کا انتظار کرو۔“ اس دوران لڑکی روٹی رہی تھی۔

”اے لڑکی، اب یہ رونا دھونا بند کر۔ اور جب باپ فون کرے تو اسے سمجھا دینا کہ اسی میں بھلائی ہے کہ ہمارا مطالبہ مان لے۔ ورنہ تیرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ پھر شکجہ نے اپنے ایک آدمی کی طرف دیکھا۔ ”جا، اب اسے کمرے میں لے جا۔ اور اس کی روٹی شونی کا بندوبست کرو۔“

لڑکی لرزتے قدموں سے اس آدمی کے ساتھ چل پڑی۔ چند ہی لمحوں بعد جب اس لڑکی کی چیخ سنائی دی تو شکجہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ ”یہ کیوں چیخ رہی تھی۔ جاؤ دیکھ کر آؤ۔“

کچھ دیر میں وہ لڑکی اور اس آدمی کو شکجہ کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ جس آدمی کو شکجہ نے اس لڑکی کے ساتھ بھیجا تھا۔ لڑکی بری طرح رورہی تھی۔

”میں برداشت نہیں کر سکتی۔ جان سے مار دو مجھے۔ وہ میرے لیے ٹھیک ہے، لیکن بدتمیزی۔“

شکجہ نے گھور کر اس آدمی کی طرف دیکھا۔ وہ خوف سے لرزنے لگا تھا۔ ”صاحب، غلطی ہو گئی مجھ سے۔“

”کیا تجھے نہیں معلوم کہ ہمارا اصول کیا ہے۔“ شکجہ غرایا۔ ”ہم یہ برداشت کر ہی نہیں سکتے کہ کسی عورت پر اس طرح کی زیادتی کی جائے۔“

”صاحب، میں نے صرف اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔“ اس آدمی نے بتایا۔

”کیوں پکڑا تھا ہاتھ، کیا نیت تھی تیری؟“

اس آدمی نے اپنی گردن جھکالی۔ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ”لڑکی۔۔۔ شکجہ نے لڑکی کو مخاطب کیا۔“ مجھے افسوس ہے کہ یہاں تیرے ساتھ ایسی حرکت ہوئی ہے۔ اب یہی ہو سکتا ہے کہ میں پچاس لاکھ کا نقصان برداشت کر لوں۔ تجھے جانے کی اجازت دیتا ہوں۔ لیکن نہیں، میں خود تجھے پہنچا کر آؤں گا۔ میں ابھی کسی حرامزادے پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ ہو سکے تو ہمیں معاف کر دینا۔“

لڑکی اپنا رونا بھول کر حیرت اور احترام سے شکجہ کو دیکھنے جا رہی تھی۔

☆☆☆

محلے کا صرف ایک ہی لڑکا سلمان کا دوست تھا۔ شیدا نام تھا اس کا۔ وہ ایک ناکارہ اور آوارہ گرد قسم کا لڑکا تھا۔ اس کا سب سے محبوب مشغلہ غلیل بازی تھی۔ وہ غلیل سے پرندوں کا شکار کیا کرتا تھا۔ اور ایسی مہارت کے ساتھ کہ اڑتے ہوئے پرندے بھی نشانہ بن جاتے۔ سلمان کو اس نے غلیل سے نشانہ لگانا سکھایا تھا۔ سلمان کو یہ ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آ گیا تھا۔

شیدے ہی نے اسے ایک غلیل مہیا کر دی تھی۔ سلمان گھر والوں سے چھپ کر دن بھر ادھر ادھر گھومتے ہوئے غلیل بازی کیا کرتا۔

اب تو اس نے اس فن میں اپنے دوست شیدے کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ شیدے جس چیز کی طرف اشارہ کرتا، سلمان اس کا نشانہ لگا کر بتا دیتا۔

سلمان اس وقت بھی اپنے نشانے کی مہارت کا مظاہرہ کرتا پھر رہا تھا کہ دو آدمی اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

”واہ استاد، تمہارا نشانہ تو بہت زبردست ہے۔“ ان میں سے ایک نے سلمان کی تعریف کی۔

سلمان غوٹ غاٹ کر رہ گیا۔ ”یار، یہ تو گونا گونا معلوم ہوتا ہے۔“ دوسرے نے حیرت ظاہر کی۔

”ہاں، یہ گونا گونا ہے۔“ پہلے نے کہا۔ ”میں کئی دنوں سے اس کو دیکھ رہا ہوں۔ شاید اسی محلے میں رہتا ہے۔“

”ہمارے کام کی چیز ہے۔“

”ہاں۔ صاحب اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔“ پہلے

ٹورنٹو

صوبہ آنٹیریو کا صدر مقام۔ آبادی 40,00000 یہاں دنیا کی مختلف قومیتوں کے افراد آباد ہیں۔ کینیڈا میں مقیم چینیوں کی سب سے بڑی تعداد اسی شہر میں رہتی ہے۔ اسی طرح اطالویوں کی بھی بہت بڑی تعداد ٹورنٹو... میں مقیم ہے۔ ٹورنٹو کا آن ٹاور یہاں کی بہترین عمارت ہے اس کی سب سے اوپر کی منزل سے پورے شہر کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ 555 میٹر (یا 1820 فٹ) بلند یہ ٹاور بغیر کسی سہارے کے کھڑا دنیا کا بلند ترین ٹاور ہے۔

یہ شہر شمالی امریکا کا ایک اہم سیاحتی مرکز بھی ہے۔ اسے کینیڈا کی اقتصادی و معاشی سرگرمیوں کا مرکز ہونے کا شرف حاصل ہے۔ چائنا ٹاؤن کے علاقے میں وکٹوریہ ٹریڈ کے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ ٹاور سے کچھ فاصلے پر فورٹ پارک ہے، جس میں برطانوی فوج کے انیسویں گریڈن رہتی تھی، ٹون لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک آرٹ گیلری بھی ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں ٹورنٹو ان تین قلعوں کے نام کے طور پر استعمال ہوتا تھا، جنہیں فرانسیسیوں نے تعمیر کرایا تھا، تاکہ ریڈ انڈینز کے ساتھ اپنی تجارت کو انگریزوں اور دوسری یورپی اقوام کی طرف سے کسی خطرے سے محفوظ بنایا جاسکے۔ جب 1759ء میں فرانسیسیوں کو شکست ہوئی تو قلعے مسمار کر دیے گئے۔ یہاں ایک بندرگاہ بھی ہے۔ وکٹوریہ کیتھڈرل، سینٹ لارنس ہال، یونیورسٹی کالج کی عمارات انتہائی دیدنی ہیں۔ یہ کینیڈا کا سب سے بڑا ثقافتی مرکز ہے۔ یہاں کا مسیحی آرکسٹر ایڈ مشہور ہے۔

ٹورنٹو کی شاہراہوں اور عمارتوں کے نیچے ایک زیر زمین شہر ہے جہاں رستوران، بینک، ہوٹل، دفاتر اور تجارتی ادارے ہیں۔ تین میل طویل سرنگوں اور زیر زمین راستوں کے ذریعے یہ شہر کے دوسرے علاقوں سے مربوط ہے۔ شہر میں دو یونیورسٹیاں ہیں ایک کا قیام 1827ء میں جبکہ دوسری کا قیام 1959ء میں عمل میں آیا، یہ بیس بال کھیل کا ایک بڑا مرکز ہے۔

نسرین ذوالقرنین، کوہاٹ

والے نے کہا۔ پھر سلمان سے مخاطب ہوا۔ ”آؤ دوست، چل کر کہیں بیٹھتے ہیں۔ دوستی۔“ اس نے دوستی کے انداز میں دو انگلیاں جوڑ کر اس کی طرف بڑھادیں۔

سلمان کے لیے بہت خوشگوار حیرت تھی۔ دوا دی اس کے دوست بن رہے تھے۔ ورنہ سوائے شیدے کے اور کون اس کا دوست تھا۔ اور ایک وہ لڑکی تھی جو اس کی طرف مسکرا کر دیکھ لیتی تھی اور اس کی خیریت دریافت کرتی تھی۔ ایک دو بار اس نے سلمان کو اس کریم بھی دی تھی۔ اس نے بھی اپنی دو انگلیاں جوڑ کر ان کی طرف بڑھادیں۔ وہ اب دوست ہو چکے تھے۔ وہ سب قریب کے ایک ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے۔

ان لوگوں نے سلمان کے لیے چائے بکٹ اور کیک وغیرہ منگوائے۔ سلمان بہت خوش تھا۔ وہ غوں غاں کر کے اور اشاروں میں اپنے بارے میں نہ جانے کیا کیا بتا رہا۔ وہ دونوں اس کی ہر بات پر گردنیں ہلاتے رہے تھے۔

سلمان کے لیے یہ دوسرا خوشگوار موقع تھا۔ پہلی بار جب اس لڑکی نے اس کے ساتھ ہمدردی کی تھی اور دوسری بار جب یہ دونوں اس کے ساتھ محبت سے پیش آرہے تھے۔

سلمان کے لیے آج کا دن بھی بہت اہم تھا۔ وہ خوش تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی خوشی میں کس کو شریک کرے۔ کسے بتلائے کہ اس کو دو دوست مل گئے ہیں جو اس کا بہت خیال رکھنے والے ہیں۔

گھر کے کسی فرد سے بات کرنی تو بے کار تھی۔ اول تو وہ اس کی بات پر دھیان ہی نہیں دیتے۔ اگر سمجھ بھی لیتے تو ان کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس لیے انہیں اپنی خوشی میں شریک کرنا بے کار تھا۔

پھر اسے وہی لڑکی یاد آگئی۔ وہ لڑکی اس کی ہمدرد تھی۔ شاید اسے یہ جان کر خوشی ہوتی۔ وہ ان دونوں سے رخصت ہو کر ہوٹل سے نکل کر اس لڑکی کے گھر کی طرف چل پڑا۔

اس کا گھر تو محلے ہی میں تھا۔ وہ کچھ دیر تک دروازے پر کھڑا رہا کہ شاید وہ دکھائی دے جائے۔ لیکن جب بہت انتظار کے بعد بھی وہ دروازے پر نہیں آئی تو اس نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دے دی۔

ایک عورت نے دروازہ کھولا تھا۔ شاید وہ اس لڑکی کی ماں تھی۔ محلے دار ہونے کی وجہ سے شاید وہ سلمان کو پہچانتی تھی۔ اس لیے اس نے بہت نرم لہجے میں دریافت کیا۔ ”کیا بات ہے، کس سے ملنا ہے؟“

”آں“ سلمان نے اشاروں کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کی۔

اس دوران وہ لڑکی بھی دروازے تک آگئی تھی۔ ”اماں“ یہ سلمان ہے۔ اسی محلے میں رہتا ہے۔ گونا گونا ہے بے چارہ۔“

”ہاں ہاں جانتی ہوں میں۔“ اس کی ماں نے کہا۔ ”لیکن یہ تو پوچھو، کیوں آیا ہے۔“

”شاید میں نے ایک بار اس سے پڑھنے کے لیے کہا تھا۔“ لڑکی نے بتایا۔ ”ہو سکتا ہے بے چارہ اسی لیے آیا ہو۔“

”لڑکی تیرا بھی جواب نہیں ہے۔“ ماں غصے سے بولی۔ ”نہ جانے کیسی کیسی مصیبتیں پال کر رکھتی ہے۔ اب تو اس کو نکلے کو پڑھائے گی۔“

لڑکی کی ماں بک بک کرتی ہوئی اندر چلی گئی تھی۔

”ہاں بھائی، اب بتاؤ۔“ لڑکی نے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا پڑھنے کے لیے آئے ہو؟“

”نہیں۔“ سلمان نے اس کی بات سمجھ کر انکار میں اپنی گردن ہلا دی۔

”تو پھر کیا بات ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہے؟“

سلمان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کس طرح بتائے۔ کس طرح اظہار کرے۔ کیسے بتائے کہ آج اس نے دو دوست بنائے ہیں۔

پھر اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ وہ بھی پاگل ہی ہو گیا ہے۔ اسے اس لڑکی کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ اگر اس کی بات سمجھ بھی لیتی تو اس سے کیا فرق پڑنے والا تھا۔

اپنی اس بے بسی پر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

وہ کچھ بتائے، کوئی اشارہ کیے بغیر واپس ہو گیا۔ وہ لڑکی ہمدردانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

کلچر نے بہت جھلا کر کہا۔ ”ابے، اگر وہ لڑکا گونگا ہے۔ تو ہمارے کس کام آ سکتا ہے۔ میں نے کوئی یتیم خانہ نہیں کھول رکھا۔“

”صاحب ہم نے اس لڑکے کا نشانہ دیکھا ہے۔“ ایک نے بتایا۔ ”وہ غلیل سے بھی سچا اور صاف نشانہ لگا لیتا ہے۔“

”پھر وہی۔ سوال یہ ہے کہ وہ ہمارے کس کام آ سکتا ہے۔“

”اس کو تھوڑی سی ٹریننگ دیں گے صاحب۔“ اس نے کہا۔ ”پھر جس ٹارگٹ کو چاہیں گے۔ وہ اسے دور سے اڑا دے گا۔ اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ گونگا ہے۔ پکڑا بھی گیا تو ہمارے بارے میں کچھ نہیں بتا سکے گا۔“

”پاگل ہو گیا ہے تو۔ ابے وہ گونگا ہے، اندھا نہیں ہے۔ وہ پولیس کو ہمارے اڈے تک لا سکتا ہے۔“

”نہیں صاحب، اس کے لیے بھی سوچ لیا ہے۔ ہم اس کو یہاں لائیں گے ہی نہیں۔ اس کو ندی کنارے والے اڈے پر لے جائیں گے۔ ویسے بھی وہ ایک ویران علاقہ ہے۔ اس کو جب ٹریننگ دی جائے گی تو گولیوں کی آواز سننے والا وہاں کوئی نہیں ہوگا۔ اور وہ اڈا تو خالی ہی پڑا ہوا ہے۔“

کلچر سوچ میں پڑ گیا تھا۔

بہت دنوں سے ایسے ہی کسی بندے کی تلاش تھی جو دور ہی سے سچا اور صاف نشانہ لگا سکے۔ اس نے اب ٹھیکے پر بھی کام لینا شروع کر دیا تھا۔

یہ ٹھیکہ کسی کو بھی ٹھکانے لگانے کا تھا۔ کسی بھی تاجر کو، پولیس آفیسر کو، مذہبی عالم کو یا کسی سیاست دان کو۔ یا کوئی بھی عام شخص معاوضہ ادا کر کے اپنے دشمن کو کلچر کے ذریعے راستے سے ہٹا سکتا تھا۔

ڈیکٹیوں اور اسٹنگ وغیرہ سے کہیں زیادہ اس میں آمدنی تھی۔ لیکن پریشانی یہ ہو رہی تھی کہ اس کے کارندے ڈیکٹیوں وغیرہ کے لیے توتیار ہو جاتے۔ لیکن کسی نشانے کو اڑانا ان کے بس کی بات نہیں ہوتی تھی۔ وہ گھبرا جابا کرتے۔

کلچر سوچ رہا تھا کہ اس کام کے لیے وہ گونگا بہتر ثابت ہو سکتا ہے۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ”ٹھیک ہے، لے آنا اس کو۔ میں بھی تو دیکھوں کیا نشانہ ہے اس کا۔“

☆☆☆

ظفر ایک مخلص و صاف دل کا مہذب اور روشن خیال انسان تھا۔

اس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ اس کے باوجود لوگ اسے بہت پسند کرتے تھے۔ اپنے محلے کے حق کے لیے اس

ابجد

ابتدائی حروف ابجد ابج د کا مرکب ہے جن سے کسی زبان کے حروف مراد ہوتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں فن تحریر کے رواج سے پیشتر اظہار مطلب کا واحد ذریعہ تصویریں ہوا کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ ان تصاویر کو مختصر کر کے حروف بنائے گئے۔ ابجد کی ایجاد کا سہرا فونیقی قوم کے سر ہے جس نے سب سے پہلے حروف ابجد مرتب کیے۔ بعد میں ماسوائے چین اور جاپان کے تمام دنیا نے انہیں اپنی ضرورت کے مطابق اپنایا۔ یورپ میں جو لاطینی حروف ابجد رائج ہیں وہ اسی قدیم فونیقی ابجد سے اخذ کیے گئے ہیں اور ان کا نام Alphabet ہے۔ جو ”الفا“ اور ”بیتا“ کا مرکب ہے۔ یہ لاطینی زبان کے ابتدائی دو حروف ہیں اور فونیقی الف اور ب کے ہم آواز ہیں۔ موجودہ عربی حروف ابجد بھی فونیقی ہی کی ایک صورت ہیں، کیونکہ فونیقی قوم بھی عربوں کی طرح سامی النسل تھی۔ جس رسم الخط میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہ جیش کو خط تحریر کیا تھا، اس میں اور فونیقی رسم الخط میں ایک عجیب مشابہت نظر آتی ہے۔ عربی ابجد: (دائیں سے بائیں) ت ث ج ح خ ذ ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک ل م ن و ہ ی۔

اردو ابجد: (دائیں سے بائیں) پ ت ث ج ح خ ذ ز س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ی۔

یاد رہے کہ ہندی رسم الخط آرامی سے اخذ کیا گیا ہے اور آرامی رسم الخط بھی فونیقی رسم الخط ہی کی پیداوار ہے۔ اردو خط عربی رسم الخط کی ایک صورت ہے جس کو نستعلیق کہتے ہیں۔ اس میں 37 حروف ہیں۔ اس کے مقابلے پر فارسی کے 32 اور عربی کے 29 حروف ہیں۔ عربی تحریر نسخ میں ہوتی ہے۔

مرسلہ: نعمان اشرف، لاہور

نے کئی جنگیں لڑی تھیں۔

پانی کا مسئلہ ہو۔ سیوریج کا مسئلہ ہو۔ بجلی کا مسئلہ ہو۔ یا محلے میں غذا گروڈی ہو رہی ہو۔ لوگ اس کے پاس پہنچ جاتے۔

ظفر بھائی، ہمارا یہ کام اٹکا ہوا ہے۔ ظفر بھائی ہمارے بھائی کو میرٹ کے باوجود داخلہ نہیں مل رہا۔ ظفر بھائی آج فلاں اسکول والوں نے ہمیں بلایا ہے۔ ان کا یہ پرابلم ہے۔ وغیرہ۔

اسے گفتگو کا فن بھی آتا تھا۔ اس کی شخصیت ایسی تھی کہ لوگ اس سے متاثر ہو جاتے۔ اس کی باتیں جوش اور ولولہ انگیز ہوتیں۔

ایک بار اسے ایک اسکول کی تقریب میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اسکول والوں نے اپنی اس تقریب میں ظفر کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا تھا۔ اسے یہ جان کر اتنی حیرت ہوئی کہ وہ صورت حال جاننے کے لیے تقریب سے دو دن پہلے ہی اسکول کے پرنسپل کے پاس پہنچ گیا۔

اس کے آنے کی خبر پورے اسکول میں پھیل گئی۔ بہت سی ٹیچرز اسٹاف روم میں جمع ہو گئی تھیں۔ ظفر اس وقت خود کو بہت نروس محسوس کر رہا تھا۔

”جناب، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگوں نے مجھے چیف گیسٹ کیوں بنایا ہے۔“ اس نے پوچھا۔ ”میں تو ایک عام سا انسان ہوں۔ نہ بہت بڑا دانش ور ہوں، نہ سیاست دان ہوں اور نہ فلمی اداکار ہوں، کچھ بھی نہیں ہوں میں پھر یہ فیصلہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔“

”ظفر صاحب ہم اپنے اسکول کے طالب علموں کو سیاست دانوں اور بیروکریش وغیرہ کے سحر سے نکالنا چاہتے ہیں۔ انہیں یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ بڑے لوگ صرف وہی نہیں ہوتے، ایک سوشل ورکر بھی ہوتا ہے۔ بلکہ وہی ہوتا ہے۔ ہم نے آپ کی تعریف سنی ہے۔ اس لیے ایک رول ماڈل کے طور پر آپ کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔“

”پرنسپل صاحب، آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“ ”دیکھیں صاحب، اگر آپ بھی شرمندگی کا اظہار کر کے پیچھے ہٹ گئے تو ہم قوم کے سامنے کس کو رول ماڈل کے طور پر لائیں گے۔“ یہ بات ایک جوان اور خوبصورت سی ٹیچر نے کہی۔ ظفر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”ظفر صاحب، ہمارے اسکول نے یہ روایت ڈال دی ہے۔“ پرنسپل نے کہا۔ ”اور مجھے یقین ہے کہ دوسرے

اسکول بھی ہماری تقلید کریں گے۔“

”پلیز ظفر صاحب، آپ ہماری بات مان لیں۔“ اسی ٹیچر نے کہا۔

ظفر کے پاس اب کوئی چارہ نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے اپنے طور پر ایک آخری کوشش کی۔ ”جناب، چیف گیسٹ 7 اسے بنایا جاتا ہے جو اسکول کی مالی مدد کر سکے۔ ڈونیشن دے سکے۔ میں تو کچھ نہیں دے سکوں گا۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ پرنسپل نے کہا۔ ”ہمارے اسکول کے پاس اپنا اچھا خاصا فنڈ ہے۔ ہمیں فنڈنگ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس آپ کا آنا ہمارے لیے بہت ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔“ ظفر نے گہری سانس لی ”میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

”یہ بات ہوئی نا۔“ وہی ٹیچر بول پڑی۔ ”اب آپ ہمارے ساتھ چائے پی کر جائیں گے۔“

پرنسپل نے اسٹاف روم میں موجود ٹیچرز کا تعارف کروایا۔ ”یہ مسز غزالہ ہیں۔ یہ مسز شاہ ہیں۔ یہ مس نورین ہیں اور یہ مس رضوانہ ہیں۔“

اس خوبصورت ٹیچر کا نام رضوانہ تھا۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد ظفر کو پورے اسکول کا دورہ کروایا گیا۔۔۔ رضوانہ اس دوران ساتھ ساتھ رہی تھی۔ اور پہلی بار ظفر کو احساس ہوا کہ اگر حسین ساتھ ہو تو لمحے کتنے خوش گوار ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

سلمان کو گلنجہ کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔ ان دونوں نے کئی دنوں تک سلمان پر کام کیا تھا۔ اس کو ہوٹل لے جاتے۔ کھلاتے پلاتے۔ اس کی نشاندہی باری پر خوش ہو کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ سلمان کو اب کیا چاہیے تھا۔

اسے وقت گزارنے اور زندہ رہنے کا ایک اچھا بہانہ مل چکا تھا۔ وہ بھی اب دوستوں والا ہو گیا تھا۔ اور وہی دونوں اسے ایک بار اپنے ساتھ گلنجہ کے پاس لے آئے تھے۔

”صاحب، یہی ہے وہ گونگا۔“ ایک نے بتایا۔ ”اس کے پاس غلیل ہے۔ آپ کہیں تو یہ نشانہ لگا کر دکھا سکتا ہے۔“ گلنجہ نے دور رکھے ہوئے ایک گھڑے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس سے کہو کہ وہ اس گھڑے کا نشانہ لگا کر کر دکھائے۔“ سلمان کو اشارے سے سمجھایا گیا۔ سلمان کے لیے یہ

بہت آسان نشانہ تھا۔ اس نے اپنی غلیل ایک جیب سے نکالی۔ دوسری جیب سے ایک چھوٹا سا پتھر نکال کر گھڑے کا نشانہ لگا دیا۔

وہ گھڑا ایک زوردار آواز کے ساتھ پھٹ گیا تھا۔ ”شاباش۔“ گلنجہ نے حوصلہ افزائی کے طور پر اپنی جیب سے کچھ چاکلیٹ نکال کر سلمان کی طرف بڑھادیں۔

سلمان کے لیے آج کا دن بہت مبارک تھا۔ اس نے خوش ہو کر گلنجہ کو اشاروں میں بتایا کہ وہ اس سے بھی اچھا نشانہ لگا سکتا ہے۔

گلنجہ کے حکم پر کچھ فاصلے پر تاش کا ایک پتھر رکھ دیا گیا۔ سلمان نے اس کو بھی اڑا دیا تھا۔

”واہ! یہ تو واقعی کام کا بندہ ہے۔“ گلنجہ خوش ہو گیا تھا۔ ”اب جاؤ اس کو ٹریننگ دو۔ لیکن.....“

”لیکن کیا صاحب؟“

”ابھی اسے واپس گھر مت جانے دو۔“ گلنجہ نے کہا۔ ”اب یہ ہمارے پاس آ گیا ہے تو یہیں رہے گا۔“

☆☆☆

دو چار دنوں تک سلمان کو تلاش کیا جاتا رہا۔ پھر سب خاموش ہو گئے۔ اس کے لیے زیادہ افسوس بھی نہیں کیا گیا تھا۔ صرف ایک ماں تھی۔۔۔ جو کچھ دنوں تک بے چین رہی تھی۔ ”ہائے کون لے گیا اس کو۔ میرا بچہ کہاں چلا گیا۔ کیا ہوا ہے اس کے ساتھ۔ وہ تو ہمیشہ گھر سے نکل کر واپس آ جاتا تھا۔ اب بار تو ایسا گیا کہ واپس ہی نہیں آ رہا ہے۔“

”اماں، اب بس بھی کرو۔“ ایک بیٹے نے کہا۔ ”وہ یہاں تھا تو کون سا کارنامہ انجام دے رہا تھا۔ سوائے گھر بیٹھ کر کھانے کے۔“

”اور کیا اماں، تم تو خواہ مخواہ اس کے لیے ہلکان ہو رہی ہو۔“ دوسرے نے کہا۔ ”اس کو کوئی اٹھا کر نہیں لے گیا۔ خود سوچو، کون لے جائے گا ایسے ناکارہ کو۔ خود ہی چلا گیا ہے۔ اور کچھ دنوں کے بعد خوار ہو کر واپس بھی آ جائے گا۔“

”اس میں ہم سے زیادہ عقل ہے اماں، تم اس کی فکر مت کرو۔“ پہلے والے نے کہا اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

ماں منہ ہی منہ میں کچھ بول کر خاموش ہو گئی۔ جانے والے کی کمی دو چار دنوں تک محسوس ہوتی رہی تھی۔ اس کے بعد سب کچھ نارمل ہو گیا۔ محلے کے لوگ بھی اسے بھول گئے۔

شام

10 جون 2000ء کو شام کے صدر حافظ الاسد انتقال کر گئے تو ان کے بیٹے بشار الاسد کو صدر کے عہدے پر جب کہ محمود مصطفیٰ امیر کو وزیر اعظم کے عہدے پر نامزد کیا گیا۔ 2000ء میں شام نے 600 کلومیٹر تک مار کرنے والے میزائل کا کامیاب تجربہ کیا، جس پر اسرائیل نے سخت تشویش کا اظہار کیا جس کے جواب میں شام نے امریکا اور اسرائیل کو زیادہ سخت جواب دیا۔ 2002ء میں شام نے سلامتی کونسل کی صدارت سنبھال لی۔

2003ء میں صدر نے محمد نجی الاوتاری کو وزیر اعظم کے عہدے پر فائز کیا جو اسرائیلی دشمنی میں مشہور تھے۔ چنانچہ امریکی ایوان نمائندگان نے 2003ء میں شام کے خلاف پابندیاں عائد کرنے کی منظوری دے دی۔ شام پر دہشت گرد گروپوں سے مبینہ تعلقات کے علاوہ کیمیائی، ایٹمی اور حیاتیاتی ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کے الزامات بھی عائد کیے گئے۔ 2003ء میں شام کے خلاف اقتصادی پابندیوں کے بل پر امریکی صدر نے بھی دستخط کر دیے۔ 2004ء میں اسرائیل کے صدر نے شام کے ساتھ غیر مشروط طور پر بات چیت کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ 2004ء میں امریکا نے شام پر اقتصادی پابندیاں عائد کر دیں اور اس کے اثاثے منجمد کر دیے۔ لیکن شام نے جھکنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر ملک میں خانہ جنگی کرا دی گئی۔

مرسلہ: ندرت اسلم، لاہور

صرف رضوانہ کبھی کبھی اپنی پڑوسن سے اس گونگے کے بارے میں معلوم کر لیا کرتی۔ جس کے بارے میں پڑوسن ہی نے بتایا تھا کہ وہ کہیں چلا گیا ہے۔

جب اس جانے والے کے گھر والے ہی اسے بھول گئے تھے تو پھر رضوانہ کو کیسے یاد رہتا۔ اس کے لیے تو سب سے اچھی بات یہ تھی کہ ظفر جیسا باکمال نوجوان اس کے بہت قریب آچکا تھا۔

جب وہ پہلی بار رضوانہ کے اسکول آیا تھا تو رضوانہ کو اسی وقت وہ بہت اچھا لگا تھا۔ وہ عام نوجوانوں سے بہت

مختلف تھا۔ اس کا مستقبل شاندار دکھائی دے رہا تھا۔

سوشل ورکر کی حیثیت سے اس نے معاشرے میں اپنا نام پیدا کر لیا تھا۔ اور جب خود ظفر نے اس کی جانب اپنا قدم بڑھایا تو وہ اس نوجوان کو انکار نہیں کر سکی۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ظفر اپنی تمام تر سچائیوں اور خلوص کے ساتھ اس کے پاس آیا تھا۔

ان دونوں کے درمیان مفاہمت کے مراحل بہت تیزی سے طے ہوتے گئے۔ اور ایک دن ایسا بھی آیا جب دونوں کے گھر والوں کی رضا مندی سے ان کی منگنی ہو چکی تھی۔

☆☆☆

کئی مہینے گزر گئے۔ ان کئی مہینوں میں سلمان نے اپنی ٹریننگ مکمل کر لی تھی۔ شگنجہ اس کے بارے میں پُر امید تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ گونگا نوجوان مشکل سے مشکل ٹارگٹ کو بھی نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

خود سلمان اب شگنجہ کے پاس اس کا غلام بن کر رہ گیا تھا۔ شگنجہ اس کی حوصلہ افزائی کیا کرتا۔ اس کے لیے بہترین کپڑے اور جوتے منگوائے گئے تھے۔

ایک چھوٹی سی گاڑی ہر وقت سلمان کے استعمال میں رہتی تھی۔ اس کی اب دنیا ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ وہ اب صرف سلمان نہیں بلکہ سلمان گولی کہلاتا تھا۔

وہ شگنجہ کے اشارے پر دو آدمیوں کو ٹھکانے بھی لگا چکا تھا۔ اور وہ بھی اتنی صفائی کے ساتھ کہ پولیس سوچتی ہی رہ گئی کہ گولی کدھر سے چلائی گئی ہوگی۔

یہ حکمت عملی بہت کامیاب رہی تھی۔ اب جس کو ٹارگٹ کرنا ہوتا تھا اس پر کوئی موثر سائیکل والے حملے نہیں کرتے تھے اور نہ ہی کوئی اس کے قریب جاتا۔ بلکہ بس بہت فاصلے سے ایک گولی آتی اور ٹارگٹ کو موت کی آغوش میں پہنچا دیتی۔

سلمان اب تک دو بندوں کو مار چکا تھا۔ شگنجہ کے ساتھی اسے اپنے ساتھ لے جاتے اور اسے اشاروں سے سمجھا دیا جاتا کہ اسے کس آدمی کو مارنا ہے۔ اس کا مورچہ کچھ فاصلے پر لگایا جاتا۔ اور جیسے ہی وہ آدمی اس کے نشانے کی زد پر آتا۔ اس کی انگلیاں ٹریگر دبا دیتیں اور کام ختم ہو جاتا۔

ایسے موقع پر خود شگنجہ بھی اس کی کارکردگی کو دیکھنے کے لیے کچھ فاصلے پر ایک گاڑی میں بیٹھا رہتا۔

کام ہو جانے کے بعد اس کی گاڑی موقع سے غائب ہو جاتی اور شگنجہ کے آدمی سلمان کو بہرہ مند واپس لے آتے۔

واپس آنے کے بعد اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ کوئٹوں کی ایک گڈی انعام کے طور پر دی جاتی۔ یہاں خرچ کچھ بھی نہیں تھا۔

اس لیے وہ سارے نوٹ سنبھال کر رکھ دیتا۔ اس ارادہ تھا کہ جب اس کے پاس کچھ اور نوٹ ہو جائیں گے وہ اس میں سے آدھی رقم اپنے گھر بھجوا دے گا اور آدھی اس لڑکی کو دے دے گا۔ جس نے اس کو تعلیم دلوانے کی بات کی تھی۔

وہ اس سے کہے گا کہ وہ ان پیسوں سے اس لیے گونگوں کے لیے کوئی اسکول کھول لے۔ اگر وہ خود حاصل نہیں کر سکا تو کیا ہوا۔ اس جیسے دوسرے گونگے تو رہ سکتے ہیں۔

☆☆☆

رضوانہ اسے پہچان نہیں سکی تھی۔ وہ اس وقت اپنے منگیتہ ظفر کے ساتھ کسی مارکیٹ سے نکل رہی تھی جب اس نے اس گونگے کو دیکھا تو اس کے محلے ہی میں رہتا تھا۔ لیکن بہت دنوں سے اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔

وہ اس گونگے کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اب سلمان کے جسم پر قیمتی کپڑے تھے۔ اس کے جوتے بھی شاندار تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک قیمتی موبائی سیٹ بھی تھا۔

یعنی وہ گونگا ہر طرح سے بدل کر رہ گیا تھا۔ وہ شاید اسے پہچان نہیں پائی۔ لیکن وہ خود ہی اس کے سامنے آ کر غوغاں کرنے لگا تھا۔

”اوہ، تو یہ تم ہو۔“ رضوانہ نے ایک گہری سانس لی۔ پھر پوچھا۔ ”اتنے دنوں سے کہاں غائب ہو گئے تھے۔“

گونگے نے اشاروں میں بتانے کی کوشش کی کہ اپنے دوستوں کے ساتھ رہنے لگا ہے۔ اور یہ کپڑے جوئے دوستوں نے دلوائے ہیں۔

”چلو، یہ تو اچھی بات ہے۔“ رضوانہ خوش ہو کر بولی۔ پھر اس نے ظفر کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔

میرے منگیتہ ہیں۔“ اس نے اپنی انگلی کی انگوٹھی دکھادی۔ صرف ایک لے

کے لیے سلمان کے چہرے پر ایک ہلکا سا عکس نمودار ہوا پھر غائب ہو گیا۔

اس نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ظفر سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کو مبارکباد دی اور ان سے اجازت لے کر ایک طرف چل دیا۔

”کون تھا یہ؟“ ظفر نے پوچھا۔

”ہمارے ہی محلے میں رہتا تھا۔“ رضوانہ نے بتایا۔ ”پیدا کنی گونگا ہے۔ بے چارے کو اس کے گھر والے نے ہی نہیں دیتے تھے۔ میں نے تو کئی بار کوشش کی کہ یہ کس تعلیم حاصل کر لے۔ لیکن اس کے گھر والے ہی راضی نہیں ہوئے۔ پچھلے دنوں گھر سے کہیں چلا گیا اور اب دکھائی دیا ہے۔“

”کیا اس کے پاس اتنے پیسے ہیں کہ اتنی قیمتی ڈرائیونگ کر سکے۔“

”نہیں تو، اس کے پاس پیسے کہاں سے آئے۔ پچھے حالوں گھومتا پھرتا تھا۔ آج اس کو ابھی حال میں دیکھ رہی ہوں۔“

”رضوانہ میرا خیال ہے کہ یہ لڑکا غلط ہاتھوں میں پڑ گیا ہے۔“ ظفر نے کہا۔ ”یہ میرا تجربہ ہے۔ میں ایسے کئی معاملات دیکھ چکا ہوں۔“

”ہائے بے چارہ! بہر حال ہمیں کیا۔ وہ جانے اور اس کے گھر والے جا میں۔“

دونوں ایک ہونٹ میں آکر بیٹھ گئے۔ ان دونوں کے درمیان بہت تیزی سے انڈر اسٹینڈنگ بڑھی تھی۔ دونوں ہی ہم مزاج اور ہم خیال ثابت ہوئے تھے۔

ظفر کہا کرتا کہ وہ اگر اس دن اسکول میں چیف گیٹ بن کر نہیں آتا تو رضوانہ جیسی نعمت سے محروم ہی رہ جاتا۔

کھانے کا آرڈر دینے کے بعد ظفر نے انکشاف کیا۔ ”رضو، کیا تمہیں اندازہ ہے کہ تم میری زندگی میں کتنی خوش قسمتی لے کر آئی ہو۔“

”نہیں تو۔“ رضوانہ مسکرا کر بولی۔ ”چلو بتا ہی دو اب کون سی نئی بات ہو گئی۔“

آکاش بیل

ایک زبردست کی بیل جس کے پتے نہیں ہوتے۔ یہ بیل مٹی میں اگنے کی بجائے بیری یا اس قسم کے درختوں کی ہری بھری شاخوں سے لپٹ کر اپنی غذا حاصل کرتی ہے کیونکہ اس کی جڑیں نہیں ہوتیں۔ کونپلوں اور نئی پھوٹنے والی شاخوں کو گرفت میں لینے کے لیے چھوٹی چھوٹی شاخیں ہی ہوتی ہیں جنہیں بال کہتے ہیں۔ آکاش بیل کے بڑھنے کی رفتار بڑی تیز ہوتی ہے۔ چند مہینوں میں تناور درخت پر پوری طرح چھا جاتی ہے۔ وہ درخت جس سے آکاش بیل لپٹ جائے زندگی بھر اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ موسم خزاں میں آکاش بیل جو بن پر ہوتی ہے۔ اس کے سفید رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول دیکھنے میں بہت خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بیل بہت سی بیماریوں میں دوا کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

مرسلہ: ملک ممتاز، منڈی بہاؤ الدین

ہی میرے پاس آئے تھے۔ یہ پارٹی پورے ملک سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کھڑا کر رہی ہے۔ تاکہ اس ملک کے عوام کو زندگی کا ایک بہتر راستہ مل سکے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات بتائی تم نے۔“ رضوانہ خوش ہو گئی تھی۔ ”لیکن تم تو اس فیلڈ میں بالکل نئے ہو۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے حلقے کی اکثریت میرے ساتھ ہے۔“ ظفر نے بتایا۔ ”پھر پارٹی میرے سارے اخراجات اٹھا رہی ہے۔ ایکشن کی مہم کا سارا خرچ اس کے ذمے ہے۔“

”اگر ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ یہ میں صرف تمہارے لیے نہیں کہہ رہی۔ بلکہ پورے ملک کے لیے کہہ رہی ہوں کہ اگر تم جیسے پڑھے لکھے مہذب لوگ پارلیمنٹ میں آجائیں تو واقعی اس ملک کی تقدیر بدل جائے۔“

”میں نے بھی یہی سوچ کر ہائی بھری ہے۔“ ظفر نے کہا۔ ”ورنہ میرا سیاست سے کیا تعلق۔ میں تو صرف ایک سیاست جانتا ہوں اور وہ ہے محبت کی سیاست۔ اور خدا کا شکر ہے کہ میں اس میں کامیاب ہو چکا ہوں۔“

رضوانہ کے ہونٹوں پر ایک پیار بھری مسکراہٹ نمودار

ایکشن کی گہما گہمی عروج کو پہنچ چکی تھی۔
ہر طرف مختلف پارٹیز کے رنگ برنگے جھنڈوں نے
ماحول کو رنگین کر دیا تھا۔
جلے، جلوس، کارز میٹنگز، ایک دوسرے پر الزامات۔
طرح طرح کے سہانے اور دل کش وعدے۔ کہیں کہیں پر
لڑائی جھگڑوں کی خبریں۔
وہی سب کچھ ہورہا تھا جو عام طور پر ایکشن میں ہوا

کرتا ہے۔
کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنے مخالف کو راستے
سے ہٹانے کے لیے سازشیں بھی کی جاتی ہیں۔
رانا ایک سازش ہی لے کر گلجہ کے پاس آیا تھا۔
”صاحب، ہم نے آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔ اسی لیے
ہمت کر کے آپ کے پاس آ گیا ہوں۔“
”ہوں۔“ گلجہ نے ایک گہری سانس لی۔ ”کام ہٹاؤ۔“
”ایک چھوکرے کو راستے سے ہٹانا ہے۔“ رانا نے
بتایا۔ ”نئے نئے پر نکل آئے ہیں اس کے۔ ہم پرانے
سیاست دانوں کو چیلنج دیتا پھر رہا ہے۔“
”تم لوگ تو خاندانی سیاست وال ہو رانا۔“ گلجہ نے
کہا۔ ”پھر کسی چھوکرے سے کیا ڈرنا۔“
”مصیبت تو یہی ہے صاحب کہ ہمارے حلقے کے
لوگوں کو اس نے نہ جانے کون سی پنی پڑھا دی ہے کہ سب
اس کے گن گانے لگے ہیں۔“ رانا نے بتایا۔ ”سالامیرے
لیے خطرے کی تلواریں بن گیا ہے۔“
”تو پھر کیا چاہتے ہو تم؟“

”بس صاحب، آپ تو خود سمجھدار ہیں۔“ رانا معنی
خیز انداز سے بولا۔

”ٹھیک ہے سمجھ گیا۔“ گلجہ نے اپنی گردن
ہلائی۔ ”میں لاکھ ہوں گے۔“
”میں لاکھ تو بہت ہیں صاحب۔“
”کام بھی تو دیکھو۔“ گلجہ نے کہا۔ ”میں لاکھ خرچ
کر کے بیس کروڑ کمانے کے لیے جا رہے ہو۔ تمہیں کوئی
خدمتِ خلق تو نہیں کرنی ہے نا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے صاحب، لیکن.....“
”لیکن لیکن کچھ نہیں۔ کام کروانا ہے تو بتا دینا۔“
”ٹھیک ہے صاحب۔ میں تیار ہوں۔“

سلمان کو ایک عمارت کی چھت پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔
اس عمارت کی چھت سے وہ میدان صاف دیکھ سکتا
وے رہا تھا جہاں جلسہ ہونا تھا۔ یہ ایک اوسط طبقہ کی آبادی کا
محلہ تھا۔ ایک منزلہ مکانات بنے ہوئے تھے۔ ان کی
مکانوں کے درمیان وہ میدان تھا۔
کچھ فاصلے پر ایک سڑک تھی۔
سلمان کو بتایا گیا تھا کہ جیسے ہی اس کا ٹارگٹ میدان
میں آئے اور اس کی طرف بڑھنے لگے۔ اسی وقت اس کی
شوٹ کر دینا ہے۔

معمول کے مطابق اس بار بھی گلجہ کو خود اس آدمی
نکرائی کرنی تھی۔ اس کی گاڑی کچھ فاصلے پر اس طرف
کھڑی کی گئی تھی کہ سلمان اس کو اور وہ سلمان کو دیکھ سکے۔
گلجہ کو امید تھی کہ اس بار بھی یہ کام بے داغ ہی ہوگا۔
سلمان کو دور مار رائل فیلڈ دی گئی تھی۔ اب اس کی
نشانی اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ وہ آنکھیں بند کر کے بھی
اندازے سے نشانہ لگا سکتا تھا۔
اور جیسے ہی وہ ٹارگٹ سامنے آیا۔ سلمان کو بتا دیا
کہ اس کو شوٹ کرنا ہے۔

سلمان کانپ کر رہ گیا۔ اس نے اس نوجوان کو پیچھے
لیا تھا۔ یہ وہی تھا اس لڑکی کا منکیتیر۔ اس لڑکی کا جس نے وہی
پاراس کے ساتھ ہمدردی کی تھی۔ جس نے اس کا مذاق اڑا
اڑایا تھا۔

”چلو شاباش۔“ اس کے برابر کھڑے ہوئے ایک
آدمی نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔
سلمان نے اپنی رائفل کا فو کس درست کیا۔ نشانہ لگا
اور دور گاڑی میں بیٹھا ہوا گلجہ اپنی سیٹ پر لڑھک چکا تھا۔
گوئی اس کے سر میں پیوست ہو چکی تھی۔

دوسرے دن کے اخبارات میں خبر شائع ہوئی تھی کہ
بدنام زمانہ دہشت گرد گلجہ آپس کی لڑائی میں مارا گیا۔ اس
پر گوئی چلانے والے شخص نے اپنے آپ کو پولیس کے
حوالے کر دیا۔ اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ نوجوان
ہے۔ وہ کچھ دنوں پہلے اپنے گھر سے غائب ہو گیا تھا۔
تو صاحبو! آپ نے کہانی پڑھی، یہ آدمی جی آدمی
جھوٹی ہے یعنی میں نے ایک سچے واقعہ کو کچھ زیادہ بڑا کر دیا
ہے، لیکن ہے مزید اور سبق آموز۔

صلی علی

معزز و محترم معراج رسول
السلام علیکم!

میں کوئی مولوی مولانا نہیں ہوں۔ حقیر سا جاہل مطلق بندہ ہوں۔
صحیح طور سے لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا اسی لیے ایک دوست سے
اپنی کہانی لکھوا کر بھیج رہا ہوں تاکہ لوگ فلاح پاسکیں۔

(شیخ انیس)
گو جرانوالہ



تمہیں جانتا تھا۔ کیونکہ ان کے اور میرے درمیان اچھا
خاصا فاصلہ تھا۔ میری ریڑھی کے پاس دو گاہک کھڑے
مجھ سے حلیم چاول مانگ رہے تھے۔ میں نے جلدی سے
ان دونوں کو نمٹا دیا۔ اس دوران میں وہ دونوں وہیں میرے
پاس ہی آ گئے تھے۔

”فضل دین۔ تمہارے لیے بھی حلیم چاول نکال
دوں؟“ میں نے خوشامداندہ انداز میں پوچھا۔

ایک بانک میرے سامنے آ کر رک گئی۔
اس پہ دو آدمی بیٹھے تھے۔ ایک فضل دین اور دوسرا
ایک ایسا شخص جو صورت ہی سے غنڈا اور بد معاش دکھائی
دے رہا تھا۔

بانک چلانے والا وہی آدمی تھا۔ جبکہ فضل دین پیچھے
بیٹھا ہوا تھا۔ فضل دین میری ریڑھی کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے اس آدمی سے کچھ کہہ رہا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا۔ یہ میں

”نہیں رہنے دو۔“ اس کا لہجہ بہت خشک تھا۔ ”جب ہم یہاں سے گزر رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ تم کو یاد لاتا چلوں۔“

”یاد ہے فضل دین۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”دیکھو۔ خدا کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی دے گا۔“

فضل دین نے پھر اس آدمی سے کچھ کہا اور دونوں بانک پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ ایک گاہک نے چاول کی فرمائش کی تھی۔ اس کو چاول نکال کر دیتے ہوئے میرے ہاتھ واضح طور پر کانپ رہے تھے۔

میں شیخ انیس نقش بندی اپنی یہ کہانی اس لیے لکھ رہا ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ میری یہ کہانی پڑھ لینے کے بعد اوروں کی مشکلیں بھی آسان ہو جائیں۔

میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میرا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔ گزر اوقات کے لیے ریڑھی پر حلیم اور چاول بیچا کرتا ہوں۔

یہ سارے کام میں خود ہی کرتا ہوں۔ چاول اور حلیم کی تیاری سے لے کر اس کو فروخت کرنا میرا ہی کام ہے۔ اتنی آمدنی ہی نہیں ہوتی کہ کسی کو اپنی مدد کے لیے رکھ سکوں۔

دن بھر میں سو دو سو روپے اوپر سے بچا لیتا ہوں۔ بس یہی میری کل آمدنی ہے اور اسی میں گھر چلا رہا ہوں۔ میری بیوی کا ایک عرصہ پہلے انتقال ہو چکا ہے۔

دونوں بیٹیاں اور بیٹا جوان ہو چکے تھے۔ بیٹا بھی ایک دکان میں کام کیا کرتا ہے۔ وہ ایک کمزور جسم کا شریف سا نوجوان ہے۔ اس نے صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اس سے آگے میں اسے پڑھانا نہیں سکا۔

جبکہ دونوں بیٹیاں دینی تعلیم حاصل کر چکی ہیں۔ دونوں انتہائی سکھڑ اور شریف ہیں۔ آج کل کی لڑکیوں کے حوالے سے ان کی تربیت بالکل مختلف انداز میں ہوئی ہے۔ انہوں نے کبھی دوپٹا سر پر لیے بغیر گھر سے قدم بھی نہیں نکالا ہوگا۔

لیکن بد قسمتی سے دونوں کے بارے میں یہ کہا جاسکتا تھا کہ دونوں کچھڑ میں کھلے ہوئے کنول کی طرح تھیں۔ خدا نے دونوں کو بہت اچھی صورت شکل سے نوازا تھا۔

یہ دونوں اگر ایک طرف طاقت بن جاتی ہیں تو دوسری طرف عذاب بھی ہو جاتی ہیں۔ طاقت دولت مندوں کے لیے ہوتی ہے اور عذاب غریبوں اور کمزوروں کے لیے۔

لہذا ان کا حسن ہمارے لیے بھی عذاب ہو گیا تھا۔ نہ جانے کتنی بری نگاہیں ان دونوں کی طرف اٹھا کرتیں اور انہوں نے کس کس طرح خود کو بچا کر رکھا ہوگا یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

محلے ہی کے کئی غنڈے ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کا باپ بے چارہ ریڑھی پر حلیم چاول فروخت کیا کرتا ہے۔ وہ کمزور اور بوڑھا آدمی ہے۔ وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔ اس لیے ان کے حوصلے بڑھتے جا رہے تھے اور وہ میری دونوں بچیوں کو آتے جاتے تنگ کرنے لگے تھے۔ یہ جو کہانی آپ کو سنارہا ہوں۔ اس کا ان واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن آپ کو یہ بتانا ضروری ہے کہ آپ ہمارے پچھلے منظر سے واقف ہو جائیں۔

ایک دن میری ایک بیٹی رابعہ روتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی۔ میں اتفاق سے گھر ہی میں تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ایک غنڈے نے آج انتہا کر دی تھی۔ اس نے گلی سنان دیکھ کر رابعہ کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

میرا خون کھول کر رہ گیا۔ میں ایک بے بس اور کمزور انسان تھا۔ اگر میں اس کے خلاف واویلا بھی کرتا تو کیا ہوتا۔

میں یہاں اپنی ایک عادت کا ذکر کرنا مناسب سمجھوں گا۔ کیونکہ میری اس کہانی کا محور ہی عادت ہے۔ اور وہ ہے ہر وقت درود شریف پڑھنے کی عادت۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے میں ہر وقت درود بھیجا کرتا ہوں۔

تو اس واقعے کے بعد میں نے اور کثرت سے درود پڑھنا شروع کر دیا ہے۔

میں نے دونوں بیٹیوں کو سختی سے ہدایت کر دی کہ وہ کسی بھی حال میں اکیلی نہ نکلا کریں۔ اگر ایسی ہی ضرورت ہو تو کسی کو اپنے ساتھ لے لیں۔

میں نے اپنے بیٹے ذاکر کو اس واقعے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ وہ لاکھ شریف اور کمزور نوجوان سہی لیکن اپنی بہن کے ساتھ کسی کی غنڈہ گردی برداشت نہیں کر پاتا۔

ایک ہی ہفتہ گزرا تھا کہ ایک دن اچانک ایک پرانے دوست میرے گھر آ گئے۔ وہ ہمارے ہی قبیلے سے تعلق رکھنے والے ایک شریف انسان تھے۔

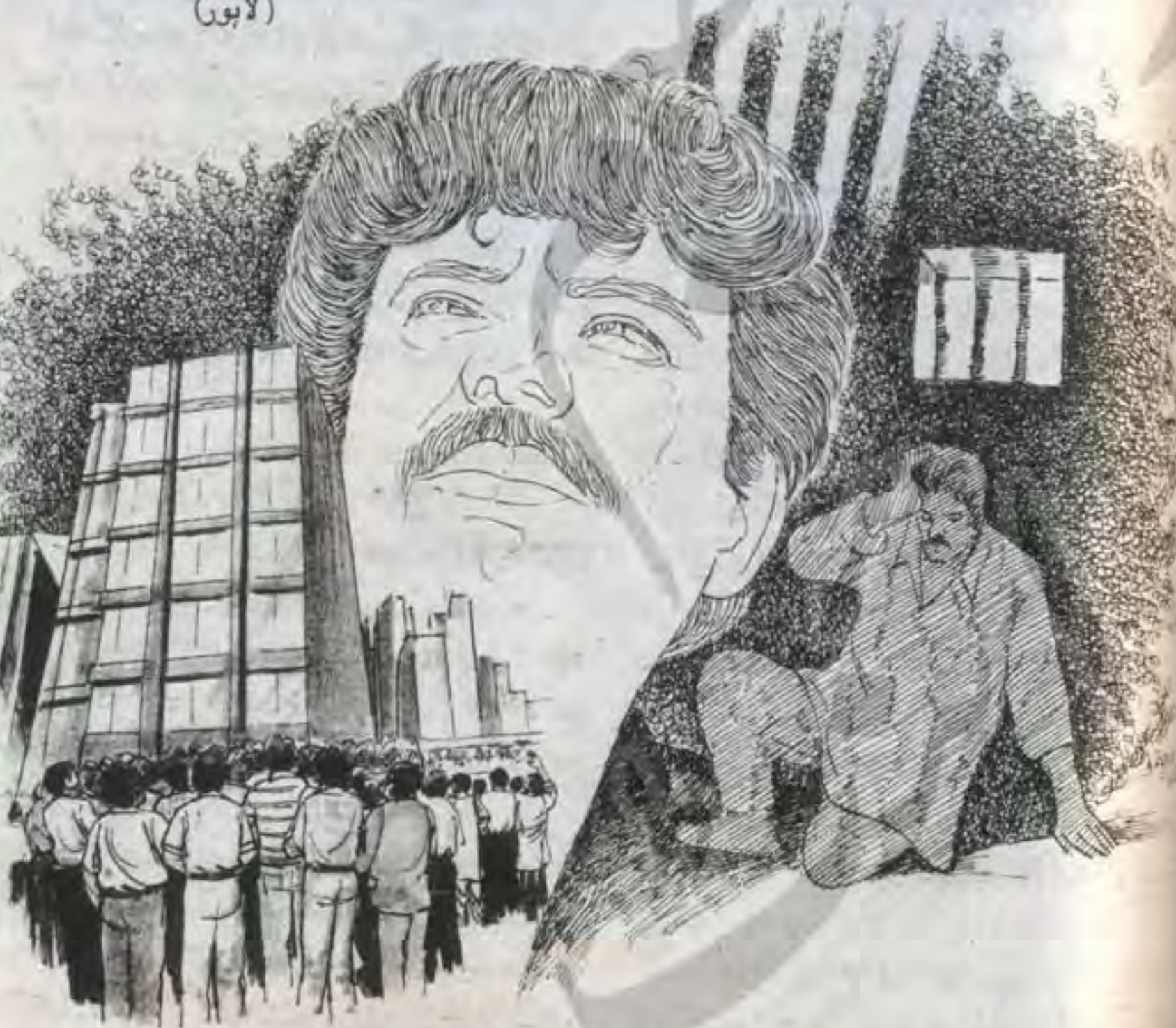
بہت دنوں کے بعد ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اسی لیے ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ دونوں نیک۔ پڑھے لکھے اور برسر روزگار۔ میرے دوست اپنے دونوں بیٹوں کے لیے رشتے تلاش کر رہے تھے

چراغ سے چراغ

محترمہ عذرا رسول... تسلیم!

میں ایک گناہ گار، کمینی عورت ہوں۔ پتا نہیں میرا خدا مجھے معاف کرے گا یا نہیں۔ بس ایک امید، ایک آس کے سہارے میں اپنی داستان کاغذ پر منتقل کر رہی ہوں کہ شاید کسی ایک آدمی پر میری تحریر اثر کر جائے۔

میڈم شازیہ
(لاہور)



میں یہ کہانی اس وقت لکھ رہی ہوں جب میں نے اپنے آپ کو بدل لیا ہے۔ میں اپنی داستان اس طرح شروع نہیں کروں گی جس طرح داستانیں شروع ہوتی ہیں کہ اپنا بیک گراؤ بتاؤں اور یہ بتاؤں کہ میں نے یہ کام کب سے شروع کیا۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ میں لڑکیاں سیلائی کرتی ہوں۔ آپ اس کو اپنے انداز سے کچھ بھی کہہ لیں لیکن میرا کام ہی یہی تھا۔ ہاں میں نے اس میں بھی وقار اور رتبے کا خیال رکھا تھا۔

دیکھنے ہی سے معقول انسان دکھائی دے رہے تھے۔ اسی لیے میں انہیں اپنے گھر میں لے آیا۔
”اب یہ بتائیں کیا آپ پر اتنے روپوں کا قرض چڑھا ہوا ہے۔“ انہوں نے دریافت کیا۔ ”اور بچوں کی شادیوں کے لیے آپ کو اتنی رقم کی ضرورت ہے۔“ انہوں نے اتنی ہی رقم بتائی جتنی مجھے ضرورت تھی۔
”جی ہاں۔ لیکن یہ سب کیا ہے۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔“ میں نے پوچھا۔

”یہ لیں۔“ انہوں نے اپنی جیب سے ایک موٹا سا لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ ”مکن لیں۔ یہ اتنی ہی رقم ہے۔ جتنی آپ کو ضرورت ہے۔“
”لیکن کیوں۔ آپ اتنی رقم مجھے کیوں دے رہے ہیں۔“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”میں آپ کو نہیں دے رہا۔“ انہوں نے کہا۔ ”کسی نے آپ کے لیے بھیجے ہیں۔“
”کس نے بھیجے ہیں۔“ میں نے پوچھا۔

”صاحب درود نے۔“ انہوں نے کہا۔ ”آپ کثرت سے درود شریف پڑھا کرتے ہیں نا؟“
”جی ہاں۔ لیکن یہ تو یا میں جانتا ہوں۔ یا خدا۔“

”جن پر آپ روزانہ درود بھیجا کرتے ہیں وہ بھی تو جانتے ہیں۔“ ان صاحب نے کہا۔ ”انہوں ہی نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں اتنی رقم لے کر جاؤں اور گوجرانوالہ کے انیس کو دے کر آؤں۔“
”میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

اللہ اللہ۔ میرے حضور کو میرا اتنا خیال۔ میری اتنی دل جوئی۔ میرے ساتھ اتنی ہمدردی۔ ہم دونوں ہی رورہے تھے۔

وہ صاحب میرے اصرار کے باوجود نہیں رکے۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ ان کو اتنا ہی حکم تھا۔

میں نے اپنا قرض ادا کر دیا۔ اپنی بچیوں کی شادیاں کر دیں۔ اور اب بہت اطمینان ہے مجھے۔ یہ سکون قلب مجھے میرے حضور کی نگاہ کرم سے عطا ہوا ہے۔ اور میں یہ کہانی اس لیے تحریر کر رہا ہوں کہ آپ بھی کثرت سے درود پاک کا تحفہ اپنے پیارے رسول پر بھیجے رہیں۔ پھر دیکھیں آپ کے بگڑے کام کس طرح سنورنے لگتے ہیں۔

کہ انہیں میرے گھر کا خیال آ گیا۔

وہ میرے پاس اپنے دونوں بیٹوں کے رشتے لے کر آئے تھے۔ کیا بڑی بات تھی۔ خدا نے بغیر کسی محنت کے اتنا بڑا کرم کر دیا۔ میں نے اپنی تینوں اولادوں سے مشورہ لے کر ہاں کر دی۔

سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا تھا کہ حیرت ہونے لگی تھی۔ فوری طور پر تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔ میں غنڈوں کی وجہ سے پریشان ہو رہا تھا لیکن خدا نے فوری طور پر ہمدوست بھی کر دیا تھا۔

اب سوال یہ تھا کہ شادی کے لیے پیسے کہاں سے آئیں۔ دو دو بیٹیوں کی شادیاں تھیں۔ اخراجات تو ہونے ہی تھے اور میرے پاس کیا تھا کچھ بھی نہیں۔

گھر میں مشکل سے بیس پچیس ہزار روپے پڑے ہوں گے۔ بیس پچیس ہزار سے کیا ہونے والا تھا۔ میں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اپنی ریڑھی اور دوسرے سامان بھی فروخت کر دوں گا لیکن اس سے بھی کیا ہوتا۔ مجھے وہ دن بہت اچھی طرح یاد ہے۔

یہ 27 اکتوبر 2007ء کا دن تھا۔ مغرب کے بعد میں اپنے گھر میں بیٹھا یہی سب سوچ رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔

دروازہ کھولا تو ایک اجنبی کو سامنے پایا جس کو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

لیکن ایک بات ضرور تھی کہ ان کے چہرے پر ایک خاص قسم کا سکون ٹھہراؤ اور نور تھا۔ جس نے پہلی نگاہ میں مجھے متاثر کر دیا تھا۔

میں سوالیہ نگاہوں سے ان صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا آپ ہی کا نام شیخ انیس ہے؟“ ان صاحب نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔
”کیا آپ حلیم چاول کی ریڑھی لگاتے ہیں۔“ اس نے دوسرا سوال کیا۔

”جی ہاں۔ یہ بھی درست ہے۔“ میں نے کہا۔
”میں آپ کا صرف دو منٹ لوں گا۔“ اجنبی نے کہا۔ ”آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ نہ جانے وہ کون صاحب تھے اور مجھ سے ایسا کون سا کام پڑ گیا تھا۔ لیکن

میری کوشی کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے نہیں ہوتے تھے۔ صرف خاص خاص لوگوں کی رسائی تھی۔ ان خاص لوگوں میں آپ سمجھ سکتے ہوں گے کہ کیسے لوگ ہوں گے۔

پیسے والے، صنعت کار، سرکاری آفیسر، وزیر، صاحب اقتدار وغیرہ۔ ایسے لوگوں کے ہوتے ہوئے کس کی مجال تھی کہ وہ میرے راستے میں آنے کی کوشش کرتا۔ اس لیے میں بڑے دھڑلے کے ساتھ اپنا کام کیے جا رہی تھی۔ میرے پاس ہر وقت خوبصورت ترین لڑکیاں رہا کرتی تھیں۔ جو باتیں کرنا جانتی تھیں۔ جن کی ادائیں ہوش رہا ہوا کرتیں جن کی آوازوں میں حلقی ہوا کرتی، جو حاضر جواب اور بذلہ رخ بھی تھیں۔

ایک بار ہمارے ایک پرانے کرم فرما ایک نوجوان کو لے کر آگئے۔ بکھرے بالوں اور کھوئی کھوئی آنکھوں والا یہ نوجوان بہت دل کش شخصیت کا تھا۔ گرچہ اس کا لباس کچھ اتنا زیادہ قیمتی نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کی پوری شخصیت سے ہم آہنگ ہو رہا تھا۔

میں نے پہلی نگاہ میں اس نوجوان کو پسند کر لیا تھا۔ جبکہ مجھے اس کا بیک گراؤ نڈ بھی نہیں معلوم تھا۔

”یہ میرے دوست ہیں۔“ کرم فرمانے اس نوجوان کا تعارف کروایا۔ ”آیان نام ہے ان کا۔“

”بہت خوبصورت نام ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ بہت زبردست شاعر بھی ہیں۔“ کرم فرمانے بتایا۔ ”ان کی شاعری نے اس وقت پورے ملک میں دھوم مچا رکھی ہے۔“

”واہ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں خوش ہو گئی تھی۔ پھر میں نے آیان سے کہا۔ ”آیان صاحب۔ آپ بالکل صحیح جگہ آئے ہیں۔ میں اپنی لڑکیوں کی تربیت کے لیے شاعری کا سہارا لیا کرتی ہوں۔ میری ہر لڑکی میرے غالب اور مومن سے آشنا ہے۔“

”بہت خوب۔“ آیان مسکرا دیا۔ ”یعنی آپ نے نشہ کو دوا آتش کرنے کا پورا بندوبست کر رکھا ہے۔“

”اچھی بات کی آپ نے۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے آپ کیا صرف شاعر ہی ہیں۔ یا کچھ اور بھی ہیں۔“

”عشق کرنا بھی جانتا ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”ویسے گزر اوقات کے لیے بزنس ہے۔ ایک چھوٹی سی ایڈورٹائزنگ کمپنی ہے میری۔“

”کس نام سے ہے۔“

”ال بطروس“ اس نے بتایا۔

”واہ۔ یہ تو بہت مشہور کمپنی ہے۔ اور آپ اسے چھوٹی سی کمپنی کہہ رہے ہیں۔ ویسے آپ نے یہ نام کیسے لکھا کیا۔“

”اس کی کئی وجوہات ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”پہلی تو یہ ہے کہ یہ نام اتنا عام نہیں ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ پرندہ منزل کی علامت ہے۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے اس کی تائید کی۔

”ارے بھائی۔ ہمارے آیان صاحب کو کیا صرف باتوں پر رکھو گی۔“ میرے کرم فرمانے کہا۔

”نہیں نہیں۔ ابھی ان کی خدمت میں ایک شاہکار پیش کیا جائے گا۔“ میں مسکرا کر بولی۔

میں نے آیان کے لیے زوبی کا انتخاب کیا تھا۔ واقعی ایک شاہکار کہلا سکتی تھی۔ انتہائی خوبصورت اور زوبی اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کا شعری ذوق بھی زبردست تھا۔

زوبی کچھ دیر بعد ہمارے سامنے آکر بیٹھ گئی تھی۔ آیان اسے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”واقعی تم بہت خوبصورت ہو۔ تم دیکھ کر میرے جمالیاتی ذوق کی تسکین ہونے لگی ہے۔“

”تو پھر آئیں۔ میں آپ کو اپنی کتابیں دکھائی ہوں۔“ زوبی نے کہا۔

زوبی آیان کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اپنے کرم فرما سے پوچھا۔ ”ہاں۔ بھی۔ یہ صاحب صرف شاعر ہی ہیں۔ یا پیسے خرچ کرنا بھی جانتے ہیں۔“

”دریا دل قسم کا آدمی ہے۔“ کرم فرمانے بتایا۔ ”اسے صرف سکون چاہئے۔ اس کی تلاش میں ہر طرف بھٹکتا رہتا ہے۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر بالکل صحیح جگہ پر آیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کو یہاں سکون ہی سکون ملے گا۔“

ہم دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر زوبی اور آیان کمرے سے باہر آگئے۔ اس وقت زوبی بالکل خاموش سی دکھائی دے رہی تھی۔ جبکہ آیان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

آیان نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا

بہت شکریہ کہ آپ نے اتنے اچھے ساتھی کا انتخاب کیا۔“ پھر اس نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور میری طرف بڑھا دی۔ ”یہ ہے اس وقت کی قیمت جو میں یہاں گزار کر جا رہا ہوں۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے زوبی سے پوچھا۔ ”کیسا آدمی تھا یہ۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔“ اس نے بتایا۔ ”اتنی دیر تک صرف باتیں کرتا رہا تھا۔“

”رومان پسند معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بہر حال اس کی دلجوئی کرتی رہنا۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔“

کچھ دنوں کے بعد وہ پھر آگیا۔ اپنے اسی بے نیازانہ کیفیت کے ساتھ۔ خوابناک آنکھیں، اچھے ہوئے بال اور لباس کے معاملے میں بے پرواہی۔ سچ یہ ہے کہ وہ دیکھنے ہی کوئی فنکار معلوم ہوتا تھا۔

”کیا خیال ہے آیان صاحب۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آج اگر زوبی کے بجائے کوئی اور آپ کے ساتھ بیٹھ جائے تو آپ کو ناگوار تو نہیں ہوگا۔“

”کیوں کیا زوبی موجود نہیں ہیں۔“

”نہیں۔ وہ کسی کے ساتھ کہیں گئی ہوئی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

صرف ایک لمحے کے لیے ایسا لگا جیسے اس کے چہرے پر ناگواری کا عکس آکر گزر گیا ہو، صرف ایک لمحے کے لیے۔ دوسرے لمحے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ”کوئی بات نہیں۔ میں پھر بھی حاضر ہو جاؤں گا۔“

”لگتا ہے زوبی آپ کو کچھ زیادہ ہی پسند آگئی ہے۔“

”بنانے والے نے کبھی کسی کو کم نہیں بتایا۔ سب ہی پسندیدہ ہوتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ کوئی کسی کے لیے اور کوئی کسی اور کے لیے۔“ اس نے کہا۔

میں اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اس نے بہت گہری بات کہہ دی تھی۔ اس کا تجربہ تو خود مجھے بھی ہو چکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد زوبی دوسرے کمرے سے نکل کر آگئی۔

وہ میری ہدایت کے مطابق ہی اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اور اس نے کس حد تک اپنے دل میں زوبی کی آگ بھڑکا رکھی ہے۔

اب یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زوبی کے لیے سیریس

ہو چلا ہے۔ اور یہی موقع تھا کہ زوبی اس سے فائدہ اٹھا جاتی۔ اس کے فائدے کا مطلب یہ تھا کہ براہ راست مجھے فائدہ ہوتا۔

”دیکھو زوبی لوہا گرم ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس قسم کے لوگ اپنے عشق میں جنونی ہو جاتے ہیں۔ وہ تمہیں پسند کرنے لگا ہے۔ اور سنا ہے کہ بہت پیسے والا آدمی ہے۔ اسی لیے اب تمہارے لیے بہتر ہے کہ تم اس کو اپنے جال میں الجھانا شروع کر دو۔ اور اس سے جو کچھ حاصل کر سکتی ہو کر لو۔“

”میڈم۔ آپ درست کہتی ہیں لیکن دوسری طرف نہ جانے کیوں اس شخص سے کچھ ہمدردی بھی محسوس ہونے لگی ہے۔“

”اور یہی بات ہمارے لیے قاتل ہے۔ ہم اگر ہمدردی، مروت اور محبت وغیرہ کے چکر میں پڑ جائیں تو پھر ہمارا کام ہو چکا۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے میں تم پر کوئی دباؤ نہیں ڈال رہی۔ کیونکہ تم جانتی ہو کہ یہاں ہم کسی پر دباؤ نہیں دیتے۔ بس ایک عقلمندی کا مشورہ دیا ہے، اس پر عمل کر کے دیکھ لو۔“

”ضرور میڈم۔ جس حد تک ممکن ہوگا۔ میں اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گی۔“

دو چار دنوں کے بعد وہ پھر آگیا۔ اس بار بھی اس کا وہی انداز تھا۔ اس بار میں نے زوبی کو بلا لیا پھر ان دونوں کو ایک کمرے میں بھیج دیا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد دونوں باہر آئے تھے۔ زوبی بہت سنجیدہ اور خاموش خاموش تھی۔ اس کے جانے کے بعد زوبی نے بتایا۔ ”میڈم۔ وہ مجھے پچیس ہزار روپے دے گیا ہے۔“

”مبارک ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔“

”کام تو شروع کر دیا ہے میڈم لیکن بات کچھ اور ہے۔“ زوبی نے کہا۔ ”اور جب سے یہ سنا ہے میری تو حالت غیر ہو رہی ہے۔“

”کیا سن لیا تم نے۔“

میڈم وہ ایڈز کا مریض ہے۔“ زوبی نے بتایا۔

”کیا۔ ایڈز کا مریض۔“ میں اچھل پڑی تھی۔ ”اور وہ یہاں آنے لگا ہے۔ تم اس کے پاس بیٹھتی ہو۔“

”ہاں میڈم۔ لیکن آپ بے فکر رہیں۔ وہ مجھے ہاتھ بھی نہیں لگاتا ہے۔“

اب یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زوبی کے لیے سیریس

اب یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زوبی کے لیے سیریس

اب یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زوبی کے لیے سیریس

اب یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زوبی کے لیے سیریس

اب یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زوبی کے لیے سیریس

”تو پھر وہ یہاں کیوں آتا ہے۔“

”صرف باتیں کرنے۔“ زوبی نے بتایا۔ ”میں اس سے خوبصورت باتیں کرتی ہوں اور وہ بھی ویسی ہی باتیں کرتا رہتا ہے۔“

”یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس کا یہ مرض تم کو بھی تو لگ سکتا ہے۔“

”نہیں، یہ صرف اس طرح پاس بیٹھنے اور باتیں کرنے سے نہیں لگتا۔“

آیان کا یہ مرض سن کر مجھے حیرانی سی ہو گئی تھی۔ اس نے یہ مرض کہاں سے لیا تھا۔ کس نے دیا تھا۔ افسوس ہی ہوا تھا۔ اتنا سنجیدہ اور مہذب نو جوان۔ نہ جانے اسے کہاں سے یہ روگ لگا تھا۔

تیسری شام کو میرے پاس وہ صاحب آگئے جو آیان کو اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد جب اس نے آیان کے بارے میں پوچھا کہ وہ آیا کرتا ہے تو میں نے کہا۔ ”ہاں۔ وہ بے چارہ دوبار آچکا ہے۔“

”کیوں میڈم۔ تم اسے بے چارہ کیوں کہہ رہی ہو۔“

”ایسے شخص کو بے چارہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں۔ اتنا پڑھا لکھا اور مہذب انسان اور ایڈز کا مریض۔“

”ایڈز کا مریض۔“ اس نے حیران ہو کر میری بات دہرائی۔ ”وہ ایڈز کا مریض کب سے ہو گیا ہے۔“

”حیرت ہے۔ کیا یہ بات تمہیں نہیں معلوم۔“

”نہیں تو۔“ اس نے بتایا۔ ”مجھے تو یہ سن کر حیرت ہوئی ہے۔“

کئی دن گزر گئے۔ ایک شام آیان پھر آیا تھا۔ اس شام زوبی واقعی موجود نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر ہی سے نہیں آئی تھی۔

میں نے یہاں شاید یہ نہیں بتایا ہوگا کہ ہمارے پاس لڑکیاں رہتی نہیں تھیں۔ بلکہ آیا کرتی تھیں۔ وہ اپنے اپنے گھروں میں رہتیں اور کام کرنے ہمارے پاس آیا کرتیں۔ ہمارے پاس دو قسم کے کام تھے۔ ایک تو وہی جس کے بارے میں آپ جان چکے ہوں گے۔ اور دوسرا کام دراصل ایک طرح کا کیمو فلوج تھا۔

یہ ایک بیوی پارلر تھا۔ میری لڑکیاں یہاں کام سیکھنے اور کام کرنے کے بہانے آیا کرتی تھیں۔ ان کی اپنی زندگی تھی۔ وہ اپنی مرضی کی مالک تھیں۔

بہر حال یہ میرا سیٹ اپ تھا۔ یہاں لڑکیاں بات و شوق کی وجہ سے آیا کرتیں یا پھر مجبوریاں یہاں لے آتی تھیں۔ زوبی مجبور لڑکی نہیں تھی۔ اس کا اپنا گھر تھا۔ کھانا پینے گھرانے سے تعلق تھا اس کا۔ اس کے باوجود وہ اپنی ایکڑ انکم ان ہی حوالوں سے حاصل کیا کرتی۔ اب جو بھی تھا اس کی عادت بن چکا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ ایک شو تیز اور بن چکی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ زوبی نے اب آنا چاہا بہت کم کر دیا تھا۔ بلکہ میں اگر فون بھی کرتی تو ادھر ادھر کی بات کر کے فون کاٹ دیا کرتی۔

پھر وہ غائب ہی ہو گئی۔ غائب ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس نے آنا چھوڑ دیا تھا اور میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں بتا چکی ہوں کہ لڑکیوں کو میں اپنے اختیار میں نہیں رکھتی تھی۔ وہ اپنی مرضی کی ہوا کرتیں۔ آنے کا دل چاہتا تو آتی رہتیں۔ نہیں چاہتا تو غائب ہو جاتیں۔

دوسری طرف آیان بھی نہیں آتا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں ایک دو بار سوچا بھی۔ پھر اپنی مسرور فہم میں الجھ گئی۔ کون کسی کو اتنا یاد رکھتا ہے۔

پھر شاید ایک یا دو تیرہ سال کے بعد اچانک ایک مارکیٹ میں زوبی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ بہت بدلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ بہت سلیقے کا اور قیمتی لباس، ہاتھ میں ایک جھومتا ہوا پرس۔

وہ بھی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ ”میڈم۔ میں آپ۔“ اس نے لہک کر پوچھا۔

”میں تو خیر ٹھیک ہوں لیکن تم کیسی بے مروت تھیں کہ تم نے مڑ کر خبر ہی نہیں لی۔“

”میڈم۔ میں نے جان بوجھ کر آپ کو فون نہیں کیا تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”کیونکہ سچ یا دیں وابستہ نہیں۔ اور شادی کے بعد مجھے اپنے آپ کو بدلنا بھی تھا۔“

”مبارک ہو۔ شادی ہو گئی تمہاری۔“

”جی میڈم۔ اور شادی بھی اسی آیان سے ہوئی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کیا؟“ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہاری شادی آیان سے ہوئی ہے۔ وہ ایڈز کا مریض۔“

اس دوران کوئی اور ہمارے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ یہ آیان تھا۔ اسی طرح، اس انداز سے۔ ”ہیلو میڈم۔ کیسی ہیں آپ۔“

”آیان۔ تم، میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں تم دونوں کے لیے کیا کہوں۔“

”چلیں میڈم۔ کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ زوبی نے کہا۔ ”پھر اطمینان سے آپ ساری داستان سن لیجئے گا۔“

☆☆☆

ہم ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے۔

آیان نے اس کہانی کی ابتدا کی تھی۔ ”میں واقعی ایک بزنس مین ہوں۔ میرا تعلق بھی ایک اچھے گھرانے سے ہے۔ خدا کے فضل سے بہت کچھ ہے ہمارے پاس۔ اس دوران میں یہ کہ میرے گھر والوں نے میرا رشتہ لگا دیا۔ یہ ڈیڈی کے ایک دوست کا گھرانہ تھا۔ ہاں۔ اس سے پہلے کی داستان بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔“

اتنا کہہ کر آیان اس طرح خاموش ہو گیا جیسے وہ سوچ رہا ہو کہ کہانی کس طرح شروع کرے۔ پھر اس نے کہا۔ ”میڈم۔ یہ کہانی میرے گناہوں کی ہے۔ میں ایک بڑکا ہوا انسان تھا۔ چونکہ باپ کے پاس دولت تھی اور دولت خراب کرنے میں سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس لیے میں جی بھر کر خراب ہوتا چلا گیا۔ ایسا کون سا گناہ تھا جو میں نے نہ کیا ہو۔“

میں حیران ہو کر اس آدمی کو دیکھ رہی تھی۔ جس کے بارے میں زوبی نے بتایا تھا کہ وہ اسے سامنے بٹھا کر اس سے صرف باتیں کیا کرتا ہے۔ پھر اس نے زوبی سے شادی بھی کر لی تھی۔ اور اب اس کی شخصیت کا دوسرا پہلو سامنے آ رہا تھا۔

”میڈم۔ میں بہت بہک چکا تھا۔“ آیان نے پھر بتانا شروع کیا۔ ”ہم چار لڑکوں کا ایک گروپ تھا۔ ہم چاروں نے مل کر ایک پوش علاقے میں ایک فلیٹ لے رکھا تھا۔ ہم وہاں لڑکیوں کو بلایا کرتے۔ تو یہ بھی ہماری زندگی۔ پھر ایک دن ایک ایسی بات ہوئی جس نے ہم چاروں کو بدل کر رکھ دیا۔“

”میں مارکیٹ سے کچھ لے کر باہر نکلا تھا کہ میں نے ایک نورانی صورت بزرگ کو دیکھا۔ ان کے ساتھ ایک انتہائی خوبصورت لڑکی تھی۔ ان دونوں کے لباس گرچہ معمولی تھے۔ لیکن یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کا تعلق اچھے خاندان

ابراہیم پاشا: 1789-1848ء

خد یو مصر، مصر جدید کے بانی محمد علی پاشا خدیو کا فرزند۔ میدان سیاست اور جنگ دونوں میں یکساں صلاحیت رکھتا تھا۔ مصر میں مملوکوں سے لڑا اور ان پر فتح پائی۔ جزیرہ عرب میں وہابی تحریک کے علمبرداروں سے اپنا لوہا منوایا۔ مورہ میں یونانیوں پر اپنی دھاک جمائی اور شام اور اناطول میں ترکوں کو شکست دی۔ ان کامیابیوں اور فتوحات نے اس کا سیاسی اثر و رسوخ بہت وسیع کر دیا تھا۔

ابراہیم جلیس: 1924-1977ء

ادیب و صحافی۔ حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ 1948ء میں پاکستان آگئے۔ کچھ عرصہ فری لانس رہے۔ پھر روزنامہ جنگ کراچی کے ادارہ تحریر میں بطور کالم نویس شامل ہو گئے۔ 1972ء میں روزنامہ حریت کراچی اور 1976ء میں روزنامہ مساوات کراچی کے مدیر مقرر ہوئے۔ 14 سال کی عمر میں پہلا مضمون حیدر آباد دکن کے مقرر روزنامہ رہبر دکن میں شائع ہوا اور اسی سے ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ تصانیف میں افسانوں کے متعدد مجموعے۔ (چالیس کروڑ بھکاری، آزاد غلام، دو ملک ایک کہانی، جیل کے دن جیل کی راتیں، زمین جاگ رہی ہے)، روس، چین اور امریکا کے سفر نامے اور ایک اسٹیج ڈراما ”اجالے سے پہلے“ قابل ذکر ہیں۔ 1963ء میں کالم نگار کا ایوارڈ ملا۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی

1571-1627ء

سلطان بیجا پور۔ علی عادل شاہ اور چاند بی بی کا بیٹا۔ باپ کے قتل کے بعد دس برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ نہایت منتظم اور روشن خیال فرماں روا تھا۔ صوبوں کا نظم و نسق اعلیٰ پیمانے پر کیا اور اراضیات کے بندوبست کی خاطر رجسٹر مرتب کروائے۔ تعمیرات کا بہت شوق تھا۔ شعرو سخن کا دلدادہ اور موسیقی کا رسیا تھا۔ موسیقی کی مشہور تصنیف ”نورس“ ہے جس میں مختلف راگنیوں کے لیے گیت لکھے ہیں۔ اس نے فارسی کے بجائے اردو کو ملک کی دفتری زبان قرار دیا۔ فارسی کا مشہور شاعر ظہوری اسی کے دربار سے وابستہ تھا۔

مرسلہ: نزہت تنسیم، شادی پور

سے ہے۔

اس لڑکی کو دیکھ کر میرے اندر کا شیطان بے دار ہونے لگا تھا۔ میں اس کو گہری نگاہوں سے دیکھتا ہوا اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا کہ اس بوڑھے نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔ ”میاں ذرا میری بات سنتے جاؤ۔“

”جی فرمائیں۔“ میں رک گیا تھا۔ وہ دونوں میرے قریب آ گئے۔ ”ہاں۔ میں اور میری بیٹی بھوکے بھی ہیں اور ہمارے پاس رہنے کے لیے ٹھکانا بھی نہیں ہے۔“ اور اچانک میرے ذہن میں ایک زبردست اسپارک ہوا، کام بن گیا تھا۔ میرے پاس ایک فلیٹ بھی تھا۔ ان دونوں کو وہاں رکھا جاسکتا تھا۔ پھر دونوں غریب اور مجبور تھے اور لڑکی بہت خوبصورت تھی۔

”گاڑی میں بیٹھ جائیں۔ میں آپ کو کھانا کھلا دیتا ہوں۔“ میں نے ان کے لیے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ دونوں بیٹھ گئے۔

میں ان دونوں کو ایک ہوٹل میں لے کر آ گیا تھا۔ اس دوران میں نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ لڑکی بھی اپنے باپ سے لگا ہیں چرا کر میری طرف دیکھنے لگی ہے۔ کھانے کے دوران میں نے ان سے ان کے حالات دریافت کئے۔

ان صاحب نے اپنا نام مستقیم بتایا تھا اور وہ لڑکی ندا تھی۔ دونوں کسی اور شہر سے آئے تھے اور ان کے پاس زندگی گزارنے کا نہ تو کوئی ذریعہ تھا اور نہ ہی کوئی ٹھکانا تھا۔

میں نے اس سے زیادہ دریافت نہیں کیا تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پھر میں نے ان صاحب سے کہا۔ ”دیکھیں۔ میں آپ دونوں کو اپنے فلیٹ میں رکھ سکتا ہوں اور آپ کے لیے کوئی کام بھی تلاش کر دوں گا۔“

”بڑی مہربانی ہوگی تمہاری۔“

”لیکن ایک مسئلہ ہے کہ اس فلیٹ میں میرے تین اور دوست بھی آیا کرتے ہیں۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ اس بار وہ لڑکی بول پڑی تھی۔ ”ہمیں تو بس سر چھپانے کو ایک چھت چاہیے۔“

”وہ تو آپ دونوں کو مل گئی۔“

پھر میں ان دونوں کو اپنے اس فلیٹ میں لے آیا۔ وہ ایک بڑا فلیٹ تھا۔ میں نے ایک کمرہ ان دونوں کو دے دیا تھا۔ وہ یہاں آ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔

پھر میں نے وہیں سے اپنے تینوں دوستوں کو فون سے ہے۔

کر کے خوش خبری سنا دی۔ ”تم لوگ آ جاؤ۔ دیکھو کہ میں کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔“

لڑکی بہت سکھڑ معلوم ہوتی تھی۔ وہ میرے منع کرنے کے باوجود فلیٹ کی صفائی وغیرہ میں مصروف ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ چار کمروں کا فلیٹ تھا۔ اسی لیے گندا ہونا تو ضروری تھا۔

وہ چاروں جب آئے تو میں نے لڑکی سے کہا کہ وہ چائے تیار کر کے لے آئے۔ کچن میں ہر قسم کا سامان موجود تھا۔ پھر جب لڑکی ان کے سامنے آئی تو وہ اسے دیکھ کر رگڑ رہ گئے تھے۔ وہ چائے رکھ کر واپس چلی گئی تھی۔ ”واہ! یار۔ یہ تم نے کیا سا تمہارا ہے۔ کون ہے یہ۔“

”پہلے یہ بتاؤ کہ یہ ہے کیسی۔“

”بہت زبردست۔“ انہوں نے کہا۔

”اب ایک بات سن لو۔ ہم چاروں کو مل کر ان دونوں کے خرچے اٹھانے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ میں نے اس لڑکی کو مستقل رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔“

”ابے فائدہ تو صرف تمہارا ہوگا۔ ہم کیوں خرچے اٹھائیں۔“

”نہیں۔ فائدہ ہم سب کا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”میں بڑے میاں سے بات کر لیتا ہوں۔ اگر وہ اس شرط پر رہنا چاہیں تو رہ سکتے ہیں۔ ورنہ جائیں یہاں سے۔“

”چلو بات کر کے دیکھ لو۔“

دونوں کے بعد میں نے واقعی اس موضوع پر بڑے میاں سے بات کر لی۔ ظاہر ہے مجھے کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔ اگر وہ ناراض ہو جاتے ہیں تو ہو جائیں۔

لیکن حیرت انگیز طور پر وہ ناراض نہیں ہوئے۔ بلکہ انہوں نے میری بات سن کر اپنی گردن جھکا لی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد گردن اٹھا کر بولے۔ ”ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔“

”کیا۔“ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ”آپ کو منظور ہے۔“

”ہاں۔ کیونکہ ہم مجبور ہیں۔“ بڑے میاں نے کہا۔ ”کیونکہ ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ اب کہاں پورے شہر کی خاک چھانیں گے لیکن میری بھی ایک شرط ہوگی۔“

”ہاں ہاں ضرور بتائیں۔“

”جب تک ہم یہاں ہیں۔ ہماری موجودگی میں یہاں کوئی اور لڑکی نہیں آئے گی۔ تمہارا کوئی دوست کسی لڑکی

کو ساتھ لے کر نہیں آئے گا۔“

”ارے صاحب۔ ہمیں ضرورت ہی کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو پھر بات طے ہو گئی۔“

اس کے بعد یہ ہوا کہ پہلی بار ہمیں یا کم از کم مجھے اس وقت ایک جھٹکا سا لگا۔ جب میں نے ان بڑے میاں کے ساتھ ساتھ اس لڑکی کو بھی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔

کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اس ناپاک فلیٹ میں شاید پہلی بار نماز ادا کی گئی تھی۔ اس رات میں نے لڑکی سے کہہ دیا تھا کہ وہ تیار ہو کر میرے پاس آ جائے۔

وہ تیار ہو کر آ بھی گئی تھی۔ میں اپنے کمرے کے بستر پر نیم دراز اس کا انتظار کر رہا تھا۔ شراب کی بوتل برابر کی میز پر رکھی ہوئی تھی۔

لڑکی نے اندر آ کر میری طرف دیکھا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”ندا۔ دروازہ بند کر دو۔“ میں نے اس سے کہا۔

”کیوں۔“

”ارے بھائی۔ اس گھر میں تمہارے ابو ہیں۔ کہیں وہ دیکھ نہ لیں۔“

”تو کیا ہوا۔ جب خدا دیکھ رہا ہے تو پھر ابو سے کیا شرماتا۔“

اس وقت میں نے اپنے بدن میں ایک کرنٹ سا محسوس کیا۔ اس لڑکی نے یہ کتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہہ سکا کہ باؤجا کر سو جاؤ۔

دوسری صبح بھی اس فلیٹ میں نمازوں سے شروع ہوئی تھی۔ دونوں باپ بیٹی نماز ادا کرتے رہے۔ اور میں ٹرم سار سا ہو کر ان کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

اس دن میرے دوستوں کا فون آیا تو میں نے ان سے بہانہ بنا دیا کہ وہ دونوں فلیٹ چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ نہ جانے میں نے یہ غلط بیانی کیوں کی تھی۔

اس کے بعد میں ان بڑے میاں کے پاس گیا۔ ”میں نے ان سے کہا۔“ قبلہ میرے پاس ایک دوسرا فلیٹ بھی ہے۔ جس کا علم میرے دوستوں کو نہیں ہے۔ آپ انہوں وہاں شفٹ ہو جائیں۔“

”کیوں بھائی۔“ بڑے میاں مسکرا کر بولے۔ ”یہ تو

کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہمارے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے۔“

”خدا کے لیے مجھے شرمندہ نہ کریں۔“ میں نے کہا۔ ”آپ دونوں نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں اب تک گمراہی کی زندگی گزارتا آیا ہوں لیکن اب اب یہ سب کچھ نہیں ہو سکے گا۔“

”خدا تمہیں ثابت قدم رکھے۔“ بڑے میاں نے دعا دی۔ ”اور دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں تمہارے کسی فلیٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔“

”کہاں۔“ میں نے بے ساختہ پوچھا۔

”یہ ہمیں بھی نہیں معلوم۔“ بڑے میاں نے کہا۔ ”بس یہ سمجھ لو کہ اوپر والا ہماری ڈیوٹیاں لگاتا رہتا ہے۔ تم جیسے نوجوانوں کے لیے اور جو کچھ تمہیں مل چکا ہے۔ اس پر ثابت قدمی سے جے رہو۔ اور اس کے حضور توبہ کرتے رہو۔ اور گواہ رہو کہ ہم دونوں باپ بیٹی نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔“

اس وقت میرے دل کی جو کیفیت ہو رہی تھی۔ وہ بیان سے باہر ہے۔ میں رو رہا تھا۔ ان کی خوشامدیں کر رہا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کر نہ جائیں۔ لیکن وہ دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ ہاں جاتے ہوئے ان بزرگ نے مجھ سے ایک بات کہی تھی۔ ”اب مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔“

”جی فرمائیں۔“

”صرف۔ ایک۔ صرف ایک کو تم راہ راست پر لانے کی کوشش کرو گے۔“ بڑے میاں نے کہا۔ ”اس طرح تمہاری کوششوں سے اگر کوئی ایک صحیح راہ پر آ جائے تو یہ سمجھ لو کہ چراغ سے چراغ جلتا جائے گا۔“

اس کے بعد وہ دونوں چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میرے اندر کی دنیا بدل کر رہ گئی تھی۔ میں کچھ اور ہو گیا تھا۔ ایک بالکل مختلف انسان۔ میں نے اپنے دوستوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ نہیں مانے تو میں نے ناصرف انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ بلکہ ان کا ساتھ بھی چھوڑ دیا۔“

آپان اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا تھا۔

اب بھی اس کی کہانی کا بہت کچھ حصہ باقی تھا۔ زوہبی سے اس کا تعلق، پھر شادی۔ آخر یہ سب کیا تھا۔

”اس کے بعد کی کہانی کچھ یوں ہے کہ میرے



دشمن

محترم معراج رسول
السلام علیکم!

جو لوگ دوسرے کے لیے گڑھا کھودتے ہیں وہ خود بھی اسی میں گرتے ہیں، جیسے کہ میرے ساتھ ہوا۔ جادو سراسر حرام ہے پھر بھی لوگ اس کا سہارا لیتے ہیں۔ عبرت کے لیے ہی سہی اس آپ بیتی کو ضرور شائع کریں۔
راحیلہ شہزاد
(حرمی)

میں امی کے ساتھ تھی اور وہاں کے ماحول نے مجھے سہا دیا تھا۔ بہت ساری عورتیں تھیں۔ فرش پر سفید چاندنی پچھی تھی۔ اگر بٹیوں کا دھواں ہر طرف چکرا رہا تھا ان کی خوشبو اتنی تیز تھی کہ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے امی سے کہا۔ ”امی یہاں سے چلیں میرا دم گھٹ رہا ہے۔“
”چپ کر کے بیٹھ۔“ امی نے مجھے گھر کا۔ ”مجھے پتا ہے تجھے کیوں موت آرہی ہے۔“
جب میں پیدا ہوئی تو بالکل نارمل تھی۔ مگر دو سال کی

اس آگ نے پھر مجھے جین نہیں لینے دیا۔ کیا گناہ معاف ہو سکتے تھے؟ کیا میں اس راستے پر آ سکتی تھی؟
راستہ آیاں اور زوبی کا تھا۔

میں نے اپنا کام بند کر دیا۔ اپنے گاہکوں سے کہا کہ وہ اب نہ آیا کریں۔ لڑکیوں کو منع کر دیا۔ جو بیوی پار چلا رہی تھی، اسے فروخت کر دیا۔

میں بھی اب خود کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ایک دن اچانک زوبی کا فون آ گیا۔ اس نے کہا۔ ”میڈم۔ میں نے آپ کو مبارکباد دینے کے لیے فون کیا ہے۔“

”کس بات کی مبارکباد۔“

”مجھے سب معلوم ہو گیا ہے کہ آپ نے اپنا کاروبار لپیٹ دیا ہے۔“

”ہاں۔ تم نے ٹھیک سنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس بات کے لیے مجھ سے زیادہ مبارکباد کی حقدا تم ہو۔“
”وہ کیوں۔“

”وہ اس لیے کہ میں نے تمہاری باتیں سن کر اور تمہارے موجودہ کردار کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہی تو بات ہے میڈم۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”ان دونوں نے آیاں کا چراغ روشن کیا تھا۔ آیاں نے میرے چراغ کو روشنی دی۔ اب آپ نے اپنا چراغ جلا لیا ہے۔“

”ہاں زوبی۔ خدا کے فضل سے ایسا ہی ہوا ہے۔“
”تو پھر آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس سلسلے کو آگے بڑھا کر صرف ایک، صرف ایک چراغ ضرور روشن کریں گی۔“

”ضرور۔“ میں نے دل سے وعدہ کر لیا۔

اور اب کئی برسوں کے بعد میں یہ کہانی اس امید لکھ رہی ہوں کہ کاش اس کو پڑھ کر صرف ایک۔ صرف ایک چراغ ہی روشن ہو جائے تو میں یہ سمجھوں گی کہ خدا نے نہ صرف میرے گناہ معاف کر دیئے ہیں۔ بلکہ مجھے میری زندگی کا مقصد بھی بتا دیا ہے۔

کیا اس کے علاوہ انسان کا کوئی اور مقصد ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے حصے کا چراغ روشن کرتا چلا جائے۔



گھر والوں نے میرے اندر کی اس تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ بہت خوش تھے کہ میں نے اپنے آپ کو بدل لیا ہے پھر میرے رشتے کی بات شروع ہوئی۔ اور میڈم آپ جانتی ہیں کس سے۔ ان محترمہ سے۔“ اس نے زوبی کی طرف اشارہ کیا۔

”جی ہاں مجھ سے۔“ زوبی بھی بول پڑی۔ ”لیکن میں شادی سے کتر رہی تھی کیونکہ میں تو ایک دوسری راہ پر چل پڑی تھی۔ اپنے شوق کے لیے نوجوانوں کا شکار۔ اور آپ کے پاس آنا جانا۔“

”اور زوبی کے بارے میں یہ سب مجھے پتا چل گیا تھا۔“ آیاں نے کہا۔ ”میں یہ سب جان کر دنگ رہ گیا تھا کہ میری ہونے والی بیوی اور اتنی آوارہ۔ میں اس رشتے کو ختم کرنے کی سوچ رہا تھا کہ ان بزرگ کی وہ بات یاد آگئی۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ مجھے چراغ سے چراغ جلاتا ہے۔ اور زوبی سے بڑا چراغ اور کون ہو سکتا تھا۔ میرے لیے یہ کتنا بڑا امتحان اور کتنی بڑی قربانی ہوتی کہ میں ایسی کسی لڑکی کو راہ راست پر لا کر اس سے شادی کرتا۔“

”اور اس طرح آیاں اپنے دوست کے ذریعے آپ تک پہنچ گئے میڈم۔“ زوبی نے کہا۔ ”اور یہ اتفاق ہے کہ میں ہی ان کے سامنے آئی۔ یہ تو جانتے تھے لیکن میں ان کو نہیں جانتی تھی۔“

”پھر میں نے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے ان سے یہ کہہ دیا کہ میں ایڈز کا مریض ہوں۔ اور ان کے سامنے باتیں کرتا رہتا۔ اور آہستہ آہستہ میں انہیں اس راستے پر لے آیا جو راستہ مجھے دکھایا گیا تھا اور جب زوبی اس راہ پر آگئیں تو پھر میں نے ان سے شادی کر لی۔ اور اب ہم دونوں میاں بیوی اپنی پچھلی زندگی کو فراموش کر کے ایک خوش باش جوڑے کی طرح آپ کے سامنے موجود ہیں۔ تو یہ ہے ہماری کہانی۔“

میں اس کے بعد کچھ نہیں بول سکی۔ وہ دونوں چلے بھی گئے اور میں نہ جانے کب تک اس طرح خاموش بیٹھی رہی۔

کچھ عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ خود میں کہاں پر تھی۔ میں کیا کام کر رہی تھی؟ دروازے بند کرنے سے کیا ہوتا تھا۔ کیا خدا انہیں دیکھ رہا تھا؟
دونوں میرے سینے میں آگ لگا کر جا چکے تھے۔

عمر میں مجھے بخار ہوا اور اس کے بعد مجھے دورے پڑنے لگے۔ جب مجھے دورہ پڑتا تو میں دھڑام سے نیچے گر جاتی، میرا جسم اٹڑ جاتا اور سچ جیسے جھٹکے لگنے لگتے۔ دانت بھی جاتے اور اگر ان میں زبان آتی تو زبان بھی کٹ جاتی تھی۔ جب دورے کی کیفیت ختم ہوتی تو میرے منہ سے جھاگ نکلتا تھا اور کچھ دیر بعد میں ہوش میں آ جاتی۔ میرے ابو محمد اقبال پڑھے لکھے تھے اور ایک نئی فرم میں اکاؤنٹ تھے۔ انہوں نے مجھے ڈاکٹروں کو دکھایا اور انہوں نے تشخیص کیا کہ بخار سے میرا دماغ متاثر ہوا تھا اور یہ دورے اسی وجہ سے پڑتے تھے۔ ابو نے میرا علاج شروع کر دیا تھا۔ اس سے مجھے افادہ بھی شروع ہو گیا تھا، دورے کم پڑنے لگے اور ان کا دورانیہ بھی کم ہو گیا تھا۔ ممکن ہے یہ علاج مستقل جاری رہتا تو میں بالکل ٹھیک ہو جاتی۔

بدقسمتی سے میری امی پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ صرف پانچویں تک انہوں نے پڑھا اور اس کے بعد میری تانی نے انہیں گھر بٹھالیا۔ ان کے گھر میں لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے کا رواج نہیں تھا۔ میری دو خالائیں تو بالکل ان پڑھ ہیں، اپنا نام بھی لکھ پڑھ نہیں سکتیں۔ لڑکوں کا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ ابو دفتر جاتے تھے اور مجھے ڈاکٹر کے پاس لانے لے جانے کی ذمہ داری امی کی تھی۔ میں چھوٹی تھی اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ انہیں یہ خیال کہاں سے آیا کہ مجھے بیماری نہیں ہے بلکہ کسی نے مجھ پر کچھ کر دیا ہے۔ ممکن ہے یہ خیال میرے نخیال والوں نے دیا ہو کیونکہ وہاں کسی کو چھینک بھی آ جاتی تو یہی کہا جاتا تھا کسی نے کچھ کر دیا ہے اور اس کے بعد وہ کسی پیر فقیر کی طرف دوڑ جاتے تھے۔ جیسے پڑھے لکھے لوگ ڈاکٹروں کے پاس جاتے ہیں اس طرح وہ پیروں فقیروں کے پاس جاتے تھے۔ ہر فرد کے بازو اور گلے میں تعویذ بندھے ہوتے تھے۔ ابو کو ان سب باتوں سے چڑھی اس لیے ہمارے گھر میں ان چیزوں کا رواج نہیں ہو سکا تھا۔

لیکن جب امی کے ذہن میں اس خیال نے جڑ پکڑی کہ مجھے بیماری نہیں ہے بلکہ کسی نے مجھ پر کچھ کر دیا ہے تو انہوں نے چپکے سے ابو کو بتائے بغیر میرا علاج بند کر دیا۔ ابو یہ سمجھتے رہے کہ وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہی ہیں۔ جب کہ امی مجھے پیروں فقیروں کے پاس لے جاتی تھیں۔ ان کے دیے ہوئے تعویذ اور دوسرے ٹوٹکے مجھ پر آزماتی تھیں۔ ان دنوں ابو بہت زیادہ مصروف تھے، وہ جاب کے ساتھ ترقی کے لیے مزید کورسز بھی کر رہے تھے اور

اس وجہ سے رات کو دیر سے گھر آتے اور صبح سویرے چلے جاتے تھے۔ ان کو پتا ہی نہیں تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ امی ان سے چھپاتی تھیں۔ میں چار پانچ سال کی ہوئی تو انہوں نے مجھے بھی سمجھانا شروع کر دیا کہ میں ابو سے ذکر نہ کروں وہ مجھے کہاں لے جاتی ہیں، اس کے بجائے میں ابو کو یہی بتاؤں۔ کہ امی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہیں۔ امی کے کہنے کے مطابق میں ابو سے یہی کہتی رہی کہ امی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہیں۔ مگر کب تک آخر ابو کو پتا چل گیا۔ ہوا یہ کہ ابو کو اچانک چھٹی مل گئی اور انہوں نے امی سے کہا۔ ”آج میں راحیلہ کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں اس کی پروگریس بھی پتا چل جائے گی۔“

اس وقت میں چھ سات سال کی تھی اور مجھے یاد ہے امی کا رنگ یہ سن کر فٹ ہو گیا تھا۔ انہوں نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں میں لے جاتی ہوں۔“

”ارے آج مجھے چھٹی ملی ہے تم کب سے اس ذمہ داری کو نبھا رہی ہو آج میں لے جاتا ہوں۔ راحیلہ تیار ہو جاؤ۔“

میں بھی خوف زدہ تھی کہ اب ابو کو پتا چل جائے گا کہ میں ان سے جھوٹ بولتی رہی تھی۔ مگر ابو مصر تھے۔ شاید انہیں شک ہو گیا تھا کیونکہ جب ڈاکٹر سے علاج ہو رہا تھا تو مجھے پڑنے والے دورے کم ہو گئے تھے اور دو تین مہینے بعد ایک بار دورہ پڑتا تھا لیکن علاج چھوڑتے ہی دورے جلدی پڑنے لگے اور اب تقریباً مہینے میں ایک بار دورہ پڑتا اور میں غمی گھٹنے تک ہوش و حواس سے بے گانہ رہتی تھی۔ کبھی گرنے سے چوٹ آتی تھی اور کبھی دانتوں تلے زبان آ جاتی۔ ابو حیران تھے کہ اب ڈاکٹر کی دوائی اور علاج سے فائدہ کیوں نہیں ہو رہا ہے۔ ابو مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور وہاں جا کر پول کھل گیا۔ ابو کا غصہ سے برا حال ہو گیا۔ امی مجھے دو سال سے ڈاکٹر کے پاس لے کر نہیں جا رہی تھیں اور ان سے جھوٹ بولا تھا۔ ڈاکٹر بھی حیران تھا کہ اچانک مجھے دکھانا کیوں چھوڑ دیا تھا۔ اس نے ابو سے کہا۔

”اقبال صاحب آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ دو سال علاج نہ ہونے سے اس بچی کو کتنا نقصان ہوا ہوگا اور اگر علاج جاری رہتا تھا ممکن ہے یہ بالکل صحت یاب ہو جاتی۔“

”تو کیا اب امکان نہیں ہے؟“ ابو پریشان ہو گئے۔

”امکان تو اب بھی ہے دراصل بچہ جتنا چھوٹا ہوتا ہے اس قسم کے مرض میں جلدی علاج سے اس کی شفا یابی کا امکان اتنا ہی بڑھ جاتا ہے اور جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے یہ امکان کم

ہوتا جاتا ہے۔ یوں سمجھ لیں سب کچھ نئے سرے سے شروع کرنا پڑے گا۔“

گھر آکر ابو امی پر برس پڑے، ان کو بے نقط بنائیں۔ جاہل عورت اور پتا نہیں کیا کیا کہا۔ امی ڈری ہوئی تھیں۔ دراصل ابو کو جب ان پر غصہ آتا تو وہ ان کے سکے جانے پر پابندی لگا دیتے تھے۔ ابو میرے نخیال والوں سے بہت چڑتے تھے۔ وہ انہیں جاہل اور توہم پرست کہتے تھے اور سچ بات ہے وہ ایسے ہی تھے۔ جب ابو کا غصہ کسی قدر ٹھنڈا ہوا تو انہوں نے امی سے کہا۔ ”شائلہ تمہیں اندازہ نہیں ہے تم نے اپنی بیٹی کے ساتھ کس قدر ظلم کیا ہے۔ اب اس کا علاج نئے سرے سے شروع کرنا پڑے گا، نہ جانے کتنا عرصہ لگے اسے بالکل ٹھیک ہونے میں۔“

”میں نے پیر صاحب کو دکھایا تھا وہ کہہ رہے تھے کہ اس پر اثر ہے۔“

”بکو اس مت کرو۔“ ابو کو غصہ آ گیا۔ ”خبردار جو اب راحیلہ کو کسی جاہل پیر کے پاس لے کر گئیں۔“

یوں میرا علاج دوبارہ شروع ہوا۔ اس بار ابو نے یہ احتیاط کی کہ میں جاتی تو امی کے ساتھ تھی لیکن وہ خود بھی اس ڈاکٹر سے مستقل رابطے میں رہتے تھے جو میرا علاج کر رہا تھا۔ یہ بہت اچھا نیوروفزیشن تھا بلکہ اب بھی ہے اور شہر میں کئی مقامات پر اس کے کلینک ہیں۔ بلکہ اب تو ایک کلینک بڑا ہسپتال بن گیا ہے جہاں اور کئی ڈاکٹر بھی بیٹھے ہیں۔ ابو کے ڈر سے امی نے میرا ڈاکٹری علاج تو جاری رکھا لیکن ساتھ ہی موقع پا کر وہ مجھے پیروں فقیروں کے پاس بھی لے جاتی تھیں۔ یوں میرا دوسرا علاج بھی جاری رہا تھا۔ اگرچہ دو سالوں میں مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں ہوا تھا لیکن اس سے امی کے یقین پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ اب بھی صدقِ دل سے یہی سمجھتی تھیں کہ مجھ پر کسی ہوائی چیز کا اثر ہے۔

امی ابو کی شادی کسی رشتے دار کے توسط سے ہوئی تھی۔ ابو کے امی ابو نہیں تھے وہ دنیا میں اکیلے تھے اور پڑھنے کے لیے حیدرآباد سے کراچی آئے تھے۔ یہاں ان کا رشتہ ہو گیا۔ اس وقت ابو امی اور ان کے گھر والوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ یہ تو شادی کے بعد ان کو پتا چلا۔ بہ قول ابو کے وہ پھنس گئے تھے۔ اگر ان کو پتا ہوتا کہ ان کے سسرال والے اس قدر وہمی اور تعلیم سے بیگانہ ہوں گے تو شادی سے انکار کر دیتے۔ شادی کے ابتدائی چند سالوں کے بعد ابو نے سسرال والوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ بس وہ

گھر آ جاتے تو ان سے مل لیتے تھے۔ ابو نے کورس کر لیے اور ان کی ترقی بھی ہو گئی تھی۔ تنخواہ بہت اچھی تھی۔ ابو نے اپنا گھر لے لیا تھا۔ میرے چار بہن بھائیوں کو اچھے اسکول میں داخل کر لیا تھا۔ مجھے دوروں کی وجہ سے اسکول میں داخل نہیں کرایا تھا لیکن گھر میں دو بچے مجھے باقاعدگی سے پڑھانے آتے تھے۔ میں ان سے پڑھتی تھی اور پھر اسکول سے امتحان دیتی۔ یوں میں عمر کے لحاظ سے تعلیمی مدارج طے کرتی رہی تھی۔

ابو نے امی کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ اب وہ مجھے کسی کے پاس لے کر نہیں جائیں گی۔ لیکن امی موقع پا کر مجھے لے جاتی تھیں۔ ان دنوں میں تیرہ یا چودہ سال کی تھی جب امی مجھے کسی چادر والے بابا کے پاس لے گئیں۔ یہ ہر وقت چادر میں روپوش رہتا تھا اور کسی کو اپنا چہرہ نہیں دکھاتا تھا۔ امی کا پورا خاندان اس کا مرید تھا اور باقاعدگی سے اس کے پاس حاضری دیتا تھا۔ امی مجھے بھی لے گئیں اور اس بار لانے کا مقصد مجھے چادر والے بابا سے بیعت کرانی تھی یعنی میں بھی مرید بن جاتی۔ لیکن مجھے وہاں کے ماحول سے وحشت ہو رہی تھی اور میں امی سے بار بار کہہ رہی تھی کہ مجھے یہاں سے لے چلیں۔ مگر امی ہر بار مجھے ڈانٹ کر خاموش کر دیتی تھیں۔

چادر والے بابا نے مرد اور عورتوں کو اکیلے میں مرید کرتے تھے اس لیے جب میرا نام پکارا گیا تو امی مجھے لے کر اٹھیں لیکن نام پکارنے والی عورت نے امی سے کہا۔ ”تم رکو بی بی صرف یہ بچی بابا کے حضور جائے گی۔“

”جی اچھا۔“ امی بیٹھ گئیں۔

”میں اکیلے نہیں جاؤں گی۔“ میں نے سہم کر کہا۔

”چل بی بی۔“ آنے والی عورت نے بے دردی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اس وقت نہ جانے مجھ میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی کہ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور چلا کر بولی۔

”نہیں جاؤں گی۔“

امی بدحواس ہو گئیں اور عورتیں مڑ کر مجھے دیکھنے لگیں۔ میں تیزی سے باہر نکل گئی۔ امی میرے پیچھے آئیں۔ ”راحیلہ یہ کیا کر رہی ہے۔ پیر جی کی شان میں گستاخی کر رہی ہے۔“

”امی یہاں سے چلیں اگر آپ مجھے اندر لے کر گئیں تو میں آج ابو کو بتا دوں گی۔“ میں نے کہا تو امی جو غصے میں تھیں فوراً نرم پڑ گئیں۔

”اچھا... اچھا... جا... بد نصیب... لیکن اپنے باپ کو مت بتانا وہ میری زندگی حرام کر دے گا۔“
میں نے سکون کا سانس لیا۔ یہ شرط بری نہیں تھی اور دھمکی بھی بری نہیں تھی۔ گھر آنے کے بعد میں نے امی سے کہا۔ ”اب مجھے ایسی کسی جگہ مت لے جائیے گا۔“
امی نے دانت پیسے۔ ”تو بھی اپنے باپ کی طرح ہو گئی ہے۔“
”مجھے اچھے نہیں لگتے ہیں یہ لوگ....“

میں گھر پر پڑھ رہی تھی۔ دوبارہ علاج شروع ہونے کے بعد میری صحت اچھی ہو گئی تھی اور دورے پڑنے کی رفتار بھی سست ہو گئی تھی۔ ان دوروں سے قطع نظر میں بالکل ٹھیک اور دماغی لحاظ سے صحت مند تھی بلکہ ابو کا کہنا تھا کہ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے ذہین ہوں۔ میری ٹیچرز بھی یہی کہتی تھیں۔ جب نائن کلاس کا مرحلہ آیا تو ابو نے مجھے پرائیویٹ داخلہ دلا دیا اور میں نے اسی طرح امتحان دیا۔ اس کے باوجود میرے بہت اچھے نمبرز آئے تھے۔ اگر میں چاہتی تو کسی اسکول میں داخلہ لے سکتی تھی لیکن مسئلہ وہی تھا اچانک اور کسی بھی وقت پڑنے والے دوروں کی وجہ سے میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتی بلکہ اکیلے گھر سے باہر جا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے مجبوراً پرائیویٹ پڑھنا پڑ رہا تھا۔ میٹرک کے بعد میں نے انٹر میں رجسٹریشن کرائی اور دو سال بعد میں نے بہت اچھے نمبرزوں سے انٹر کر لیا تھا۔

جب میں بارہ سال کی تھی تب ابو نے میرا علاج دوبارہ شروع کرایا تھا۔ اب میں اٹھارہ سال کی تھی اور اس علاج سے مجھے بہت فائدہ ہوا تھا۔ مجھے دورے پڑنے کم ہو گئے تھے۔ اب چار یا پانچ مہینے بعد جا کر کہیں دورہ پڑتا تھا۔ ابو نے میرا چیک اپ کرایا تو پتا چلا کہ دماغ میں ہونے والی بلاکج جس سے مجھے دورہ پڑتا تھا بہت کم رہ گئی تھی اور اگر میں مزید دو تین سال دوائیاں استعمال کروں تو یہ ہمیشہ کے لیے ختم بھی ہو سکتی تھی۔ یہ ہمارے لیے بہت بڑی خوش خبری تھی۔ امی کو یقین تھا کہ یہ ان کے کسی پیر کی دعاؤں اور دم کیے ہوئے پانی کا نتیجہ ہے جو وہ مجھے باقاعدگی سے پلاتی رہی تھیں۔ یہ بات انہوں نے کسی کو بتائی نہیں تھی کیونکہ ابو کے ساتھ ہم بہن بھائیوں میں بھی کوئی اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا۔

مجھ سے بڑے ایک بھائی راشد اور ایک بڑی بہن نازیہ تھیں۔ جبکہ مجھ سے چھوٹا ایک بھائی اسد اور پھر بہن فاطمہ تھی۔ ابو کی طرح ہم تعلیم یافتہ اور توہمات سے دور

تھے۔ جو باتیں عقل سے بعید ہوں وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ ابو تو اس معاملے میں بہت کثرت تھے۔ ان دنوں میں پرائیویٹ گریجویٹیشن کر رہی تھی کہ نازیہ باجی کی شادی کا ہنگامہ ہوا۔ یہ ہمارے گھر کی پہلی شادی تھی اس لیے خوب ہلاکلا ہوا اور ہم نے یہ شادی بھر پور طریقے سے انجوائے کی تھی۔ امی تو راشد بھائی کی شادی بھی کرنا چاہتی تھیں لیکن وہ انٹر کے بعد آئی سی ایم اے میں آگئے تھے اور ان کا ارادہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننے کا تھا، اس میں خاصا عرصہ لگتا اور وہ اس کے بعد شادی کرتے۔ اس لیے نازیہ باجی کے فوراً بعد امی نے میری شادی کی تیاری شروع کر دی۔

ابو نے ہماری شادیوں کا معاملہ امی پر چھوڑ رکھا تھا کہ وہ کب کرتی ہیں اور کس طرح کرتی ہیں۔ رشتہ تلاش کرنا بھی امی کی ذمہ داری تھی لیکن جب تک ابو کے نہیں کرتے بات آگے نہیں بڑھتی۔ نازیہ باجی کی شادی بھی ابو نے دیکھ بھال کر کی تھی۔ رشتہ امی کی ایک جاننے والی کے توسط سے آیا تھا۔ مگر جب تک ابو کو اطمینان نہیں ہو گیا انہوں نے ہاں نہیں کی تھی۔ لڑکے کے لیے ابو کی شرط یہی تھی کہ وہ تعلیم یافتہ اور کھلے ذہن کا مالک ہو۔ خوش قسمتی سے منزل بھائی بالکل ایسے ہی نکلے تھے۔ نازیہ باجی ان کے ساتھ بہت خوش تھیں۔ ابو چاہتے تھے کہ میرے لیے بھی ایسا ہی رشتہ آئے۔ مگر ایک بات بھول گئے تھے میرے ساتھ مسئلہ تھا اور مجھے رہ رہ کر دورے پڑتے تھے اور ہمارے جاننے والوں میں سب ہی اس سے واقف تھے اس لیے ان کی طرف سے رشتہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس بارے میں تو امی نے بھی نہیں سوچا تھا لیکن جب انہوں نے جاننے والیوں سے میرے رشتے کی بات کی تو تقریباً سب نے یہی کہا کہ میرے لیے رشتہ آنا مشکل ہے۔ ناکملہ خالہ نے امی کو مشورہ دیا۔

”راحیلہ کے لیے رشتہ غیروں میں تلاش کرو۔ جاننے والوں میں تو مشکل ہے۔“

خود ناکملہ خالہ کے دو بیٹے تھے جن میں سے ایک کی شادی ہو گئی تھی لیکن انہوں نے ایسا کوئی عندیہ نہیں دیا کہ وہ دوسرے بیٹے کا رشتہ بہن کے ہاں کرنا چاہتی ہیں۔ صرف ناکملہ خالہ نہیں بلکہ جاننے والوں میں کوئی مجھے اپنی بہو بنانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ حالانکہ سب کو علم تھا میرا علاج جاری ہے اور ڈاکٹر نے مکمل شفایابی کی امید ظاہر کی ہے۔ پھر مجھ میں مزید کوئی کمی نہیں تھی صورت شکل کے لحاظ سے خاندان کی خوب صورت

ذہن لڑکیوں میں شمار ہوتا تھا۔ قد کاٹھ اچھا تھا اور پھر تعلیم یافتہ تھی جس کا میرے خنصالی میں رواج کم تھا۔ کالج تک آنے والی لڑکیوں کی تعداد گنی جیتی تھی اور وہ بھی پڑھنے کے بجائے وقت گزاری کرنے جاتی تھیں۔ یہی حال لڑکوں کا تھا جج معنوں میں تعلیم یافتہ کم تھے، دوسرے تیسرے طریقوں سے پاس ہونے والے زیادہ تھے اور اب وہ ملازمت کے بجائے چھوٹے موٹے کاموں پر لگے ہوئے تھے۔

صحیح معنوں میں پڑھا لکھا گھرا نا ہمارا ہی تھا۔ اس لیے جب نازیہ باجی کے لیے رشتے کی تلاش شروع ہوئی تو خاندان کے بہت سارے لوگ اپنے بیٹوں کے رشتے لے آئے۔ نازیہ باجی خوش شکل تھیں اور انہوں نے ماسٹر کیا تھا، کوئی کمی نہیں تھی پھر ابو سے بہت اچھے جینز کی امید تھی۔ لیکن ابو نے منزل بھائی کے رشتے کے لیے ہاں کر دی جو خاندان سے باہر کے تھے اس پر سب کے منہ بن گئے اور میری باری میں ان لوگوں کو کہنے کا موقع مل گیا کہ راہیلہ کی شادی بھی غیروں میں کر دیں۔ میں نے گریجویٹیشن مکمل کیا تو اس وقت تک خاندان سے میرے لیے صرف ایک رشتہ آیا تھا۔ یہ امی کے دور کے خالہ زاد بھائی فرحان تھے جو ایک بیوی بھگتا چکے تھے۔ وہ آلو چھوٹے کی ریڑھی لگاتے تھے اور جب امی نے ابو کو اس رشتے کے بارے میں بتایا تو ان کو غصہ آ گیا۔ ”تمہارا دماغ خراب ہے۔ ان کی جرات کیسے ہوئی میری بیٹی کے بارے میں ایسا سوچنے کی۔“

”آپ جانتے ہیں راہیلہ کا کوئی رشتہ نہیں آ رہا ہے۔“
”نہ آئے وہ مجھ پر بوجھ نہیں ہے۔“ ابو برہمی سے بولے۔ ”آئندہ اس قسم کا کوئی الٹا سیدھا رشتہ آئے تو اسے دروازے سے لوٹا دینا مجھ تک لانے کی ضرورت نہیں ہے۔“
”مگر باہر سے کوئی رشتہ نہیں ہے اور اس کی عمر بھی میں سے زیادہ ہو گئی ہے۔“

”ہونے دو ابھی میں اسے ماسٹر کراؤں گا۔ بلکہ یہ اس سے آگے پڑھنا چاہیے گی تو اس سے آگے بھی پڑھاؤں گا جب تک اس کا علاج مکمل نہیں ہو جاتا اس کی شادی کے بارے میں مت سوچو۔ ڈاکٹر نے بھی منع کیا ہے۔ شادی کے بعد دوسرے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔“

امی اتنی پڑھی لکھی نہیں تھیں کہ ان مسائل کو سمجھ سکتیں۔ اس لیے وہ بدستور میری شادی کے لیے پریشان رہیں۔ درحقیقت جب فرحان کا رشتہ آیا تو میں خوفزدہ ہو گئی تھی۔ وہ دیکھنے میں ہی اچھے نہیں لگتے تھے اور ان کا مزاج

بھی ان کے پیسے کی طرح تھا ایک کچی آبادی جیسی جگہ پر وہ چھوٹے سے مکان میں اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتے تھے جس سے شادی کی وہ سات سال بعد خون تھوکتی مر گئی کیونکہ ماں بیٹا دونوں مل کر اس پر ظلم کرتے تھے۔ ابو کے جواب نے مجھے خوش کر دیا خود میری خواہش تھی کہ میں آئی آر میں ماسٹر کروں۔ ظاہر ہے امی نے مخالفت کی۔ لیکن جیسے ہی میرا گریجویٹیشن کا رزلٹ آیا اور میں نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی تو ابو سے انعام میں ماسٹر کرنے کی اجازت مانگ لی جو وہ پہلے ہی دے چکے تھے لیکن اس طرح میں نے اپنا ماسٹر پکا کر لیا تھا، دوسری بات یہ منوائی کہ جب تک میں ماسٹر نہیں کروں گی میری شادی کی بات نہیں کی جائے گی۔

گریجویٹیشن کے بعد میں نے پرائیویٹ ہی یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ میری خواہش تھی کہ میں یونیورسٹی جا کر پڑھوں اور میرے نمبرز اتنے اچھے تھے کہ مجھے ایڈمیشن بھی مل جاتا لیکن میری بیماری نے مجھے روک دیا۔ بہر حال میں خوش تھی کہ ماسٹر تو کر رہی ہوں، خنصالی میں پہلی لڑکی تھی جسے یہ اعزاز حاصل ہو رہا تھا۔ امی نے مخالفت کی تھی کہ میں ماسٹر نہ کروں لیکن ابو کی اجازت کے بعد ان کی ایک نہیں چلی تھی۔ دراصل امی کی خواہش تھی کہ میں ان کے خاندان میں جاؤں اور جب انہوں نے اپنے خاندان والوں کا رویہ دیکھ لیا تب بھی یہ خواہش کسی نہ کسی طرح برقرار تھی جبکہ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں کسی صورت خاندان میں شادی کے لیے نہیں مانوں گی۔ ویسے بھی ابو ہمارے حمایتی تھے اور وہ بھی ہماری شادیاں خاندان سے باہر کرنا چاہتے تھے۔ راشد بھائی آئی سی ایم اے کے آخری سال میں تھے اور ایک جگہ جاب بھی کر رہے تھے۔ سی اے مکمل کرنے کے بعد ان کا ارادہ یو کے یا یو ایس اے جانے کا تھا اس لیے ابو نے ان کی شادی کا فیصلہ کیا تا کہ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر جائیں۔

راشد بھائی کے لیے امی نے خاندان میں کئی لڑکیاں دیکھ رکھی تھیں خود خاندان والوں میں دوڑ لگی تھی لیکن ابو نے اپنے ایک کمپنی ڈائریکٹر کی بیٹی منتخب کر کے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ یہ ڈائریکٹر عزیزانگل ابو کے اچھے دوست تھے اور ان کی بیٹی فریڈا اچھی لڑکی تھی۔ اس نے ایم بی اے کیا تھا اور عزیزانگل کے ساتھ ہی کام کرتی تھی۔ امی کی مرضی نہیں تھی لیکن ابو کا فیصلہ تھا انہیں قبول کرنا ہی پڑا تھا۔ البتہ اس بار امی ابو سے لڑی بہت تھیں۔

”آپ چاہتے ہیں میرے بچے میرے خاندان میں

لیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ دوسرا معاملہ مجھے پڑنے والے دوروں کا تھا۔ شہزاد نے کہا کہ فی الحال وہ اپنی امی کو نہیں بتائے گا کہ مجھے دورے پڑتے ہیں۔ مجھے آخری دورہ پڑے کئی مہینے ہو گئے تھے اور اس کے بعد سے میں خود کو ٹھیک محسوس کر رہی تھی۔

پھر شہزاد نے نہ جانے کیا چکر چلایا اور کسی کے توسط سے اس کا رشتہ یوں آیا کہ ہمارے گھر میں کسی کو شبہ تک نہیں ہوا کہ میری اور شہزاد کی آپس میں انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ امی حسب معمول مجھے اپنے خاندان میں دینا چاہتی تھیں لیکن ابو کو شہزاد کی تعلیم اور شخصیت نے متاثر کیا۔ کیونکہ وہ خود جا کر اس سے یونیورسٹی میں مل کر آئے تھے۔ میں سپر زورے ہوئی تھی اور جیسے ہی رزلٹ آیا شادی کی تاریخ طے کر دی گئی۔ میں نے سینکڑوں ڈیڑھن میں ماسٹر کیا تھا۔ میں نے ظاہر کیا کہ مجھے اس کی بہت خوشی ہے حالانکہ مجھے اصل خوشی شہزاد سے شادی طے ہو جانے کی تھی۔ اس سے بھی زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ شہزاد اور اس کی فیملی بہت پڑھی لکھی اور مہذب تھی۔ ان میں وہ جہالت نہیں تھی جو میں اپنے خفیہ خیال میں دیکھتی آئی تھی۔

شہزاد کے والد ایک بڑا مکان وراثت میں چھوڑ کر گئے تھے جس میں اوپر نیچے چار پورشن تھے۔ گراؤنڈ فلور پر وہ لوگ خود رہتے تھے جبکہ اوپر کے تین پورشن کرائے پر دیے ہوئے تھے۔ یہ مکان کے سی ایچ ایس میں تھا اور خاصے بڑے رقبے پر تھا اس لیے پورشنوں کا کرایہ بھی اچھا خاصا آتا تھا پھر شہزاد کی امی خود بھی ایک اچھے اسکول میں پرنسپل تھیں۔ ان کی اچھی خاصی تنخواہ تھی۔ دو ماں بیٹیوں کا خرچ اتنا نہیں تھا اور آمدنی اچھی خاصی تھی۔ شہزاد نے لیکچرر ہونے کے باوجود گاڑی لی ہوئی تھی۔ ابو نے شہزاد اور اس کی فیملی کے بارے میں چھان بین کرائی تھی اور پھر امی کی مرضی کے خلاف ہاں کر دی کیونکہ میں اس رشتے سے خوش تھی۔

☆☆☆

”تمہارے گھر والوں نے یہ کیا جہیز دیا ہے، کیا تمہارے گھر میں بیٹیوں کو یوں بیاہا جاتا ہے۔“ یہ جملہ میری ساس نفیسہ بیگم نے شادی کی صبح ناشتے کی میز پر میرے سلام کے جواب میں کہا۔ میں حیران رہ گئی اور اس سے زیادہ حیرت مجھے شہزاد پر ہوئی جو سر جھکائے ناشتا کرتا رہا جیسے اس کی ماں نے بالکل کوئی عام سی بات کی ہو۔ میں نے ابھی ناشتے کا آغاز نہیں کیا تھا۔ توس کی طرف بڑھتا میرا ہاتھ

رک گیا۔

”میں سمجھی نہیں امی.... پھر کس طرح جہیز دیا جاتا ہے۔“ اس نے منہ بنایا۔ ”نہ داماد کو گاڑی دی اور نہ سروس کی گھڑی۔“

”میرے ابو کی جو حیثیت تھی انہوں نے اس سے بڑھ کر ہی دیا ہے۔ کار تو نہیں.... ہاں اگر آپ کی طرف سے مطالبہ ہوتا تو ابو شہزاد کو بائیک دے سکتے تھے لیکن ان کے پاس پہلے ہی کار ہے اور....“

”میں معافی چاہتی ہوں۔“ میں نے ادب سے کہا اور ناشتا کرنے لگی۔ مجھے حیرت ہے اس وقت میں نے کسے یہ سب بہت لائٹ لیا اور مجھے ساس کے طرز عمل سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد جب ہم کمرے میں آئے تو شہزاد نے سنجیدگی سے کہا۔

”راہیلہ تمہیں امی سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”میں نے کیا بات کی ہے ان کی بات نہیں سنی تھی آپ نے؟“

”امی اسی طرح کی باتیں کرتی ہیں اور ان کا سب سے اچھا جواب خاموشی ہے۔“

ہر لڑکی جس کی نئی نئی شادی ہوئی ہو اور جس نے خود کو اپنے شوہر کے سپرد کیا ہو اس میں لازمی ایک فخر و غرور اور تنگ مزاجی آ جاتی ہے مجھ میں بھی آئی تھی۔ ”میں کسی کی ناجائز بات نہیں سن سکتی۔“

شہزاد نے مجھے ڈانٹا نہیں تھا بلکہ بڑی اپنائیت سے سمجھایا تھا اس سے بھی میرا حوصلہ بڑھا تھا ورنہ وہ مجھے دوسرے لہجے میں کہتا۔ میری بات پر اس نے کسی قدر بے بسی سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”پلیز میری بات سمجھو امی کو نہیں جانتی ہو.... بہتر ہوگا کہ تم ان سے اپنے رویے کی معافی مانگ لو بات ختم ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے اگر آپ کہتے ہیں تو میں معافی مانگ لوں گی لیکن وہ دوبارہ اس بات کو اٹھا میں گی؟“

”وہ نہیں اٹھا میں گی۔“ شہزاد نے یقین سے کہا۔ ”امی کی کسی بات پر رد عمل نہیں دکھایا کرو اور جو میں کہوں اس پر عمل کیا کرو.... میری بات مانو گی۔“

میں شہزاد سے محبت کرتی تھی اس کی بات کیسے نہ مانتی۔ ”ٹھیک ہے جیسا آپ کہیں....“

”میں نے امی کو تمہاری بیماری کے بارے میں نہیں بتایا ہے اس لیے تم بھی چھپاؤ گی۔“

”لیکن میں دوا کھاتی ہوں وہ ان سے کیسے چھپاؤں؟“

”کسی طرح بھی چھپاؤ.... دوائیں اپنے لاکر میں رکھو لیکن امی کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔“ شہزاد ڈرے ہوئے انداز میں بولا۔

نفیسہ بیگم دیکھنے میں بہت نرم مزاج اور سادہ سی نظر آتی تھی، گورارنگ اور نقوش بھی اچھے تھے۔ صرف آنکھیں کسی قدر سخت لگتی تھیں۔ مگر شہزاد ایسے خوف زدہ تھا جیسے وہ اس کی ماں نہیں جلاو ہو۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا۔ دوپہر میں جب میں گھر جانے کے لیے نکلنے لگی تو میں نے ساس سے معافی مانگ لی۔ وہ خوش ہوئی بھی تو ظاہر نہیں کیا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ یولی اور شہزاد کی طرف دیکھا۔ ”جلد گھر آ جانا.... شادی ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنے معمولات بھول جائے۔“

راستے میں شہزاد نے مجھے ایک حیرت انگیز بات بتائی کہ وہ شام سات بجے کے بعد بغیر ماں سے اجازت لیے گھر سے باہر نہیں جاتے تھے۔ یہ پابندی اب بھی برقرار تھی۔ میں سن کر ہنس پڑی۔ ”آج کل تو بارہ تیرہ سال کے بچے بھی اس قسم کی پابندی قبول نہیں کرتے ہیں۔“

”لیکن مجھ پر یہ پابندی ہے اور میں امی کی لگائی پابندی کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔“

”یہ پابندی مجھ پر بھی ہوگی؟“

”ممکن ہے میں امی سے پوچھ لوں گا۔“

”میرے خدا.... یہی پابندی ہے یا اس کے علاوہ اور پابندیاں بھی ہیں؟“ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

”ہاں رات نو بجے سو جانا اور صبح سات بجے اٹھنا بھی لازمی ہے۔“

”صبح سات بجے اٹھنا تو سمجھ میں آتا ہے، میں خود بھی اس وقت اٹھ جاتی ہوں لیکن رات نو بجے....“

”میں رات نو بجے لازمی سونے کے لیے لیٹ جاتا ہوں۔“

یہ میرے لیے انکشاف تھا۔ شہزاد پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہا تھا اور نفیسہ بیگم نے ایجوکیشن میں ماسٹر کیا تھا۔ اتنی پڑھی لکھی فیملی میں اس قسم کے اصول نافذ ہوں گے

یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ شہزاد نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ہمیں چھ بجے لازمی واپس جانا تھا تاکہ سات بجے سے پہلے گھر پہنچ جائیں۔ شہزاد شادی کے بعد مجھے شاپنگ بھی کرانا چاہتا تھا اور میں نے گھر میں بھی یہی بہانہ کیا۔ ورنہ سب رات کے کھانے پر روک رہے تھے۔ شہزاد نے مجھے ایک جیولر شاپ سے سونے کی نازک سی چین گفت کی تھی پھر ہم گھر آئے۔ رات شہزاد نے مجھے بتایا کہ اوقات والی پابندی مجھ پر بھی ہے۔ مجھے غصہ آ گیا۔

”مجھ پر کیوں ہے اور اب آپ ایک شادی شدہ فرد ہیں، آپ کو اپنے اصول خود بنانے چاہئیں۔“

شہزاد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”جب تک امی ہیں اس گھر میں ان کے بنائے اصول چلیں گے۔“

یہ بات آنے والے چند دنوں میں اچھی طرح میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ اس گھر پر نفیسہ بیگم کا مکمل ہولڈ تھا۔ اس کا صرف ظاہر جاہل عورتوں سے مختلف تھا ورنہ باطن وہ کسی ان پڑھ عورت جتنی جاہل اور تنگ ذہنیت رکھتی تھی۔ میں خود حیران تھی اور اس سے زیادہ فکر مند تھی کہ اپنے گھر والوں کو یہ سب کس طرح بتاؤں کیونکہ وہ میری سسرال کو روشن خیال اور کھلے ذہن کا سمجھتے تھے۔ یہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری ساس اس سوچ کی مالک ہوگی اور بیٹا اس کے اصولوں سے سرمو انحراف نہیں کرتا ہوگا۔ لیکن یہ بات ہمیشہ کے لیے بھی نہیں چھپائی جاسکتی تھی۔ اس لیے ویسے کے بعد جب میں دوسری بار امی کے گھر رکنے کے لیے گئی تو میں نے ابو کو سب بتا دیا۔ وہ حیران رہ گئے تھے۔

”میں تو انہیں کھلے ذہن کا سمجھتا تھا۔“

”بد قسمتی سے وہ ایسے نہیں ہیں۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔

جہاں تک میری بیماری کا تعلق تھا تو میرا علاج اتنا کامیاب رہا تھا کہ مجھے پچھلے ایک سال سے دورہ نہیں پڑا تھا۔ دورے کے علاوہ بھی بعض اوقات مجھے ذہن سن ہونے کی شکایت تھی لیکن اس ایک سال کے دوران یہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ شادی سے پہلے ابو نے میرا چیک اپ کرایا تھا۔ اس میں پتا چلا تھا کہ دماغ میں متاثر حصہ اب بہ ظاہر ٹھیک تھا لیکن ڈاکٹر نے خبردار کیا تھا کہ مجھے دوائیں باقاعدگی سے استعمال کرنی چاہئیں۔ ورنہ مسئلہ دوبارہ بھی اٹھ سکتا ہے کیونکہ معاملہ دماغ کا ہے جس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ امی نے بعد میں بتایا کہ ڈاکٹر نے شادی

سے کہا۔

جہاں تک میری بیماری کا تعلق تھا تو میرا علاج اتنا کامیاب رہا تھا کہ مجھے پچھلے ایک سال سے دورہ نہیں پڑا تھا۔ دورے کے علاوہ بھی بعض اوقات مجھے ذہن سن ہونے کی شکایت تھی لیکن اس ایک سال کے دوران یہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ شادی سے پہلے ابو نے میرا چیک اپ کرایا تھا۔ اس میں پتا چلا تھا کہ دماغ میں متاثر حصہ اب بہ ظاہر ٹھیک تھا لیکن ڈاکٹر نے خبردار کیا تھا کہ مجھے دوائیں باقاعدگی سے استعمال کرنی چاہئیں۔ ورنہ مسئلہ دوبارہ بھی اٹھ سکتا ہے کیونکہ معاملہ دماغ کا ہے جس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ امی نے بعد میں بتایا کہ ڈاکٹر نے شادی

سے کہا۔

جہاں تک میری بیماری کا تعلق تھا تو میرا علاج اتنا کامیاب رہا تھا کہ مجھے پچھلے ایک سال سے دورہ نہیں پڑا تھا۔ دورے کے علاوہ بھی بعض اوقات مجھے ذہن سن ہونے کی شکایت تھی لیکن اس ایک سال کے دوران یہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ شادی سے پہلے ابو نے میرا چیک اپ کرایا تھا۔ اس میں پتا چلا تھا کہ دماغ میں متاثر حصہ اب بہ ظاہر ٹھیک تھا لیکن ڈاکٹر نے خبردار کیا تھا کہ مجھے دوائیں باقاعدگی سے استعمال کرنی چاہئیں۔ ورنہ مسئلہ دوبارہ بھی اٹھ سکتا ہے کیونکہ معاملہ دماغ کا ہے جس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ امی نے بعد میں بتایا کہ ڈاکٹر نے شادی

سے کہا۔

جہاں تک میری بیماری کا تعلق تھا تو میرا علاج اتنا کامیاب رہا تھا کہ مجھے پچھلے ایک سال سے دورہ نہیں پڑا تھا۔ دورے کے علاوہ بھی بعض اوقات مجھے ذہن سن ہونے کی شکایت تھی لیکن اس ایک سال کے دوران یہ بھی ختم ہو گئی تھی۔ شادی سے پہلے ابو نے میرا چیک اپ کرایا تھا۔ اس میں پتا چلا تھا کہ دماغ میں متاثر حصہ اب بہ ظاہر ٹھیک تھا لیکن ڈاکٹر نے خبردار کیا تھا کہ مجھے دوائیں باقاعدگی سے استعمال کرنی چاہئیں۔ ورنہ مسئلہ دوبارہ بھی اٹھ سکتا ہے کیونکہ معاملہ دماغ کا ہے جس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ امی نے بعد میں بتایا کہ ڈاکٹر نے شادی

سے کہا۔

کی مشروط اجازت دی تھی۔ اگر مجھے شادی کے بعد دورہ پڑتا تو پھر مجھے ماں بننے سے گریز کرنا ہوگا۔ یہ بات امی نے مجھے شادی کے بعد بتائی تھی۔ میری ساس کو میری بیماری کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ دوائیں میں اب بھی کھا رہی تھی۔ ابو نے مجھے منع کر دیا کہ اپنی امی کو نہ بتاؤں ورنہ انہیں غصہ آجائے گا۔

”ابھی شادی کے شروع دن ہیں۔“ ابو بولے۔ ”تم ویسا ہی کرو جیسا تمہارا شوہر کہتا ہے۔ اگر کوئی بات بڑھی تو پھر ہم دیکھ لیں گے۔“

عام حالات میں میری ساس کا رویہ نارمل ہوتا تھا بلکہ کبھی کبھی تو مجھ سے بہت اچھے موڈ میں ملتی مذاق بھی کر لیتی تھی لیکن اچانک اس کا موڈ بدل جاتا تھا۔ خاص طور سے جب اس کے بنائے اصولوں کی معمولی سی بھی خلاف ورزی ہو۔ شہزاد صبح یونیورسٹی جاتا اور شام کو چھ بجے تک واپس آتا تھا۔ لیکن رشتہ کے ساتھ وہ پی ایچ ڈی کی تیاری بھی وہیں کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا گھر میں اسے پڑھنے میں مشکل پیش آتی تھی اور پھر یہ سائنس کا مضمون تھا۔ اس میں کتابوں کے ساتھ آلات اور لیب کی ضرورت بھی تھی جو صرف یونیورسٹی میں تھی۔

میرا خیال تھا کہ میری ساس زیادہ پڑھنے کی وجہ سے ایک مخصوص ذہنیت کی مالک بن گئی ہے۔ ماسٹر میں نے بھی کیا تھا لیکن مجھے مطالعے کا وہ شوق نہیں تھا جو انہیں تھا۔ ساس کے پاس بے شمار کتابیں تھیں اور وہ اسکول سے آنے کے بعد اپنا بہت سا وقت مطالعے میں گزارتی تھی۔ البتہ میں نے ایک عجیب بات نوٹ کی تھی کہ وہ جو کتاب پڑھتی اس پر پہلے اخبار کا کور چڑھا لیتی۔ یہ ظاہر ایسا لگتا تھا کہ اس کا مقصد کتاب خراب ہونے سے محفوظ رکھنا ہے۔ مگر اس سے یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ کتاب کا نام کیا ہے اور وہ کس موضوع پر ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس کی کتابوں کی بڑی سی الماری جو بیڈروم میں تھی ہمہ وقت لاک رہا کرتی تھی۔ اس سے باہر صرف وہی کتاب آتی تھی جسے وہ پڑھتی تھی۔ میں نے اس بات کو بھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ بہت سے لوگ اپنی کتابوں کے معاملے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ وہ نہ تو کسی کو کتاب دیتے ہیں اور نہ پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔

گھر میں کل پانچ کمرے اور ایک بڑا سالونج تھا۔ ایک کمرہ ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اگرچہ ان کے ہاں کوئی آتا جاتا نہیں تھا۔ میری شادی کے بعد میں نے

بہت کم لوگوں کو آتے جاتے دیکھا تھا۔ نفیسہ بیگم نے شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ وہ نہ تو خود کسی کے ہاں آتے جاتے ہیں اور نہ ہی اپنے گھر میں کسی کا زیادہ آنا جانا پسند کرتے ہیں۔ میں سمجھ گئی اور اپنے گھر والوں کو بھی سمجھا دیا تھا اس لیے وہ شادی کے بعد بس دو تین بار آئے اور مجھ سے مل کر تھوڑی دیر بعد واپس چلے گئے تھے۔ اس معاملے میں شہزاد بھی اپنی ماں کی طرح تھا۔ کسی سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتا تھا لیکن یہ بھی غنیمت تھا کہ میرے گھر چلا جاتا تھا اور میرے آنے جانے پر پابندی نہیں لگائی تھی۔ میں مبینے میں ایک بار دو دن کے لیے میکے جا سکتی تھی۔

نفیسہ بیگم کے پاس دو کمرے تھے، ایک بیڈروم اور ایک اس کے برابر والا کمرہ تھا۔ اس کا دروازہ اس کے بیڈروم سے ہی جاتا تھا۔ ایک دروازہ باہر بھی کھلتا تھا مگر وہ ہمہ وقت بند رہتا تھا۔ وہ اس کمرے میں اپنے بیڈروم سے آتی جاتی تھی۔ مجھے کئی مہینے گزرنے کے بعد بھی اس کمرے میں جانے کا موقع نہیں ملا۔ ایک دو بار میں نے صفائی کے بہانے اندر جانا چاہا تو نفیسہ بیگم نے منع کر دیا۔ وہ اس کمرے کی صفائی بھی خود کرتی تھی۔ گھر میں صفائی اور کپڑے دھونے کے لیے ماسی آتی تھی لیکن اسے بھی اس کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک بار میں نے شہزاد سے پوچھا۔ ”اس کمرے میں ایسا کیا ہے جو امی وہاں کسی کو جانے نہیں دیتی ہیں۔“

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تم بھی اس چکر میں مت پڑو۔“

”لیکن شہزاد ایک گھر میں ایک کمرہ....“

”میں نے کہا تاہم اس چکر میں مت پڑو۔“ شہزاد کا لہجہ سخت ہو گیا اور پھر وہ اٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔ میں اس کے رد عمل پر حیران رہ گئی تھی۔ ہماری شادی کو کئی مہینے گزر گئے تھے لیکن شہزاد نے مجھ سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔ میں رودی اور ساتھ ہی مجھے ضد سوار ہو گئی کہ میں اس کمرے کو اندر سے دیکھ کر رہوں گی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کمرہ لاک رہتا تھا اور اس کی چابی صرف میری ساس کے پاس تھی لیکن ساتھ ہی جب وہ اسکول جاتی تو اپنا کمرہ بھی لاک کر کے جاتی۔ صرف اسکول ہی نہیں بلکہ وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی کہیں جاتی تو کمرہ لاک کر دیتی۔ اب کوئی کیسے اندر کھسک سکتا تھا۔ اس کے کمرے میں جانا مشکل تھا دوسرے کمرے میں جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

شادی کے بعد ہماری ازدواجی زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی۔ بچے شہزاد کو بھی اچھے لگتے تھے اور مجھے تو بچوں کی شدید خواہش تھی۔ شادی کے شروع دنوں میں ڈر رہی تھی کہ کہیں پھر مجھے دورہ نہ پڑے۔ ایک تو ساس کے سامنے بھید کھل جاتا اور اس سے بھی بری بات یہ ہوتی کہ میں ماں نہیں بن سکتی تھی لیکن جب چھ مہینے بعد بھی مجھے دورہ نہیں پڑا تو میں نے شہزاد سے کہا۔ ”میں کسی ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔“

شہزاد مان گیا۔ ”ٹھیک ہے کسی چھٹی کے دن تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔“

آنے والے اتوار کو ہم ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئے۔ اس نے میرا معائنہ کیا اور کچھ ٹیسٹ بتائے۔ صرف میرے نہیں بلکہ شہزاد کو بھی ٹیسٹ لکھ کر دیے تھے جو ہم نے اسی دن کرا لیے اور آنے والے اتوار تک ان کی رپورٹ بھی آگئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے ہمیں صحت مند قرار دیا۔ پھر اس نے مجھے ماں بننے کی کچھ تدابیر بتائیں۔ میں نے ان تدبیروں پر عمل بھی کیا۔ لیکن کئی مہینے گزرنے کے بعد بھی کچھ نہیں ہوا۔ مجھے اور شہزاد کو بچے کا ارمان تھا لیکن میری ساس نے شادی کے بعد ایک بار بھی مجھ سے بچے کی بات نہیں کی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا اسے پوتے پوتی کا کوئی ارمان نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ بچہ آنے سے گھر کا ماحول بدل جاتا اور یہ اس کے اصولوں کے خلاف ہوتا۔

ایک دن میری طبیعت کچھ خراب تھی اور مجھے صبح سے چکر آرہے تھے۔ شہزاد اور ساس کو ناشا کرا کے اور رخصت کر کے میں بستر پر لیٹ گئی۔ شادی کے چند دن بعد ہی کچن مکمل طور پر میں نے سنبھال لیا تھا۔ ساس کو ویسے بھی کھانا بنانے سے دلچسپی نہیں تھی۔ ایک دو بار اس نے جو چیزیں بنائیں وہ اتنی بد ذائقہ تھیں کہ مجھے حیرت ہوئی کہ شہزاد شادی سے پہلے یہ سب کس طرح کھا لیتے تھے۔ کھانا بنانے کے علاوہ ڈسٹنگ اور دوسرے چھوٹے موٹے کام بھی میرے ذمے تھے۔ اتوار والے دن میں شہزاد کے ساتھ مارکیٹ جا کر مارے ہفتے کا سامان لاتی تھی۔ ناشتے کے بعد کچن کی صفائی کر کے میں دوپہر کا کھانا بناتی تھی۔ ساس دو بجے آ جاتی تھی اور اسے کھانا چاہیے ہوتا تھا۔ میں اس کے آنے سے پہلے سب تیار کر لیتی تھی۔ ہانڈی ایک بار پکتی تھی اور رات کو کچنی نیکی استعمال ہوتی تھی۔ ماسی دوپہر کے بعد آتی تھی، صفائی اور کپڑے دھوتی تو مجھے اس کی نگرانی کرنا پڑتی تھی۔ ان چکروں سے مجھے امید ہوئی کہ شاید میں امید سے

ہو گئی تھی۔ لیکن کچھ دیر بعد اچانک میرے جسم کو جھکے لگنا شروع ہوئے اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ جب ہوش آیا تو میں فرش پر پڑی تھی اور زبان دانت تلے آکر زخمی ہو گئی تھی۔ مجھے پھر دورہ پڑا تھا۔ میں یہ مشکل اٹھ کر بستر پر لیٹی۔ میری حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے کسی نے مجھے ڈنڈے سے چٹکا ہے۔ اتنے عرصے بعد دورہ پڑا تھا، جب میں اس کی عادی بھی نہیں رہی تھی مگر اتنا شدید دورہ اور اس کے بعد کے خراب اثرات اس وقت ہوتے تھے جب امی نے میرا ڈاکٹر سے علاج روک دیا تھا۔ اس کے بعد اتنا شدید دورہ کبھی پڑا تھا۔ میں چار گھنٹے بے ہوش رہی تھی اور اس کے بعد حالت ٹھیک ہوتے ہوئے مزید ایک گھنٹا لگ گیا تھا۔ تکلیف سے زیادہ صدمے سے میرا برا حال تھا۔ جب میں پریقین تھی کہ میں اپنے مرض سے چھٹکارا پا چکی ہوں اور ماں بننا چاہتی تھی تو اس دورے نے ایک ہی جھٹکے میں میری ساری خوش فہمی دور کر دی تھی۔ میں رونے لگی تھی پھر میری نظر گھڑی کی طرف گئی۔ ڈیڑھ بج رہا تھا اور ساس کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں جلدی سے اٹھی اور لڑکھڑاتے قدموں سے کچن میں آگئی۔ شام کو شہزاد آیا تو کمرے میں آتے ہی میں نے اسے دورے کے بارے میں بتا دیا وہ بھی ساکت رہ گیا۔ ”یہ تو برا ہوا تمہیں ڈاکٹر کو دکھانا ہوگا۔“

”لیکن کب آپ کو تو صرف اتوار کو فرصت ملتی ہے اور باقی دن ہم سات بجے کے بعد باہر جا نہیں سکتے۔۔۔۔۔“ میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”تم فکر مت کرو میں کوشش کرتا ہوں اس ڈاکٹر کا نمبر دو مجھے جس سے تم علاج کرا رہی تھیں۔“

”دوائیں تو میں اب بھی کھا رہی ہوں اور ڈاکٹر نے ٹیسٹ کرا کے مجھے ٹھیک قرار دیا تھا۔“

”بیماری کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے۔“ شہزاد نے کہا اور ڈاکٹر سے بات کی، اس نے رات نو بجے کا وقت دیا تھا۔

”نو بجے ہم کیسے جائیں گے؟“

”تم طبیعت خرابی کا ڈراما کرنا اور میں تمہیں ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے لے جاؤں گا اور پھر ہم اس ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔“

رات کو میں نے سر چکرا نے اور کمزوری کا ڈراما کیا۔ اس ڈرامے میں اتنی حقیقت تھی کہ میں کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ دورہ پڑنے کے بعد دو تین دن مجھے کمزوری

محسوس ہوتی تھی۔ اس کے بعد میں معمول پر آجاتی۔ میری ساس نے اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی جلد گھر آنے کا حکم بھی دیا۔ میں نے اسے کہتے سنا۔ ”ڈاکٹر کے بعد کہیں گھومنے نہ نکل جاتا۔“

”امی راحیلہ کی حالت ایسی نہیں ہے۔“ شہزاد نے کہا۔ ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا اور پھر سوالات کیے، دواؤں کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ میں تمام احتیاط کرتی رہی اور دوائیں باقاعدگی سے وقت پر کھاتی رہی تھی۔ ڈاکٹر بھی حیران تھا۔ اس کے کلینک میں مشینیں موجود تھیں اس نے اسی وقت میرا معائنہ کیا اور آخر میں بتایا کہ دماغ کے متاثرہ حصے میں پھر کھٹکی سی بنا شروع ہو گئی ہے اور یہ دورہ اسی کا نتیجہ تھا۔ ”عام طور سے ایسا ہوتا نہیں ہے کہ کھٹکی دوبارہ سے بنا شروع ہو جائے ممکن ہے یہ دوائیں اثر نہ کر رہی ہوں۔“

یہ ایک اور بری خبر تھی۔ کئی سالوں کے لگاتار علاج کے بعد ختم ہونے والی خرابی پھر پیدا ہو گئی تھی۔ واپسی پر میں روتی رہی اور شہزاد مجھے تسلیاں دیتا رہا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”میں نے سوچا بھی نہیں تھا اتنے علاج کے بعد میں دوبارہ اسی مقام پر کھڑی ہوں گی۔“

”ہم دوبارہ سے علاج کرائیں گے۔ علاج تو ہے نا۔“

”اب میں ماں بھی نہیں بن سکوں گی۔“

”جب تم ٹھیک ہو جاؤ گی تو ماں بھی بن سکو گی۔“

شہزاد کی تسلیوں نے میرا غم ہلکا کیا۔ جیسے جیسے ہماری شادی کو وقت گزرتا جا رہا تھا، شہزاد میرا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔ اس کی محبت میں شدت آ گئی تھی۔ بس جب اس کی ماں کا معاملہ آتا تو وہ سخت ہو جاتا تھا، ماں کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتا تھا اور نہ ماں کی شکایت سن سکتا تھا، اگر میں کچھ کہتی تو خاموشی سے سن لیتا مگر اس پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کرتا تھا۔ مجھے ایسا لگتا جیسے میں پتھر کی دیوار سے شکایت کر رہی ہوں۔ لیکن باقی معاملات میں وہ بہت اچھا تھا۔ میرا پورا خیال رکھتا تھا۔ کھانا خرچ دیتا تھا اور کھانے، پینے اور پہننے اوڑھنے پر میری ساس نے بھی مجھے بہت کم ٹوکا تھا۔ ہاں اگر اس کے فرمان سے بھی ذرا انحراف ہوتا تو میری شامت آجاتی۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے میں نے تاثرات درست کر لیے ورنہ ساس کھٹک جاتی اور اس کے بعد شہزاد سے اگلا لیتی۔ اس کی عادت تھی اگر ماں اس سے پوچھتی تو پھر وہ جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔

گزشتہ تقریباً ایک سال میں میں نے ساس کی کئی اونکھی باتیں نوٹ کی تھیں۔ کمرے والا معاملہ تو تھا ہی، ساتھ ہی ہر مہینے چاند کی پہلی تاریخ کو عصر اور مغرب کے درمیان وہ کہیں جاتی تھی اور اس نے کبھی نہیں بتایا کہ وہ کہاں جاتی تھی۔ حد یہ کہ شہزاد کو بھی نہیں پتا تھا کہ وہ کہاں جاتی تھی اور عام طور سے ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹ آتی۔ اس دن وہ بڑے اہتمام سے تیار ہو کر جاتی تھی۔ اچھی طرح نہادھو کر اور تھوڑا میک اپ کر کے وہ اپنا کوئی اچھا جوڑا نکال کر پہنتی تھی اور اوپر سے ایک کالی چادر لے لیتی۔ اگر شہزاد گھر پر ہوتا تب بھی اسے ساتھ لے کر نہیں جاتی۔ اس نے اسکول آئے جانے کے لیے ایک ٹیکسی والا مخصوص کر رکھا تھا وہ اسے بلا لیتی۔ وہی لے کر جاتا اور پھر چھوڑ کر بھی جاتا تھا۔

اس طرح کتابوں کا معاملہ تھا۔ وہ جو کتابیں پڑھتی انہیں سب سے چھپاتی تھی۔ وہ اسکول سے آتے ہوئے کتابیں لاتی تھی اور تب بھی یہ کتابیں اس طرح پیک ہوتی تھیں کہ کسی کو نظر نہیں آتی تھیں۔ وہ انہیں لے جا کر سیدھا اپنی مخصوص الماری میں بند کر دیتی۔ اسکول سے آکر کھانے کے بعد وہ ماسی سے اپنا کمرہ صاف کراتی اور پھر کمرے میں بند ہو جاتی۔ اس کے بعد وہ شام چھ بجے سے پہلے کمرے سے باہر نہیں آتی تھی۔ چاہے اس دوران میں لائٹ بھی چلی جائے۔ اگر چہ گھر میں یو پی ایس تھا لیکن وہ اسے ہی نہیں چلاتا تھا۔ عام اوقات میں لائٹ جانے اور اسے ہی بند ہوتے ہی وہ باہر آ جاتی تھی لیکن دوپہر سے شام چھ بجے تک اور رات نو بجے کے بعد کچھ بھی ہو جائے وہ باہر نہیں آتی تھی۔ ایک بار لائٹ لمبی گئی اور یو پی ایس بھی چند گھنٹوں کے بعد بند ہو گیا لیکن وہ باہر نہیں آئی تھی۔

جب تک میری طبیعت دوبارہ خراب نہیں ہوئی تھی مجھے ساس کی پراسرار سرگرمیوں کے بارے میں تجسس لاحق رہا تھا لیکن دورہ پڑنے کے بعد مجھے اپنی فکر لگ گئی۔ جب میں بالکل ٹھیک ہو چکی تھی تب مرض دوبارہ نمودار ہوا۔ میں دوا تو پہلے بھی کھا رہی تھی لیکن ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا ہوتا تھا۔ اب ہر مہینے اسے چیک کرانے کے لیے جانا پڑتا تو ساس کو شک ہو سکتا تھا۔ اس کا حل میں نے یہ سوچا کہ جب امی کے گھر جانا ہوتا تو وہاں سے ڈاکٹر کو دکھانے چلی جاتی۔ دورہ پڑنے کے بعد میری طبیعت سنبھلی نہیں تھی بلکہ مستقل گری گری رہنے لگی تھی۔ اکثر سر چکراتا اور دماغ سن ہونے والی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ میں نے ایک مہینے بعد جا کر

ڈاکٹر کو دکھایا تو وہ فکر مند ہو گیا تھا۔ اس نے دوبارہ مشینوں سے دماغ کا معائنہ کیا۔

”راحیلہ آپ کے دماغ کی کھٹکی بڑھ رہی ہے جب کہ دواؤں کے استعمال سے اسے کم ہونا چاہیے۔“

”اگر دواؤں کے استعمال سے اسے کم ہونا چاہیے تو یہ آپ کی غلطی ہے۔“ شہزاد نے تیز لہجے میں کہا۔

”میں اب سے نہیں گزشتہ سولہ سترہ سال سے راحیلہ کا علاج کر رہا ہوں۔ لیکن اگر آپ مجھ سے مطمئن نہیں ہیں تو کسی دوسرے نیورولوجسٹ کو دکھائیں۔“

”شاید مجھے ایسا ہی کرنا پڑے۔“ شہزاد نے کہا۔

دوسرے ڈاکٹر نے بھی وہی دوائیں تجویز کیں۔ شہزاد نے اس سے آپریشن کی بات کی لیکن ڈاکٹر نے بتایا کہ اول تو یہ کیفر والی کھٹکی نہیں ہے ہاں جب ایک مخصوص سائز سے بڑی ہو جائے تو دورے پڑتے ہیں دوسرے یہ دماغ میں ایسی جگہ بھی جس کا آپریشن ممکن نہیں تھا۔ اسے صرف دواؤں سے حل کیا جاسکتا تھا۔ دوسرے ڈاکٹر نے خبردار کیا کہ اگر کھٹکی ایک سائز سے بڑھ گئی تو یہ میری جان کے لیے خطرہ بن سکتی تھی۔ اس صورت میں پڑنے والا دورہ میری جان لے سکتا تھا۔ میں اور شہزاد یہ سن کر پریشان ہو گئے تھے۔ جب ہم گھر آئے تو رات سونے سے پہلے شہزاد نے مجھ سے کہا۔ ”ان دنوں میں باہر جانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن یہ چکر سامنے آ گیا۔“

میرا دم خشک ہو گیا۔ ”باہر مگر کیوں؟“

”بی ایچ ڈی مکمل کرنے کے لیے... دراصل یہاں ہولتیس نہیں ہیں اور نہ لیب اچھی ہے۔ ایک جرمن یونیورسٹی سے بات چل رہی ہے شاید وہ مجھے اسکا لرشپ دے دے۔“

”آپ مجھے یہاں چھوڑ جائیں گے؟“

”نہیں، میں تمہیں بھی لے جاؤں گا، میں تو تمہارے

مرض کی طرف سے پریشان ہوں۔“

میں مطمئن ہو گئی۔ ”یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے باہر تو اس

کا زیادہ اچھا علاج ہو جائے گا۔“

”ہاں لیکن پریشانی تو ہے۔“

میں دورہ پڑنے کے بعد بہت پریشان تھی۔ مجھے

بیماری سے زیادہ اس بات کی فکر لاحق تھی کہ یہ بات میری

ساس کے علم میں نہ آنے پائے۔ اب شہزاد نے باہر جانے کا

بتایا تو میں خوش ہو گئی تھی، ایک تو مجھے راز افشا ہونے کے

خوف سے نجات مل جاتی دوسرے اس گھنے ماحول سے بھی

نکل جاتی جہاں بعض اوقات سانس لینا بھی مشکل لگتا تھا۔ مجھے یہاں آئے ایک سال ہو گیا تھا اور مجھے حیرت ہوتی تھی کہ میں نے یہ ایک سال کیسے گزار لیا۔ جب کہ دو مہینے سے میں بہت تکلیف میں بھی تھی۔ دوسرے ڈاکٹر کے علاج سے بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا۔ ہاں اس دوران میں یہ خوشخبری مل گئی کہ شہزاد کو اسکا لرشپ مل گیا تھا اور انہوں نے میرے اور اپنے ویزے کے لیے اپلائی کر دیا تھا۔ ماں کو اس نے صرف اتنا بتایا تھا کہ اسے بی ایچ ڈی کے لیے جرمنی جانا ہے۔ اس وقت وہ بھی کہ صرف شہزاد جا رہا ہے۔

شاید پڑھنے والوں کو عجیب لگے کہ میں نفیسہ بیگم کا ذکر اس طرح کیوں کر رہی ہوں، اسے نفیسہ بیگم یا شہزاد کی ماں کیوں لکھ رہی ہوں، جب کہ میرا تعلق ایک تعلیم یافتہ اور مہذب خاندان سے ہے۔ اس کی وجہ آگے آپ کے سامنے آجائے گی۔ ساس ایک قابل احترام رشتے کا نام ہے اگرچہ اس سے ہمارے ہاں بڑا منفی تاثر لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ عورت ساس کہلانے کی مستحق نہیں تھی۔ ایک مہینے بعد ویزے لگ کر آ گئے۔ میرا پاسپورٹ میری شادی سے پہلے ابونے ہی بنا دیا تھا۔ اب نفیسہ بیگم کو پتا چلا کہ میں بھی شہزاد کے ساتھ جا رہی ہوں۔ یہ خبر اس نے کھانے کی میز پر سنی۔ ہم تینوں اکثر کھانے کی میز پر ہی جمع ہوتے تھے۔ وہ اچھل پڑی تھی۔ ”راحیلہ بھی جا رہی ہے، وہ کیوں؟“

شہزاد نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔ ”راحیلہ میری بیوی ہے اس لیے جائے گی۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے تم پڑھنے جا رہے ہو بیوی کا

وہاں کیا کام؟“ وہ ہلکا کر بولی۔

”تب میرا یہاں کیا کام ہے شہزاد یہاں بھی پڑھ رہے

ہیں۔“ میں نے کہا تو اس نے قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھا۔

”بکواس بند کرو... یہ ساری بچی تمہاری پڑھائی ہوئی ہے۔“

”امی کیا ہو گیا ہے آپ کو۔“ شہزاد نے کاٹا رکھ

دیا۔ ”راحیلہ میری بیوی ہے اور اسے میرے ساتھ رہنا چاہیے ورنہ

شادی کرنے کا فائدہ اگر بیوی آدمی کے ساتھ نہ رہے۔“

”تمہیں میرا خیال نہیں ہے یہاں میں اکیلی رہوں گی؟“

”امی آپ ابو کے بعد اکیلی رہی ہیں اور راحیلہ کے

آنے سے پہلے بھی اکیلی ہی رہ رہی تھیں۔“ شہزاد نے اسے

یاد دلایا۔

وہ کچھ دیر زہریلی نظروں سے شہزاد کو دیکھتی رہی پھر

بولی۔ ”میں دیکھ رہی ہوں اس عورت نے تمہیں بہت بدل

ماہنامہ سرگزشت

کپڑے کی گڑبڑوں پر مبنی۔ یہ گڑیاں باریک دھاگوں سے کیلوں سے لٹکی تھیں۔ گڑیاں کپڑے، روئی اور سوئی دھاگے کی مدد سے بنائی گئی تھیں۔ جیسی کہ پہلے لڑکیاں بناتی تھیں اور اب اس کا رواج نہیں رہا ہے کیونکہ بازار میں بنی بنائی مل جاتی ہیں۔ میں نے پاس جا کر دیکھا۔ یہ تین گڑیاں تھیں۔ سب سے اوپر والی گڑیا کو کمر سے دھاگا باندھ کر لٹکایا تھا۔ اس کا ایک پاؤں ایک گڑیا کے سر پر تھا اور دوسرا پاؤں دوسری گڑیا کے سر پر۔ دائیں طرف والی گڑیا یہ ظاہر گمراہی کیونکہ اس کے نقوش میں مونچھیں بھی شامل تھیں اور سر کے بال چھوٹے تھے۔ جبکہ بائیں اور اوپر والی گڑیاں تھیں۔ ان کے سروں پر لمبے بال تھے۔ خاص بات یہ تھی کہ نیچے والوں میں گڈا ہاتھ کے بل لٹکا ہوا تھا جبکہ گڑیا سر کے بالوں کی مدد سے لٹکی ہوئی تھی۔

میں نے نیچے والی گڑیا کو ہاتھ میں لیا تو کوئی چیز میرے ہاتھ میں چبھی۔ یہ ایک چھوٹی سے سوئی تھی جو اس گڑیا کے سر میں گڑی ہوئی تھی۔ میرے روٹنے کھڑے ہونے لگے۔ کالے جادو اور اس کے طریقوں کے بارے میں مجھے بہت کچھ پتا تھا۔ اس میں کسی انسان کا پتلا یا گڑیا بنا کر اس میں کالے عمل والی سوئی گاڑ کر اس انسان کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ میں نے بھی دیکھا نہیں لیکن سنا ہے کہ اس سے انسان مر بھی جاتا ہے۔ مجھے شک ہوا کہ اس عورت نے مجھ پر کوئی عمل کیا تھا اور اس وجہ سے میرے سر میں اتنا خوف ناک درد ہوا پھر اس سے مزید شک پیدا ہوا کہ میری بیماری کے دوبارہ ہونے کے پیچھے بھی اسی کا ہاتھ ہے۔ اس کا مقصد واضح تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو اپنے قابو میں رکھنا چاہ رہی تھی اور شہزاد مجھ سے محبت کرتا تھا۔ اس لیے پہلے اس نے مجھے بیمار کرنا چاہا اور جب دیکھا کہ میں اس کے چنگل سے نکل کر جا رہی ہوں تو اس نے مجھے مارنے کی کوشش کی۔

ذرا غور پر مجھے معلوم ہوا کہ تینوں گڑیوں کے سر پر اصلی بال تھے۔ میرے اور نفیسہ بیگم کے بال لائٹ براؤن تھے جبکہ شہزاد کے بال سرخی مائل سیاہ تھے۔ نیچے والی گڑیا کے سر پر میرے بال تھے جس کے سر میں سوئی لگی تھی۔ گڈے کی گردن میں چھوٹی سی سوئی لگی تھی۔ اوپر والی گڑیا خود نفیسہ بیگم کی تھی۔ اس میں کوئی سوئی نہیں تھی۔ اس کے دونوں پاؤں ہمارے سروں پر اس کا غلبہ ظاہر کر رہے تھے۔ لیکن اس کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے میں اس کے کالے جادو کے وار سے بچ

گئی تھی اور مجھے اس کی حقیقت کا بھی پتا چل گیا تھا۔ اس کمرے میں داخل ہونے کے بعد میں مستقل درود شریف کا ورد کر رہی تھی۔ جب میں گڑیاں واپس دیوار سے لگا رہی تھی تو بے دھیانی میں ورد رک گیا اور فوراً کمرے میں ایسی آواز گونجی جیسے کوئی الو اپنی کرخت اور ڈراؤنی آواز میں چلایا ہو۔ میں اچھل پڑی اور پھر بے تحاشا کمرے سے باہر کی طرف بھاگی۔ باہر آ کر میں نے چابی گھما کر لاک لگا یا اور چابی اسی دراز میں ڈالی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ نفیسہ بیگم بے دھیانی میں دروازہ پورا بند نہیں کر سکی تھی اندر سے اس نے لاک ہونے والی تاب دہادی تھی۔ میں نے دروازہ کھینچ کر اسے لاک کر دیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ نفیسہ بیگم نے جادو گری کا پورا سیٹ اپ لگا رکھا تھا اور اس کمرے میں بیٹھ کر نہ جانے کیا کیا عمل کرتی رہی تھی۔

جب تک میں نفیسہ بیگم کے اس خفیہ کمرے میں رہی مجھے یہی دھڑکا لگا رہا کہ ابھی وہ آجائے گی اور مجھے رینگے ہاتھوں پکڑ لے گی اور اس کے بعد میری خیر نہیں ہوگی۔ حالانکہ جسمانی لحاظ سے میں اس سے برتر تھی۔ وہ بوڑھی اور کمزور عورت تھی لیکن اس کے خفیہ روپ کی دہشت نے اسے برتر کر دیا تھا۔ اگر وہ سامنے آ جاتی تو میں صرف خوف سے ہی بے دم ہو جاتی۔ شکر ہے وہ نہیں آئی تھی۔ میں اس کے ایک وار سے بچ گئی تھی لیکن وہ میرے لیے مزید کوئی خطرناک چیز لینے گئی تھی۔ یہ سب دیکھ لینے کے باوجود مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک اتنی بڑھی لکھی اور اچھے طبقے سے تعلق رکھنے والی عورت جہالت کی ان گہرائیوں میں اتری ہوئی تھی جس کا تصور صرف غریب اور مخصوص ذہنیت کے لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ ان سے زیادہ خطرناک تھی کیونکہ وہ اپنے ظاہر سے ایسی نہیں لگتی تھی۔

اپنے کمرے میں آ کر میں کتنی دیر بے دم پڑی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورت حال میں کیا کروں۔ اگر میں شہزاد کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنے گھر چلی جاتی تب بھی نہیں بچ سکتی تھی۔ اس واقعے سے پہلے میں نے بھی سوچا نہیں تھا کہ کالے جادو کی کوئی حقیقت ہونی ہے لیکن کچھ دیر پہلے میں خود بھگت چکی تھی۔ میں شہزاد کو اس بارے میں بتانا چاہتی تھی لیکن کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں شہزاد کو نہیں بتاؤں گی۔ وہ اپنی ماں کے بارے میں یقین نہ کرتا کہ وہ مجھے قتل کرنا چاہتی ہے۔ نفیسہ بیگم کے لیے مجھے جھٹلانا نہایت آسان تھا۔ اس کے بعد میرے اور شہزاد

کے تعلق میں دراڑ آ جاتی۔ اس کے بجائے مجھے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ وہی مجھے بچانے والا تھا۔ بے شک نفیسہ بیگم کالے جادو کی ماہر تھی لیکن اللہ نے مجھے بھی عقل دی تھی میں اسے استعمال کر کے اس سے بچ سکتی تھی۔

میں نے اٹھ کر وضو کیا اور دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ سے اپنے اور اپنے گھر کی حفاظت کے لیے دعا مانگی۔ ایک بار ابونے مجھے بتایا تھا کہ اگر انسان فرائض پورے کرے اور اللہ کی کھلی نافرمانی سے بچے تو وہ اس قسم کی چیزوں سے خود انسان کی حفاظت کرتا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں ہمہ وقت با وضو رہوں گی اور مجھے تجربہ ہو چکا تھا کہ درود شریف ایسی چیزوں کے خلاف کتنی بڑی ڈھال ہے۔ اس منحوس کمرے میں ایک لمحے کو میں غافل ہوئی اور وہاں وہ جیج سنائی دی تھی۔ میں مستقل درود پاک کا ورد کرنے لگی۔ نفیسہ بیگم کی گھنٹے بعد لوئی اس وقت میں کھانا بنا رہی تھی۔ اس نے آتے ہی کڑے تیوروں سے پوچھا۔

”کھانا نہیں بنایا ابھی تک....؟“

”میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے دیر ہو گئی ویسے آدھے گھنٹے میں بن جائے گا۔“

وہ مجھے گھورتی رہی پھر زہریلے لہجے میں بولی۔ ”فکر نہ کرو ایسا علاج کروں گی کہ تمہاری طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔“ وہ تنہائی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس نے حسب معمول چابی سے تالا کھولا تھا۔ اسے شک نہیں ہوا تھا کہ وہ دروازہ کھلا چھوڑ گئی تھی اور میں اس کے کمرے میں جا چکی تھی۔ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ آتے ہی مجھ پر وار نہ کرے۔ اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ میرے کمرے میں آ کر مجھے فرش پر پڑے دیکھ چکی تھی۔ ہم دونوں انجان بن کر ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے تھے۔ لیکن میرا مقصد اسے نقصان پہنچانا نہیں تھا اور وہ مجھے مارنے کے درپے تھی۔ میں صرف اپنا بچاؤ کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد شہزاد بھی آ گیا تھا اور میں نے محسوس کیا کہ اس نے مجھے صحیح سلامت دیکھ کر سکون کا سانس لیا تھا۔

”تم ٹھیک ہونا؟“

”ہاں مجھے کیا ہوتا ہے۔“ میں مسکرائی۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

یہ حقیقت تھی گزشتہ دو مہینے کے دوران میں نے خود کو ذہنی لحاظ سے اتنا اچھا محسوس نہیں کیا تھا جتنا اس وقت کر رہی

گر قبول افتد

ایجابات کی افادیت ضرورت اور افیت کے مابین عجیب و غریب واقعات کو جنم دیتی ایک پر فکر داستان۔ محی الدین نواب کا شاہکار

جراغ رفتہ

داراشکوہ..... ایکٹ دگا کر دار..... فتح اور شکست کے نشیب و فراز، رشتوں کی آزمائش پر مشتمل تاریخی صفحات۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی کاوش

معصومہ

پسندیدہ قلم کار اسما قادری کی سپنس کے لیے ایک نایاب تحریر

مسافر

کہیں پہاڑوں کی سختی، کہیں کھیتوں کی ہریالی..... بدلتے موسم کی روداد۔ ناصر ملک کے خیالات کی روانی

کاشف زبیر تنویر ریاض سلیم انور منظر امام
ضیاء نسیم بلگرامی ڈاکٹر شہینہ اسد کی دلچسپ کہانیاں

مئی 2013ء..... موسم گرما کا خوبصورت شمارہ

مزید
مرزا امجد بیگ کے ملائ
آپ کے خطوط
اور محفل شعر و سخن

254

مئی 2013ء

255

ماہنامہ سرگزشت

مئی 2013ء

254

ماہنامہ سرگزشت

WWW.PAKSOCIETY.COM

آج کا جرم

مکرمی معراج رسول..... آداب!

ایک سوچ بیانی ارسال کر رہا ہوں۔ یہ مجھ بیٹی ہے۔ اس پوری کہانی کا ایک پاورفل کردار میں بھی ہوں۔ یہ صرف کہانی نہیں، سوچ کے در کھولنے والی آپ بیٹی ہے۔ اسے سرگزشت کے صفحات کی زینت ضرور بنائیں تاکہ نئی راہ پر چل پڑے معاشرے کو کچھ لگام لگے۔

ارسلان حمید
(کراچی)

میرے موبائل پر ایک اجنبی نمبر آ رہا تھا۔
میں عام طور پر اجنبی نمبرز کو انڈیٹ نہیں کرتا۔ اسی لیے
میں نے اس کال کو بھی نظر انداز کر دیا۔ لیکن وہ نمبر میرے
حافظہ میں محفوظ رہا تھا۔

دوسرے دن پھر اسی نمبر سے کال آئی۔ میں نے اس
بار یہ سوچ کر انڈیٹ کر لیا کہ شاید یہ میرے کسی جانتے والے
کی کال ہو۔ دوسری طرف سے کسی لڑکی کی آواز تھی۔ بہت
دل کش اور بہت مہذب۔ ”آپ ارسلان حمید صاحب بول



اور میں نفیسہ بیگم کو لے کر نزدیکی اسپتال کی طرف روانہ ہوئے جہاں ڈاکٹر نے تصدیق کی کہ دل کے صدمہ دورے نے اس کی جان لے لی تھی۔ جب ہم لاش سے کرواپس آئے تو شہزاد اور رہا تھا۔ وہ بہر حال اس کی ماں تھی۔ میں نے سب سے پہلے اندر والا کمرالاک کر کے چابی اپنے پاس رکھ لی تاکہ میت میں آنے والا کوئی فرد اس کمرے کو نہ دیکھ سکے۔

اگلے روز جب تدفین کے بعد رات تک سب لوگ چلے گئے تھے تو میں اور شہزاد اس کمرے میں آئے۔ میں نے شہزاد سے کہا۔ ”نہ جانے یہ کیا چیزیں ہیں اور ان پر کیا اثر کیے گئے ہیں بہتر ہوگا انہیں سمندر میں پھینک دیا جائے۔ میں نے سنا ہے کہ سمندر میں ان کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔“ شہزاد نے میری بات مان لی اور اگلی رات ہم نے یہ سب چیزیں لے جا کر سمندر میں پھینک دیں۔ ان میں وہ سیکڑوں کتابیں بھی تھیں جو جادوگری اور کالے علم پر تھیں۔ صرف شہزاد کی خاطر میں نے نفیسہ بیگم کے لیے سپارے پڑھے ورنہ مجھے یقین ہے اس قسم کے کالے عمل کرتے ہوئے مرنے والا ایمان کی حالت میں نہیں رہتا ہے۔ نفیسہ بیگم نے کالے جادو کا عمل کر کے مجھے مارنے کی کوشش کی لیکن خود اپنے عمل کا شکار ہو گئی۔ میں نے صرف اتنا کیا تھا کہ اوپر والی گڑیا کو نیچے کر دیا اور اس کے سر میں وہ سوئی لگا دی جو نیچے والی گڑیا کے سر میں لگی تھی اور نیچے والی گڑیا کو اوپر کر دیا۔ جب نفیسہ بیگم نے نیچے والی گڑیا کے سینے میں سوئی گھونپی تھی تو وہ دراصل اپنی گڑیا کے سینے میں سوئی گھونپی تھی اور اس کا کیا ہو گا! اتنا خطرناک تھا کہ اس نے ایک لمحے میں اس کی اپنی جان لے لی اور اسے اتنا موقع بھی نہیں ملا کہ سوئی واپس نکال سکتی۔

آج کئی سال بعد میں جرمنی میں شہزاد اور اپنے دو بچوں کے ساتھ خوش ہوں۔ حیرت انگیز بات ہے جرمنی آنے کے بعد شہزاد نے میرا چیک اپ کرایا تو کئی سرے سے غائب تھی اور اس کے بعد نہ مجھے دورہ پڑا اور نہ تکلیف ہوئی۔ اس کا مطلب تھا کہ دوبارہ ہونے والا مرض اصل میں کالے عمل کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ختم ہونے والی ہو گئی تو عمل بھی ختم ہو گیا اور میں بالکل ٹھیک ہو گئی۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں بے شک اس کی ذات ہے جو انسان کو ہر بری چیز سے بچاتی ہے۔

تھی۔ یہ مقدس آیات اور درود شریف کی برکت تھی۔ ”کھانا نکالو! آج آپ جلدی آگئے؟“

”ہاں خوشخبری ہے آٹھ دن بعد کی سیٹ مل گئی ہیں۔ آج سے آٹھ دن بعد ہم فلائی کر جائیں گے۔“

شہزاد کے لہجے سے مجھے لگا جیسے وہ بھی گھر سے دور جانے کے خیال سے خوش تھا۔ میں نے آہستہ سے پوچھا۔ ”اور آپ کی امی؟“

”امی شروع سے اکیلی رہنے کی شوقین ہیں، جب میں چھوٹا سا تھا تب بھی ان کی یہی روشن تھی۔ چوبیس گھنٹے میں سے مشکل سے چند گھنٹے مجھے ملتے تھے۔“

نفیسہ بیگم باہر آئیں اور ہم نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران ہی شہزاد نے اسے بتا دیا کہ آٹھ دن بعد ہم جا رہے ہیں۔

”مہینوں میں کی گئی ہے۔“ وہ بگڑے لہجے میں بولی۔

”امی میں کون سا ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ جیسے ہی پی ایچ ڈی مکمل ہوگی میں لوٹ آؤں گا۔“

نفیسہ بیگم کی آنکھوں میں خطرناک چمک نمودار ہوئی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں..... مجھے لگ رہا ہے اگر تم اس طرح چلے گئے تو پھر پلٹ کر نہیں آؤ گے۔“

میں حیران رہ گئی۔ خود میرے ذہن میں شہزاد کے حوالے سے یہی بات آئی تھی۔ کھانے کے بعد نفیسہ بیگم خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ یہ آخری موقع تھا جب ہم نے اسے زندہ دیکھا کیونکہ کوئی آدمی گھنٹے بعد اس کے کمرے سے اس کی خوفناک چیخ سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ شہزاد پریشان ہو کر باہر آیا اور اس کے کمرے کا دروازہ پیٹنے لگا جو ظاہر ہے اندر سے بند تھا۔ بڑی مشکل سے شہزاد نے ایک تھوڑے کی مدد سے دروازے کا

لاک توڑا اور دم اندر گھسے۔ نفیسہ بیگم اپنے خفیہ کمرے میں دیوار پر لگی گڑیوں کے عین سامنے قالین پر ڈھیر تھی اس کا ہاتھ اپنے دل پر تھا اور چہرے پر کرب کے تاثرات تھے۔ شہزاد نے جلدی سے اس کی نبض دیکھی اور پھر دل کی دھڑکن چیک کی لیکن دونوں ساکت تھیں۔ وہ مر چکی تھی۔

میں نے دیکھا کہ دیوار پر لگی گڑیوں میں سے نیچے والی گڑیا کے سینے میں عین دل والی جگہ پر سوئی پیوست تھی۔ میں نے دیکھنے کے بہانے ان گڑیوں کو اٹھا لیا تاکہ شہزاد دیکھ نہ سکے کہ کس گڑیا کے سینے میں سوئی پیوست تھی۔ ابھی کسی اور طرف توجہ دینے کا وقت نہیں تھا۔ شہزاد

ہے ہیں نا۔“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں“ میں ارسلان حیدر ہی ہوں، لیکن آپ کون ہیں۔“

”میں عالیہ ممتاز ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”آپ شاید مجھے نہ جانتے ہوں لیکن میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”جی فرمائیں عالیہ صاحبہ“ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔“ میں نے پوچھا۔

”مجھے آپ سے ملنا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔“

”کیوں خیریت۔“

”میں یہ سب فون پر نہیں بتا سکتی۔“ اس نے کہا۔ ”کیا آپ کے لیے اتنا اطمینان کافی نہیں ہے کہ میں آپ کو جانتی ہوں۔“

”معاف کیجئے گا عالیہ صاحبہ“ میرے لیے یہ اطمینان کافی نہیں ہے۔ کیونکہ میں آپ کو نہیں جانتا ہوں۔“

”آپ جب مجھ سے ملیں گے تو مجھے پہچان جائیں گے۔“ اس نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

”تو ٹھیک ہے۔ کب اور کہاں ملنا چاہتی ہیں؟“

”جہاں آپ کہیں۔ یقین کریں، میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ صرف دس منٹ۔ لیکن آپ کو کارساز روڈ پر آنا ہوگا۔ وہاں ایک جوس کارز ہے، شاید آپ نے دیکھا ہو۔“

”ہاں“ میں نے دیکھا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تو کب حاضر ہو جاؤں۔“

”کل شام پانچ بجے، میں آپ کا انتظار کروں گی۔“

”لیکن میں آپ کو کیسے پہچانوں گا۔“ میں نے پوچھا۔

”آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میں آپ کو پہچانتی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”میں خود ہی آپ سے مل لوں گی۔“

میں نے یہ سوچا تھا کہ میں دوسرے دن اس لڑکی سے ملنے ضرور جاؤں گا۔ اس کی آواز بہت اچھی لگی تھی اور اس کے لہجے میں بھی شائستگی تھی۔ پڑھی لکھی معلوم ہوتی تھی۔

نہ جانے اسے مجھ سے کیا کام پڑ گیا تھا۔ وہ مجھے کیسے جانتی تھی۔ یہ سب اب اس سے مل کر ہی معلوم ہو سکتا تھا۔

لیکن ہوا یہ کہ میں دوسرے دن اس سے ملنے نہیں جا سکا۔ ایسی بے ٹکی مصروفیت نکل آئی کہ یہ دھیان بھی نہیں رہا کہ میں نے کسی سے ملنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔

تیسرے دن پھر اس کا فون آ گیا۔ ”ارسلان صاحب، آپ نے تو خوب انتظار کروایا۔“ اس کے لہجے میں شکایت تھی۔

”اوہ مجھے بہت افسوس ہے۔ آپ یقین کریں کہ مجھے ذرا سادھیان بھی نہیں رہا تھا۔ ایک ایسا کام سر پر آ گیا تھا کہ اس کو نال نہیں سکتا تھا۔ آپ تو جانتی ہیں کہ کاروباری انجینئر کیا ہوتی ہیں۔“

”ہاں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس لیے میں نے کوئی خیال نہیں کیا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”بہر حال اگر ممکن ہو تو کل آ جائیں۔“

”اب آپ شرمندہ نہ کریں۔ میں آج ہی آ رہا ہوں۔“

اس دن میں دفتر سے ساڑھے چار بجے ہی اٹھ گیا۔ ورنہ چھ سات بجے تک بیٹھا رہتا ہوں۔ ڈرائیور کو میں نے اپنے ساتھ نہیں لیا تھا۔ بلکہ خود ہی گاڑی چلاتا ہوا جوس کارز تک پہنچ گیا۔

پانچ بجتے ہی والے تھے۔ میں اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اچانک دو آدمی میری کھڑکی کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت کھڑکی کا شیشہ کھلا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے کہا۔ ”بس اب چپ چاپ گاڑی سے اترو اور سامنے والی کار میں بیٹھ جاؤ۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”مطلب یہ ہے۔“ دوسرے نے اپنے پستول کی جھلک دکھلا دی۔ ”زیادہ ہوشیاری کی تو یہیں پر مار کر ہم نکل جائیں گے۔“

”دیکھو بھائی تم دونوں شاید کسی اور کے دھوکے میں ایسا کر رہے ہو۔“

”نہیں ارسلان صاحب، یہ ہم آپ ہی کے لیے کر رہے ہیں۔ اور ہم ہی نے تمہیں فون کر کے یہاں بلایا ہے۔ بس اب دیر نہیں، جلدی کرو۔“

میرے پاس ان کی بات ماننے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں نے اپنی گاڑی یوں ہی چھوڑی اور اس گاڑی میں بیٹھ گیا، جس کے شیشے بالکل کالے ہو رہے تھے۔

اس میں ایک ڈرائیور بھی موجود تھا۔ یعنی وہ تین آدمی تھے جنہوں نے مجھے اغوا کیا تھا۔ میرے بیٹھے ہی گاڑی چل پڑی۔ میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ میں جانتا تھا کہ یہ لوگ میری کسی بات کا جواب نہیں دیں گے۔

مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کیسے لوگ تھے جنہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ راستے میں کئی جگہ پولیس کی چیکنگ ہو رہی تھی۔ بے چارے ڈبل سواری والے پکڑے جا رہے تھے۔ لیکن مجال ہے جو اس گاڑی کو رککنے کا اشارہ بھی کیا گیا ہو۔

بہر حال ہم کارساز سے شاہراہ فیصل پر آ گئے۔ اس کے بعد گاڑی پھر آگے جانے لگی۔ لائڈھی اور لیبر وغیرہ کا علاقہ بھی پیچھے رہ گیا اور یہاں میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ نہ تو میں نے کچھ پوچھا تھا اور نہ ہی انہوں نے کچھ بتایا تھا۔

حیرت ہو رہی تھی کہ انہوں نے مجھے ٹریپ کرنے کے لیے کسی لڑکی کا سہارا لیا تھا۔ وہ خوبصورت آواز اور اچھی گفتگو کرنے والی لڑکی ان کی ساتھی ہی ہو سکتی تھی لیکن خدایا، یہ کیسے لوگ تھے۔ مجھ سے کیا چاہتے تھے؟ میری تو کسی سے ایسی دشمنی بھی نہیں تھی کہ مجھے اغوا کرنے کا منصوبہ بنالیتا۔

تقریباً آدھا گھنٹا چلنے کے بعد گاڑی روک کر مجھے اتار دیا گیا۔ یہاں میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ یہ ایک بہت بڑا احاطہ تھا۔ ہر طرف مرغیوں کی بو پھیلی ہوئی تھی جو یہ ظاہر کر رہی تھی کہ یہ ایک مرغی خانہ ہو سکتا ہے۔

یہاں دو آدمی پہلے سے موجود تھے اور ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ ایک نوجوان، خوبصورت اسارٹ سی لڑکی۔ وہ سب مسکرا مسکرا کر میری طرف دیکھے جا رہے تھے۔

”چلو آگے۔“ ایک نے مجھے دھکا دیا۔ ”سامنے والے کمرے میں۔“

”لیکن کیوں۔“ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ میں نے غصے سے پوچھا۔

”تمہاری پوجا کرنے۔“ گاڑی چلانے والے نے کہا تھا۔

اس پر وہ سب زور سے ہنس پڑے۔ ان میں وہ لڑکی بھی شامل تھی۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ اگر وہ مسک نہیں ہوتے تو شاید میں ان سے بھڑ جاتا لیکن اس وقت سوائے چپ رہنے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

مجھے ایک کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں ایک چارپائی تھی۔ دو کرسیاں تھیں۔ بس اس کے علاوہ وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا۔

”کم از کم یہ تو بتا دو کہ تم لوگ مجھے کیوں اٹھا کر لائے

ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”مسٹر ارسلان، تمہاری یہ الجھن میں دور کر دیتی ہوں۔“ لڑکی نے کہا۔ اس کی آواز سن کر چتا چل گیا کہ یہ وہی لڑکی تھی۔ ”ہم تمہیں تاوان کے لیے اغوا کر کے لائے ہیں۔ صرف پانچ لاکھ روپے۔ پھر ہم تمہیں آزاد کر دیں گے۔“

”لیکن میں تو ایک عام سا انسان ہوں۔ میرے پاس پانچ لاکھ روپے کہاں سے آئے۔“

”بکواس نہیں کرو۔“ ایک آدمی نے مجھے جھڑک دیا۔ ”تم ایک بزنس مین ہو۔ تمہارے بینک میں ہر وقت پچاس پچاس لاکھ پڑے ہوتے ہیں۔ ہم تو صرف پانچ لاکھ مانگ رہے ہیں۔ پانچ لاکھ دے کر اپنی جان چھڑالو۔“

”خدا کے بندو! یہ تو سوچو اس وقت مغرب ہو چکی ہے، کون سا بینک کھلا ہوگا، کل سنڈے ہے۔ کل بھی بینک بند رہیں گے۔“

”تو کیا ہوا۔ پرسوں سہی۔ ہم پرسوں تک انتظار کر لیں گے۔“

”کیوں نہ اس کے گھر والوں سے رابطہ کیا جائے۔“ ایک نے کہا۔

”کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”گھر میں دس بارہ ہزار سے زیادہ ہم نہیں رکھتے۔ میں پرسوں صبح تک بندوبست کروادوں گا۔“

اس بات میں زیادہ صداقت نہیں تھی۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ میری بیوی غزل کو پتا نہ چلے کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ ورنہ وہ رورو کر آسمان سر پر اٹھا لیتی۔ وہ مجھ سے اتنی ہی محبت کرتی تھی۔

”تمہاری جیب میں اس وقت کیا ہے۔“ لڑکی نے پوچھا۔

”کچھ ضروری کاغذات۔ لائسنس، اور سات آٹھ ہزار روپے ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”ہاں“ میرا موبائل بھی ہے۔“

”لاؤ“ وہ سب ہمارے حوالے کر دو۔“ لڑکی نے کہا۔ ”سات آٹھ ہزار روپوں میں پرسوں تک تمہارے کھانے پینے کا بندوبست کیا جائے گا۔ ہم تم کو یہاں فری میں تو نہیں رکھ سکتے۔“

کیسی لڑکی تھی اور کتنے اطمینان سے یہ سب کہہ رہی تھی۔ اور کس طرح ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔

”تم چاہو تو اپنے گھروں کر کے پرسوں تک کے لیے انہیں اطمینان دلا سکتے ہو۔“

”مجھے دونوں کرنے ہوں گے۔“

”کیوں، دونوں کیوں؟“

”اس لیے کہ میری گاڑی کارساز روڈ پر کھڑی ہوئی ہے۔ میں اپنے منبر سے کہوں گا کہ وہ گاڑی اٹھا کر میرے گھر پہنچا دے۔“

”لیکن تم کوئی اشارہ وغیرہ نہیں دو گے۔“

”کیا کروں گا اشارہ دے کر۔ میں تو جانتا ہی نہیں کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ اور تم لوگ مجھے کہاں لے آئے ہو۔“

میں نے اپنی جیب سے ساری چیزیں نکال کر ان کے سامنے رکھ دیں۔ اور موبائل پر پہلے غزل سے رابطہ کر کے اسے اطمینان دلایا کہ میں خیریت سے ہوں۔ اور کسی ضرورت کام سے اسلام آباد آ گیا ہوں۔ میری واپسی پرسوں تک ہوگی۔ پھر میں نے اپنے منبر سے فون کر کے اس سے کہا کہ وہ گاڑی کارساز سے اٹھوالے۔

اب میں مطمئن ہو گیا تھا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر منبر کو فون کیا تھا۔ وہ ایک ذہین آدمی تھا۔ معاملے کی تہ تک پہنچنا اس کے لیے مشکل نہیں تھا۔

اول تو اس طرح گاڑی کالا وارث چھوڑ جانا پھر یہ کہ میرے موبائل اور اس کے موبائل میں ٹریکر لگے ہوئے تھے۔ جو یہ بتا دیتے تھے کہ رابطہ کہاں سے کیا جا رہا ہے۔ وہ یقیناً کھٹک گیا ہوگا کہ ارسلان اپنی گاڑی کارساز پر کھڑی کر کے شہر سے باہر کیوں چلے گئے ہیں۔

اس کو مزید اشارہ دینے کے لیے مجھے ایک کھٹکے کے بعد اسے ایک اور فون کرنا تھا۔ کوئی بھی بہانہ بنا کر۔ میں نے دونوں کالز ان کے سامنے کی تھیں۔ اور کوئی ایسی اشارے والی بات نہیں کی تھی۔ اس لیے وہ سب مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔

”اب تمہیں پرسوں تک یہاں آرام کرنا ہے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”تمہارے لیے کھانے پینے کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ اور ہاں، یہاں سے بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سب کمرے سے باہر چلے گئے۔ اس وقت بھی مجھے اس لڑکی پر افسوس ہو رہا تھا۔ وہ اچھی خاصی پڑھی لکھی اور مہذب لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔ خدا جانے وہ کن چکروں میں پھنس گئی تھی۔

کچھ دیر بعد میرے لیے چائے آگئی۔ میرا خیال تھا

کہ اگر وہ لڑکی ایک بار تہا مل جائے تو میں اس سے بات کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس کی بجائے ایک آدمی چائے لے کر آیا تھا۔

میں نے اپنے انداز سے ایک گھٹنا گزارنے کے بعد دروازے پر دستک دینی شروع کر دی۔ ایک درشت مزاج شخص نے دروازہ کھولا تھا۔ ”کیا بات ہے۔ کیوں شور کر رہے ہو۔“

”مجھے اپنے منبر کو فون کر کے ایک ضروری ہدایت دینی ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”پہلے بھول گیا تھا۔“

”چالا کی کر رہے ہو۔“

”چالا کی کیسی۔ فون تمہارے سامنے کروں گا۔“ میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے موبائل لا کر میرے حوالے کر دیا تھا۔ وہ اکیلا نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ دو اور بھی تھے۔

میں نے اپنے منبر سے کہا۔ ”نسیم صاحب، آپ ایسا کریں میری گاڑی کو سر دستک کے لیے دے آئیں۔ تاکہ پرسوں تک اس کی حالت ٹھیک ہو جائے۔ شکر ہے۔“

اتنی سی بات کر کے میں نے موبائل آف کر کے ان کی طرف بڑھادیا۔ میرا کام ہو چکا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ لوگ چل چکے ہوں گے۔ اس فون نے ٹریکر کے ذریعے انہیں اور بھی بتا دیا ہوگا کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔ بس کچھ دیر کی بات تھی۔ اس کے بعد اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو جاتا۔

میں نے اس بار اندر سے دروازے کی کنڈی لگائی تھی۔ تاکہ وہ لوگ غصے میں میرے خلاف کوئی حرکت نہ کر سکیں۔ سب کچھ پلاننگ کے مطابق ہوا۔

آدھے گھنٹے بعد باہر سے دو چار گولیاں چلنے لگیں۔ آوازیں آئیں چیخیں، گالیاں، بھاگنے کی آوازیں۔ اس لڑکی کی چیخ و پکار۔ اور دروازے پر باہر سے دستک ہونے لگی۔

”سر، کیا آپ اندر ہیں؟“ یہ میرے منبر سے منبر کی آواز تھی۔

”ہاں بھئی۔“ میں نے دروازہ کھول دیا۔

وہ سب گرفتار ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک زخمی بھی تھا۔ اس کے بازو سے خون بہہ رہا تھا۔ پولیس نے ان سب کو پکڑ رکھا تھا۔ ان میں وہ لڑکی بھی تھی۔ اس نے بہت زخمی اور شکوہ کرنے والی نگاہوں سے میری طرف دیکھا تھا۔

مجھے ایک بار پھر اس پر افسوس ہونے لگا تھا۔ وہ شاید روری

تھی۔ میں نے اس کی طرف سے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

”نسیم! میں نے نسیم کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔“ تم نے بہت ذہانت سے کام لیا ہے۔“

”میں سر، آپ کا فون ملتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں نے اسی وقت پولیس سے رابطہ قائم کر لیا تھا۔“

”یہ لوگ نہ جانے کتنی وارداتیں کر چکے ہیں سر۔“ پولیس آفیسر نے بتایا۔ ”یہ لڑکی فون کر کے شکار کو پھانسی ہے پھر شکار کو یہاں لایا جاتا ہے اور تادان کی رقم وصول کر لی جاتی ہے۔“

”اب تو یہ لوگ جیل جائیں گے سرجی۔“ ایک کانٹیل نے کہا۔

”چلو آگے، پولیس والوں نے انہیں موبائل کی طرف دھکا دیا۔

جاتے جاتے اس لڑکی نے پھر ایک بار میری طرف دیکھا تھا۔ میری ہر چیز ان لوگوں سے پر آمد ہو چکی تھی۔ میں جب گھر پہنچا تو غزل معمول کے مطابق تھی۔ کیونکہ اسے ابھی تک کچھ نہیں معلوم تھا۔ لیکن میں نے جیسے ہی اسے یہ سب کچھ بتایا وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔ اس نے رور و کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ ”خدا کی بندی، اب کیوں روری ہو۔ اب تو میں واپس بھی آچکا ہوں۔“

”میں اس لیے روری ہوں کہ خدا نہ کرے آپ کو کچھ ہو جاتا تو پھر میرا کیا ہوتا۔“

دوسرے دن کے اخبارات میں اس گروہ کے پکڑے جانے کی خبر شائع ہوئی تھی۔ اور یہ بھی لکھا گیا تھا کہ میری اور میرے منبر کی ہوشیاری نے اس گروہ کو گرفتار کروانے میں مدد کی تھی۔ اخبارات کے مطابق اس لڑکی کا نام عالیہ تھا۔ وہ لوگ اس سے پہلے اور کئی وارداتیں کر چکے تھے۔

اس لڑکی کے بیک گراؤنڈ کے حوالے سے کوئی بات نہیں لکھی تھی۔

جب میں پیر کے دن دفتر پہنچا تو دفتر والے مجھے مبارکبادیں دینے لگے۔ میں نے اس موقع پر نسیم کی بہت تعریف کی کہ اگر یہ شخص عقل مندی سے کام نہیں لیتا تو یہ گروہ کبھی پکڑا نہیں جاتا۔

بہر حال پھر ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ ایک دن وہ لڑکی مجھے مارکیٹ میں دکھائی دے گئی۔

ٹیتوف، گھرمین

(Titov Gherman)

منبر گھرمین سچا نووچ ٹیتوف، روس کا دوسرا خلا باز، مشرقی سائبیریا کے ایک گاؤں پولکوفینی کوف میں پیدا ہوا۔ ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسٹالن گراڈ میں فضائیہ کے تربیتی اسکول میں داخل ہو گیا۔ بعد ازاں روسی فضائیہ میں نمایاں کارنامے انجام دیے اور اعلیٰ کارکردگی پر سرٹیفکیٹ آف میرٹ حاصل کیا۔ 1949ء میں بنگ کیونسٹ لیگ کا ممبر بنا دیا گیا۔ 17 اگست 1961ء کو خلا میں کامیاب پرواز کی 25 گھنٹے 18 منٹ تک خلا میں رہا اور زمین کے گرد سترہ چکر لگائے۔ اس نے 4 لاکھ چوبیس ہزار نو سو ساٹھ میل کا سفر کیا جو چاند پر جانے اور آنے کے برابر ہے۔ اس کے خلائی جہاز دوستوک دوم کا وزن ۷/۴ - 4 ٹن تھا۔ اس جہاز نے زمین کے گرد ہر چکر 88 منٹ میں پورا کیا۔

مرسلہ: اسماعیل، لید

وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک... قبول صورت آدمی بھی تھا۔

میں نے اس لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ بلاشبہ وہ وہی تھی۔ میں اسے کیسے بھلا سکتا تھا۔ اس کی تصدیق یوں ہو گئی کہ... اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ خود ہی میرے پاس آگئی تھی۔

”ارسلان صاحب، آپ نے مجھے پہچانا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، تم شاید وہی ہو۔“ میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں، میں وہی ہوں۔ آپ کی مجرمہ۔“ اس نے کہا۔ ”جس نے آپ کو اپنے ساتھیوں کی مدد سے کڈنیپ کر دیا تھا۔“

”لیکن تمہیں تو شاید سزا ہو گئی تھی۔“

”ہاں، کیس تو چل رہا ہے۔ لیکن میری ضمانت ہو گئی ہے۔“ اس نے اپنے ساتھ والے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ حبیب صاحب ہیں۔ انہوں نے میری ضمانت کروائی ہے اور یہی میرے وکیل بھی ہیں۔“

”خوب۔“ میں نے حبیب کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ ”آپ نے اچھا کیا جو اسے ضمانت پر رہائی دلا دی۔ مجھے پہلے دن سے اس سے ہمدردی رہی ہے۔“

”ایک بات اور بتا دوں۔“ عالیہ نے کہا۔ ”یہ حبیب میرے شوہر بھی ہیں۔ ہم نے شادی کر لی ہے۔“

یہ ایک چونکا دینے والی خبر تھی۔ ایک مجرمہ کے وکیل نے خود مجرمہ ہی سے شادی کر لی تھی۔

”آپ کو یقیناً یہ سن کر حیرت ہو رہی ہوگی۔“ وکیل نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ میں نے اعتراف کیا۔ ”واقعی حیرت ہو رہی ہے کہ آپ نے جان بوجھ کر ان محترمہ سے شادی کر لی۔“

”اگر آپ کے پاس فرصت ہے تو چلیں کہیں چل کر بیٹھ جاتے ہیں۔“ وکیل نے کہا۔ ”یہ آپ کو اپنے بارے میں بتائیں گی۔ پھر آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے غلط کیا ہے یا اچھائی کی ہے۔“

”ضرور۔ میں خود بھی سننا چاہوں گا۔“

ہم ایک پرسکون سے ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے۔ وکیل کے پاس بھی اپنی گاڑی تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی وکالت ٹھیک چل رہی ہے۔

”ارسلان صاحب، انسان مجرم پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کو حالات اور واقعات مجرم بنادیتے ہیں۔“ عالیہ نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔ ”میرا تعلق ایک اچھے خاصے شریف پڑھے لکھے گھرانے سے ہے۔ میرے والد صاحب ایک استاد ہیں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ہمارے اس معاشرے میں بے چارے استاد کے پاس ہوتا ہی کیا ہے۔ ہم تین بہن بھائی ہیں۔ دو بہنیں اور ایک بھائی۔ میں ان دونوں سے چھوٹی ہوں۔ والد صاحب کے پاس صرف دو چیزیں تھیں۔ علم اور تربیت۔ وہ انہوں نے ہمیں دے دیں۔ ہمیں بہت اچھی تعلیم دلائی۔ اپنے طور پر بہت اچھی تربیت کی۔ لیکن ہمارے سیدھے سادے والد صاحب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ احساس محرومی کتنے داغ دامن پر لگا دیتی ہے۔“

عالیہ بہت موثر انداز میں بتا رہی تھی۔ میں تو یہ پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس کا انداز گفتگو بہت دل کش تھا۔ اسے بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنا یہ جوہر دکھا رہی تھی۔

”میں جب کالج میں دوسری لڑکیوں کو دیکھا کرتی جن کے پاس سب کچھ تھا تو اندر ہی اندر کھول کر رہ جاتی۔ آخر کیوں مجھ میں ایسی کیا کی تھی۔“

میں بھی خوبصورت ہوں، ذہین ہوں اسارت ہوں۔ پھر میرے حالات ایسے کیوں نہیں ہیں۔ دوسری لڑکیوں کو کالج میں خرچ کرنے کے لیے روزانہ ہزار ہزار ملا کرتے تھے اور میں صرف تیس روپے لے کر گھر سے چلتی تھی۔ کتنا فرق تھا۔ وہ بے تحاشا پیسے خرچ کرتیں اور میں ان کی طرف دیکھتی رہ جاتی۔ ارسلان صاحب یاد رکھیں کہ ہمارے یہاں نانوالے فیصد جرائم معاشی صورت حال کی وجہ سے ہوا کرتے ہیں۔“

”جی ہاں، اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔“ میں نے تائید کی۔

مختصر یہ کہ ایک دن کالج میں ایک لڑکی نصرت سے میری دوستی ہوئی۔ وہ ایک موٹی بے ڈھنگی سی لڑکی تھی۔ بات کرنے کا انداز بھی عامیانا تھا۔ بس خوبی یہ تھی کہ وہ بے دریغ خرچ کیا کرتی۔ نہ جانے اس کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اس کے والدین کوئی بڑا بزنس کرتے ہوں گے۔ اس لیے ایک دن میں نے اس سے دریافت کر لیا۔ ”نصرت، تمہارے ابو تو شاید کوئی بزنس مین ہوں گے۔“

”نہیں بھائی، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”تو پھر کوئی بڑے سرکاری آفیسر ہوں گے۔“

”نہیں بابا، ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ میرے ابو تو بس ایک عام سے انسان ہیں۔ ایک دکان پر سیلز مین ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو۔ تمہیں میرے ابو سے کیا دلچسپی ہوگی۔“

”دلچسپی تمہارے ابو سے نہیں تم سے ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم جو اتنے پیسے خرچ کرتی ہو تو میں نے یہی سمجھا تھا۔“

”جانتی ہو، میرے پرس میں ہمیشہ چار پانچ ہزار روپے پڑے رہتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”اسی پر تو حیرت کر رہی ہوں کہ یہ آتے کہاں سے ہیں۔“

”یہ ایک راز ہے اور اس وقت تک نہیں بتا سکتی جب تک میں تم پر بھروسہ نہ کرنے لگوں۔“ اس نے کہا۔

”اور یہ بھروسہ کس طرح ہوگا؟“

”تم دو چار بار میرے ساتھ چلوگی۔ تو پھر تم پر بھروسہ ہو جائے گا۔ لیکن شرط یہی ہوگی کہ تم جو بھی دیکھو اس کا ذکر کسی سے نہیں کرو گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اقرار کر لیا۔

اس وقت میرے ذہن میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مجھ میں صرف تجسس بے دار ہو گیا تھا۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ کرتی کیا ہے۔ بہر حال ایک دن وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ مجھے ایک ہوٹل میں لے آئی تھی جہاں دو نوجوان اس کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے نصرت کی طرف دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں، یہ میری دوست ہے۔ انتہائی وفادار اور رازدار۔“

پھر ان لوگوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہم نے وہاں کچھ دیر بیٹھ کر کھایا پیا۔ پھر نصرت نے مجھ سے کہا۔ ”عالیہ ایک بات بتاؤ۔ کیا تم ہمارے ساتھ ایڈونچر میں شریک ہونا چاہتی ہو۔“

”کیسا ایڈونچر؟“

”تم صرف دیکھتی رہو گی۔“ اس نے کہا۔

پھر ہم ہوٹل سے باہر آئے۔ ایک طرف دو موٹر سائیکلیں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک نے ایک موٹر سائیکل سنبھال لی۔ نصرت اس کے پیچھے بیٹھ گئی تھی۔ پھر اس نے مجھے اشارہ کیا کہ میں دوسرے کے ساتھ اس کی بائیک پر بیٹھ جاؤں۔ میں ہچکچانے لگی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص میرے لیے اجنبی تھا۔ میں اس کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتی تھی۔

نصرت نے میری جھجک محسوس کر لی تھی۔ ”اوہو، پریشان مت ہو۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ تم بیٹھ جاؤ اس کے ساتھ۔“

اس کے کہنے پر میں اس نوجوان کے ساتھ بائیک میں بیٹھ گئی اور ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اس زمانے میں چونکہ ڈبل سواری پر پابندی عائد تھی لیکن عورت مرد کے ساتھ بیٹھ کر جا سکتی تھی۔ پولیس والے چیک نہیں کرتے تھے۔ ہم ایک ایسی سڑک پر آ گئے جو نسبتاً سناٹا ہی تھی۔

یہاں ایک معقول صورت آدمی ایک طرف پیدل چلا جا رہا تھا۔ نصرت اور اس کے ساتھی کی بائیک اس آدمی کے پاس آکر رک گئی۔ جبکہ میری والی بائیک آہستہ رفتار سے آگے نکلتی چلی گئی تھی۔

ثیریا سانپ (Rattle Snake)

سانپ کی ایک قسم جس کی دم سخت کھردری اور کھوکھلی ہوتی ہے۔ امریکا میں اس کی ابتدائی نوع بھی پائی جاتی ہے۔ دم ہلتی ہے تو اس سے کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ رنگ خاکستری، زرد اور سیاہی مائل ہوتا ہے اور اس پر خفیف سی دھاریاں ہوتی ہیں۔ لمبائی تقریباً آٹھ فٹ تک ہوتی ہے۔

ٹرینٹ برج

انگلستان میں کرکٹ کا وہ میدان جو نو ٹیموں میں واقع ہے۔ اس ٹرینٹ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اس میدان میں کرکٹ 1837ء میں کھیلی گئی اور پہلا ٹیسٹ میچ 1899ء میں ہوا۔ ٹرینٹ برج پر کھیلے جانے والے ٹیسٹ میچوں میں سب سے زیادہ اسکور 1938ء میں ہوا جب انگلستان نے آسٹریلیا کے خلاف کھیلے ہوئے آٹھ کھلاڑیوں کے عوض 658 رنز بنائے، چار کھلاڑیوں نے سچریاں بنائیں۔ اتفاق سے اس میدان پر سب سے کم اسکور بھی انگلستان کا ہی ہے۔ 1921ء میں آسٹریلیا کے خلاف پہلا ٹیسٹ کھیلے ہوئے انگلستان کی ٹیم صرف ایک سو بارہ رنز بنا کر آؤٹ ہو گئی۔

شکر آیوڈین

ایک زہریلا مخلوق یا لوشن۔ یہ دوا جراثیم کو ہلاک کر دیتی ہے۔ عموماً چوٹ وغیرہ لگنے پر لگائی جاتی ہے۔ اس کے لگانے سے خون بند ہو جاتا ہے اور جراثیم زخم کے اندر داخل نہیں ہوتے۔ ورم پر لگانے سے بھی افاقہ ہوتا ہے۔ چہرے پر آنکھ کے قریب یا گلے میں لگانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ زیادہ تیز قسم کی شکر آیوڈین لگانے سے جلد جل جاتی ہے، اس لیے زخم کے مطابق تیز یا کم تیز استعمال کرنی چاہیے۔

مرسلہ: فہیم الدین، شادی پور



جھول

مکرمی مدیر
السلام علیکم!

عرض یہ ہے کہ میں کوئی کہانی کار نہیں ہوں اور نہ اس سے پہلے کسی جگہ کوئی کہانی لکھی ہے۔ دوستوں کے کہنے سے اپنی ٹوٹی پھوٹی کہانی لکھ دی ہے۔ اگر پسند آجائے تو نزدیکی شمارے میں لگا دیں۔
رشید
(کوئٹہ)

میں اپنے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑا ہوا تھا۔ سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ سامنے والی عمارت کے کچھ فلیٹوں کے دروازے اور کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کچھ میں لڑکیوں اور عورتوں کے چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کیونکہ مجھے اس وقت ربا کا انتظار تھا میں اس کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس وقت رات کے سوا آٹھ ہو چکے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ربا ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ نہ راشد اور آخر آئے تھے۔ میں

کا سودا کرنے کی بات نہیں کی۔" عالیہ نے بتایا۔ "یہ اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ ہیں۔ انہیں صرف اپنے ٹارگٹ سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ جبکہ یہ نام نہاد شریف، یہ دفاتروں کے پاس، یہ سرکاری اعلیٰ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے با اختیار لوگ۔ خدا ان سے محفوظ رکھے۔ یہ صرف جسم کو دکھتے ہیں۔ کسی کی مہجوری یا کسی کی تعلیم وغیرہ سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔"

"میں نے عالیہ سے یہ سب سن کر ہی اس کو اپنانے کا فیصلہ کیا ہے۔" وکیل نے بتایا۔ "اس نے جب سے اپنی غلطیوں کا اعتراف کیا ہے یہ ہزاروں لاکھوں لڑکیوں سے بہت بہتر ہو گئی ہے۔"

"عالیہ اب آئندہ تمہارا کیا ارادہ ہے۔" میں نے پوچھا۔

"ارسلان صاحب" میں نے پہلے بھی یہ سب ایک مہینوں زندگی کی خواہش میں کیا تھا۔" اس نے بتایا۔ "آج بھی میں یہی چاہتی ہوں۔ اور اب تو مجھے حبیب جیسے شوہر کا ساتھ مل گیا ہے۔ ہم دونوں مل کر یہ کوشش کریں گے کہ لوگ گناہ فون کا لڑکے دھوکے میں نہ آئیں۔ ہمارا گروہ تو ختم ہو چکا ہے۔ لیکن نہ جانے اس شہر میں اس قسم کے اور کتنے گروہ کام کر رہے ہوں گے۔"

"عالیہ" اب احساس ہوا کہ تم واقعی بہت اچھی لڑکی ہو۔" میں نے کہا۔ "سچی بات ہے کہ صبح کا بھولا اگر شام کو واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔"

"لیکن میں تو شام سے بہت پہلے واپس آ چکی ہوں۔" وہ ہنس پڑی تھی۔ "لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس ساری کہانی میں سب سے زیادہ پاورفل اور متاثر کرنے والا کردار کس کا ہے۔"

"یقیناً تمہارے حبیب صاحب کا۔" میں نے حبیب کی طرف دیکھا۔ "ورنہ یہ تم سے شادی نہیں کرتے۔ کسی اور طرح سے فائدہ اٹھانے کی بات کرتے۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ میرے صحیح راہ پر آنے کا سارا کریڈٹ ان ہی کو جاتا ہے۔"

وہ دونوں چلے گئے۔ اور یہ کہانی شاید اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ لیکن میں یہ سوچتا رہ گیا کہ ایسی کہانیاں ہمارے معاشرے میں بہت عام ہیں۔ لیکن کیا ایسی کہانیوں کے کردار عالیہ یا حبیب جیسے ہو سکتے ہیں؟ بہت مشکل ہے۔



میرے ساتھی نے بائیک کچھ فاصلے پر آ کر روک لی تھی۔ شاید وہ نصرت اور اسے ساتھی کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بائیک بھی آگئی اور نکلتی چلی گئی۔

ایک بار پھر دوڑ شروع ہوئی۔ اور بہت فاصلے پر ہم ایک پارک کے گیٹ پر پہنچ گئے۔ یہاں دونوں موٹر سائیکلیں روک لی گئی تھیں۔ پھر چاروں ایک ساتھ ہو گئے۔ نصرت اور اس کا ساتھی دونوں بہت خوش ہو رہے تھے۔

تو اس دن سمجھ میں آ گیا کہ نصرت کے پاس پیسے کہاں سے آتے تھے۔ وہ موبائل چھیننے..... والوں کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ اور اس کے... جسے کی رقم روزانہ کی بنیاد پر اس کو مل جاتی تھی۔

تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میری احساس محرومی اور احساس کمتری مجھے اس مقام تک لے آئے۔ نصرت نے مجھ سے کہا تھا کہ جب مجھے ضرورت ہو میں اس کو اشارہ دے دوں۔

میں اس کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ یہ میرے مزاج اور میری تربیت کے خلاف تھا۔ لیکن قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

ابو بیمار پڑ گئے۔ اور اتنے شدید کہ ان کے علاج کے دوران ہمارے پاس کچھ نہیں رہا۔ اول تو ویسے بھی کچھ نہیں تھا۔ پھر ان کی بیماری نے رہی ہی کس بھی پوری کر دی۔

اور اس وقت مجھے نصرت کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ ہو سکتا ہے کہ آپ یہ کہیں کہ مجھے جائز طریقے سے پیسے حاصل کرنے تھے۔ میں نے ناجائز ذریعہ کیوں اختیار کیا۔ تو پھر میں یہ بتا دوں کہ میں نے بہت کوشش کی۔ رشتے داروں اور جاننے والوں کے پاس گئی۔ لیکن کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ میں نے جائز انداز سے ملازمت چاہی۔ لیکن وہ بھی نہیں مل سکی۔ اگر ملتی بھی تو صرف ایک شرط کے ساتھ۔ اور وہ شرط پوری کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ تنگ آ کر میں نے نصرت سے رابطہ کیا۔ اس نے مجھے کچھ اور لوگوں سے ملوادیا پھر ہم نے یہ کام شروع کر دیا۔ اب یہاں پر میں ایک بات اور بتا دوں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو بہت عجیب محسوس ہو لیکن یہ بات بالکل درست ہے۔

"وہ کیا ہے؟"

"یہ جو مجرم قسم کے لوگ میرے ساتھ ہیں۔ یہ آپ کے نام نہاد شریفوں سے لاکھ گنا بہتر ہیں۔"

"وہ کس طرح؟"

"وہ اس طرح کہ انہوں نے کبھی مجھ سے میرے جسم

اخباری اصطلاح، اس کا اطلاق ایسی باتوں پر ہوتا ہے جو کسی شخصیت یا ملک کے خلاف ناگواری کا اظہار کرتی ہوں اور ان کی ٹی وی، ریڈیو، اخبارات، رسائل و جرائد میں اشاعت سے کسی ملک کے عوام یا کسی گروہ میں بے چینی پیدا ہونے کا خدشہ ہو۔ اسی بنا پر جب کوئی شخص بات کر رہا ہو اور وہ بات کسی شخص یا ملک کے لیے ناگوار ہو تو وہ کہہ دیتا ہے کہ یہ بات آف دی ریکارڈ ہے۔

مرسلہ: ناہید افروز، ڈسکہ

کے زیورات اور نو سو روپے کے پرائز بانڈ اور سونے کی پانچ پانچ تولے کی پانچ سلاخیں تھیں۔ اب تم ہی حساب لگا لو کہ ان جہانزوں نے کتنا بڑا ہاتھ مارا ہے۔

”اچھا اب میری بھی سنو.....“ ربا اتر کے بولی ”کیا خیال ہے۔ میرے کنجوس باس کے بیٹکے پر ڈکیتی کی واردات کی جائے تو پچیس سے تیس لاکھ کی رقم آسانی سے مل جائے گی۔“

”تمہارے اس کنجوس باس کے پاس کیا ہوگا جو روزانہ اپنی گاڑی میں ایک لیٹر پیٹرول ڈلواتا ہے اور اسے خود ہی چلاتا ہے۔“ راشد نے کہا۔

”اے ایک سے ایک شاندار گاڑی خریدنے کا خط ہے۔“ ربا نے بتایا۔ ”آج بھی اس نے نئے ماڈل کی ہنڈا اکارڈ خریدی ہے۔ وہ مجھے اس نئی گاڑی میں اپنے بیٹکے پر لے گیا تھا۔“

”کیوں، وہ تمہیں اپنے گھر کیوں لے گیا تھا؟“

”اس لیے کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“ ربا کے رس بھرے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”اس نے مجھے اپنی تجوری کھول کر دکھائی تھی جس میں نہ صرف ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں بھری تھیں بلکہ اس کے علاوہ دس دس تولے کے سونے کی سلاخیں جن کی گنتی میں فوراً نہ کر سکی..... اس کے علاوہ اس کی مرحوم بیوی کے سونے کے زیورات کے چھ سات سیٹ..... ہر سیٹ میں چالیس تولے سے کم نہ ہوگا۔ یہ سونے اور ہیرے جواہرات کے زیورات..... آج کل سونے کے بھاؤ میں روز بہ روز تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی تجوری کی چابی خزانے سے کم نہیں ہے۔ میرے خیال میں رقم اور زیورات پچاس لاکھ سے کم نہ ہوں گے..... سچ پوچھو تو یہ خزانہ دیکھ کر میرے منہ میں پانی

اُترنے لگا۔

”یہ کشتی پولیس نے بھی عجیب مصیبت کھڑی کر رکھی ہے۔“ میں انہیں نشست گاہ کی طرف لے کر بڑھا۔ ”خاص کرات کے وقت کسی نہ کسی روڈ اور چوراہے پر گاڑیاں روک کر چیک کی جاتی ہیں۔“

”ایسی کسی گاڑی کو نہ روکا جاتا ہے اور نہ چیک کیا جاتا ہے جس میں کوئی لڑکی یا عورت ہو۔“ ربا کمرے سے باہر آ کر بولی۔

”تو آپ تشریف رکھتی ہیں؟“ راشد نے کہا اور اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

”تم تو دلہن بن کر آئی ہو.....“ اختر نے معنی خیز لہجے میں کہا ”کیا آج تم دونوں کی شادی ہو رہی ہے؟“

”بس ایک لمبا ہاتھ مارتے ہی ہم دونوں شادی کر لیں گے۔“ میں اسے ساتھ لے کر صوفے پر بیٹھ گیا اور ندیدہ نظروں سے ربا کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔ ”اب زیادہ انتظار ممکن نہیں رہا۔ جدائی کی تاب نہیں رہی ہے۔“

”لمبا ہاتھ مارنے کے لیے کسی نگڑی آسامی کی ضرورت ہے۔“ اختر نے کہا۔ ”ہم نے جو دو تین وارداتیں کیں اس میں کیا ملا۔ ایک جگہ سے نو ہزار سات سو روپے..... دوسری جگہ سے تیار نگین ٹی وی اور ڈی وی ڈی اور ایک ہزار کی رقم ملی۔ تیسری جگہ سے دو تولے کے زیورات نو سو روپے..... لوگ آج کل بہت ہوشیار ہو گئے ہیں۔ سونے کے زیورات میں چاندی کی کھوٹ تھی۔“

”ہوشیار نہیں ہو گئے ہیں، ہم غلط جگہ چلے گئے تھے۔“ راشد نے کہا۔

”اور اب ایسی غلطی ہرگز نہیں کریں گے۔“ اختر نے کہا ”بار بار وارداتیں کرنا بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں چند ہزار کے لیے آزادی خطرے میں ڈالنے کا قائل نہیں ہوں۔ اس بار تو میں تیس لاکھ روپے ہاتھ لگنے چاہئیں۔“

”میں تیس لاکھ کے لیے بینک میں ہی ڈاکا مارا جا سکتا ہے۔“ راشد نے کہا۔

”کسی بینک میں ڈاکا مارنا اتنا آسان نہیں رہا ہے۔“ راشد نے کہا ”ویسے گھروں میں وارداتیں بڑھ گئی ہیں یہ آج اخبار میں بارہ وارداتوں کی خبر چھپی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ایک بھی آدمی پکڑا نہیں گیا ہے۔ سب سے چھوٹی واردات جو ہوئی ہے اس میں تین لاکھ کی رقم، سوتولے سونے

مگنے تھے۔

ربا نے جیسے ہی اطلاعی گھنٹی کا بجن دیا میں نے لپک کر دروازہ کھول دیا۔ ربا نے نہ صرف خصوصی سنگھار کیا ہوا تھا بلکہ لباس میں بھی اہتمام کیا تھا۔ وہ اس سچ دج میں کسی نئی ٹوپی دلہن کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ اس کا حسن و شباب آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ وہ رات کی طرح مہک رہی تھی۔ میں نے اسے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

”ربا! تم نے آج بڑا انتظار دکھایا۔“ میں نے ربا کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”ہوشیار! یہ بناؤ سنگھار کیسا؟ تمہیں تو یہاں آنا تھا؟“

میرے گلے میں اپنی سرسری بانہیں جائل کر رہے ہوئے بولی ”مجھے ای ایک شادی کی تقریب میں لے کر پہنچی تھیں تاکہ لڑکے والوں کو دکھائیں۔ میں کسی بہانے سے کھٹک آئی ہوں، گیارہ بجے مجھے واپس شادی ہال پہنچنا ہے۔“

”تو تمہاری شادی کی بات چیت چل رہی ہے؟“ میرا چہرہ ہچک سا گیا۔

”وہ تو تین چار برس سے چل رہی ہے۔“ وہ ایک دم سے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ”میرے لیے کتنے ہی رشتے آئے اور آتے ہی رہتے ہیں۔“

”تم نے کبھی ذکر نہیں کیا۔“

”مگر میں ان میں کچھ ایسے کپڑے نکال دیتی ہوں کہ بات آگے نہیں بڑھ پاتی۔“ وہ پھر ہنسی۔ اس کے موتیوں جیسے دانتوں کی لڑی ہونٹوں کے درمیان سے جھانکنے لگی۔ میں اس کے دانتوں کو دیکھ کر کہتا تھا۔ ”تمہارے دانت تو تھ پیسٹ کے اشتہار کے لیے موزوں ہیں۔“

”کوئی بہت ہی اچھا رشتہ آجائے گا تو.....؟“

”تمہارے مقابلے میں کوئی شہزادہ نہیں پہنچے گا۔“ وہ محبت بھرے لہجے میں بولی۔

”سچ.....!“ میں اس پر جھک گیا۔

میں ہنسنے لگا تو وہ غیر محسوس انداز سے بازوؤں سے نکل آئی۔ چند لمحوں کے بعد اطلاعی گھنٹی بجی تو میں دروازے کی طرف بڑھ گیا اور وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو راشد اور اختر دروازے پر تھے۔ دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو میں نے دروازہ بند کر کے پوچھا۔ ”کہاں رہ گئے تھے؟“

”راستے میں ایک تو ٹریفک جام تھا۔ اس سے نجات ملی تو گشتی پولیس نے چیکنگ کے لیے گاڑی روک لی گی۔“

بڑی بے چینی اور شدت سے کوئی ایک گھنٹے سے انتظار کر رہا تھا۔ دوستوں سے زیادہ انتظار مجھے اپنی محبوبہ ربا کا تھا۔ میں نے ربا کو تاکید کی ہوئی تھی کہ وہ کوشش کر کے میرے دوستوں سے پہلے پہنچ جائے۔ میں نے جب بھی ربا سے جلدی پہنچنے کے لیے کہا وہ وقت مقررہ سے پہلے پہنچ جاتی تھی۔ اس طرح ہم اپنی محبت کی تجدید بڑی آزادی اور سکون سے کر لیتے تھے۔ میں اسے ہوش ربا کہتا تھا۔ وہ واقعی ہوشربا ہی تھی۔ مگر آج دور دور تک اس کا پتا نہیں تھا۔

میں اپنے دل کی بے چینی چھپانے کے لیے کمرے کے اندر آ کر ٹیبلے لگا تھا پھر میری گھٹی مونچھوں کے نیچے ہونٹ بار بار کانپ رہے تھے۔ طرح طرح کے دوسووں اور اندیشوں کے زہریلے پھکڑوں نے میرے دل و دماغ میں ڈنگ مار مار کر ادھ موا کر دیا تھا۔ میں کرب ناک انداز سے سوچ رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ربا نے راشد اور اختر سے ساز باز کر کے میرے خلاف کوئی گہری سازش کر لی ہے۔ ان تینوں نے اپنا الگ کوئی منصوبہ بنا لیا ہے۔ راشد اور اختر نے ربا کو میرے خلاف ورغلا یا ہوگا۔ کوئی عجب نہیں کہ ربا ان کے فریب میں آگئی ہو۔ میں نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ میرے یہ دوست ربا کے دل فریب حسن کو گرسنہ نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ربا کا حسن اور شباب ہر کسی کو پہلی ہی نظر میں دیوانہ بنا دیتا تھا۔

ربا ایک حسین اور خواب ناک زندگی کی متلاشی تھی۔ میں نے ربا کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا۔ اسے حسین خواب اور سبز باغ دکھائے تھے اس لیے وہ مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔ میں ربا کو اپنانے کے لیے سنجیدہ تھا۔ اس لیے میں نے کچھ منصوبے بنائے اور دوستوں کو شریک کر لیا۔ میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ کئی منصوبوں پر عمل کیا تھا مگر اس کے کوئی خاطر خواہ نتائج نہیں نکلے تھے۔ آج میں نے ربا اور دوستوں کو اس لیے بلایا تھا کہ کوئی بڑا ہاتھ مارنے کا منصوبہ بنایا جائے مگر ان تینوں میں سے اب تک کوئی نہیں پہنچا تھا۔ جب میں دوبارہ بالکونی میں آیا تو نو بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ چند لمحوں کے بعد میری نظریں اس گاڑی پر جم گئیں جو اندروالی سڑک پر اس سمت آرہی تھی۔ یہ ایک ٹیکسی جیو اس عمارت کے نیچے آ کر رکی تھی۔ ربا اپنا سراپا سمیٹی، لباس سنبھالتی اور اپنے بے حد نفیس کٹے ہوئے بال سہلائی ٹیکسی سے اتری تو میرے دل کی عجیب سی حالت ہو گئی۔ سارے اندیشے اور دوسوے جاگ اٹھے تھے جو بھجک کی طرح بیٹھ

”تو تم یہ خزانہ دیکھ کر اس بڑھے طوطے سے شادی کرنے پر راضی ہو گئیں.....؟“ میں جل کر رہ گیا۔

”تم مردوں میں یہی ایک بہت بڑی خرابی ہے کہ عورتوں پر شک کرنے لگتے ہو۔“ ربا کو غصہ آگیا۔ ”اگر مجھے اس سے شادی کرنی ہوتی تو میں یہاں کیوں آتی؟ میں یہ بتانے کے لیے آئی ہوں کہ لمبا ہاتھ مارنا ہے تو میرے پاس کا گھر حاضر ہے۔“

”نیکی اور پوچھ پوچھ.....“ میں چپکا ”اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس کے ملازمین کتنے ہیں؟“

”صرف ایک.....“ ربا نے جواب دیا۔ ”اس نے ایک خانساں رکھا ہوا ہے جو چالیس برس کی عمر کا ایک صحت مند شخص ہے۔ وہی چوکیدار اور گھبراہٹ ہے۔ صبح کے وقت دو ماسیاں آکر گھر کی..... صفائی کر جاتی ہیں۔ خانساں رات دن گھر پر رہتا ہے۔“

”کنجوس نے صرف ایک شخص کو اور دونوں کو رکھا ہوا ہے۔“ ربا نے کہا ”یہ ہمارے لیے اچھی خبر ہے۔“

”اس کی نئی گاڑی کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ میں نے اختر سے پوچھا۔ ”کتنے میں وہ بک جائے گی؟“

”ایک لاکھ روپے میں.....؟“

”صرف ایک لاکھ میں.....؟ یہ بہت کم قیمت ہے۔“ میں نے کہا۔

”چوری کا مال کوڑیوں میں بکتا ہے۔“ پھر اس ہاتھ دے، اس ہاتھ لے اور کیا چاہیے؟“ اختر نے کہا۔

”اچھا اب میں چلتی ہوں۔“ ربا جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”مجھے شادی ہال پہنچنا ہے۔ امی تلاش کر رہی ہوں گی۔“

”کل تم دفتر سے سیدھی یہاں آ جانا!“ میں نے کہا۔

”وہ کس لیے.....؟“ ربا زیر لب مسکرائی۔ ان جانے خیال سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”اس لیے کہ کل اس منصوبے کو حتمی شکل دے دی جائے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کل ہم تینوں نہ صرف تمہارے پاس کی گاڑی دیکھ آئیں گے بلکہ پاس کے بیگلے کا محل وقوع بھی دیکھ آئیں گے تاکہ واردات کے وقت کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔“

دوسرے دن ربا میرے دوستوں سے قبل فلیٹ پر پہنچ گئی تھی۔ ہم دونوں ان کے انتظار میں بیٹھ کر باتیں کرتے

ہوئے خوابوں کی دنیا میں پہنچ گئے تھے۔ ربا نے کہا ”ہم دونوں ہی مون منانے کہاں جا رہے ہیں؟“

”میں تمہیں سری لنکا لے جانے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“ میں نے کہا ”وہ ایک خوبصورت، سرسبز و شاداب اور شہر ملک ہے۔ اس کی میں نے بڑی تعریف سنی ہے۔“

”کیوں نہ ہم وہی میں جا کر مستقل رہائش اختیار کر لیں۔“ ربا نے تجویز پیش کی۔

”اس بات کا انحصار تمہارے پاس کے گھر سے ہاتھ لگنے والی دولت کا ہے۔“ میں سوچتے ہوئے بولا۔ ”پوری دولت پر صرف ہم دونوں کا حق نہیں ہوگا۔ اس میں راشدا اور اختر کو بھی تو حصہ دینا ہوگا۔“

”میرے اندازے کے مطابق فی کس پندرہ سے بیس لاکھ روپے حصہ ملے گا۔“

”اگر پندرہ بیس لاکھ فی کس مل گئے تو پھر کیا بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا اس میں اتنی دولت موجود ہے۔“

”کیوں نہیں.....؟“ ربا نے اپنا سر ہلایا۔ ”میرے اندازے کے مطابق سونے کی سلاخیں اور ہیرے جواہرات کے زیورات ہی پچاس ساٹھ لاکھ کی مالیت کے ہوں گے اور پھر ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں..... جو ان گنت ہیں۔“

”پھر تو ہم دونوں کی کاپیا پلٹ ہو جائے گی۔“ میں نے سرشاری سے کہا۔

ہم دونوں کیف رنگ کے جہان میں پہنچے تھے کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ ربا کو خود سے جدا کرتے ہوئے بڑی اذیت ہوئی تھی۔ میں دانت پیتا ہوا بولا۔ ”یہ عین وقت پر نازل ہو جاتے ہیں۔ شیطانوں کی طرح.....“

ربا مجھے غصے میں دیکھ کر بے اختیار ہنس دی۔ وہ سر کے بال اور دوپٹا درست کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ دروازے پر راشدا اور اختر کھڑے ہوئے تھے۔ پھر وہ دونوں اندر آکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”کل رات واردات کرنے کی غرض سے زیب النساء اسٹریٹ سے ایک شیراڈ لے اڑے ہیں۔“ اختر نے کہا۔ ”اسے ایک جگہ رکھ آئے ہیں..... اور آج ہم نے نہ صرف بیگلے کے محل وقوع کا جائزہ لیا ہے بلکہ اس خانساں کو بھی دیکھا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ صبح کے وقت نوکرانی کام کرنے نہیں آتی ہیں۔ وہ خانساں اکیلا رہتا اور سارے

کام نمٹاتا ہے۔ ہم اس پر آسانی سے قابو پا سکتے ہیں۔“

”اب تم بتاؤ..... کیا کرتا ہے؟“ میں نے کہا۔

”کل رات نوبے ہم چاروں اس مشن پر چلیں گے۔ راشدا نے کہا۔

”میرا جانا کیوں ضروری ہے؟“ ربا بولی۔ ”میں باس کا سامنا کرنا نہیں چاہتی اور نہ خانساں کا.....“

”تمہارا ساتھ ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ پولیس تمہیں دیکھ کر گاڑی روکے گی نہیں۔“ راشدا نے کہا۔

”اگر اس نے پھر بھی روکنے کی کوشش کی تو.....؟“

ربا نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”پھر وہ ہماری گرد بھی نہیں پائیں گے۔“ اختر سینہ تان کر بولا۔ ”اس شہر میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو میرے مقابلے میں تیز رفتار گاڑی چلا سکے۔ جب میں نئی گاڑی کے اسٹیرنگ پر بیٹھوں گا تو وہ راکٹ بن جائے گی۔“

”جیسے ہوا میں اڑتا جائے میرا لال دوپٹا ہو جی.....“ میں نے ترنگ میں آکر کہا ”گاڑی بھی لال رنگ کی ہے۔“

ہم تینوں ہنسنے لگے۔ جب ہنس چکے تو ربا بولی۔ ”اچھی طرح سے اس منصوبے کا جائزہ لے لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی جھول رہ جائے اور پھر ہم سب دھریے جائیں۔“

”منصوبہ انتہائی سیدھا اور بے عیب ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم بینک پر ڈاکا مارنے نہیں جا رہے ہیں۔ ہم تمہارے پاس کا مال لوٹ کر گاڑی میں لائیں گے۔ چوری کی گاڑی وہیں چھوڑ دیں گے۔ اس لیے کہ اس گاڑی میں جانے تک خطرہ ہے کہ پولیس اسے چیک کر سکتی ہے۔ اس لیے کہ اس کی چوری کی ایف آئی آر کٹ چکی ہوگی۔ اختر اور راشدا ہمیں فلیٹ پر چھوڑ کر باس کی گاڑی کو فروخت کر کے رقم لے کر آجائیں گے۔ پھر ہم اپنا اپنا حصہ کر لیں گے۔“

ہم چاروں دن ڈوبنے تک اس منصوبے کا جائزہ لیتے رہے۔ ہم نے ہر پہلو پر غور کیا۔ پھر رات کا کھانا کھانے بارہی کیو چلے گئے۔ وہ چاروں بہت خوش تھے۔ کل کی کامیابی کا نشہ ابھی سے آنکھوں میں چھانے لگا تھا۔

ہم اپنے اپنے خوابوں میں کھوئے ہوئے چپک رہے تھے۔ سب سے زیادہ خوش ربا اور میں تھا۔ شادی اور نئی مون کا تصور بہت دور لے گیا تھا۔

اگلی رات نوبے سے پہلے ہی ہم ربا کے پاس کے گھر پہنچ گئے۔ گلی سنسان، ویران اور نیم تاریکی میں ڈوبی ہوئی

تھی۔ گھنٹی بجانے پر دروازہ خانساں نے کھولا تھا۔ اس پر قابو پانے میں ہمیں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس کے منہ پر کلوروفام کا رومال رکھ دیا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اور ہاتھ پیر باندھ کر اسے سرورٹ کوارٹر میں بند کر دیا۔ پھر ہم تینوں نے اپنے چہروں پر نقابیں چڑھالیں اور اندر داخل ہوئے۔ ربا اپنے آپ کو چھپانے کے لیے نئی گاڑی میں اگلی نشست میں بیٹھی رہی۔ اندھیرے کے باعث وہ نظر نہیں آئی تھی۔ اس کے کنجوس پاس نے ہم تینوں کو مسلح دیکھ کر تجوری کھول دی۔ ہم نے اس کی مشکلیں کس دیں اور منہ پر شپ چپکا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دو بڑے بریف کیسوں میں سارا مال رکھ کر تجوری میں جھاڑو پھیر کر نکل آئے اور نئی گاڑی میں بیٹھ گئے جس کی ابھی رجسٹریشن نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ایک کارڈ پر لکھا ہوا تھا۔ اچلائی فار رجسٹریشن۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی تیز رفتاری سے سڑک پر دوڑنے لگی تو ہم چاروں آپس میں خوشی سے سرشار ہو کر مبارک باد دینے لگے۔ کامیابی کے نشے نے اختر کا دماغ آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ وہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرنے لگا۔ جب ہماری گاڑی پولیس کی گشتی گاڑی کے قریب سے گزری تو پولیس کی گاڑی نے رکنے کا ہارن دیا۔ اس ہارن نے اختر کا نشہ ہرن کر دیا۔ اس نے گاڑی کی رفتار اور تیز کر دی۔ پولیس کی گاڑی ہمارے تعاقب میں چلی آ رہی تھی۔ ہماری اور پولیس کی گاڑیوں کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہمارے چہرے پر نوج گئے تھے ہمیں اس بڑھتے ہوئے فاصلے نے خوش کر دیا۔ اختر نے آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے باپ بھی ہماری گرد نہیں پاسکتے.....“

اختر کی بات سن کر ہم قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد اختر کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ ایک دم سے ہڈیانی لہجے میں چیخا۔ ”یار پیٹرول..... ختم ہو رہا ہے، ہم بھول گئے تھے کہ..... وہ کنجوس اپنی گاڑی میں ایک لیٹر سے زیادہ پیٹرول نہیں ڈلواتا ہے..... اس خبیث کنجوس نے ہمیں.....“

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی گاڑی کا انجن جواب دے گیا۔ ہم لاچاری سے قریب آتی ہوئی پولیس موہائل کو دیکھ رہے تھے۔ پھر کیا ہوا، یہ بتانا ضروری نہیں۔ اس لیے کہ ہم چاروں اس وقت سینٹرل جیل میں وقت گزار رہے ہیں۔



سب کچھ کسی پراسرار کہانی کی طرح ہو رہا تھا۔
بارش میں پہاڑی راستوں کا سفر، ریست ہاؤس اور
ایک بوڑھا چوکیدار۔ نہ جانے اس قسم کے ماحول میں کتنی
کہانیاں جنم لے چکی ہیں اور آج شاید ایک اور کہانی کی ابتدا
ہونے والی تھی۔
”آؤ بابو جی کمرے میں آ جاؤ۔“ بوڑھے نے
کہا۔ ”یہاں بہت سردی ہے۔ اور تم بھیکے ہوئے بھی ہو۔“
”ہاں۔ مجھے کپڑے بدلنے ہیں۔ گاڑی میں میرا
سوٹ کیس رکھا ہے۔ میں نکال کر لاتا ہوں۔“
میں چونکہ خود بھیگا ہوا تھا۔ اس لیے مناسب نہیں سمجھا
کہ چوکیدار کو سوٹ کیس نکالنے کے لیے کہوں۔ کپڑے
بدل کر میں نے بھیکے ہوئے کپڑے ایک طرف ڈال دیے

بھی لے کر آتے ہیں۔ اس لیے ہر طرف مکمل تاریکی تھی۔
بجلی کی کڑک ایسی محسوس ہوتی جیسے پہاڑیوں پر کسی
نے بم پھینک دیا ہو۔
اور ایسے میں وہ ریست ہاؤس نما عمارت اندھیرے میں
بجراغ کی طرح تھا۔ عمارت سڑک سے ذرا ہٹ کر ٹیپ میں
تھی۔ میں نے اپنی گاڑی ایک طرف کھڑی کر دی اور پانی میں
بھینکا ہوا ریست ہاؤس کے برآمدے تک آ گیا۔
”کوئی ہے۔“ میں نے زور زور سے آواز دی۔
اس وقت بھی بہت تیز بارش ہو رہی تھی۔ بارش کے
شور سے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے دوبارہ آواز
لگائی۔ تیسری آواز پر ایک بوڑھا کسی کمرے سے نکل کر
سامنے آ گیا۔

سفید بھالو

جناب ایڈیٹر صاحب..... السلام علیکم!
اسکول لائف میں لکھنے لکھانے کا شوق تھا پھر بزنس کی
مصروفیت نے گھیر لیا لیکن پڑھنے کا شوق ہنوز باقی رہا۔ عرصہ بعد
اپنی ہی سرگزشت لکھی ہے۔ مجھے تو اچھی لگی اگر آپ کو بھی
پسند آجائے تو مجھے بھی سرگزشت کے لکھاریوں میں شامل
کر لیں۔
طارق ظفر
(مری)

وہ ریست ہاؤس اتفاقاً ہی مل گیا تھا۔
نہ جانے کیا شامت سوار ہوئی تھی کہ میں نے اپنی
گاڑی میں پاکستان کی سیر کا پروگرام بنالیا تھا۔ اور وہ بھی
اکیلے۔ یہ میری شروع سے عادت رہی ہے۔
نہ جانے کیوں میں اکیلا ہی انجوائے کرنا پسند کرتا ہوں۔
اگر کسی اجنبی شہر میں ہوں تو پیدل ہی گلیوں اور
سڑکوں پر ٹہلنا شروع کر دیتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں کون
میرا ساتھ دے سکتا ہے۔
یا اگر کسی صحت افزا پہاڑی مقام پر ہوں تو پھر گھنے
بادلوں، پرواز کرتے پرندوں اور اونچی چوٹیوں کو دیکھ کر رک
جاتا ہوں۔ اور قدرت کے صنائی پر اس کا شکر ادا کرنے لگتا
ہوں۔ دوستوں کے ساتھ یہ ٹھہراؤ نصیب نہیں ہو سکتا۔ اس
لیے میں اکیلے ہی جانے کو ترجیح دیتا ہوں۔
تو وہ ریست ہاؤس مجھے اتفاقاً دکھائی دے گیا تھا۔
میں مری سے صبح دس بجے نکلا تھا۔ بھور بن تک آتے
آتے موسلا دھار بارش ہونے لگی تھی۔ جن لوگوں کو ان
علاقوں میں گاڑیاں چلانے کا اتفاق ہوا ہو وہ ہی بتا سکتے ہیں
کہ بارش میں ڈرائیونگ کتنی خطرناک ہو جاتی ہے۔ ذرا سی
لا پرواہی ہوئی اور سیکڑوں فٹ نیچے۔
وائپر مسلسل چلائے رکھنے کے باوجود کچھ نہیں دکھائی
دے رہا تھا۔ ان علاقوں میں گھنے بادل اپنے ساتھ اندھیرا

اور بستر پر رکھا ہوا کیبل لیٹ کر بیٹھ گیا۔

بہت مناسب کمر تھا۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ چوکیدار میرے لیے گرم چائے اور گیس کا بیٹر بھی لے آیا تھا۔ ذرا سی دیر میں بہت آرام محسوس کرنے لگا تھا۔

چائے پینے کے دوران میں نے چوکیدار سے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے بابا؟“

”مراد نام ہے بابو صاحب، لیکن بہت نامراد آدمی ہوں۔“ اس نے کہا۔

میں اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ ”تم کب سے اس ریٹ ہاؤس میں ہو۔“

”میں برس ہو گئے۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ گورنمنٹ کا ریٹ ہاؤس ہے۔ مجھے حکومت سے تنخواہ ملتی ہے۔ لیکن اس ریٹ ہاؤس میں بہت کم لوگ آتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی سرکاری آفیسر آگیا تو آگیا۔ ورنہ یہ خالی پڑا رہتا ہے۔“

”لیکن تم نے تو اس کو بہت ٹھیک ٹھاک کر رکھا ہے۔“

”رکھنا پڑتا ہے نا۔ نہ جانے کس وقت کون آنکے۔“

اس نے کہا۔ ”ویسے یہاں ضرورت کی ہر چیز ہے۔ راشن تک بھرا رہتا ہے۔ برابر میں ایک چھوٹی سی مارکیٹ ہے جہاں سے ہر چیز مل جاتی ہے۔“

”کیا تم یہاں اکیلے رہتے ہو؟“

”نہیں تو۔ اپنی بیٹی کے ساتھ رہتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ اس وقت اپنے کمرے میں ہے۔ ہر وقت پڑھتی رہتی ہے۔ اس وقت بھی پڑھ رہی ہوگی۔“

”کیا پڑھتی ہے۔“

”انٹر میں ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”یہاں سے کچھ فاصلے پر مری میں ایک کالج بھی ہے۔ وہ وہاں جاتی ہے۔ صبح سویرے اس کو لینے کے لیے کالج کی گاڑی آ جاتی ہے۔ روڈ پر آ کر ہارن دیتی ہے۔ ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ گاڑی آ گئی ہے۔“

”چلو۔ یہ تو اچھی بات ہے کہ تم اپنی بیٹی کو تعلیم دلا رہے ہو۔“

”اے شوق بھی تو بہت ہے۔“ بوڑھا مراد کھڑے ہوئے ہوتے ہوئے بولا۔ ”اب بابو صاحب تمہارے لیے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں۔“

”ہاں بابا۔ کیونکہ میں کل تک تو جانیں سکتا۔ یہ بارش رکنے والی نہیں معلوم ہو رہی ہے۔ اور ویسے بھی سیر ہی کے لیے نکلا ہوں۔ دو چار دن یہاں بھی گزار دوں تو کیا ہوگا۔“

پھر میں نے اس چوکیدار کو کچھ روپے دیئے تاکہ وہ میرے کھانے پینے کا بندوبست کر دے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کمرے میں رکھی ہوئی کرسی اٹھائی اور برآمدے میں آکر بیٹھ گیا۔

بارش کا زور گرچہ کم ہو گیا تھا لیکن ابھی بھی بہت تیز تھی۔ اور مجھے اس برآمدے میں بیٹھ کر بارش کو دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

ابھی میں بارش کو دیکھ ہی رہا تھا کہ کسی نے آواز دی۔ ”بابو جی۔“

میں بری طرح چونک پڑا تھا۔ ایک خوبصورت لڑکی نہ جانے کس طرف سے نکل کر برآمدے میں آ گئی تھی۔ ”میں چوکیدار کی بیٹی ہوں جی۔“ وہ کچھ آگے آکر بولی۔ ”بابا نے آپ کے بارے میں بتایا تھا کہ کوئی مہمان آکر ٹھہرا ہے۔“

میں اس کا جواب دینے کے بجائے اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ سفید شلوار قمیص میں، اس کے بھیکے ہوئے بال اس کے چہرے پر گرے ہوئے تھے۔

”میرا نام نرگس ہے جی۔“ اس نے بتایا۔ ”اور آپ کون ہیں جی۔“

اس کا باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ اس لیے میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ ”میں طارق ظفر ہوں۔ ایک آوارہ گردم کاسیاح۔ بس پورے ملکوں کی سیر کرتا پھرتا ہوں۔“

”واہ۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”یہ تو بہت اچھا شوق ہے۔ ویسے رہتے کہاں ہیں۔“

”کراچی میں۔“ میں نے بتایا۔ ”تم نے کراچی تو دیکھا ہوگا۔“

”نہیں جی۔ میں تو مری سے آگے بھی نہیں گئی۔“ اس نے بتایا۔ ”بابا بے چارے مجھے کہاں لے جاسکتے ہیں۔ میری دنیا تو بس یہی ہے جی۔ پڑھنے کے لیے مری چلی گئی اور وہاں سے یہاں واپس آ گئی۔“

”یہ بہت اچھی بات ہے کہ تم تعلیم حاصل کر رہی ہو۔“ میں نے کہا۔

اس دوران چوکیدار بھی وہاں آگیا۔ اس نے نرگس کی طرف دیکھا۔ ”تو یہاں کیا کر رہی ہے۔ جا کر کچن میں سلا دینا دے۔“

”اچھا بابو۔“ نرگس جلدی سے اندر چلی گئی۔

”مراد بابا۔ تمہاری بیٹی بہت اچھی ہے۔ بہت

”بجھدار۔“

”ہاں بابو۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”بس دعا کرو کہ اس کا نصیب اچھا ہو۔ یہ اپنے گھر کی ہو جائے تو میں سکون سے مر سکوں گا۔ روزانہ بیمار رہتا ہوں۔“

”کیوں نہیں۔ خدا ضرور بہتر کرے گا۔“

کچھ دیر بعد دونوں نے مل کر کھانا لگا دیا۔ ساوہ سا کھانا تھا۔ لیکن بہت مزیدار۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ بارش گرچہ رک گئی تھی۔ لیکن سردی بہت تھی اور ایسی سردی میں اور ایسے ماحول میں سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں کہانیوں کے دیس میں پہنچ چکا تھا۔

اس لڑکی نے میرے لیے بستر درست کر دیا تھا۔ ایک بات تھی کہ اس ریٹ ہاؤس میں سب کچھ صاف ستھرا تھا۔ میں جب سونے کے لیے لیٹا تو وہ لڑکی مجھے شب بخیر کہہ کر چلی گئی تھی۔

میں بہت دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی۔ مہذب، خوبصورت، اور اچھی باتیں کرنے والی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ایسی خوبصورت لڑکی اس دیرانے میں زندگی بسر کر رہی ہوگی۔

صبح ہوئی تو چوکیدار میرے لیے چائے لے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ لڑکی کالج جا چکی ہے اور دوپہر تک واپس آئے گی۔ آج بادل صاف ہو گئے تھے۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ اب وہاں میرے رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن کیا میں وہاں سے جا سکتا تھا؟ نرگس نے تو میرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ میں اسے پسند کرنے لگا تھا۔

میری اپنی زندگی بھی اب تک تنہا ہی گزری تھی۔ میں نے شادی کی تھی۔ لیکن صرف ایک سال کے بعد بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد پھر دل ہی نہیں چاہا۔

شاید اسی لیے میں اپنے آپ کو بھلانے کے لیے ادھر ادھر گھومتا رہتا تھا۔ ایک عرصے کے بعد کوئی لڑکی مجھے پسند آئی تھی۔ اس کا پس منظر چاہے کچھ بھی ہو۔ خاندان چاہے کچھ بھی ہو۔ لیکن خود وہ بہت اچھی تھی۔

دوپہر کے وقت وہ کالج سے واپس آ گئی تھی۔ وہ جب میرے لیے کھانا لگانے لگی تو میں نے اس سے کہا۔ ”نرگس۔ میں شام کو چلا جاؤں گا۔“

”کیوں؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”ارے میں مسافر ہوں۔ مجھے آگے تو جانا ہے نا۔“

”ٹھیک کہتے ہیں آپ۔“ اس نے ایک گہری سانس

لی۔ ”مسافر تو جانے ہی کے لیے ہوتے ہیں۔ آج نہیں تو کل۔“

”ویسے دل چاہ رہا ہے کہ میں یہیں رک جاؤں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“ میں نے کہا۔

”اس خواہش کی وجہ بھی بتا دیں۔“

”وجہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ مجھے بہت پسند آیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہاں کا ماحول۔ ہر طرف ٹھہرا ہوا حسن۔ اور اور تم لوگ۔“

”تو پھر رک جاؤ۔“ وہ مسکرا دی۔

”رکنا بھی تو مشکل ہے۔“ میں نے کہا۔ ”زندگی رہی تو واپسی میں پھر آؤں گا۔“

وہ اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ غم زدہ ہو گئی ہے۔ کچھ دیر بعد چوکیدار میرے پاس آگیا۔ ”بابو جی۔ نرگس بتا رہی تھی کہ آپ شام کو واپس چلے جائیں گے۔“

”ہاں بابا۔ جانا تو پڑے گا نا۔“

”دو چار دن رک کر جاتے۔ میرا مطلب ہے نرگس کی شادی کے بعد۔“ اس نے کہا۔

”نرگس کی شادی!“ مجھے ایک شاک سا لگا تھا۔ ”کب ہے اس کی شادی۔“

”پرسوں۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ ”شادی کیا ہے۔ بس یہ سمجھ لیں کہ دل پہ پتھر رکھ کر اسے کسی کے حوالے کر رہا ہوں۔“

”آخر کیوں۔ کس کے حوالے کر رہے ہو اسے۔“

”اس کے خالہ زاد بھائی کے۔“ چوکیدار نے بتایا۔ ”ایک نمبر کا بد معاش انسان ہے۔ کسی طرح بھی میری بیٹی کے قابل نہیں ہے۔ لیکن مجبوری ہے۔ ہم نے زبان دے رکھی تھی۔ ویسے میں جانتا ہوں کہ میری نرگس رو رو کر مرجائے گی۔ لیکن کیا کریں۔ رخصت تو کرنا ہے نا۔“

”عجیب آدمی ہو۔ جب یہ جانتے ہو کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ تو پھر کیوں اپنی بیٹی کے ساتھ ظلم کر رہے ہو۔“

”تو پھر کیا کروں میں۔ کون ہے اس کا ہاتھ تھامنے والا۔“

اور اس وقت نہ جانے کس جذبے کے تحت میں بول پڑا۔ ”میں ہوں۔ میں اسے اپنانے کو تیار ہوں۔“

”کیا!“ اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ ”بابو جی تم۔ تم اس سے شادی کر لو گے۔“

”ہاں۔“

پھر میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا کہ میں کون ہوں۔ کیا میرا کاروبار ہے۔ کیا خاندان ہے۔ اور میری

شادی کے ایک سال بعد بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ یعنی میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اور اب میں اپنی آوارہ گردی کی زندگی سے بہت تنگ آچکا ہوں۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ شادی کر کے سکون کی زندگی گزاروں۔“

”بابو جی۔ مسئلہ یہ ہے کہ میری نرگس بہت سیدھی سادی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اس نے مری سے باہر کی دنیا نہیں دیکھی۔ وہ جنگل کا ایسا پھول ہے جو شہر جا کر مرجھا جائے گا۔“

”اس کا تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اسے ہر طرح کا آرام دوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”جو کچھ بھی میرے بس میں ہوگا۔ وہ میں اس کے لیے کروں گا، آگے تمہاری مرضی۔“

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ”بابو جی۔ میں تمہیں بالکل نہیں جانتا ہوں۔ تم ایک مسافر کی طرح یہاں آئے ہو۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں معلوم کہ تم دیکھنے میں اچھے لگتے ہو۔ لیکن تم پر بھروسہ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ اب میں نرگس سے پوچھ لوں کہ وہ کیا کہتی ہے۔“

وہ نرگس سے پوچھنے کے لیے چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے آکر بتایا۔ ”بابو جی۔ نرگس خود تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔“

”کیوں نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بلا واس کو۔“ نرگس شرمائی شرمائی سی میرے سامنے آکر بیٹھ گئی۔ خود میں نے اسے مخاطب کیا تھا۔ ”نرگس تم کو یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں نے تمہارے بابا سے کیا کہا ہے۔“

”ہاں۔“ اس نے اپنی گردن ہلا دی۔ ”اسی لیے تو پوچھنے آئی ہوں کہ آخر کیوں۔ آپ نے مجھ میں ایسی کون سی بات دیکھ لی۔ میں تو ایک سیدھی سادی لڑکی ہوں۔“

”اسی لیے تو میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں کہ تم ایک سیدھی سادی لڑکی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”ورنہ شہر میں بھی لاکھوں لڑکیاں ہیں۔“

”کیا میں شہر میں خوش رہ سکوں گی؟“ ”کیوں نہیں۔“ تم وہاں ایک نئی زندگی گزارو گی۔“ میں نے کہا۔ ”ورنہ تم یہاں رہیں تو تمہاری شادی اس آدمی سے ہو جائے گی جس کو تم پسند نہیں کرتی ہو۔“

”ہاں جی۔“ اس نے ایک بار پھر بڑی معصومیت سے اپنی گردن ہلا دی۔ ”ہماری شادی پرسوں ہونے والی ہے۔“

”اب تم بتاؤ۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی۔“

”آپ بابا سے بات کر لیں۔“

”میں نے بابا سے بات کر لی ہے۔“ میں نے

کہا۔ ”تمہارے جواب کا انتظار ہے۔“

”اگر میں نے ہاں بھی کر دی تو اتنی جلدی کیا ہوگا۔ وہ تو پرسوں برات لے کر آ جائے گا۔“

”تم اس کی بات چھوڑو۔ اپنی بات کرو۔“ میں نے

کہا۔ ”اگر تم راضی ہو، تو ہم کل شادی کر سکتے ہیں۔ ایک دن میں سارا بندوبست ہو سکتا ہے۔ میں ویسے بھی اکیلا انسان ہوں۔ کس کو میری شادی میں شریک ہونا ہے؟“

کچھ دیر بعد چوکیدار بھی ویں آ گیا تھا۔ نرگس نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ شاید اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہوگا۔ پھر اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد چوکیدار نے کہا۔ ”بابو جی۔ نرگس اس شادی کے لیے تیار ہے اور میں بھی تیار ہوں۔ میں انہیں منع کر دیتا ہوں کہ انہیں برات لے کر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آج ہی خاموشی سے تم دونوں کی شادی کروا دیتا ہوں۔ شادی کے بعد تم اپنی ولہن کو لے کر چلے جانا یہاں سے۔“

”بابا۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔“ میں نے

کہا۔ ”تمہیں یہاں اکیلے کیا کرنا ہے۔“

”نہیں۔ یہ مشکل ہو جائے گا۔ مجھے یہیں رہنے دو۔ وہ دھیرے سے بولا۔ ”اس عمر میں مجھے کہاں جانا ہے۔ یہاں میرے باپ دادا کی قبریں ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کرنا ہوں۔ خود بھی اسی مٹی میں مل جاؤں گا۔ اسی لیے مجھے یہیں رہنے دو۔ بس تم دونوں خوش رہو، مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“

اب صرف ایک دن رہ گیا تھا۔

میرے پاس اے نی ایم کارڈ کے علاوہ ٹریولرز چیک بھی تھے۔ پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے دوسری صبح بابا اور نرگس کو اپنے ساتھ لیا اور مری آ گیا۔

یہاں میں نے شاپنگ کی۔ اپنے لیے، نرگس کے لیے اور بابا کے لیے۔ دوسٹ زیورات، کچھ کپڑے، اس دوران میں بابا نے اپنے کچھ دوستوں کو بتا دیا تھا کہ رات کو اس کی بیٹی کا نکاح ہونے والا ہے۔

بابا کے پاس کچھ پیسے تھے۔ جو شاید اس نے اسی دن کے لیے جمع کر کے رکھے ہوں گے۔ اس نے اپنے پیسوں سے پندرہ بیس لوگوں کے لیے کھانے کا بندوبست کیا تھا۔ بہر حال مختصر یہ کہ اسی رات کو نرگس سے میری شادی

ہو گئی۔

وہ میری زندگی کی سب سے خوبصورت رات تھی۔

نرگس جیسی لڑکی میری زندگی کی ساتھی بن چکی تھی۔ دوسری صبح پورا ماحول نرگس کی وجہ سے اور بھی خوبصورت ہو گیا تھا۔

اور وہی دن نرگس کی وہاں سے رخصتی کا تھا۔

وہ اپنے باپ سے لیٹ لیٹ کر روئے جا رہی تھی۔

”بابا۔ کون تمہارا خیال رکھے گا۔ تم تو ویسے ہی بیمار رہتے ہو۔ کون تمہارا خیال کرے گا بابا۔“

”خدا خیال رکھے گا بیٹا۔“ بابا اس کو پیار کرتے ہوئے بول رہا تھا۔ ”تم میری فکر مت کرو۔ میں اب بہت خوش ہوں۔ بہت سکون ملا ہے مجھے۔ تم اپنے گھر کی ہو گئی ہو۔ ایک باپ کو اس کے علاوہ اور کیا چاہئے کہ اس کی بیٹی آرام سے رہے۔“

بہت ہی جذباتی منظر تھا۔ خود میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔

میں نرگس جیسی ولہن کو لے کر شہر واپس آ گیا تھا۔

یہاں میرا اپنا اپارٹمنٹ تھا۔ جس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

میں نرگس کی اداسی دور کرنے کے لیے ہر ممکن جتن کرتا رہتا تھا۔ میں نے مری سے چلتے ہوئے ایک موبائل سیٹ خرید کر بابا کو دے دیا تھا تاکہ نرگس سے اس کا رابطہ رہ سکے۔

شہر آنے کے تیسرے دن میں نے ولیمہ بھی کیا تھا۔

رشتے دار تو تھے نہیں۔ صرف دوست آئے تھے۔ میں نے اس دن نرگس کو ایک بیوٹی پارلر سے تیار کروایا تھا۔ سب ہی اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔ وہ کسی خوبصورت پری کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

میرے دوستوں نے دل کھول کر میرے انتخاب کو سراہا۔ مبارکبادیں دیں۔ اس دن نرگس اپنے بابا سے بہت دیر تک باتیں کر چکی تھی۔ اسی لیے مطمئن بھی دکھائی دے رہی تھی۔

زندگی پر سکون انداز سے گزرنے لگی۔

نرگس انتہائی وفادار اور سعادت مند بیوی ثابت ہو رہی تھی۔ اس نے خدمت، محبت اور اطاعت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

میرے دوست کہا کرتے۔ ”بھائی تم بہت خوش نصیب ہو۔ ایسی بیوی مقدر سے ملتی ہے۔“

”یہ تو ہے۔“

شہر کا ماحول اور یہاں کی زندگی نرگس کے لیے بہت حیران کن ثابت ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ یہاں آکر بہت خوش ہو۔ اور کبھی ایسا لگتا کہ اداس ہو گئی ہو۔ چونکہ پڑھی لکھی تھی۔ اس لیے اس نے بہت جلدی اپنے آپ کو یہاں کے ماحول میں ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ اس نے ایک بار مجھ سے کہا۔ ”سنیں۔ میں اکیلی دن بھر گھر میں رہتی ہوں کیا میں کسی سے دوستی کر لوں۔“

”ارے ضرور کرو۔ آس پاس کے اپارٹمنٹس میں درجنوں عورتیں ہیں۔ تمہارے پڑوس میں دو چار لڑکیاں ہیں۔ کسی سے بھی دوستی کر لو، کون روکتا ہے تمہیں۔“

اور اس نے میری اجازت سے دوست بنانے شروع کر دیئے۔

وہ چونکہ خود بہت اچھی تھی۔ ہر ایک کے دکھ درد میں کام آنے والی۔ اس لیے کئی عورتیں اور لڑکیاں اس کی دوست بن گئیں۔

مجھے بھی اطمینان ہو گیا کہ وہ اب ایک نارمل زندگی گزار رہی ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ مجھے اپنے بزنس کے سلسلے میں ایک مہینے کے لیے دہلی جانے کی ضرورت پڑ گئی۔ میں نے نرگس سے پوچھا۔ ”نرگس یہ بتاؤ۔ کیا میری غیر موجودگی میں تم رہ سکو گی۔“

”کیوں نہیں۔“ اس نے بڑی خود اعتمادی سے جواب دیا۔ ”آس پاس کی عورتیں میری دوست بن گئی ہیں۔ وہ میرا خیال رکھیں گی۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں اور ویسے بھی مجھ میں اتنی خود اعتمادی تو آ ہی گئی ہے۔“

اور میں بے فکر ہو کر دہلی چلا گیا۔

جب ایک مہینے کے بعد میری واپسی ہوئی تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ سب کچھ سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس نے گھر بدل لیا تھا۔ یا اس کی صورت شکل میں تبدیلی ہو گئی تھی۔ یا وہ بے وفا ہو گئی تھی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ تبدیلیاں یہ ہوئی تھی کہ اب وہ غصہ کرنے لگی تھی۔ کبھی کبھی زبان بھی چلانے لگتی جو اس کے مزاج کے بالکل خلاف تھا۔

کچھ دنوں کے بعد اس نے باقاعدہ لڑنا بھی شروع کر دیا تھا۔ خدا جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ میں نے تو اس کے ایسے مزاج کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔

آسان الفاظ میں سمجھ لیں کہ وہ شہر کی ان گنت بیویوں کی طرح ہو گئی تھی جو اپنے شوہروں کی زندگیاں حرام

جناب ایڈیٹر سرگزشت
موقیانہ سلام!

یہ سرگزشت گوکہ پرانی ہے لیکن اپنے دامن میں سبق لیے ہوئے ہے۔ ہمارے علاقے سے ذرا دور کے علاقے کی ہے۔ مامتا کا جذبہ انسانوں اور حیوانوں دونوں میں ہوتا ہے مگر انسان اپنے مفاد کی خاطر کبھی کبھی اس جذبے کو چھوڑ دیتا ہے اور تب حیوان سبق سبق سکھاتا ہے۔ امید ہے یہ واقعہ سرگزشت کے قارئین کو نئے پن کی وجہ سے پسند آئے گا۔

محمد ایاز راہی
(مانسہرہ)



کہانیاں آپ نے بہت سی پڑھی ہوں گی اور سنی بھی ہوں گی۔ آج ایک کہانی میں بھی سنا رہا ہوں جس کا ایک خاموش کردار میں بھی ہوں۔ مگر میں اپنی زبانی یہ کہانی سناتا ہوں تو اتنا مزہ نہیں آئے گا اس لیے بیانیہ انداز میں یہ

کہانی سن رہا ہوں۔ شانہ ہمارے ہی گاؤں کی الہڑنیار تھی۔ اس دن نیند اس کی خوبصورت آنکھوں سے کوسوں پرے تھی بلکہ اس وقت اس کے آنے کا سوال ہی ناپید تھا۔ اچھی رذیل خواہش کے بیجان آور منہ زور جذبے نے اسے

مطابق حق حق کرتی رہی تھی کہ خواجہ وقت برباد ہوا ہے۔ اس رات بستر پر لیٹ کر میں نے نرگس کے مزاج اور رویے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ آخر ایسا کیوں ہوا تھا۔ اس لڑکی نے اپنے آپ کو کیوں بدل لیا تھا۔ کیوں؟ پھر اچانک ذہن کے در پیچے کھلے اور کھلتے چلے گئے۔ دوسری صبح میں شاید اپنی زندگی کا سب سے بڑا اور سب سے انوکھا فیصلہ کر چکا تھا۔ میں نے ایک ہفتے کے اندر اندر اپنا سارا کاروبار سمیٹ دیا۔ اور جتنی رقم ملی وہ بینک میں جمع کرادی۔

میں نے نرگس کو ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا۔ اسے اس وقت بتا چلا جب میں اپارٹمنٹ اور گاڑی بھی بیچ چکا تھا۔ ”یہ آپ نے کیا کر دیا؟“ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”مری میں ہونے لگا رہا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ کیوں۔“

”یہ میں وہیں چل کر بتاؤں گا۔“ وہ شہر چھوڑنے کے نقصانات پر لپکھ رہی تھی۔ لیکن میرا فیصلہ اٹل تھا۔ میں نے شہر چھوڑ دیا۔ اور نرگس کو لے کر مری آ گیا۔ ہونٹ کی بات پہلے ہو چکی تھی۔

اسی ریسٹ ہاؤس کے برابر میں ریسٹ ہاؤس ہی کی طرز کا ایک مکان فروخت ہو رہا تھا۔ میں نے وہ بھی خرید لیا۔ بابا ابھی تک زندہ تھے۔ ان کی بھی حیرت اور خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ اور میں نے اس لیے کیا تا کہ چڑیا گھر میں آئے ہوئے سفید بھالو کی موت نے میرے ذہن کے در پیچے کھول دیے تھے۔ اور مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اگر کسی کو اس کے ماحول، اس کی تہذیب اور اس کی مٹی سے اکھیر دیا جائے تو پھر یا تو اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ یا اس کی زبان چلنے لگتی ہے۔

اب میں بہت سکون سے ہوں۔ مری میں ہونٹ چلاتا ہوں۔ رات کو واپس آتا ہوں تو نرگس میرے انتظار میں ہوتی ہے۔ اس کی سعادت مندی، فرمانبرداری اور لہجے کی نرمی ایک بار پھر واپس آ گئی ہے۔

اس وقت بھی تیز بارش ہو رہی ہے۔ اور میں اپنے گھر کے برآمدے میں بیٹھ کر یہ کہانی تحریر کر رہا ہوں۔ نرگس میرے لیے گرم چائے رکھ کر اچھی اچھی کچن کی طرف گئی ہے۔



کر کے رکھ دیتی ہیں۔ وہ اب مجھ پر شک بھی کرنے لگی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس قسم کا شک عورت کی فطرت میں شامل ہے لیکن کیا ضروری تھا کہ نرگس بھی ایسی ہو جاتی۔

ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔ ”نرگس ایک بات بتاؤ۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔“

”کیوں۔“ مجھے کیا ہونے لگا۔ ”وہ چپک کر بولی۔“ ”تم ایسی تو نہیں تھی۔ اب ذرا ذرا سی بات پر زبان چلانے لگتی ہو۔“

”واہ۔ عورتیں ٹھیک ہی کہتی ہیں کہ مرد کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ چاہے اس کے لیے کچھ بھی کر جاؤ، وہ بیوی کو برا ہی سمجھتا رہے گا۔“

میں سمجھ گیا کہ میں نے اسے اس پاس کی عورتوں سے دوستی کی اجازت دے کر خود اپنے پیروں پر کلبھاڑی مار لی ہے۔ یہ سارا فساد ان ہی عورتوں کا تھا۔

لہذا میں نے پہلی فرصت میں یہ کیا کہ کسی بہانے سے وہ اپارٹمنٹ فروخت کر کے دوسری جگہ شفٹ ہو گیا۔ کچھ دنوں تک تو سکون رہا، پھر وہی کھل کھل شروع ہو گئی۔

اس نے یہاں بھی کچھ عورتوں سے دوستی کر لی تھی۔

ایک سیدھی سادی پہاڑی لڑکی نے شہر آ کر اپنے ہاتھ پاؤں نکال لیے تھے۔ پرانیم یہ بھی کہ میں اس پر سختی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور نہ ہی کسی قیمت پر اسے چھوڑ سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی ان حرکتوں کے باوجود مجھے اس سے بے انتہا محبت تھی۔ لیکن اس کی سعادت مندی، فرمانبرداری اور خاموشی وغیرہ نہ جانے کہاں رخصت ہو گئی تھی۔

ایک دن میں نے اس کے خوش گوار موڈ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نرگس۔ کیا خیال ہے آج شام کو زچلوگی۔“

”وہ کیوں۔ ایک بار تو جا چکی ہوں۔“

”پرسوں وہاں سامبر یا سے سفید بھالو لا کر رکھا گیا ہے۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”یہ ایک نایاب نسل کا جانور ہے۔ اور پاکستان میں پہلی بار آیا ہے۔“

”اچھا۔“ وہ کچھ سوچ کر خوش ہو گئی تھی۔ ”پھر تو ضرور چلوں گی۔“

شام کے وقت میں اسے چڑیا گھر لے آیا۔ اور یہاں آ کر ایک افسوسناک خبر سننے کو ملی کہ وہ بھالو رات ہی کو مر گیا تھا کیونکہ یہاں کی آب و ہوا اسے راس نہیں آئی تھی۔

ہم بہت بور ہو کر واپس آئے تھے۔ نرگس عادت کے

اندھا کر رکھا تھا۔ گھر، شوہر حتیٰ کہ ننھے ننھے دو بچے بھی اسے راستے کی دیوار لگ رہے تھے جسے گرانے یا پھلانگنے میں فی الوقت اسے کوئی عار نہیں تھا، ایسے میں اس کی مامتا سمو چاہنا وجود کھوٹتی تھی۔ جسمانی امیگوں اور خواہشات کے ریلے میں جذبہ امومت (ماں پن) خس و خاشاک کی مانند بکھر کر فنا ہو چکا تھا وہ بار بار بے چین ہو کر بستر پر اٹھ بیٹھتی تھی۔ اپنے ارد گرد سوائے ہونے معصوم بچوں اور خاوند پر ایک گہری نظر ڈالتی، لمحہ بھر غور سے انہیں دیکھتی اور پھر خلاؤں میں کچھ دیر گھور کر لیٹ جاتی۔ بچوں اور خاوند کے ڈر سے زیادہ اپنے ارادے کی ناکامی کا اندیشہ اسے گھیرے ہوئے تھا۔ اس نے ہر صورت گھر سے بھاگنے کی ٹھان لی تھی۔ ایک طرف اگر عیار نفس اسے بار بار احتیاط کی تاکید کر رہا تھا تو دوسری طرف سفلی خواہش کا زور اسے شعلہ بہ جان رکھے ہوئے تھا۔ امید اور خوف کی یہ اعصاب شکن کھینچا تانی بہت کٹھن بہت ہی بھاری تھی مگر بچپن کی ہٹ دھرم اور ضدی فطرت بھی اس کی مکمل پشت پناہی کر رہی تھی۔ اپنی ہر بات پر اڑے رہنا اسے منوانے کی خواہش وقت بھی اسے جھوٹی انا اور کھوکھلے غرور میں جکڑے ہوئے تھی۔ ہوش و خرد اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ گھر کی محدود فضا بری طرح سبھی ہوئی تھی کہ ایک ماں اپنا تقدس اور مامتا کو پاؤں تلے روندنے پر تکی ہوئی تھی۔ اوپر چھت میں شہتر کے ساتھ گونسلا بنا ہوا تھا جہاں چڑیا سوتی جاگتی کیفیت میں پروں تلے اپنے پوتوں کو سینے پیٹتی ہوئی تھی۔ ان بچوں کے خود فیصل ہونے اور اڑان بھرنے تک چڑیا کا انہیں چھوڑ کر جانا ناممکن تھا جبکہ حسین مگر جاہل شہانہ اپنے بچوں کو چھوڑنے پر کمر بستہ تھی۔ آدی کا کیا بھروسہ۔ گرنے پر آئے تو جانوروں اور کیڑے مکوڑوں سے بھی پست اور ذلیل بن بیٹھتا ہے۔ کوئی رشتہ کوئی تعلق آڑے نہیں آ پاتا۔ اس سے ایک ہی خیال شہانہ کو گھر سے نکل جانے پر اکسار رہا تھا۔ ”میرے بچپن کا ساتھی اور محبوب میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ مجھے جانا ہے۔ جلدی جانا ہے اور پھر ہم دونوں کو دور، بہت دور اپنے من کی دنیا بسائی ہے جہاں خوشیاں ہی خوشیاں ہوں گی اپنی مرضی سے جینا اور جیون گزارنا ہوگا۔“

بالآخر اس کی دانست میں میاں اور بچوں کی نیند سمیت رات بھی گہری ہوئی تو وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ خواہشوں کی آگ میں جلتے ہوئے جسم پر چادر لیٹی، پاؤں میں احتیاط سے جوتے پھنسائے اور گرہ قدمی سے بیرونی

دروازے کا رخ کیا۔ اجانک ایک بچہ نیند میں کسمپاس کے بڑبڑایا۔ ”امی۔“ شبانہ ٹھٹھک کے رک گئی دل یکبارگی اچھل کر حلق میں آگیا، سانسیں رکیں اور گلا خشک ہو گیا۔ پھیلے ہوئے دیدے اور پھٹی نگاہیں بچے پر جم گئیں لیکن نیند میں ڈوبا بچہ پھر سے بے سدھ ہو گیا۔ اس نے ایک نظر دوبارہ اپنے شوہر پر ڈالی جو بظاہر بھرپور نیند میں لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ شبانہ کو یقین کی حد تک خوش فہمی تھی کہ دن بھر کھیتوں میں کام کرنے والا اس کا تھکا ہارا خاوند اب صبح کی خبر ہی لائے گا تب تک وہ اس کی دست رس سے دور، کٹھن دور جا چکی ہوگی اور ایک آزاد پرندے کی سی زندگی اس کا مقدر ہوگی۔ اس نے آہستگی سے بیرونی دروازے کی چنجی اتاری، ایک پٹ نیم وا کیا اور باہر نکل گئی۔

شک میں مبتلا شبانہ کا شوہر جو بظاہر خود پہ گہری نیند طاری کیے ہوئے تھا تیزی سے اٹھا، پیروں میں جوتے اڑے۔ حن میں پڑی کپھاڑی اٹھائی اور بیوی کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔

☆☆☆

صوبہ سرحد ہزارہ کی حسین و جمیل اور شاداب وادی، وادی پکھل جہاں قدرتی حسن، معدنی دولت سے مالا مال ہے وہاں صد ہا پرانی ریت، روایات اور بھرپور آثار بھی اس کا گہنا ہیں۔ ندی سرن کے دونوں کناروں پہ آبادی بستر گاؤں بڑے بوڑھوں کا ساتھ تقدس لیے آج بھی قدیم ثقافت کے امن ہیں اور میدان پکھل کے اندر نیز اس کے قرب و جوار میں سیکڑوں برس پرانے کھنڈر اس کی سوقت اور عظمت کی دلیل ہیں۔ ہزاروں برس پہلے قبل از مسیح کے پتھروں پر کندہ مہاراجا اشوک کے فرامین۔ اس سے بھی کہیں پہلے آریا آمد کی ہندو آبادی اور آباد کاری۔ ہندو مذہب کی طبقاتی تقسیم، پھر بدھ مت کا احیاء اور عروج، ہندو متدر، بدھ خانقاہیں، تیموری ترکوں کا میدان پکھل کو مرکز بنا کر وسیع علاقے پر حکومت کرنا، عروج و زوال سے گزرتا، مثل شہنشاہوں کی گزرگاہ، میدان پکھل پر سواتی قوم کی یلغار اور فتح، پاکستان بننے پر ہندوؤں کی نقل مکانی، ان کی جگہ مسلمانوں کا پھیلاؤ، ان تمام ادوار کی بازگشت اور گونج سے پکھل کی فضا معمور ہے۔ جنت نظیر کشمیر کو جانے والی ایک بڑی شاہ راہ آج بھی وادی پکھل کے قریب سے ہو کر نکلتی ہے۔ عالمی شہرت یافتہ جمیل سیف الملوک یہاں سے صرف چار گھنٹوں کی مسافت پر ہے۔ شاہ راہ ریشم جو ملک چین تک دراز ہے۔

وادی پکھل کی حد فاصل ہے۔ میدان پکھل کے نشیب و فراز اور کوہ جنگلات کی سربہ فلک بلندی انسانی عزم و ہمت کو للکارتی دعوت دیتی نظر آتی ہے۔ سر دیوں کی آمد پر شمال کی جانب سے خانہ بدوش گروہ اور قبیلے ادھر کا رخ کرتے دکھائی دیتے ہیں اس لیے کہ موسم سرما میں برف سے ڈھکی وادیاں کسی سوتیلی ماں کی طرح سرد مہر، سنگ دل ہو جاتی ہیں اور عام آدمی کو دیس نکالا دے ڈالتی ہیں ایسے میں وادی پکھل متا سے بھرپور ماں کی طرح باہنیں کھولے آغوش وا کیے آنے والے ارضی بیٹوں بیٹیوں کا استقبال کرتی ہے نہ صرف انسان بلکہ چرند پرند بھی شمال کی برقی فضاؤں سے آکر وادی پکھل میں زندگی کی حرارت، نرمی اور جوش سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

شبانہ کے ماں باپ بھی اسی وادی پکھل کے ایک بڑے قصبے کے باسی تھے جہاں علاقے کے خوانین نے تجارت، کاروبار اور دیگر ہتھکنڈوں سے بچے گاڑ رکھے تھے۔ وہ خود یا ان کے گماشتے ہر بازار میں آدمیت کا لبادہ اوڑھے مخلوق خدا کی ہڈیاں تک چبانے پر عمل پیرا تھے۔ کچھ آدمی نما بھیڑیے سود پر قرض کے کاروبار میں ملوث تھے مگر خفیہ طریقے سے، انتہائی رازداری کے ساتھ کام کرتے تھے۔ ہندوگان خدا کی مجبوریاں غربت کی جکڑ بندیاں لوگوں کو ان درندوں کے آگے باندھ بیٹھتی تھیں کہ عام روزگار کے مواقع ناپید تھے۔ خوانین طبقہ علم و ہنر اور خوش حالی کی راہ میں سد سکندری بنا کھڑا تھا کیونکہ علم و ہنر سے محروم مجبور لوگ ہی ان خوانین امراء کا سرمایہ تھے یہی دولت ان کی طاقت ان کا وقار تھی۔ مزدور کا پسینا ان کے چہرے کی تازگی تھی۔ شبانہ کا باپ بھی اک عام سا مزدور تھا۔ باپ دادا کی ورثے میں ملی ہوئی جھونپڑی ہی اس کا کل اثاثہ تھی جہاں گھریلو آرائش اور ساز و سامان کی جگہ مفلسی کے دیکتے انگاروں کا راج تھا، کھیتوں، کھلیاؤں اور قصبے کے بازاروں کی مزدوری ہی شبانہ کے باپ کا مقدر تھی، مزدوری کی تلاش اسے گھمائے رکھتی پھر بھی دونوں میاں بیوی سوکھی کھا کر اللہ خیر الرازقین کا شکر ادا کرتے اور پانچوں وقت سجدہ گزار رہتے۔ پھکی محسب، اجاڑ شامیں، رنگ نہ روپ، کبھی کبھی دیہاڑی نہ لگتی تو شبانہ کا باپ جال لے کر ندی سرن کا رخ کرتا اور مچھلیاں پکڑ کر فروخت کرتا۔ ندی سرن کا کشادہ دامن اسے کبھی بھی مایوس نہ کرتا۔ وہ وہاں سے مقدور بھر اور حسب ضرورت جھولی بھر کے ہی لوٹتا، بازار سے بچی ہوئی

ثالمی (Ptolemy)

مصر کے یونانی بادشاہوں کا خاندان، جس نے 345 ق م سے 40 ق م تک حکومت کی۔ ثالمی اول نے جو سکندر اعظم کا ایک جرنیل تھا، 323 ق م میں مصر پر قبضہ جمایا اور اسی نام کے بادشاہ کے بعد دیگرے اس کے جانشین بنے۔ آخری بادشاہ ثالمی پنچ دہم ملکہ قلوپٹرہ کا پوتا تھا۔

ثالین

خلیج فن لینڈ کے جنوبی ساحل پر ایسٹونیا کی بحری بندرگاہ اور دارالحکومت، اس کی بنیاد 1219ء میں رکھی گئی تھی۔ یہ ینسک لیگ کا رکن بھی رہا۔ 1561ء میں یہ سویڈن اور 1750ء میں روس کی عملداری میں چلا گیا۔ یہاں تیرہویں صدی عیسوی کا بنا ہوا ایک قلعہ بھی ہے۔ اہم صنعتوں میں بجلی، پارچہ بافی اور کاغذ کی صنعتیں شامل ہیں۔ تیل کے کنوؤں کی کھدائی کے لیے مشینری بھی تیار ہوتی ہے۔ 1917ء تک اس کا نام ریول (جرمن) تھا۔

ٹامس کپ

بیڈمنٹن کے عالمی مقابلے کے کپ کا نام۔ اس کی حیثیت وہی ہے، جوٹینس میں ڈبوس کپ کی ہے، گو اس کا سرکاری نام انٹرنیشنل بیڈمنٹن چیمپئن شپ ہے، لیکن چاندی کی یہ خوبصورت صراحی تمام دنیا میں ٹامس کپ کے نام سے مشہور ہے۔ عالمی بیڈمنٹن چیمپئن شپ کے بارے میں 1939ء میں انٹرنیشنل بیڈمنٹن فیڈریشن نے سنجیدگی سے غور کیا اور اس کے صدر جارج ٹامس کی طرف سے یہ کپ مقابلے میں رکھا گیا۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کی وجہ سے یہ مقابلے فوراً نہ ہو سکے۔ پہلا مقابلہ 1948ء میں ہوا۔ یہ مقابلے ہر تین سال بعد ہوتے ہیں۔ ابتدائی مقابلوں کے لیے اسے چار علاقوں (زون) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ چاروں علاقوں کے فائنل جیتنے والے ملک یہ کپ حاصل کرنے کے لیے چیمپئن ملک کے خلاف کھیلتے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ دو مسلم ممالک ملائیشیا اور انڈونیشیا کے کھلاڑی بیڈمنٹن کے ان مقابلوں میں سرفہرست رہتے ہیں۔

مرسلہ: عارف اللہ، کراچی

دو سال کے کسی بچی کو شے میں اور ملک گھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 7,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 6,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ شمیر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیئر 11 سٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی من کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 ٹیکس: 35802551

اسے کسی حور جمی بہو کی تلاش تھی کہ اکلوتا بیٹا بھی مردانہ حسن کا نمونہ تھا۔ شبیر اپنے کام سے کام رکھنے والا نوجوان تھا، فارغ وقت میں اپنے جیسے ہی گئے تھے دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا۔ اس کی ماں بیٹے کے لیے شریک حیات کی تلاش میں گاؤں سے مایوس ہوئی تو اس نے ارد گرد کی بستیوں کا رخ کیا۔ ہفتوں خاک چھاتی پھری اور سندھ بہو لانے کی چاہ سواہتی گئی۔ یہ چاہ کیوں نہ ہوئی کہ ایک ہی تو بیٹا تھا اس کا۔ بہن بھی نہیں تھی کوئی۔ چنانچہ بہو کے روپ میں بیٹی کا ارمان بھی پورا کرنا تھا اور پھر خوبصورت پوتے پوتیوں کا تصور جو تو گرم رکھتا۔

شبیر کا باپ بیوی کی دیوانگی پر اکثر ہنس پڑتا۔ کبھی جھڑک بھی دیتا کہ ارے اونا دان عورت۔ زمین پہ رہ کے آسمان کی کیوں سوچتی ہے۔ مگر حسن کی بچی شبیر کی ماں سنی ان کی کردیتی۔ بالآخر اس کی کھوج شبانہ کے وجود پہ آ کے ختم ہوئی۔

غریب گھر کا یہ گوہر شب تاب اسے بری طرح بھا گیا، یوں پہلی ملاقات میں ہی اس نے شبانہ کے والدین پر واضح کر دیا کہ آپ کی تمام شرائط سارے مطالبے مجھے منظور ہیں لیکن شبانہ اب میری ہے۔ شبانہ نے سنا تو وہ بدگ اٹھی۔ شبانہ کی ہٹ دھرمی اور اڑیل مزاج سے تمام رشتے دار اور محلے والے خوب واقف تھے اس لیے اسے اپنانے بیانے میں پس و پیش کا شکار تھے جبکہ شبیر کی ماں فی الحال ان باتوں سے بے خبر تھی۔ شبانہ کے والدین اس رشتے پر بڑے خوش تھے کہ لڑکا اکلوتا اور گھر جائیداد کا واحد وارث ہے مگر شبانہ کی صورت مان کے نہیں دے رہی تھی۔ آخر ماں نے شبانہ کو قطعی طور پر گھیرا تو اس کے دل کا چور پکڑ لیا۔ اس پر ماں نے اپنے طور پر خط کے ذریعے کراچی تکلیل کے ماں باپ سے رابطہ کیا۔ بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں خط ہی عام رابطے کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ پہلے تو تکلیل کے والدین نے پرواہ ہی نہ کی آخر ش بہت اشتہار پر روکھا سا جواب دیا کہ ابھی ہمارا لڑکا پڑھ رہا ہے اور پھر ضروری نہیں کہ ہم اپنے خاندان سے ہی لڑکی بیاہیں گے۔ اس صورتحال پر شبانہ تلملا کر رہ گئی۔ ماں نے آخری بار بیٹی کو سمجھایا۔ ”دیکھ شبانہ، شبیر ماں باپ کا اکلوتا ہے۔ مندوں کا جھنجٹ نہ دیو جیٹھ کا جھگڑا۔ اور پھر صاحب جائیداد بھی ہے۔ تو وہاں راج کرے گی راج۔“

شبیر کی ماں مسلسل پھیرے لگا رہی تھی۔ ہر بار تحفوں

تھکیل کا باپ کراچی کے کسی سرکاری ادارے کا ملازم تھا سال میں ایک آدھ بار ہی گھر آتا اور کچھ دن گزار کے چلا جاتا۔ شبانہ کو مدرسے میں داخل کیا گیا مگر وہ اکثر جی چڑھتی۔ ایک دن جاتی تو دو دن نام بھی نہ لیتی۔ حروف والفاظ اسے ریختے ہوئے کن کھجوروں اور چھکلیوں کی مانند لگتے جن سے وہ وحشت کھاتی۔ ان پڑھ اور کم فہم ماں باپ تو شبانہ کی خوشی میں خوش تھے۔ ان کے نزدیک شبانہ کے علاوہ ہر چیز ثانوی اور فضول تھی۔ سو، شبانہ بالکل آزاد تھی۔

وقت کا دریا بہتا رہا۔ شبانہ کے من، ذہن اور آنکھوں میں تکلیل کی صورت بنی جتنی اور پختہ ہوتی گئی۔ لڑکپن نے ساتھ چھوڑا تو شبانہ کا دل تکلیل کے نام پر دھڑکنے لگے۔ نینوں کے دیپ تکلیل سے ملتے ہی لودے اٹھتے۔ مگر تکلیل اسے سٹپلی جذبے اور بے باک نگاہوں سے ہی دیکھتا آوارگی کی تسکین حاصل کرتا۔ اس کی مہکتی بہکتی نظر میں ہر کئی کے گرد منڈلاتیں رقص کرتیں اور سیرور کشید کرتی تھیں۔ خاندان کی سبھی لڑکیاں اس کی امیدوار تھیں مگر وہ کسی سے بھی وفادار نہیں تھا۔ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تکلیل ابھی دسویں میں ہی تھا کہ اس کے باپ نے اچانک سب گھر والوں کو کراچی لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں ایک ماہ کے اندر ہی تکلیل اپنے گھر والوں کے ساتھ کراچی چلا گیا۔ اس غیر متوقع صورتحال پر شبانہ بری طرح بوکھلا گئی۔ کئی دنوں تک وہ روہانسی شکل لیے تکلیل کی یاد میں تڑپتی رہی۔ من سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ دل ڈوبتا ابھرتا رہا۔ ذہن بگولے کی مانند چمکراتا رہا۔ ماں باپ اسے بچی سمجھ کر بہلاتے رہے۔

وقت کا مرہم اپنا کام کرتا رہا شب و روز کی بدلتی مرہم بچوں سے شبانہ قرار پکڑتی گئی۔ بالآخر زخم مر جاتا ہوا گھر مٹا نہیں۔ وقت کی دھول سے اک کھرندھی جم گئی۔ زخم اندر ہی اندر موجود رہا۔

قصبے سے دو کوس کے فاصلے پر ندی سرن کے کنارے شبیر کا گاؤں آباد تھا یعنی وہ گاؤں جس میں ہم بھی رہتے تھے۔ وہ ماں باپ کا اکلوتا ایک سیدھا سادہ محنت کش نوجوان تھا جو دن بھر اپنے باپ کے ہمراہ بھتی باڑی کرتا۔ اپنا مکان اور معقول سی زمین بھی تھی جس کی فصلی پیداوار سے ان کی گزر بسر خوش حالی سے ہو رہی تھی۔ شبیر کی ماں ایک سلیقہ مند اور گزشتن عورت تھی۔ کشادہ ذہن اور میانہ روی کی عادت سے اس نے گھر کو جنت بنا رکھا تھا۔ سو اس جنت کے لیے

ایک آدھ مچھلی گھر کھانے کے لیے لے آتا۔ گھر میں مچھلی کا پیٹ چاک کرتے اسے قصبے کہانیوں کا وہ روایتی چھیرا یاد آ جاتا جسے مچھلی کے پیٹ سے ہیرا یا قیمتی انگلیں مل جاتی ہے اور وہ اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کر کے انعام و اکرام پاتا ہے مگر شبانہ کا باپ ہر بار مچھلی کا خالی پیٹ دیکھ کر ہنس پڑتا اور بیوی سے کہتا۔ ”نیک بخت۔ اپنی ایسی قسمت کہاں۔“

لوگ کہانی کے پس منظر سے آگاہ بیوی بھی مسکرا دیتی۔ شادی کے تیسرے برس غیر معمولی حسن لیے شبانہ نے جنم لیا تو باپ کو یوں لگا جیسے مچھلی کے پیٹ سے ہیرا یا قیمتی انگلیں اب برآمد ہوئی ہو۔ لیکن شاید باپ نہیں جانتا تھا کہ شبانہ کی صورت گھر میں مفلسی کے انگاروں میں ایک اور دیکھتے انگارے کا اضافہ ہوا ہے۔ بہر حال پہلو تھی کی اولاد تو ہر کسی کو پیاری ہوتی ہے چاہے وہ معذور بچہ ہی کیوں نہ ہو جبکہ شبانہ تو ظاہری خوب صورتی کے تمام استعارے ساتھ لائی تھی۔ اڑوس پڑوس کی عورتوں نے اسے دیکھا تو حیرت اور خوشی کا اظہار کیا۔ ”اللہ کتنی پیاری بچی ہے۔“

”اے بہن۔ نذر نیاز اتارو۔ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔“

”ارے جلدی سے تعویذ بنوا کر ڈالو اسے۔“

”بھائی مبارک ہو۔ گھر میں لکشی آئی ہے۔“

”واہ۔ بچی ہے کہ سفید گلاب۔“

ماں کا خون سیروں بڑھتا رہا کہ اس کی تنہائی کا اس قدر خوبصورت مداوا ہو گیا تھا۔ پہلے جب شبانہ کا باپ صبح کام کے لیے گھر سے نکلتا تو ماں تنہائی سے گھبرا کر محلے میں نکل جاتی اور ادھر ادھر گھروں میں دوسروں کے بچوں سے دل بہلاتی۔ وقت کاٹنے نہ کنتا۔ مگر اب قدرت نے اسے ایک جیتی جاگتی گڑیا سے نواز دیا تھا۔ پشتو میں بیٹی کو پرائے ڈھیر کی مٹی کہا جاتا ہے۔ خاص مٹی سے بنی شبانہ بے جالاؤ پیار میں پلتی بڑھتی رہی۔ بچپن نے گھر کے آنگن سے باہر کا رخ کیا تو شبانہ کا زیادہ وقت اپنے چچا زاد تکلیل کے ساتھ کھیل کود میں گزرنے لگا جو اس سے تقریباً تین برس بڑا تھا، تکلیل اپنے نام کی طرح وجیہہ و تکلیل مگر بھونرا ذہن کا حامل تھا۔ بھونرا جو ہر پھول پر بیٹھتا۔ رس چوستا اور اڑ جاتا ہے۔ تکلیل سب ہم جولیوں کے ساتھ کھیلتا۔ ان کے کھلونے چیتنا اور توڑ مروڑ کے پھینک دیتا۔ لڑکپن آیا تو اس کا ہر جانی پن سوا ہو گیا لیکن اس کی خوبصورتی، شوخی اور چستی اس عیب پر پردہ ڈالے رہی۔

مولانا جامی

23 شعبان 917ھ - 7 نومبر 1414 کو

نور الدین عبدالرحمن المعروف مولانا جامی ایک بہت بڑے عالم دین، صوفی اور بلند پایہ فارسی شاعر تھے، والد کا نام نظام الدین احمد دہلوی تھا۔ ان کا خاندان پہلے دشت میں سکونت پذیر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خود مولانا جامی بھی پہلے دشتی تھے۔

بعد میں ان کے والد نے دشت کو چھوڑ کر علاقہ جام میں سکونت اختیار کر لی۔ آپ بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ ہرات اور سمرقند گئے جو اسلامی علوم کے بہت بڑے مراکز تھے۔ جہاں پر آپ نے علوم اسلامی اور تاریخ و ادب کی تعلیم حاصل کی اور اس میں کمال پیدا کیا۔ ظاہری علوم حاصل کرنے کے بعد باطنی علوم کی طرف متوجہ ہوئے اور سعد الدین محمد کاشغری کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور بیعت کی۔ یہ بزرگ سلسلہ نقشبندیہ کے بانی حضرت بہاء الدین نقشبندی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ چنانچہ آپ نے ان کی بدولت تصوف میں کمال حاصل کیا۔ مرشد کی وفات کے بعد مسند خلافت پر متمکن ہوئے۔ 1472ء میں حج بیت اللہ سے شرف یاب ہوئے۔ واپسی میں ہمدان، کرمان، بغداد، کربلا، نجف شریف، دمشق، حلب اور تبریز کے علاقوں کا سفر کرتے ہوئے واپس وطن لوٹے۔ بقیہ زندگی ہرات ہی میں بسر کی جہاں آپ کا سارا وقت مطالعہ، شعر و شاعری اور روحانی مجاہدات میں صرف ہوتا تھا۔ اگرچہ آپ نہایت بلند مرتبہ شاعر تھے۔ لیکن تمام زندگی کسی دربار کا رخ نہیں کیا اور نہ ہی کسی بادشاہ کی خوشامدی۔ آپ کے زمانے کے بادشاہ آپ کی بہت عزت کرتے تھے بقول شہنشاہ ظہیر الدین بابر ”علوم عقلی و نقلی میں ان کا کوئی ہمسرہ نہ تھا۔“ نویں صدی ہجری میں جب آپ کی شہرت ترکی پنجابی تو محمد ثانی نے آپ کو استنبول آنے کی رغبت دلائی۔ آپ نے ہرات میں 9 نومبر 1492ء کو وفات پائی اور حاکم ہرات نے نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کا مقبرہ ہرات میں آپ کے مرشد سعد الدین کے مقبرے کے قریب میں واقع ہے۔

مرسلہ: انظر جاوید، بہاولپور

سے ٹھیک کے لیے کھانا تیار کیا۔ مختلف چیزیں بنائیں اور خوب آؤ بھگت کی۔ شبیر اسے پہلی بار یوں خوش اور لہراتے دیکھ رہا تھا۔ شبانہ کے دیگر رشتے دار بھی آتے رہے تھے مگر شبانہ مہمان نوازی کی رسم ہی بھاتی رہی تھی لیکن ٹھیک سے اس کا دلہانہ برتاؤ شبیر کو شجے میں ڈال گیا۔ شبانہ کی نظریں بار بار ٹھیک سے لپٹیں اور بٹنے کا نام نہ لیتیں۔ ٹھیک چلا گیا تو شبانہ کا چہرہ بھی بجھ گیا۔

میسرے دن شبانہ میکے آئی تو دو تین دن تک رہی۔ تنہائی ملنے پر ٹھیک سے خوب راز و نیاز کیے۔ تین دن میں کئی بار تنہائی ملی اور وہ ٹھیک کے آگے کھلتی پھلتی گئی۔ ٹھیک نے اسے کراچی کی بڑی رنگین داستانیں سنائیں۔ سبز باغ دکھائے وہ سماں باندھا کہ شبانہ کہہ اٹھی۔ ”ٹھیک مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔“ ٹھیک سنی ان سنی کر کے شبانہ کا اشتیاق بڑھاتا رہا۔ شبانہ ٹھیک کے لیے تر والہ ثابت ہو رہی تھی۔ اب ایک ہفتے ٹھیک اگر شبیر کے گھر جا پہنچتا تو دوسرے ہفتے شبانہ میکے آ جاتی۔ ملاقاتوں اور راز و نیاز کا سلسلہ جاری رہا۔ شبیر کا شک بڑھتا گیا مگر ایک دو باتیں اسے مصلحت پر مجبور رکھتی تھیں کہ اول تو ٹھیک کچھ دنوں کا مہمان ہے چلا جائے گا دوسرے شبانہ اب دو بچوں کی ماں ہے کوئی الہڑ چھو کر نہیں۔ بچوں کی محبت۔ اپنے ماں باپ کی عزت، ساس سر کا وقار اور شوہر کا اعتماد۔ یہ سارے سلسلے شبانہ سے جڑے ہوئے تھے۔

شبیر بزدل ہرگز نہیں تھا مگر دور اندیشی کی عادت اسے خاموش رکھے ہوئے تھی۔ خواہ مخواہ کسی بھی شرمندگی سے بچنے کی احتیاط دامن گیر تھی۔

دوسری طرف ٹھیک شبانہ کے گرد چال بٹا رہا۔ شبانہ خوب بھی تو فریب کھانے اور لٹنے پہ آمادہ تھی۔ ٹھیک کے سوا اسے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بچے، شوہر، ماں باپ، ساس، سرسب پس منظر میں چلے گئے تھے۔ اسے لگتا تھا کہ ٹھیک اسے چھوڑ کر چلا گیا تو وہ زندہ درگور ہو جائے گی۔ دونوں نے کراچی جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ ٹھیک کا منصوبہ تھا کہ کسی کو بھی بتائے بغیر چکے سے شبانہ کو لے کر نکل جائے گا۔ خالہ اور اس کا گھرانا بھی مکمل بے خبر ہوگا۔ کراچی پہنچ کر کچھ دن شبانہ سے دل بہلائے گا۔ بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

انجام سے بے پرواہ کلنڈرے ٹھیک کے لیے یہ ایک رندانہ مہم تھی۔ اس روز ٹھیک دوپہر کے بعد شبانہ کے گھر گیا۔ اسے یقین تھا کہ شبیر کھانا کھا کر کھیتوں میں چلا گیا ہوگا۔ گھر

تو شبیر کا گھرانا جیسے مکمل ہو گیا۔ دو بچوں کی پیدائش کے بعد بھی شبانہ کسی الہڑ و شیزہ کی طرح لگتی تھی۔ ٹھیک اب بھی اس کے من مندر کا دیوتا تھا۔ شبانہ جب جب بھی میکے جاتی تو ماں اسے سو سو طرح سے سمجھاتی۔ نصیحت کرتی کہ شبیر اچھا آدمی ہے اس کی قدر کرو، ساس سر کی خدمت کرو۔ اپنے لیے نہیں تو کم از کم اپنے ننھے ننھے بچوں کی خاطر گھر گرہستی اپناؤ ورنہ بچوں کو اب تو تم ایک ڈسے دار ماں ہو۔ بیٹی، سائے کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دو۔ لیکن شبانہ چکنا گھڑانی رہی۔ اسے شبیر اور اس کے ماں باپ کم تر لگتے، آنکھوں میں جپتے ہی نہ تھے۔ محنت و مشقت کے پسینے میں تو شبیر کو دیکھ کر وہ ناک بھوں چڑھاتی اور کئی کترانے کی کوشش کرتی۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی شبیر بچوں کی خاطر درگزر کرتا۔ کبھی کبھی جھجلا کے ماں سے جا الجھتا کہ یہ پتھر کی حسین صورت تو کیوں اٹھالائی ہے ماں جو اپنے بچوں کی خاطر بھی پھلٹا نہیں جانتی۔ آخر کیا مجھتی ہے خود کو یہ؟ کیا چاہتی ہے یہ؟ کب سدھرے گی یہ جاہل عورت؟ اس کا یہ بے گانہ بین نہیں ہم سب کو نہ لے ڈوبے۔

ماں حتی المقدور بیٹے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی کہ جانے دو بیٹا۔ کچھ گزارہ تو کر ہی رہی ہے، ایک دن ضرور اسے احساس ہوگا۔ شاید غربت کی گنجی ابھی تک اس کے ذہن سے نہیں نکل پائی، صبر کرو بیٹا۔

گرمیوں کی پھٹیاں ہوئیں تو ٹھیک نے گاؤں جانے کا ارادہ کر لیا۔ بظاہر بھولی صورت کا ٹھیک اندر سے خطرناک کھلاڑی بن چکا تھا۔ کراچی میں اسے اپنے جیسے آوارہ دوست ملے۔ جرم و گناہ کی راہوں کو وہ تیزی سے اپناتا گیا۔ نشہ، تاش، جوا، بدکار عورتوں سے تعلق اور دیگر برائیاں اس کی عادت بن گئیں۔ پڑھنے کے بہانے اس کا زیادہ وقت بد قماش لوگوں اور لڑکوں کے ساتھ گزرتا۔ وہ قصہ پہنچا تو دوسرے دن پچھا کے گھر گیا۔ شبانہ کی ماں گھر میں اکیلی تھی۔ اس نے شبانہ سے متعلق سب کچھ ٹھیک کو بتا دیا اور کہا کہ بیٹا تمہاری اسے کچھ سمجھاؤ۔ اب تو وہ دو بچوں کی ماں ہے۔ ٹھیک نے بڑی مصیبت سے کہا کہ آپ فکر نہ کریں میں شبانہ کو ضرور سمجھاؤں گا۔

چچی نے اسے شبیر کا پتا اور گھر بتا دیا۔ اگلے دن دوپہر کو ٹھیک شبانہ کے گھر پہنچا تو شبیر دوپہر کے کھانے کے لیے آیا ہوا تھا۔ شبانہ نے اچانک ہی ٹھیک کو دیکھا تو خوشی سے بدحواس ہو گئی۔ پاؤں رکھتی کہیں تھی۔ پڑتا کہیں تھا۔ جلدی

سے لدی پھندی آتی اور شبانہ پر داری صدقے جاتی۔ شبانہ کے مزاج سے متعلق ایک دو باتیں اس کے کانوں میں پڑیں تو اس نے لوگوں کا حسد جان کر پروا نہ کی اور پھر اس کا خیال تھا کہ شبانہ میں غربت و افلاس کی وجہ سے چڑچڑاہٹ آ گیا ہوگا۔ شادی کے بعد خوش حالی اور خاوند کا پیار دیکھے گی تو از خود سنور سدھر جائے گی۔ آخر کار شبیر کی ماں بامراد ہوئی اور شبانہ شبیر کی ڈولی میں بیٹھ گئی۔

سرخ ڈولی شبانہ کو اپنی امیدوں کے خون سے رنگی ہوئی لگ رہی تھی اور ڈولی کے نیچے کہا رہے شبیر کے رشتے دار اسے لٹیرے لگ رہے تھے مگر وہ لاچار تھی۔ شبیر نے شبانہ کا گھونگھٹ اٹھایا تو دیر تک حیرت سے اسے تکتا رہا۔ اسے ماں کے اس حسین انتخاب پر بڑا پیار آیا۔ شبانہ نے شبیر میں ٹھیک کا عکس ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن مایوس ہو کر آنکھیں موند لیں۔ رات دن کے چھو وقت کی نیا کو دھیرے دھیرے کھیتے رہے۔ شبیر شبانہ کی سردمہری کو توڑنے کی اپنی سی کوشش کرتا رہا۔ شبانہ نے نہ پھلٹا تھا۔ سونہ پھلٹ۔ کچھ عرصے بعد شبیر تھک ہار کے چپ تو ہو گیا مگر یہ ابجھن پھانس بن کے دل میں رہ گئی کہ آخر شبانہ چاہتی کیا ہے؟ اس نے شبانہ کی ماں سے بھی دو چار بار ذکر کیا مگر شبانہ کی ماں حد سے زیادہ لاڈ پیار میں بگڑنے کا بہانہ تراش گئی اور یہ بھی اک حقیقت ہی تھی جس پر شبانہ کی ماں اب پچھتا رہی تھی مگر وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ بیٹی بہت دور جا چکی تھی اتنی دور جہاں سے واپس پلٹنا اب ناممکن ہو گیا تھا۔

شبیر کام سے تھکا ہارا آتا تو شبانہ بے دلی سے اس کے آگے کھانا رکھ دیتی، اس کی ضرورتوں کو ختم پشتم پورا کرتی۔ مارے باندھے جی سے گھر کے کام کاج نمٹاتی۔ شبیر کا بھرپور پیار اور پھر اکتا کر غم و غصے کا اظہار۔ کوئی سا بھی جذبہ شبانہ کوئس سے مس نہ کر سکا۔ سال بھر بعد پہلا بچہ ہوا تو پوتے کو پا کر دادی ماں نہال ہو گئی۔ شبیر نے سوچا اب شاید برف پکھل جائے اور شبانہ ماں بن کر معمول پر آجائے لیکن یہ شبیر کی خام خیالی تھی۔ کچھ عرصہ گزرا تو شبیر کے والدین نے علیحدہ مکان کا بندوبست کر دیا کہ تاخوش بہو اپنی مرضی سے رہے ہے۔ شبیر کی ماں دن میں دو تین بار آتی اور کچھ دیر پوتے سے دل بہلا کر چلی جاتی۔

شبانہ کی خاموشی اور لیے دیے رہنا اب شبیر کو زہر لگنے لگا۔ کوئی وجہ ہی اس کے لیے نہیں پڑ رہی تھی۔ گھر کی جنت سرد جہنم میں بدل کے رہ گئی تھی۔ دوسرے برس بیٹی نے جنم لیا



آپا میرج ہیورو

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!

اس دور میں بیٹیوں کو لوگ بوجہ سمجھتے ہیں۔ آپا کی بھی ایک دو نہیں سات سات بیٹیاں تھیں مگر انہوں نے حوصلے سے کام لیا، عقل کو کام میں لایا تو خدا نے بھی ان کی زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں بھر دیں۔ ان کی بیٹیاں راج کر رہی ہیں۔ یہ کام کیسے ہوا؟ آپ عمیرہ بھی ملاحظہ کریں۔

(کراچی)

تھیں ان کا کچھ اتا پتا ہی نہیں تھا۔ یہ تین سال پہلے کی بات تھی جب مجھے اس سرکاری اسکول میں ٹیچر بھرتی ہوئے پانچ سال ہوئے تھے۔ اس وقت آپا نے سب سے سینئر ٹیچر تھیں۔ مگر بد قسمتی سے صرف میٹرک پاس ہونے کی وجہ سے

میں اسکول پہنچی اور ابھی کلاس میں جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ بوانے آکر اطلاع دی۔ ”آپا نے نب آئی ہیں، میڈم کے پاس بیٹھی ہیں۔“ میں حیران ہوئی کیونکہ جب سے آپا نے نب ریٹائر ہوئی

بچوں کو تیار کر احسن تقویم کے سانچے میں ڈھلی شائد اپنی جہالت کی بنا پر اسٹل سافٹین کی پستیوں میں گرتی پھسلتی جا رہی تھی۔ ندی سرن کے کنارے اگی جھاڑیاں اور درخت ماحول کے اسرار میں بے طرح اضافہ کر رہے تھے۔ مقررہ جگہ پر پہنچ کر شائد ٹھیک کو نہ پا کر سر اسید ہو گئی۔ ادھر ادھر تیزی سے نگاہ دوڑائی مگر دھندلی چاندنی میں کچھ بھائی نہ دیا پھر خیال آیا کہ ٹھیک آتا ہی ہوگا۔ وہ تھوڑی دیر کھڑی رہی۔

شبیر دم سادھے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ آخر شائد پر وقت کی کمی اور جلد نکلنے کی وحشت سوار ہوئی تو وہ قصبے کی جانب دوڑ پڑی کہ آگے چل کر راہ میں آتے ٹھیک کے سنگ ہوئے گی۔ اندھا دھند بھاگتی ہوئی شائد اچانک ایک جھاڑی کے پیچھے بھڑنی اور اس کے بچوں یہ چڑھ گئی اس اچانک افتاد سے بھڑنی کے بچے تو گھبرا گئے مگر خوں خوار بھڑنی نے اچھل کر شائد کی گردن دیوچ لی اور اسے مروڑ ڈالا لے دانتوں کی گرفت میں شائد کی گردن بری طرح چرمرائی اسے چنچنے چلانے کا بھی موقع نہ ملا۔ بھڑنی نے تیز نوکیلے پنجوں سے اس کا نرم دناڑک بدن چیر پھاڑ ڈالا۔ ادھر شبیر اپنی ہی جھونک میں پیچھا کرتا وہاں پہنچا تو صورتحال کو دیکھ کر سٹ پٹا گیا۔ بھڑنی نے شائد کو تین چار جھکے دیے اور اس کو چھوڑ کر شبیر پر جھپٹی۔ شبیر نے کلباڑی کا بھرپور وار کیا۔ چوٹ کھائی بھڑنی نے شبیر کو بھی نہ چھوڑا اور اسے بھی ادھیڑ کر رکھ دیا۔ شبیر شائد کے قریب ہی جا کر۔ دم توڑتی شائد کو دور سے شبیر کی ڈوبتی ابھرتی آواز سنائی دی۔ ”دیکھا ڈیل شش، شعی، درندے، بھی بچوں کو..... نہیں..... چھہ..... چھوڑتے۔“

بھڑنی بچوں کو لے کر وہاں سے بھاگتی چلی گئی۔ وہ دونوں زخمی حالت میں پڑے تھے۔ میں جو کچھ دوری پر ایک پیڑ کے پیچھے کھڑا تھا ان دونوں کی مدد کو آگے بڑھ آیا شائد مر چکی تھی مگر شبیر میں ابھی جان باقی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا ”گناہ کسی کو بھی بخشا نہیں ہے۔ یہ ماں ہو کر اپنے بچوں کو چھوڑ کر جا رہی تھی۔ بھڑنی بھی ماں تھی، اس نے اسے اچھا سبق دے دیا کہ بچے کی خاطر مر جانا بہتر ہے۔ کاش یہ بچے کو بے آسرا کرنے کا نہ سوچتی تو آج گھر میں راج کر رہی ہوتی۔“

اتنا کہ کر شبیر نے بھی گردن ڈال دی اور میں مرے مرے قدموں سے لوٹ آیا تاکہ گاؤں والوں کو بلا لاؤں۔



پہنچا تو شائد اکیلی ہی تھی۔ وہ ٹھیک سے ٹوٹ کر ملی۔ ٹھیک نے جلدی جلدی اسے منصوبے سے آگاہ کیا کہ آج رات تم ندی سرن کے کنارے فلاں جگہ پہنچ جانا میں تمہارا انتظار کروں گا۔ وہاں سے ہم قصبہ جا کر صبح پہلی گاڑی سے نکل چلیں گے۔ رات کو ضرور آنا۔ ٹھیک ہے؟

شائد نے دل و جان سے ہاں بھری تو ٹھیک ترنت قصبہ لوٹ آیا۔

رات کھانے کے بعد تمام لڑکے ایک بیٹھک میں اکٹھے ہوئے تو تاش کی محفل جمی۔ یہ روز کا معمول تھا مگر اس رات دوران کھیل آوارہ لڑکے آپس میں بگڑا گئے۔ بات بڑھ گئی۔ ہنگامہ ہوا تو ٹھیک کے سر پر گہری اور کاری ضربیں لگیں۔ اسے بے ہوشی کی حالت میں قصبے کے سرکاری شفاخانے میں داخل کر دیا گیا۔ ادھر شائد منصوبے کے مطابق گھر چھوڑنے پر آمادہ تھی۔ شام ہی سے اس کا اضطرابی اور بوکھلایا رویہ شبیر کو محسوس اور انتشار میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔ وہ بہ غور شائد کی وحشت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ رات کھانے کے بعد وہ لیٹا تو اس کی چھٹی حس کسی ان ہونی کا احساس دل رہی تھی۔ وہ بظاہر سویا ہوا مگر بیدار تھا۔ رات گئے شائد کا بار بار اٹھ بیٹھنا۔ ادھر ادھر وحشت سے دیکھنا شبیر کو تجسس رکھے ہوئے تھا۔ آخر کار شائد اٹھی اور گھر سے نکل پڑی۔

شبیر ایک مناسب فاصلے سے شائد کا پیچھا کر رہا تھا۔ اتفاق سے میں اٹھا تھا اور لوٹا لے کر جھاڑیوں کی طرف چلا تھا کہ میں نے تیز تیز چلتے شبیر کو دیکھ لیا۔ اس کے ہاتھ میں کلباڑی دیکھ کر میں سہم اٹھا پھر آگے جانی شائد کو دیکھا اور ان کے تعاقب میں لگ گیا۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ اس کا ارادہ شائد کو آشنا سمیت رنگے ہاتھوں پکڑ کر دونوں کا کام تمام کر دینا تھا۔ غیرت اور غصے سے اس کا وجود کھول رہا تھا۔ آنکھوں میں اترا ہوا خون اور دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑی کلباڑی سب کچھ کر گزرنے کی دلیل تھی۔ آخری تاریخوں کا چاند اور اس کی مرجھائی چاندنی سے فضا بڑی خوفناک لگ رہی تھی۔ اوس کے مسلسل گرتے قطرے جیسے سہی ہوئی رات کے پسینے چھوٹ رہے ہوں مگر شائد اپنے اندر کی وحشت اور اضطراب میں گرفتار ڈاڑی جا رہی تھی۔ اسے ندی سرن کے کنارے مقررہ جگہ پر پہنچنا تھا جہاں اس کے خیال میں ٹھیک یقیناً اس کا منتظر تھا۔ آنے والی سنہری زندگی کا خواب اور محبوب کی کشش اسے سمجھنے لیے جا رہی تھی۔ شوہر اور

ہیڈ مسٹر میں نہیں بن سکی تھیں۔ البتہ اسٹنٹ ہیڈ مسٹر میں بن گئی تھیں اور وہ بھی محکمہ تعلیم کے بعض اعلیٰ افسران کی مہربانی سے جو آپانہب کو جانتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے پہلی بار انہیں دیکھا تھا۔ بی ایڈ کر کے میں نے سرکاری اسکول کی ملازمت کے لیے اپلائی کیا تھا اور خوش قسمتی سے مجھے بغیر کسی سفارش کے جاب مل گئی تھی۔ اب سفارش تو ایک طرف رہی لاکھوں کی رشوت کے بغیر سرکاری اسکول میں جاب ملنا ناممکن سمجھا جاتا ہے۔

سفید لباس اور سفید ہی دوپٹے میں آپانہب منیجر سے زیادہ خاندان کی بزرگ خاتون لگ رہی تھیں۔ جن کے بے شمار بیٹے بیٹیاں اور پوتے پوتیاں ہوں اور وہ ان میں گن ہوں۔ ان کے سرخ و سفید جہرے پر ایسا ہی سکون تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہیں کوئی پریشانی یا غم ہی نہ ہو۔ وہ اسکول میں اردو کی منیجر تھیں۔ تعارف کے بعد بہت محبت سے ملیں اور مجھ سے کہا۔ ”عمیرہ میں اس اسکول میں سب سے پرانی منیجر ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ جب اسکول بنا تھا تب سے یہاں ہوں۔ اگر تمہیں کسی قسم کا کوئی مسئلہ ہو تو بلا جھجک مجھ سے کہنا۔“

یہ کہتے ہوئے ان کے لہجے میں فخر اور جتانے والے انداز کے بجائے خلوص اور اطمینان تھی۔ اس پہلے تعارف کے بعد رفتہ رفتہ ان کے حالات زندگی پتا چلے۔ تب میں نے جانا کہ آدمی کا چہرہ کس قدر دھوکا دیتا ہے۔ وہ جتنی پرسکون اور خوش نظر آتی تھیں ان کی زندگی اتنی ہی مشکلوں اور پریشانیوں میں گھری ہوئی تھی۔ اکہتر میں لٹ پٹ کر آنے والوں میں آپانہب اور ان کے شوہر بھی تھے۔ آپانہب کی شادی بہت کم عمری میں ہو گئی تھی ابھی وہ سولہ سال کی بھی نہیں ہوئی تھیں جب ماں باپ نے بیاہ کر رخصت کر دیا۔ اس زمانے میں اور پھر مشرقی پاکستان کے سادہ ماحول میں لڑکیوں کو کم عمری میں رخصت کر دیا جاتا تھا۔ آپانہب کے شوہر ان سے عمر میں دو گنے تھے۔ لیکن کھاتے پیتے اچھے آدمی تھے۔ ڈھاکہ میں اپنا کاروبار تھا۔ وہ کپڑے کے ہول سیلر تھے۔ مغربی پاکستان سے کپڑا منگوا کر مشرقی پاکستان میں سپلائی کرتے تھے۔ ڈھاکہ کے ایک پوش علاقے میں اپنا بڑا سا مکان تھا، نوکر چاکر تھے، گاڑی تھی۔ آپانہب بہت عیش و آرام میں رہ رہی تھیں۔

پھر اچانک ہی حالات خراب ہونے لگے اور پھر خراب ہوتے چلے گئے۔ آپانہب کے شوہر اور ان جیسے

بہت سے دوسرے لوگوں نے اسے عارضی خرابی سمجھا تھا۔ جو ہوشیار تھے اور آنے والی تباہی کو بھانپ گئے تھے وہ جلد ہی جلدی اپنے اثاثے لے کر یا بچ کر وہاں سے نکل گئے۔ جب ملٹری ایکشن شروع ہوا اور آمد و رفت بند ہو گئی تو وہاں رہ جانے والے بچھڑ کر رہ گئے تھے۔ آپانہب کے شوہر نے کوشش کی کہ ان کا کاروبار بک جائے اور وہ بھی یہاں سے نکل جائیں مگر ان حالات میں کاروبار کون خریدتا؟ ایک دن بلوائیوں نے دکان پر حملہ کیا اور لوٹ مار کے بعد آگ لگا دی۔ برسوں کی محنت سے جمایا ہوا کاروبار ایک گھنٹے میں تباہ ہو گیا۔ خود آپانہب کے شوہر بڑی مشکل سے اور چند پرانے وفادار ملازموں کی مدد سے جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

اب یہاں ٹھہرنا حماقت تھی۔ انہوں نے بھراپڑا گھر چھوڑا، جو سونا اور نقد تھا وہ ساتھ لیا اور انڈیا کے راستے پاکستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ ایک اور مصیبت بھری داستان تھی۔ وہ جیسے چھپاتے اور انڈیا کے مسلمانوں کی مدد حاصل کرتے، پیسا کھلاتے ہوئے کسی طرح سرحد پار کر کے پاکستان پہنچنے میں کامیاب رہے۔ مگر اس وقت تک وہ بالکل خالی ہو چکے تھے۔ کراچی آئے تو اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ ایک وقت کا کھانا کھا سکتے۔ ایک بھری بچری زندگی سے اچانک خالی ہاتھ ہو جانا کیسا سانحہ ہے۔ یہ صرف وہی لوگ جانتے ہیں جن پر گزرتی ہے۔ مشرقی پاکستان سے لٹ پٹ کر آنے والے اور مٹی کے علاقے میں آباد ہو رہے تھے۔ آپانہب اور ان کے شوہر نے بھی ایک جگہ جھونپڑی ڈال لی۔ اس وقت بہت سارے لوگ آنے والوں کی مدد کر رہے تھے اور انہیں آباد ہونے میں مدد بھی دے رہے تھے۔

آپانہب کے شوہر منزل بھائی نے ان لوگوں سے رابطہ کیا جن سے ان کے کاروباری تعلقات تھے۔ کاروبار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اول تو ملک کے حالات و مگرگوں تھے دوسرے ان کے پاس سرمایہ کہاں تھا۔ کپڑے کے بارے میں اپنے تجربے کی بنا پر ایک دکان میں ملازمت مل گئی اور وہ ممبر شکر کے ساتھ گزارہ کرنے کے لیے کام کرنے لگے۔ چند مہینے پہلے ان کی اس سے بڑی دکان اور کاروبار تھا۔ درجن سے بھی زیادہ ملازم تھے اور اب وہ خود ایک ملازم تھے۔ مالک اچھا تھا اور دوسرے نوکروں کی نسبت ان سے اچھا سلوک کرتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اندر ہی اندر کڑھتے رہتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بی بی ہو گئی۔ منہ سے خون آنے لگا تو

ہسپتال میں دکھایا، وہاں بی بی تشخیص ہوئی۔ کھانسی بے پناہ تھی اور ذرا سا کام کر کے سانس پھول جاتی تھی، ایک بار دکان میں کھانسی کا دورہ پڑا اور خون آیا تو مالک نے بہت معذرت کے ساتھ جواب دے دیا۔

”منزل بھائی آپ خود سوچو اگر گا بک یہاں کسی کو کھانسی کے ساتھ خون تھوکتا دیکھتے تو دوبارہ کب آئے گا۔“ مالک نے انہیں دو مہینے کی تنخواہ بھی دے دی لیکن ساتھ ہی ملازمت سے جواب دے دیا۔ یہ ایک نیا مسئلہ تھا اب گزارہ کیسے ہوگا۔ علاج تو ان کا سینی ٹوریم سے چل رہا تھا۔ دوائیں مل جاتی تھیں لیکن اچھی خوراک اور دوسرے اخراجات کے لیے رقم چاہیے تھی۔ منزل بھائی اتنے ناتواں ہو گئے تھے کہ ذرا سا چلنے پھرنے سے ہاپنے لگتے اور کھانسی کا دورہ پڑ جاتا تھا۔ ایسے میں کام کیسے کرتے اور اگر کرنے کی کوشش کرتے تو انہیں کام دیتا کون؟ آپانہب ہر اسال ہو گئیں کہ اب کیا ہوگا؟ کسی سے کچھ مانگنا ان میاں بیوی کے لیے موت سے کم نہیں تھا کیونکہ خودداری کو زندگی سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ آپانہب نے بتایا کہ تین تین دن تک کچھ کھانے کو نہیں ملتا تھا لیکن کسی کو پتا نہیں چلتا کہ وہ میاں بیوی فاقے سے ہیں۔ شروع کی مالی تنگی کے دور میں آپانہب نے منزل بھائی سے اجازت مانگی کہ وہ کہیں ملازمت کر لیں مگر انہوں نے اجازت نہیں دی تھی۔ وہ آپا سے بہت محبت کرتے تھے اور انہیں کام کرتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

مگر جب منزل بھائی کی ملازمت ختم ہو گئی اور اب گزارے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو آپانہب نے کام کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے منزل بھائی سے بھی منوالیا کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے یا کسی کے دیے ہوئے پر گزارہ کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ وہ محنت سے کما کر گزارہ کریں۔ منزل بھائی نے بڑی مشکل سے اور آنسوؤں کے ساتھ آپانہب کو اجازت دی تھی۔ شوہر سے اجازت ملنے کے بعد آپانہب نے سوچا کہ کیا کریں۔ انہوں نے میٹرک پاس کیا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی ہنر نہیں تھا۔ اتفاق سے ان کے پڑوس میں ایک خاتون منیجر رہتی تھیں۔ جب آپانہب نے ان سے کسی کام کے بارے میں کہا تو وہ بولیں ”تم منیجر کے لیے کوشش کرو، آج کل آسامیاں نکلی ہوئی ہیں۔“

آپانہب نے ملازمت کے لیے درخواست دے دی اور خوش قسمتی سے انہیں ملازمت مل گئی۔ انہیں اس کے لیے

دھکے نہیں کھانا پڑے تھے۔ اسکول بھی پاس ہی تھا۔ وہ صبح جاتیں اور دوپہر میں واپس آ جاتی تھیں۔ تنخواہ بہت زیادہ تو نہیں تھی لیکن ان دونوں میاں بیوی کے گزارے کے لیے کافی تھی۔ پھر مکان کچا کچا جیسا بھی تھا اپنا تھا۔ شروع میں بجلی نہیں تھی بعد میں بجلی آ گئی۔ پانی کی لائنیں بچھا دی گئی تھیں جن سے کبھی کبھی پانی بھی آ جاتا تھا ورنہ آپانہب محلے کے بچوں کے ہمراہ گلی کے کونے کے ٹل سے پانی بھر کر لے آتی تھیں۔ گیس تو بعد میں بھی نہیں آئی تھی مٹی کے تیل کے چولہے سے کام چلتا تھا۔ ان کا مکان زیادہ بڑا نہیں تھا مشکل سے سو مربع گز پر تھا۔ دو کمرے تھے اور ان کے آگے برآمدہ تھا۔ ایک طرف لیٹرین اور غسل خانہ تھا اور دوسری طرف باورچی خانہ تھا۔ آگے پیچھے چھوٹے کھن تھے۔ جن میں آپا نہب نے پھولدار پودے اور بنریاں لگا رکھی تھیں۔ اینٹوں کا مکان تھا جن پر سیٹ کی شیشیں پڑی تھیں۔ دیواروں پر سفیدی کی گئی تھی۔ اس سادگی کے باوجود ان کا گھر سلیقے اور صفائی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ملازمت ملنے سے ان کا مالی مسئلہ ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ سکون سے اپنے گھر میں دو وقت کھا سکتے تھے۔ منزل بھائی کا علاج بھی باقاعدہ چل رہا تھا۔

اولاد کے معاملے میں آپا نہب کا نصیب انوکھا تھا۔ شادی کے بعد جب وہ دو سال تک ماں نہیں بن سکیں تو ڈاکٹروں کو دکھایا۔ انہوں نے آپا اور منزل بھائی کو ہر لحاظ سے صحت مندر قرار دیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اولاد کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ ڈاکٹروں کے بعد حکیموں اور سنیا سیوں کے باری آئی پھر بیروں فقیروں کے چکر لگنا شروع ہوئے مگر آپانہب کے دل کی مراد نہ برآئی۔ شادی کو پانچ سال گزر چکے تھے پھر حالات خراب ہوئے اور انہیں تن کے کپڑوں میں بھاگنا پڑا تب پہلی بار آپانہب نے اولاد نہ ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ ان حالات میں جب ہر طرف موت تھی اور اپنی جان بچانا مشکل ہو رہا تھا، وہ بچوں کو کیسے سنبھالتیں اور انہیں کچھ ہو جانے کے خدشے سے اوجھ موٹی ہو جاتیں۔ اب ان کی سمجھ میں اللہ کی مصلحت آئی تھی۔

کراچی آنے کے بعد جن حالات سے گزری تھیں ان میں اولاد کا خیال ہی کہاں سے آتا۔ یہاں تو اپنے کھانے کے لالے پڑے تھے، اولاد کا کھڑاگ کون پالتا۔ پھر جب زندگی ذرا پرسکون ہوئی اور آپانہب کے دل میں اولاد کا ارمان انگڑائی لینے لگا تو اچانک ہی منزل بھائی کو

ٹی بی ہو گئی۔ وہ پھر اولاد کا خیال دل سے نکال کر شوہر کی زندگی اور گھر کے لیے فکر مند ہو گئیں۔ منزل بھائی کام نہیں کر سکتے تھے وہ گلی کے کٹڑے سودا بھی لانے کے قابل نہیں رہے تھے اس لیے آپا نے سب نے ساری ذمے داریاں اپنی جان پر لے لیں۔ وہ صبح ناشتا بنا کر اور شوہر کو ناشتا کرا کے جاتی تھیں۔ دوپہر کے لیے وہ پہلے ہی کچھ بنا لیتی تھیں۔ اسکول سے آ کر روٹیاں ڈالتیں یا چاول بنا لیتیں۔ رات کا کھانا وہ منزل بھائی کے لحاظ سے بناتی تھیں۔ ڈاکٹر نے انہیں قوت بخش غذا میں کھلانے کو کہا تھا۔ وہ خود وال اور سبزی کے ساتھ روکھی سوکھی کھا کر بھی خوش رہتی تھیں لیکن منزل بھائی کو گوشت، دودھ اور انڈے کھلاتی تھیں۔ محدود تنخواہ میں ان کے لیے یہ سب کرنا آسان نہیں تھا لیکن وہ جیسے تیسے کرتی تھیں۔ اضافی آمدنی کے لیے انہوں نے شام کو گھر میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دی اور نوجوان ہوتی بچیوں کو سلائی کڑھائی سکھانے لگیں۔ ایک زمانے میں انہوں نے سلائی کڑھائی شوقیہ سکھی تھی جو اب ان کے کام آ رہی تھی۔

ایک دن وہ اسکول سے آئیں تو ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ شام کو بچوں کو پڑھا رہی تھیں کہ اچانک چکر آیا اور بے ہوش ہو گئیں۔ منزل بھائی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ کیا کریں۔ انہوں نے آپا کو بستر پر لٹایا اور پانی کے چھینٹے مارنے لگے، استے میں بچے جا کر اپنی ماؤں کو بلالائے۔ عورتیں آئیں تو انہوں نے آپا کو سنبھال لیا۔ وہ کچھ دیر میں ہوش میں آ گئیں۔ پانی میں گلو کوڑ ملا کر دیا تو ان کے حواس بحال ہوئے تھے۔ عورتیں سب شادی شدہ اور تجربہ کار تھیں جب انہوں نے آپا کی کیفیت سنی تو مشترکہ فیصلہ دے دیا کہ وہ ماں بننے والی تھیں۔ آپا ششدر رہ گئیں۔ جس خوش خبری کے لیے وہ شادی کے بعد کیا کیا جتن کرتی رہی تھیں وہ ملی بھی تو کن حالات میں۔ ایک پڑوسن انہیں نزدیکی لیڈی ڈاکٹر کے کلینک لے گئی اور اس نے تصدیق کر دی کہ آپا ماں بننے والی تھیں۔

اس خبر نے آپا نے سب کو خوش کرنے کے بجائے فکر مند کر دیا تھا۔ فکر یہ تھی کہ اس حالت میں وہ نوکری کیسے کریں گی؟ گھر اور منزل بھائی کو کیسے سنبھالیں گی؟ اور بچوں کو ٹیوشن کیسے کریں گی؟ اس موقع پر منزل بھائی نے ان کی مدد کی۔ انہیں حوصلہ دیا کہ وہ فکر نہ کریں وہ خود کو دیکھ لیں گے اور گھر بھی دیکھ لیں گے۔ نوکری سرکاری تھی آخری دنوں میں انہیں

چھٹی مل جائے گی۔ منزل بھائی کی تسلیوں کے باوجود آپا کی فکر کم نہیں ہوئی تھی۔ ایک فکر یہ بھی تھی کہ اولاد آئے گی تو اپنی توجہ اور خرچ چاہے گی جب کہ آپا ایک ایک روپیہ منزل بھائی کے لیے بچا کر رکھتی تھیں۔ بعض اوقات سرکاری اسپتال سے دوا نہیں ملتی تھی تو انہیں خود سے خریدنا پڑتی تھی اور پھر ان کی خوراک پر بھی اچھا خاصا خرچ ہو جاتا تھا۔

منزل بھائی کی مدد اور حوصلہ دینے کے باوجود آپا نے سب کی مشکلات کم نہیں ہوئی تھیں۔ انہوں نے جیسے تیسے یہ وقت کاٹ لیا اور پھر ایک بیٹی کو جنم دیا۔ یہاں سے ان کی مشکلات میں اضافہ ہوا اور اب انہیں ملازمت، شوہر اور گھر کے ساتھ اپنی بچی کو بھی دیکھنا ہوتا تھا اور شروع کے چند مہینے انہیں بچی کو اسکول ساتھ لے کر جانا پڑا تھا۔ اس کے بعد وہ اسے گھر منزل بھائی کے پاس چھوڑ کر جاتی تھیں اور وہ اس کی دیکھ بھال کر لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ بچی ان کے گھر کی رونق بن گئی۔ جب وہ آئی تو آپا کو زیادہ خوش نہیں ہوئی تھی لیکن وہ ان کی اولاد تھی اس نے خود ان کے دل میں اپنی جگہ بنالی۔ جب وہ اسے گھر چھوڑ کر آنے لگیں تو ان کی چھٹی کے وقت کی بے چینی دیکھنے والی ہوتی تھی۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ کسی طرح اڑ کر اپنی بیٹی کے پاس گھر پہنچ جائیں۔

بیٹی کے آنے کے بعد آپا کی توقعات کے عین مطابق خرچ میں اضافہ ہوا تھا جب کہ آمدنی اتنی ہی تھی۔ ان کی مشکلات دیکھتے ہوئے منزل بھائی نے گلی کے ساتھ مین روڈ پر ایک چھوٹی سی دکان کھول لی جس میں وہ بچوں کی چیزیں فروخت کرتے۔ جب آپا گھر آ جاتیں تو منزل بھائی شام کے قریب دکان کھولتے تھے اور پھر اندھیرا ہونے تک وہیں رہے۔ مغرب کے بعد بچوں کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے وہ بھی دکان بند کر کے آ جاتے۔ چار پانچ گھنٹے کی دکانداری سے انہیں تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی جس سے ان کی مالی مشکلات میں کمی ہوتی تھی۔ ختم تو یہ کسی صورت نہیں ہو سکتی تھیں۔ پھر ابھی پہلی بچی دو سال کی ہوئی تھی کہ آپا پھر امید سے ہو گئیں۔ پہلی بچی کو تو انہوں نے پیدا کر لیا تھا لیکن ان حالات میں وہ مزید بچوں کی خواہش نہیں رکھتی تھیں۔ انہوں نے معاملہ ختم کرنا چاہا لیکن منزل بھائی نے روک دیا۔ وہ مذہبی خیالات رکھتے تھے اور ان کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ تھا جس کی وہ کسی صورت اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ انہوں نے آپا سے کہا۔

”میرا، تمہارا اور آنے والے تمام بچوں کا پالنے والا

اصل میں اللہ ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں کسی کو پیدا کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنے والے، یہ بھی اسی کا اختیار ہے، یہ اس کی نعمت ہے اس لیے کفرانِ نعمت مت کرو۔“ اس بار بھی بیٹی ہوئی تھی۔ آپا خوش تھیں لیکن منزل بھائی ان سے زیادہ خوش تھے۔ پہلے کی طرح انہوں نے آپا سے مکمل تعاون کیا۔ دوسری بچی کو درزا ول سے انہوں نے سنبھال لیا تھا۔ بس وہ فیڈ کے لیے آپا کے پاس جاتی تھی۔ اسے اسکول بھی نہیں لانا پڑتا تھا۔ خوشی اپنی جگہ تھی لیکن آپا اور منزل بھائی کے لیے زندگی کی مشکلات میں اضافہ ہوا تھا۔ دو کے مقابلے میں چار افراد کا خرچ یقیناً زیادہ ہوتا ہے۔ منزل بھائی کی دکان چل رہی تھی اور آپا پہلے سے زیادہ ٹیوشن بھی کر رہی تھیں اس کے باوجود چار اکثر پیروں سے چھوٹی پڑ جاتی تھی۔ مہینے کی تنخواہ تو سو دوں، بچیوں کی خوراک اور بجلی کے بل میں ختم ہو جاتی تھی۔ اوپری اخراجات ٹیوشن کی فیس اور منزل بھائی کی دکان کی آمدنی سے پورے ہوتے تھے۔ وہ بھی اپنی بہت سے بڑھ کر کر رہے تھے۔ ایک بیمار آدمی کے لیے پانچ گھنٹے مسلسل دکان پر بیٹھنا اور اکیلے سب دیکھنا آسان کام نہیں تھا۔

آپا جس اسکول میں پڑھاتی تھیں وہ لڑکیوں کا تھا اور میٹرک تک تھا۔ سارا اسٹاف سوائے چوکیدار کو چھوڑ کر خواتین پر مشتمل تھا اس لیے اسکول اور اسٹاف روم میں بہت گھریلو ماحول تھا۔ ساٹھی پیچرز بلا تکلف اپنے مسائل ایک دوسرے سے شیئر کر لیتی تھیں۔ وہ دور بھی ایسا تھا کہ لوگ ایک دوسرے کے مسائل حل نہیں کر سکتے تھے لیکن وہ ایک دوسرے کے دکھ درد سن کر ان کا بوجھ ہلکا کر دیا کرتے تھے۔ آپا نے سب کے حالات بھی سب کے علم میں تھے اور ساٹھی پیچرز ان کا ہر ممکن ساتھ دیتی تھیں۔ جیسے ہفتے میں ایک دن وہ اضافی چھٹی کر سکتی تھیں۔ آپا کی کلاس کوئی دوسری پیچر لے لیتی تھی۔ بولس کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن اسکول فنڈ میں سے پیچرز کو حصہ مل جاتا تھا۔ ہیڈ مسٹر لیس آپا نے سب کو زیادہ دیتی تھیں۔

وقت کی خوبی ہے کہ یہ اچھا ہوتا تو گزرتا ہے لیکن جب آزمائش کا ہوتا تو بھٹی گزر رہی جاتا ہے۔ آپا اور منزل بھائی کی آزمائش جاری تھی۔ دوسری بیٹی کے دو سال بعد تیسری بیٹی ہوئی اور اس کے بعد لگاتار دو تین سال کے وقفے سے آپا کی چار بیٹیاں اور ہوئیں۔ جو ستا حیران رہ جاتا کہ کہاں تو شادی کے پہلے دس سال اولاد ہی نہیں ہوئی اور

جب اللہ نے اولاد دینا شروع کی تو سولہ سال میں سات بیٹیاں دے دیں۔ ممکن ہے ان کی مزید اولادیں ہوتیں لیکن آپا عمر سے گزر گئی تھیں۔ یوں قدرت کی طرف سے بس ہو گیا۔ ورنہ منزل بھائی ساتویں بیٹی کے موقع پر بھی یہ گناہ کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھے۔ پہلے ہی چھ بیٹیاں تھیں اس لیے انہوں نے آپا سے کہا۔ ”اگر ایک بچہ اور اس دنیا میں آ جائے تو کیا فرق پڑے گا۔“

فرق تو پڑتا تھا بوجھ بڑھ جاتا تھا۔ آپا کی سب سے بڑی بلکہ اس سے چھوٹی بھی اس قابل ہو گئی تھی کہ اب وہ گھر سنبھال سکتی تھیں۔ انہوں نے آپا کو اس فکر سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اب وہ اپنی چھوٹی بچیوں کو دیکھتی تھیں اور بچوں و بچیوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھیں۔ منزل بھائی کی دکان بھی اچھی چل رہی تھی لیکن نو افراد کا خرچ پورا کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ انہوں نے کوشش کر کے عقبی محن میں ایک کمرا اور بنوا لیا تھا۔ یہ بھی سادہ اور سینٹ کی شیٹوں والا تھا۔ اس کے باوجود نو افراد کا اس چھوٹے سے مکان میں رہنا جس میں سوائے بجلی کے اور کوئی سہولت نہیں تھی۔ فریج، ٹی وی، واشنگ مشین اور کچن کی کوئی مشین نہیں تھی۔ ان سب چیزوں کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ کچن تان کر اخراجات پورے ہو جاتے تھے۔ بڑی بچیاں سلائی کڑھائی کرنے لگی تھیں اس سے ان کا ذاتی خرچ نکل آتا تھا۔

آپا نے اپنی بچیوں کو اپنے ہی اسکول میں پڑھایا تھا۔ یہاں ان کی برائے نام ٹیوشن فیس بھی معاف تھی۔ کتابیں اور یونیفارم اسکول کے فنڈ سے مل جاتے تھے۔ بچیاں آپا کے ساتھ جاتی تھیں اور ان کے ساتھ ہی اسکول سے واپس آ جاتی تھیں۔ جب ان کی بڑی بیٹی نے میٹرک کر لیا تو اس نے ضد کر کے پرائیویٹ انٹر میں داخلہ لے لیا۔ اسے پڑھنے کا شوق تھا۔ پرائیویٹ پڑھنے کے باوجود اس نے اے گریڈ لیا تھا۔ پھر اس نے بی اے کیا اور آخر میں ایم اے بھی کیا۔ آپا نے کوشش کی کہ اسے بھی ٹیچر کی نوکری مل جائے لیکن اس نے ٹیچنگ کورس نہیں کیا تھا اور اب ٹیچر کی نوکری کے لیے ٹیچنگ کورس لازمی ہو گیا تھا۔ بیٹی نے زور دینے پر بھی ٹیچنگ کورس نہیں کیا تھا اس کے بجائے وہ گھر میں سلائی کر کے کمانے لگی تھی۔ اس دوران میں باقی بچیاں بھی اس عمر کو پہنچ رہی تھیں کہ گھر کی ذمے داریوں میں حصہ بنا سکیں۔ وہ سلائی کڑھائی کر کے اور ٹیوشن پڑھا کر اپنا خرچ بھی نکال لیتی تھیں اور آپا کی مدد بھی کر دیتی تھیں۔ اس کی کمائی سے گھر

کے چھوٹے موٹے مالی مسائل حل ہو جاتے تھے لیکن بڑے مسائل حل ہوتے نظر نہیں آ رہے تھے اور ان میں سب سے بڑا مسئلہ لڑکیوں کی شادی کا تھا۔ گھر میں جو اتنا تھوڑا خرچ ہو جاتا تھا اور اگر کچھ بچتا بھی تھا تو کسی موقع پر یا کسی بیماری میں خرچ ہو جاتا تھا۔ ہاتھ میں کچھ باقی نہیں رہتا تھا۔

بڑی بیٹی رافیہ نے بائیس سال کی عمر میں ماسٹر کیا تھا۔ اس وقت اس سے چھوٹی دو بہنیں شادی کے قابل ہو چکی تھیں لیکن ان کے لیے کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔ ظاہر ہے ان کے گھر کون رشتہ لے کر آتا جب کہ سب جانتے تھے کہ ان سے جہیز میں کچھ ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔ ایک آدھ بیٹی ہوتی تو پھر بھی رشتہ آ جاتا کہ ماں باپ کہیں سے قرض ادا کر کے جہیز کر دیں گے لیکن سات بیٹیوں کے ساتھ تو اس کی توقع بھی نہیں تھی۔ ماں باپ نے ساتوں کو دیکھنا تھا کسی ایک کو جی بھر کر نہیں دے سکتے تھے اور یہاں تو ایک کو بھی جہیز دینے کی گنجائش نہیں تھی۔ آپا اور مزل بھائی کا یہاں کوئی رشتہ دار نہیں تھا حد یہ کہ دور پرے کا بھی نہیں تھا۔ ان کی ساری واقفیت محلے میں اور آپا کے اسکول میں تھی۔ ان کی بیٹیوں کے لیے اسی حلقے سے رشتے آ سکتے تھے مگر وہ سب ان کی حالت سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لیے کسی نے رشتہ لانے کی زحمت نہیں کی۔

آپا کی طرح ان کی بچیاں بھی خوب صورت تھیں۔ گوری چٹی اور اچھے نقوش والی، پھر سلیقہ شعار اور مختلف کاموں کی ماہر تھیں۔ جن کو پڑھنے کا شوق تھا وہ گریجویٹیشن اور ماسٹر کر رہی تھیں اور ٹیوشن پڑھا کر اپنے اخراجات پورے کر رہی تھیں۔ باقی سلائی کڑھائی کرتی تھیں۔ وہ کام گھر میں کرتی تھیں تعلیم بھی انہوں نے اسکول کے بعد پرائیویٹ ہی حاصل کی تھی کیونکہ آپا کی اتنی گنجائش نہیں تھی کہ انہیں باقاعدہ کالج اور یونیورسٹی میں پڑھائیں۔ باقی کام بھی انہوں نے آپا سے یا از خود کوشش کر کے سیکھے تھے۔ کھانا بنانے اور دوسرے گھریلو کاموں میں طاق تھیں۔ آپا کی ریٹائرمنٹ سے پہلے میں کئی بار ان کے گھر گئی اور ہر بار ان کا گھر جگمگاتا ہوا ملا۔ میری رہائش ناتھ ناظم آباد میں تھی اور آپا کا گھر دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ یہ اورنگی کے شروع میں ہی تھا۔ ذرا صل مجھے آپا کی بچیوں سے اپنے لیے کپڑے سلوانے ہوتے تھے اس لیے ہر دوسرے تیسرے مہینے ان کے گھر کا چکر لگتا تھا۔ میں ایک ساتھ کئی سوٹ اکٹھے لے جاتی تھی۔ جب سوٹ سل جاتے تو آپا مجھے اسکول میں لا

دیتی تھیں۔

جب میں پہلی بار آپا کے گھر گئی تو ان کی سب سے چھوٹی بیٹی... بھی جوانی کی حدوں پر قدم رکھ رہی تھی اور رافیہ تیس کے پاس پہنچ گئی تھی اگرچہ اپنے چھریے جسم اور چہرے کی معصومیت سے وہ میں بائیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی مگر اس کی عمر اچھی خاصی ہو چکی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ایک بچی کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ شادیاں تو سب بچیوں کی ہو جاتی ہیں چاہے وہ کتنی ہی غریب کیوں نہ ہوں۔ میرے اندر کرید لگ گئی تھی کہ یہ کیا مسئلہ تھا۔ ایک دن اتفاق سے اسٹاف روم میں ہم دونوں ہی تھے۔ میں نے بوا سے چائے لانے کو کہا اور موقع غنیمت جان کر آپا سے ان کی بچیوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ ”آپا آپ کی بچیاں ماشا اللہ اتنی پیاری ہیں اور اتنی سکھڑ اور سلیقہ شعار ہیں پھر پڑھی لکھی بھی ہیں۔“

”بس عیسو یہ اللہ کی دین ہے۔“ وہ اپنے مخصوص منکسر لہجے میں بولیں۔ ”میں نے اپنی بچیوں کی اچھی تربیت کی کوشش کی ہے۔“

”لیکن ان کی شادی نہیں کی... آپا کسی ایک کی تو ہونی چاہیے تھی؟“

انہوں نے سر آدھ بھری۔ ”کیا بتاؤں... نصیب اسی کو کہتے ہیں، تم نے دیکھ لیا ہے میری بچیوں میں کوئی کی نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ میں انہیں گھر بھر کر جہیز نہیں دے سکتی۔ محلے میں ہم سے بھی غریب لوگ ہیں وہ جہیز کیا بیٹی کو ایک جوڑے سے زیادہ کچھ دے نہیں سکتے۔۔۔۔۔ ان کی بچیاں صورت اور سلیقہ میں میری بچیوں سے کم ہیں مگر ان کی شادیاں ہو گئیں اور آج وہ اپنے گھروں میں آباد ہیں۔ کئی بچوں کی مائیں ہیں۔ رافیہ کے ساتھ کی لڑکیوں کی اپنی لڑکیاں اب جوان ہو رہی ہیں۔ ان کی پندرہ سولہ سال کی عمر میں شادی کر دی گئی تھی لیکن میری رافیہ ابھی تک بیٹھی ہے۔“

”آپا اس کی کیا وجہ ہے؟“

”میں نہیں جانتی... شاید اللہ کی کوئی مصلحت ہو۔ کئی بار رشتے آئے لیکن وہ پلٹ کر دو بارہ نہیں آئے۔“

میں نے آپا کو بہت کرید لیا لیکن وہ وضاحت نہیں کر پائیں کہ ان کی بچیاں کیوں گھر بیٹھی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خود بھی اس چیز کو نہیں سمجھ پا رہی ہیں اور حیران ہیں۔ اس کے بعد کئی بار میرا ان کے گھر جانا ہوا، میں بہت دیر وہاں رکی۔ ان لڑکیوں کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھایا۔ ان

کے گھر کا ماحول دیکھا۔ ان کی زبان اور ادب و آداب دیکھے۔ ہر کام میں تمیز طریقہ اور سلیقہ تھا۔ کوئی بدظنی، بد تہذیبی اور بد سلیقگی نہیں تھی۔ غربت کو انہوں نے جس طرح سے چھپایا تھا وہ واقعی قابل تحسین تھا۔ وہ اپنی غربت پر شرمندہ بھی نہیں تھیں اور پوری طرح با اعتماد تھیں۔ وہ لڑکیاں اس قابل تھیں کہ بڑے گھروں میں جاتیں مگر ستم طر فی نہیں تھی کہ عام اور معمولی گھروں سے بھی ان کے لیے رشتے نہیں آ رہے تھے۔

ایک دن میں آپا کی بچیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور جیسے جیسے میں اس پر غور کرتی گئی وہ میرے ذہن میں پختہ ہوتا گیا۔ مسئلہ آپا یا ان کی بچیوں میں نہیں تھا مسئلہ ان لوگوں کا یا اس ماحول کا تھا جس میں وہ رہ رہی تھیں۔ یہ بہت نچلے طبقے کی آبادی والا علاقہ تھا جہاں گھروں میں تعلیم اور تہذیب کا گزر بہت کم تھا وہاں اپنی غربت کو سلیقے میں چھپانے کا رواج نہیں تھا بلکہ وہ اسے اشتہار بنا کر اپنے لیے رعایتیں حاصل کرتے تھے۔ یہ ایک کھلے قسم کا ماحول تھا اور اس میں وہی بس سکتا تھا جو اس ماحول کا عادی ہو۔ جبکہ آپا کے گھر کا ماحول بالکل مختلف تھا۔ یہی وجہ تھی ان کے ہاں جو رشتہ لے کر آتے تھے وہ اس ماحول کو دیکھ کر دوبارہ آنے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ کے خیال میں اس ماحول کی لڑکی ان کے ہاں نہیں چل سکتی تھی اور کچھ ہمت نہیں کرتے تھے کہ انہیں انکار ہو جائے گا۔ اگر آپا اور ان کی بچیاں اس ماحول کے مطابق ہوتیں تو یہ مسئلہ ہی نہ ہوتا۔

جب مجھے اگلی بار موقع ملا تو میں نے آپا کے سامنے اپنا خیال اور اس کا تجزیہ پیش کر دیا۔ وہ حیران ہوئیں اور پھر مسکرا کر بولیں۔ ”تم ہمارے لیے اتنا سوچتی ہو۔“

میں نے اعتراف کیا۔ ”ہاں آپا... آپ کو برا تو نہیں لگا؟“

”اس میں برا لگنے کی کیا بات ہے میں تو تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے میری بچیوں کے لیے اتنی زحمت کی۔“

”آپا آپ اس علاقے میں مس فٹ ہیں۔“

”لیکن میں یہ جگہ چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ یہ مکان جس قیمت میں جائے گا اس قیمت میں کسی اچھی جگہ پلاٹ بھی نہیں ملے گا۔“

”آپا کچھ کریں یہاں سے نکلیں تب ہی آپ کی لڑکیوں کو رشتے ملیں گے یہاں تو بہت مشکل ہے۔“

آپا سوچ میں پڑ گئیں۔ ان کی ریٹائرمنٹ کا وقت قریب آ گیا تھا اور وہ فکر مند تھیں کہ اس کے بعد کیا ہو گا۔ اگرچہ اس وقت تک ان کی تنخواہ اچھی خاصی ہو گئی تھی لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد تو بس پنشن ملتی اور جب تنخواہ میں گزرا نہ نہیں ہو رہا تھا تو خالی پنشن میں کہاں سے ہوتا۔ انہوں نے سر آدھ بھر کر کہا۔ ”میں نے کتنا کہا تھا رافیہ سے کہ بی ایڈ کر لے تو اسکول میں جاب مل جائے گی لیکن وہ نہیں مانی اسے ملازمت پسند نہیں ہے چاہے لڑکیوں کے سرکاری اسکول کی ہو۔ اگر وہ ملازم ہو گئی ہوتی تو مجھے اس وقت کتنا

قارئین متوجہ ہوں

پرچا

نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ **بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔**

☆ **شہر اور علاقے کا نام۔**

☆ **مکس ہوٹل بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر۔**

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ناصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگرم

63-C فیروز ٹرسٹ ہاؤس اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

سہارا ہو جاتا... خیر اصل سہارا تو اللہ ہے۔ آگے بھی وہی مالک ہے۔“

”کوئی دوسری بیٹی تیار نہیں ہوئی؟“

”اس سے چھوٹی دونوں کو تعلیم سے خاص دلچسپی نہیں ہے بس اتر کیا۔ ایک نے بی کام کا انتخاب کیا ہے اور اس سے چھوٹی والی بھی آئی کام کر رہی ہے۔ اس پر انہیں گورنمنٹ لیجر کی جاب کہاں ملے گی۔ پانچویں نے میٹرک کر کے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا اور دوا بھی اسکول میں ہیں۔“

آپا نضب کی چھ اور سات نمبر کی بیٹیاں بالترتیب میٹرک اور آٹھویں کلاس میں تھیں۔ آپا آخری بیٹی کے میٹرک کرتے ہی ریٹائر ہو جاتیں۔ اکثر ٹیچران کو مذاق میں چیخرتی تھیں کہ اصل میں اسکول کی نوکری بیچوں کو یہاں سے میٹرک کرانے کے لیے کی تھی۔ اس مذاق پر آپا ہستی تھیں اور برا نہیں مناتی تھیں لیکن کسی بات کا برا منائیں تو ان کے چہرے سے پتا چل جاتا تھا۔ جتنی خود دار تھیں اتنی ہی عزت نفس بھی رکھتی تھیں اور کسی کو اس سے کھیلنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ پھر تین سال پہلے آپا کی عمر ساٹھ سال ہوئی اور وہ ریٹائر ہو گئیں۔ سب نے بوجھل دل کے ساتھ انہیں رخصت کیا۔ ان کے اعزاز میں فیروزیل پارٹی دی گئی جس میں ان کی سابقہ اسٹوڈنٹس بھی آئی تھیں۔ سب نے انہیں تحفے دیے۔ اس کے بعد آپا صرف دو بار اسکول آئیں جب انہیں اپنی پشن اور پروویڈنٹ فنڈ کے سلسلے میں ہیڈ مسٹر بس سے کام پڑا تھا اس کے بعد وہ غائب ہو گئیں۔ کوئی ایک سال بعد میرا اتفاق سے اورنگی میں آپا کے گھر کے پاس سے گزر رہا تو میں وہاں رکی دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک اجنبی عورت نکلی۔

”کیا بات ہے۔“ اس نے اجڈ لہجے میں پوچھا۔

”وہ مجھے آپا نضب سے ملنا ہے۔“

”وہ یہاں سے چلی گئی ہے۔“ عورت نے عجیب انداز میں کہا اور دروازہ بند کرنے لگی۔

”ایک منٹ کہاں چلی گئی ہیں؟“

”مجھے کیا پتا مالک مکان کو پتا ہوگا ہم تو یہاں کرائے دار ہیں۔“

اب میں مالک مکان کا پتالیتی اور پھر اس کے گھر جا کر آپا نضب کا موجودہ پتا پوچھتی تو یہ ممکن نہیں تھا۔ میرے میاں جی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا اس لیے میں مایوس ہو کر

روانہ ہو گئی۔ اتنے عرصے بعد آپا سے ملنے کا سارا جوش و لولہ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ پھر میں نے اس معاملے کو قسمت پر چھوڑ دیا کہ اگر تقدیر میں ہوا تو آپا کہیں چلتے پھرتے مل جائیں گی یا اسکول آجائیں گی۔ مگر وہ ایسی نہیں کہ پلٹ کر نہیں آئی تھیں۔ کچھ عرصے ہم لوگ ان کے بارے میں فکر مند بھی رہے کہ خدانہ خواستہ ان کے ساتھ کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گیا یا ان کی طبیعت تو نہیں خراب ہو گئی یا کوئی اور بات تو نہیں ہو گئی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ وہ فکر ان سے نکل کر یادوں میں رہ گئیں اور پھر یہ یاد بھی ذہن سے محو ہونے لگی وہ کسی حوالے سے یاد آئیں تو اشاف روم میں ان کا ذکر ہوتا تھا۔ ورنہ کوئی خاص طور سے ان کا ذکر نہیں کرتا تھا۔

اس لیے اب کسی کو توقع بھی نہیں رہی تھی کہ اتنے سال بعد وہ اچانک آجائیں گی۔ بہر حال سب نے گرم جوش سے ان کا استقبال کیا تھا۔ جس جس ٹیچر کو اطلاع ملتی وہ بھاگی آئی تھی۔ میں بھی کلاس سے فارغ ہو کر وہاں پہنچی تو آپا نضب سب کے درمیان میں بیٹھی خوش نظر آرہی تھیں۔ ان کی صحت بہتر ہو گئی تھی اور انہوں نے بہت اچھا سا سوٹ پہن رکھا تھا۔ ملازمت کے دنوں میں بھی میں نے انہیں اتنا اچھا سوٹ پہنے نہیں دیکھا تھا۔ میں گلے سے لگی۔ ”آپا کیسی ہیں... یہاں سے جا کر ہمیں بھول ہی گئیں؟“

”ارے نہیں عمیرہ... میں تم لوگوں کو بھول سکتی ہوں بھلا بس یہاں سے نکلنے کے بعد ایک مشن میں لگ گئی تھی اور اللہ کا شکر ہے یہ مشن مکمل ہو گیا۔ اب میں آزاد ہوں۔“

”کیسا مشن آپا؟“ میں نے پوچھا۔ سب ہی تجسس ہو رہے تھے۔

”بعد میں بتاؤں گی ابھی تو تم لوگوں سے ملنے آئی ہوں۔“ انہوں نے نالنے والے انداز میں کہا۔ ”کلاس کا وقت ہے زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گی۔“

وہ کچھ دیر بعد اٹھ گئیں بوائے اور سوسوں سے ان کی خاطر تواضع کی تھی۔ جب وہ چلی گئیں تب دوسروں کو خیال آیا کہ کسی نے آپا سے ان کے بچے گھر کا پتا تو لیا نہیں تھا اور نہ انہوں نے بتایا کہ اب وہ کہاں رہتی ہیں۔ میں دل موس کر رہ گئی۔ میں جاننے کے لیے بے تاب تھی کہ آپا اچانک کیوں غائب ہو گئی تھیں اور انہوں نے اپنا گھر کیوں بچ دیا تھا۔ ہمارے خدشات کے برعکس ان کی بہت اچھی حالت دیکھ کر یہ تجسس مزید بڑھ گیا تھا مگر اب اسے رفع کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ آپا آئیں اور پتا دیے بغیر چلی گئیں۔ آپا کی ایک ہم عصر اور حریف ٹیچر نے

جل کر کہا۔ ”ارے تم لوگ پاگل ہووے تمہیں اپنے گھر بلانا ہی نہیں چاہتی اس لیے پتا دیے بغیر چلی گئی۔“

”ایسا نہیں ہے میں کتنی بار آپا کے گھر گئی ہوں۔“ میں نے جلدی سے تردید کی۔

”عمیرہ... وہ اس کا پرانا گھر تھا۔ اب وہ کسی نے گھر میں ہے اس کی حالت بھی بدل گئی ہے۔ دیکھا نہیں تھا کتنا اچھا سوٹ پہن کر آئی تھی۔“

”آپ تو رہنے دیں۔“ ایک ٹیچر نے منہ بنا کر کہا۔ ”آپ سے کسی کا اچھا پہنا اور حارداشت ہی کہاں ہوتا ہے۔“

”مرضی تمہاری نہ مانو... دیکھنا اب دوبارہ نہیں آئے گی وہ بس اپنی چھب دکھانے آئی تھی۔“

آپا نضب کے بارے میں ان کی یہ باتیں کسی کو اچھی نہیں لگی تھیں۔ اس لیے گفتگو کا موضوع بدل دیا گیا۔ مگر میرے ذہن میں ابھرنے لگی تھی کہ آپا نضب نے ایسا کیوں کیا۔ انہیں کم سے کم مجھے تو اپنا پتا دے کر جانا چاہیے تھا۔ کیا وہ واقعی اب ہم سے نہیں ملنا چاہتی تھیں اور نہ ہم میں سے کسی کو اپنے گھر بلانا چاہتی تھیں؟ یہ سوالات کئی دن تک میرے اندر گونجنے رہے اور پھر میں بھولنے لگی۔ اس واقعے کے چند دن بعد میں اپنے علاقے کی مارکیٹ میں گئی تھی۔ یہاں سب چیزیں مل جاتی تھیں اس لیے مہینے میں ایک دو چکر لگ جاتے تھے۔ ایک دکان میں اپنے لیے پرس دیکھ رہی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی۔ ”عمیرہ... تم؟“

میں نے سر کر دیکھا تو آپا نضب کھڑی تھیں۔ انہوں نے نوکری اٹھا رکھی تھی اور وہ بھی سامان لیے آئی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی کیونکہ یہ مقامی مارکیٹ تھی اور لوگ باہر سے نہیں آتے تھے۔ آپا نضب یہاں کیا کر رہی تھیں۔ سلام دعا اور خیریت کے بعد میں نے ان سے پوچھا تو بولیں۔ ”دور سے کہاں سے آئی ہوں، میرا گھر کچھ ہی تو دور ہے۔“

مجھے حیرت ہوئی کیونکہ یہ علاقہ مہنگا تھا۔ بے شک تار تھ ناظم آباد کے باقی علاقوں جتنا مہنگا نہیں تھا لیکن اورنگی کی نسبت خاصا مہنگا تھا۔ میں نے شکوہ کیا۔ ”آپ نے اس دن اپنا پتا بتایا ہی نہیں۔“

”میں نے جان کر نہیں بتایا تھا۔“ وہ بولیں۔ ”میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ بات سب پر کھلے اور وہ بعد میں میرا مذاق اڑائیں۔ لیکن تمہارے لیے میرا ارادہ تھا کہ کسی دن تمہارے گھر آ کر تمہیں لے جاؤں گی اور اپنا گھر دکھاؤں

گی۔ بلکہ ایسا کروا بھی چلو اگر شایک کرتی ہے تو؟“ میری کچھ شایک باقی تھی لیکن آپا نضب کا گھر دیکھنے اور ان کے حالات جاننے کی فکر میں... باقی شایک ملتوی کر دی۔ ”سب لے لیا ہے... یہاں سینڈ بیگ دیکھ رہی تھی کہ اب تنخواہ ملے تو نیا بیگ لوں پرانا تو پھٹنے والا ہو رہا ہے۔“

آپا نضب نے ایک رکشا روکا اور ہم دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ مشکل سے پانچ منٹ بعد رکشے والے نے ایک مکان کے سامنے اتار دیا۔ یہ ایک سوئیس گز کا دو منزلہ مکان تھا اور خاص بات اس کے سامنے لگا آپا میرج بیورو کا بورڈ تھا۔ بڑے گیٹ کے ساتھ والا کمرامیرج بیورو کے لیے مخصوص تھا۔ آپا مجھے اندر لائیں، مکان اندر سے سادہ لیکن بہت صفائی اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ لاؤنج میں بڑا سا تخت بچھا تھا جس پر رلی کا چادر پوش اور اس سے میچ کرتے ہوئے گاؤٹیکے تھے۔ لاؤنج کے ساتھ ہی کھانا ہوا امریکن کچن تھا۔ پیچھے دو بیڈ روم ایچ باٹھ کے ساتھ تھے۔ جب تک آپا نے صندل کا شربت بتایا۔ میں پورے گھر کا جائزہ لے چکی تھی۔ ایک بیڈ روم اچھا فرشتہ تھا۔ اس میں ڈبل بیڈ... اور ڈریسنگ کے ساتھ ایک چھوٹا بیڈ بھی لگا ہوا تھا جب کہ دوسرے بیڈ روم میں ایک چھوٹا بیڈ، ایک بڑی تین پٹ والی الماری اور ایک چھوٹی اور سادہ ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ دونوں کمروں میں نیلے رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ ہر چیز میں صفائی ستھرائی اور سلیقے کی مخصوص جھلک تھی جو آپا نضب کے گھر کی نشانی تھی۔ مگر نہ تو کوئی لڑکی دکھائی دی اور نہ مزل بھائی نظر آئے۔ میں لاؤنج میں واپس آئی۔

”آپا لڑکیاں اور مزل بھائی کہاں ہیں؟“

”لڑکیاں اپنے گھر کی ہو گئیں اور مزل...“ آپا نے

شمارہ اپریل 2013ء کی منتخب سچ بیابیاں

ہماری پیش کش... آپ کا انتخاب

☆ اول: محبت... عمران صدیقی (کراچی)

☆ دوم: غلطی... سحرش (کراچی)

☆ سوم: تیرے جانے کے بعد... آسیہ (لاہور)

پہلے دو سرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ اپنی منتخب کتب

ہم آپ کی مدد کا احراز کریں گے

رک کر سرد آہ بھری۔ ”تین سال پہلے... اپنے رب کے پاس چلے گئے۔“

مزل بھائی کے انتقال کی خبر میرے لیے غیر متوقع نہیں تھی کیونکہ آپا کے اسکول کے آخری دنوں میں ان کی بیماری بہت بڑھ گئی تھی اور وہ مہینے میں دو ہفتے اسپتال میں داخل رہتے تھے لیکن آپا کی سات کی سات بیٹیاں اپنے گھر کی ہو چکی تھیں میرے لیے یہ خبر انتہائی حیرت ناک تھی۔ تین سال پہلے ایک بیٹی کی بھی شادی نہیں ہوئی تھی اور اب سب کی شادی ہو چکی تھی۔ آپا نے مجھے شربت کا گلاس تھمایا جو میں نے ایک ہی سانس میں چڑھا لیا تب کہیں جا کر میرے حواس ٹھکانے آئے۔

”پر آپا یہ ہوا کیسے... میرا مطلب ہے اتنی جلدی...؟“

”بس عمیرہ ان کا بلاوا آگیا تھا۔“ آپا نے جواب دیا۔

”آپا میں لڑکیوں کی شادی کی بات کر رہی ہوں۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا اور پھر مجھے اپنی بدتمیزی کا احساس ہوا۔ ”سوری آپا... مزل بھائی کا سن کرافس ہوا ہے۔“

”ہونے والی بات کو کون روک سکتا ہے، جن دنوں میری ریٹائرمنٹ ہو رہی تھی ان ہی دنوں ڈاکٹر نے بتا دیا تھا کہ مزل کے پیچھے دے بالکل ختم ہو گئے ہیں اور وہ کسی وقت بھی گزر سکتے ہیں۔ میں نے اور بچیوں نے خود کو اس خبر کے لیے تیار کر لیا تھا۔“

آپا کچھ دیر مزل بھائی کی باتیں کرتی رہیں اور میں صبر سے سنتی رہی کہ کب وہ اصل موضوع پر آتی ہیں۔ بالآخر انہوں نے لڑکیوں کی بات کی۔ ”اللہ کا شکر ہے سب اپنے گھر میں آباد ہیں اور خوش باش ہیں۔“

”آپا آپ کو بہت مبارک ہو... جو سنے گا اسے یقین نہیں آئے گا۔ یہ ہوا کیسے؟“

”سب سے پہلے تو میں تمہارا شکر یہ ادا کروں گی کہ تم نے میری بچیوں کی شادی نہ ہونے کا بالکل ٹھیک سبب کھوج نکالا تھا۔ پھر اللہ نے مجھے عقل اور ہمت دی کہ میں نے تمہارے مشورے پر عمل کیا۔ میں نے مزل کے انتقال کے بعد وہ مکان اور دکان بیچ دی۔ خوش قسمتی سے گاہک اچھے ملے تھے۔ اس لیے میں لٹنے سے بچ گئی۔ مجھے بھلا مکان و جائیداد کی قیمت کا کیا پتا تھا۔ پھر مجھے فنڈ کی جو رقم ملی تھی اسے ملا کر میں نے یہ مکان لے لیا۔ یہ مکمل نہیں تھا اس لیے

مارکیٹ سے کم قیمت پر مل گیا۔ میں لڑکیوں کو لے کر ایسے ہی یہاں اٹھ آئی پھر بیچ جانے والی رقم سے نیچے اور اوپر کا حصہ مکمل کر لیا۔ اور پر کرائے پر دے دیا۔ کرائے کی رقم اور میری پنشن سے کسی نہ کسی طرح گزارہ ہو رہا تھا پھر لڑکیوں نے یہاں بھی کام شروع کر دیا۔ آغاز میں کچھ مشکلات پیش آئی تھیں لیکن ایک بار کام ملنے لگا تو پھر مشکلات بھی کم ہو گئیں۔ مگر بات وہی تھی جو آ رہا تھا اس سے گھر چل رہا تھا اور لڑکیوں نے اپنے شوق سے گھر کو جانا شروع کر دیا تھا ان کی شادی کے لیے میں کچھ نہیں جوڑ پا رہی تھی۔ چھ سات مہینے میں گھر سیٹ ہو گیا۔“

میں بے تاب ہو رہی تھی۔ ”لیکن آپا، بچیوں کی شادیاں کیسے کیں اور یہ آپا میرج بیورو کیسے کھولا؟“

آپا مسکرائیں۔ ”بتا رہی ہوں تم ہمیشہ کی طرح بے صبری رہی ہو۔“

”سچ ہے آپا اور ہر شخص میں آپ جیسا صبر ہو بھی نہیں سکتا ہے۔ اس لیے بس اب جلدی سے بتا دیں۔“

”ایک دن بیٹی بچیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی اور اخبار دیکھ رہی تھی۔ اس میں اشتہارات والا حصہ سامنے تھا۔ اچانک میری نظر ضرورت رشتہ والے حصے پر پڑی اور میں نے سوچا جن لوگوں کے تعلقات نہیں ہوتے یا ان کو عام طریقے سے رشتہ نہیں ملتا ہے وہ بے چارے میرج بیورو کے چکر لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر دھوکا کھاتے ہیں۔ اب تم سے کیا چھپاؤں میں خود کئی بار ان لوگوں کے ہاتھوں لٹ چکی تھی۔ فیس لے کر وہ فرخاتے رہتے ہیں یا ایسے رشتے سامنے کر دیتے ہیں جنہیں آدمی خود مسترد کر دے۔ مجھے خیال آیا کہ میں خود کیوں نہ میرج بیورو کھول لوں۔ میرے پاس جگہ ہے اور اس طرح آمدنی کی ایک سبیل بھی پیدا ہو جائے گی۔“

”تو آپ نے صرف آمدنی کے خیال سے میرج بیورو کھولا؟“

”نہیں اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو میری سات بیٹیاں گھر بیٹھی تھیں اور میں جانتی ہوں کسی غریب ماں کے لیے اس سے بڑا عذاب اور کوئی نہیں ہوتا ہے کہ اس کی جوان بیٹی رشتہ نہ ملنے کی وجہ سے گھر بیٹھی رہے۔ میرے ذہن میں تھا کہ میں ایسی لڑکیوں کے... رشتے کراؤں گی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اللہ میرے خلوص کو قبول کرے اور اپنی رحمت سے میری بچیوں کو بھی اپنے گھر کا کر دے۔ یہ سوچ کر

میں نے اللہ کا نام لیا اور گھر میں میرج بیورو کھول کر اخبار میں اس کا اشتہار دے دیا۔ یہ اشتہار ہر اتوار کو آتا ہے۔ ایک منٹ میں تمہیں اشتہار دکھائی ہوں۔“ آپا اٹھ کر اندر گئیں اور پچھلے اتوار کا اخبار لے آئیں۔ ”یہ دیکھو۔“

میں نے اشتہار دیکھا۔ ”ایسے غریب گھرانے جن کی بچیوں کے رشتے نہیں آتے، پورے اعتماد کے ساتھ رجوع کریں، کوئی فیس نہیں ہے۔ ایسے مرد حضرات جو اپنا گھر سناٹا چاہتے ہوں رابطہ کریں۔“

”اچھا اشتہار ہے آپا لیکن اس میں تو آپ نے فیس منع کر دی ہے۔“

”صرف لڑکی والوں کو منع کی ہے۔ ان سے کوئی رجسٹریشن فیس یا شادی کے وقت کی فیس نہیں لیتی ہوں۔ یہ فیس میں لڑکے یا مرد سے لیتی ہوں جو اپنے طور پر شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔“

”یعنی آپ ایسے لڑکوں یا مردوں کے رشتے کراتی ہیں جن کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہوتا ہے۔ وہ خود مختار ہوتے ہیں یا پھر دوسری شادی کرنے والے جن کے گھر والے آگے آنے کو تیار نہ ہوں۔“

”تم نے بالکل ٹھیک تجزیہ کیا ہے۔ میرے پاس ایسے ہی لڑکے اور مرد آتے ہیں۔ جن کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہوتا ہے یا وہ کسی وجہ سے دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

”آپا یہ تو بڑا جھجھٹ والا کام ہے۔ میں نے سنا ہے اس میں لڑائی جھگڑے ہو جاتے ہیں اور لوگ میرج بیورو کو بھی درمیان میں کھینچ لیتے ہیں۔“

”تم نے ٹھیک سنا ہے، مجھے بھی ان جھگڑوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جو مرد دوسری شادی کر رہے ہوتے ہیں اگر ان کی پہلی بیوی یا گھر والوں کو پتا چل جائے تو وہ لڑنے کے لیے یہاں بھی آ جاتے ہیں۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اکثر افراد اپنا مسئلہ نمٹا کر آتے ہیں اور شادیاں خیر و خوبی سے ہو جاتی ہیں۔“

”آپ کو یقین تھا میرج بیورو چلے گا؟“

”جی ہاں بات ہے یقین نہیں تھا کیونکہ ایک تو یہ رہائشی علاقہ ہے اور وہ بھی اندر کا... یہ عام گزرگاہ تو ہے نہیں کہ تلاش کرنے والا آرام سے پہنچ جائے... پھر مجھے اس کام کا تجربہ بھی نہیں تھا۔ فون کوشش کے باوجود نہیں لگوا سکی اس لیے موبائل فون سے کام چلاتی ہوں۔ اشتہار دینے کے دو دن بعد پہلی کال آئی۔ یہ ایک مرد تھا وہ دوسری شادی کرنا

ثریڈ مارک

رجسٹری شدہ الفاظ یا نشان جو بنانے والا اپنی مصنوعات کے لیے مقرر کرتا ہے۔ یہ نشان یا علامت ایک ہی قسم کی مختلف مصنوعات میں تمیز پیدا کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ رجسٹری کر لینے سے نقل کا اندیشہ نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ ٹریڈ مارک مال کی تشہیر میں بھی مدد دیتا ہے۔ کارخانے کی شہرت کے ساتھ ساتھ یہ نشان مصنوعات کی عمدگی اور نفاست کا بھی ضامن ہوتا ہے اور اس طرح تجارتی شہرت کا ایک اہم جزو تصور کیا جاتا ہے۔ ٹریڈ مارک کے مالکانہ حقوق اس ادارے کو ملتے ہیں جو سب سے پہلے حکومت کے متعلقہ محکمے سے اس کی اجازت حاصل کر لے۔

ثریڈ یونین

کسی صنعت کے مزدوروں کی انجمن جو ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے قائم کی جائے، اسے لیبر یونین بھی کہتے ہیں۔ اس کا مقصد مزدوروں کی اجرت بڑھوانا اور کام کے حالات درست کرنا ہے۔ یہ صحت، تعلیم، نیسے، اوقات کار، حالات کار اور دیگر سہولتوں اور مراعات کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ ٹریڈ یونین مختلف شکلوں میں قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔ ازمنہ وسطی کے گلفڈنی درحقیقت ٹریڈ یونین ہی تھے۔ شروع میں اس قسم کی مزدور انجمن کی رکنیت کو سیاسی طور پر بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا اکثر عمر قید اور موت کی سزا دی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کے اوائل میں صنعتی انقلاب کے رونما ہونے کے بعد حالات بدل گئے اور ٹریڈ یونین نے رفتہ رفتہ صنعتی ممالک کی معاشی ترقی میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ پاکستان میں بھی مختلف ناموں کے ساتھ ٹریڈ یونین اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

مرسلہ: احمد کمال، کمالیہ

چاہتا تھا، میں نے اسے بلا لیا۔ اس وقت رجسٹریشن فیس میں نے پانچ سو روپے رکھی تھی۔ میں نے فون پر اسے واضح کر دیا کہ وہ یہ سوچ کر آئے اس کا جس لڑکی یا عورت سے رشتہ ہوگا وہاں سے اسے کچھ نہیں ملے گا اور شادی کا خرچ بھی اسے خود برداشت کرنا پڑے گا۔ اس لیے وہ سوچ سمجھ کر آئے۔ اس آدمی نے کہا کہ اسے صرف ایک ایسی لڑکی یا عورت چاہیے جو اسے گھر کا سکون دے سکے باقی اسے کچھ نہیں درکار ہے۔ اسی دن وہ آدمی آیا۔ وہ اندرون سندھ سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی خاندان میں شادی ہو چکی تھی مگر اپنی بیوی سے نہیں بنتی تھی اس لیے وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ عمر پینتیس برس تھی، پڑھا لکھا بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ایک صوبائی محکمے میں اٹھارہ گریڈ کا افسر تھا۔ تم یقین کرو گی اس کے صرف پندرہ دن بعد اس کی شادی ہو گئی تھی اور میرے توسط سے ہوئی تھی۔

”لڑکیوں کے ماں باپ تو دھڑا دھڑا رابطہ کر رہے ہوں گے؟“

”ایسے ویسے۔“ آپا نے سب نے سرد آہ بھری۔ ”یقین کرو اگر شادی کا خواہش مند ایک مرد ہوتا ہے تو اس کے مقابلے میں لڑکیوں کے دس رشتے موجود ہوتے ہیں۔ اکثر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی بچیوں کو صرف تن کے کپڑوں میں بیاہ سکتے ہیں۔ ان کے پاس ایک وقت کا کھانا کھلانے کی سکت بھی نہیں ہوتی ہے۔ ایک مہینے کے اندر میرے پاس سو سے زیادہ لڑکیوں کی رجسٹریشن ہو گئی تھی۔ میں نے شروع سے پورا ریکارڈ رکھا۔ لڑکیوں کے رجسٹر الگ بنائے اور لڑکیوں کے الگ۔ میں پوری معلومات لیتی تھی اور رشتہ ہونے کی صورت میں ایک حلف نامہ بھی سائن کراتی تھی جس میں لڑکی اور لڑکے دونوں کی طرف سے اقرار ہوتا تھا کہ انہوں نے مجھے جو بتایا اس کے ذمے دار وہ خود ہوں گے اور میری کسی قسم کی ذمے داری نہیں ہوگی۔ رجسٹریشن فیس کے علاوہ شادی کے موقع پر لڑکے سے پانچ ہزار لیتی ہوں۔ اب رجسٹریشن فیس ہزار روپے کر دی ہے۔“

آپا نے سب نے اب بھی پوری بات نہیں بتائی تھی کہ کس طرح انہوں نے مختصر عرصے میں اپنی بیٹیوں کی شادی کر دی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”آپا آپ نے میرج بیورو کی مدد سے اپنی بیٹیوں کی شادی کی؟“

”ہاں لیکن اس طرح نہیں جیسے تم سوچ رہی ہو۔“

”میں کیا سوچ رہی ہوں؟“

”یہی کہ مردوں میں جو اچھا رشتہ آیا ہوگا میں نے اسے اپنی بیٹی دکھا دی ہوگی۔“

واقعی میرے ذہن میں ایسا ہی خیال آیا تھا لیکن میں نے تردید کی۔ ”نہیں آپا۔۔۔ میں آپ کے بارے میں جانتی ہوں۔ آپ ایسا نہیں کر سکتی ہیں۔ مگر لڑکیوں کے رشتے میرج بیورو کے توسط سے ہی کیے ہوں گے؟“

”ہاں ہوئے تو اسی ذریعے سے ہیں۔ لیکن میں نے کس طرح سے رشتے کیے وہ تمہیں بتاتی ہوں۔ میرے پاس جو لڑکیوں کے رشتے آتے ہیں وہ اکثر غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا ماحول کیسا ہوتا ہے، رہن بہن کا انداز، تعلیم اور تہذیب ان سب چیزوں کا تمہیں اندازہ ہو گا۔ یوں سمجھ لو کہ معاشرے کے بہت نیچے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں سے بہت کم غربت کے باوجود تیز اور تہذیب والے گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ورنہ اکثر لڑکیوں کا پس منظر گھٹا ہوا اور تقریباً جاہلانہ ہوتا ہے۔ میرے پاس لڑکیوں کے جو رشتے آتے ہیں ان میں اکثر تعلیم یافتہ، مہذب اور اچھی حیثیتوں کے حامل ہوتے ہیں۔“

”آپا دو نمبر لوگوں کے رشتے بھی آتے ہوں گے جو شادیوں کے شوقین ہوتے ہیں یا اس طرح لڑکیاں حاصل کر کے ان سے غلط سلط کام کراتے ہوں گے۔“

”بہت آتے ہیں لیکن میں انہیں ٹال دیتی ہوں۔ اللہ نے انسانوں کی پہچان دی ہے۔ جنہیں پہلی بار میں نہیں پہچان پاتی انہیں چند ملاقاتوں میں جان لیتی ہوں۔ یہ بتا دوں کہ میں صرف فیس لے کر رجسٹر نہیں بھرتی ہوں بلکہ آنے والے ہر لڑکے اور مرد سے مکمل انٹرویو کرتی ہوں۔ ایک کھنٹے میں اس سے بہت کچھ پوچھ لیتی ہوں، اس سے مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ ٹھیک آدمی ہے اور گھر بسانے میں سنجیدہ ہے یا پھر کوئی دو نمبر چکر باز ہے۔ اب تو پہلی نظر میں ہی جان جاتی ہوں۔ بس شروع میں ذرا مشکل ہو گئی تھی۔ ایک دو غلط قسم کے لوگ آئے تھے اور میں نے انہیں لڑکی والوں سے ملوا دیا تھا لیکن جب لڑکی کے گھر والوں نے چھان بین کی تو ان کی اصلیت سامنے آ گئی۔ اس کے بعد میں نے انہیں بھگا دیا۔ میں پہلے ہی واضح کر دیتی ہوں کہ اگر کسی نے کوئی غلط بیانی کی اور وہ پکڑی گئی تو میں رشتہ کرانے کی پابند نہیں رہوں گی۔ ایسے لوگ دوبارہ یہاں آنے کی زحمت نہ کریں۔“

”پھر آپ نے اپنی بیٹیوں کی شادی کیسے کرائی؟“

”میرے پاس جو اچھے رشتے آتے تھے میں انہیں پوری ایمان داری سے اپنے پاس موجود لڑکیوں کے رشتے دکھاتی تھی۔ طریقہ یہ ہوتا ہے کہ میں پہلے لڑکی کی صرف تصویر دکھاتی ہوں، وہ بھی چند منٹ کے لیے اور اسی دفتر میں۔۔۔ کسی کو تصویر لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر لڑکا تصویر دیکھ کر رشتہ پسند کرتا ہے تو پھر اس کے سامنے لڑکی کا پس منظر رکھتی ہوں اور سوائے نام و پتے کے اسے تمام معلومات فراہم کرتی ہوں۔ پھر اسے سوچنے کی مہلت دیتی ہوں۔ اگر لڑکا یا مرد تفصیل جان کر بھی رشتے میں دلچسپی برقرار رکھتا ہے تو دن طے کر کے لڑکی والوں کو اس سے ملنے کے لیے بلا لیتی ہوں۔ یہ پہلی ملاقات نہیں میرج بیورو میں ہوتی ہے۔ اگر دونوں فریق اس کے بعد آپس میں۔۔۔ دلچسپی لیتے ہیں تو معاملہ ان کے سپرد کر دیتی ہوں کہ وہ آپس میں خود طے کرتے رہیں۔ ان سے حلف نامہ لے لیتی ہوں کہ اب میری کوئی ذمے داری نہیں ہے۔ شادی ہونے کی صورت میں لڑکے سے اپنی فیس وصول کر لیتی ہوں۔“

آپا حسب معمول تفصیل میں جا رہی تھیں اور اصل بات کی طرف نہیں آرہی تھیں لیکن میں نے انہیں ٹوکا کہ نہیں بالآخر انہیں احساس ہو گیا کہ وہ مجھے ترسار رہی ہیں تو وہ اصل موضوع پر آ گئیں۔ ”اگر مرد یا لڑکا کسی رشتے پر راضی نہ ہو رہا ہو اور وہ کسی ایسی فیملی سے رشتہ چاہتا ہو جو پڑھی لکھی اور مہذب ہو بے شک پیسے والی نہ ہو تو میں اسے اپنی بیٹی کی تصویر دکھاتی ہوں یہ بتائے بغیر کہ وہ میری بیٹی ہے۔ اگر اسے تصویر پسند آ جاتی اور وہ آگے بات کرنا چاہتا تو اسے بتا دیتی ہوں کہ تصویر میری بیٹی کی ہے۔ جس کی رافیہ سے شادی ہوئی وہ اچھی عمر کا آدمی تھا۔ بہنوں کی شادیاں کرنے کے چکر میں اس کی عمر نکل گئی اور اب بہنوں کو اس کی پروا نہیں تھی۔ ماں باپ گزر گئے تھے اس لیے وہ خود رشتہ لے کر آیا تھا۔ یونیورسٹی میں اسٹنٹ پروفیسر ہے۔ اپنا مکان اور گاڑی ہے، اچھی تنخواہ ہے۔ اسے اپنے لحاظ سے لڑکی چاہیے تھی جب کہ میرے پاس جو رشتے تھے ان میں سے کوئی بھی اس کے جوڑ کی نہیں تھی پھر بھی میں نے اسے بعض لڑکیاں دکھائیں۔ مگر اس نے انکار کر دیا تب میں نے ہمت کر کے رافیہ کی تصویر دکھائی اور بتایا کہ لڑکی ماسٹر ہے اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نے رافیہ میں۔۔۔ دلچسپی لی اور بات آگے چلانے کو کہا تب میں نے اسے بتا دیا کہ رافیہ اصل میں میری بیٹی ہے۔ مگر میری اتنی حیثیت نہیں

ہے کہ میں ایک حد سے زیادہ دے سکوں۔ وہ فوراً مان گیا اور اسی وقت کہہ دیا کہ شادی بالکل سادگی سے ہوگی اور اسے کچھ نہیں چاہیے۔ اس کے ایک مہینے بعد میری بیٹی اپنے گھر کی ہو گئی تھی، وہ سکیل احمد سے صرف چھ سال چھوٹی ہے اس لیے یہ جوڑ بہت ہی مناسب تھا۔ رافیہ کو تو تم نے دیکھا ہے۔ سکیل احمد بھی شکل صورت کا اچھا ہے اور مزاج کا تو بہت ہی اچھا ہے۔ رافیہ بہت خوش ہے اور اب تو ان کی ایک بیٹی بھی ہو گئی ہے۔“

”یہ تو اچھی خبر سنائی آپ نے۔۔۔ بہت مبارک ہو آپ تانی بن گئیں۔“

آپا مسکرائیں۔ ”صرف یہی نہیں ہے بلکہ میری ایک نواسی اور دونوں اسے اور بھی ہیں۔“

”آپ نے باقی بیٹیوں کی شادیاں بھی اسی طرح کیں، مگر آپا کچھ کم معیار کے لڑکے اور مرد بھی آئے ہوں گے کیا آپ نے انہیں بھی اپنی بیٹیوں کے رشتے پیش کیے تھے؟“

”نہیں۔“ انہوں نے سچائی سے کہا۔ ”میں نے ہمیشہ اچھے رشتے ہی دیکھے، لیکن اپنی طرف سے ان کے لیے پوری کوشش کرنے کے بعد جب انہیں کوئی اور رشتہ پسند نہیں آیا تو اپنی بیٹی کا رشتہ پیش کیا۔ اللہ کا شکر ہے جس کے سامنے بھی رشتہ رکھا اس نے انکار نہیں کیا۔ کسی نے مجھ سے جھجھکا مطالبہ نہیں کیا؟ کسی نے بعد میں روپ نہیں بدلا۔ میرے سب داماد بہت اچھے ہیں۔“

”آپ کا کام اچھا چل رہا ہے؟“

”ماشاء اللہ سے بہت اچھا چل رہا ہے۔ شروع کے ایک مہینے کچھ ہلکا رہا تھا لیکن اس کے بعد تم یقین کر دو تقریباً ہر ہفتے ایک شادی کرائی ہے اور بڑی عجیب سی بات ہے۔ ہر دسواں رشتہ میری بیٹی کا ہوتا تھا۔ میں نور شتے دوسری لڑکیوں کے کراتی تھی اور دسواں رشتہ میری بیٹی کا آ جاتا تھا۔ لازمی نہیں تھا کہ دسواں رشتہ ہی ہوتا بھی آگے پیچھے ہو جاتے تھے۔ لیکن دو مہینے پہلے جب سب سے چھوٹی زارا کو رخصت کیا تو وہ میرا ستر واں رشتہ تھا جو اپنی ہی بیٹی کا کرایا۔ میں نے تقریباً ہر ڈھائی مہینے میں اپنی ایک بیٹی کی شادی کی اور بالکل سادگی کے ساتھ، مجھے بھی چند ہزار سے زیادہ رقم خرچ نہیں کرنا پڑی۔ سب میرے ہونے والے داماد بنے کیا۔“

”یہ سارے رشتے میرج بیورو کے توسط سے آئے؟“ میں نے حیرت سے کہا، آپا نے سب کی کہانی واقعی

نا قابل یقین تھی۔

”ہاں تمام رشتے۔ میں نے ایک بیٹی کا رشتہ بھی کسی اور توسط سے نہیں کیا۔ جب میری تین بیٹیاں اپنے گھر کی ہو گئیں تو انہوں نے کہا کہ میں اب باقی بیٹیوں کے لیے پریشان نہ ہوں ان کے لیے رشتے اب وہ تلاش کریں گی۔ مگر میں نے ان سے کہا، جس طرح میں نے ان کی شادی کی ہے اسی طرح میں اپنی باقی بیٹیوں کی شادی بھی کروں گی۔“

”آپ آپ کے سارے داماد اکیلے اور بغیر خاندان کے ہیں؟“

”نہیں تین کے تو باقاعدہ خاندان ہیں لیکن گھر والوں کی عدم توجہی سے تنگ آ کر انہوں نے خود اپنی شادی کے لیے کوشش کی۔ زارا کا شوہر دہلی میں کسی فرم اکاؤنٹنٹ ہے۔ بے چارہ کما کر بھیج رہا تھا اور یہاں گھر والے عیش کر رہے تھے اس نے کئی بار کہا کہ اس کی شادی کی کوشش کریں۔ مگر گھر والے اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ تب اس نے مجبور ہو کر خود سے کوشش کی۔ اس نے مجھ سے رابطہ کیا۔ وہ اچھے خاندان سے تھا اس لیے کسی اچھی فیملی میں شادی کرنا چاہتا تھا۔“

”تو کیا اس کے گھر والے راضی ہو گئے بعد میں؟“

”کہاں اگر انہوں نے راضی ہونا ہوتا تو پہلے ہی شادی نہ کر دیتے۔ انہوں نے تو شادی کے موقع پر بھی ہنگامہ کرنے کی کوشش کی تھی، مگر اللہ نے عزت رکھی۔ زارا کے شوہر نے اپنے کچھ دوستوں کی فیملیز کی مدد حاصل کی تھی۔ شادی کر کے وہ زارا کو ان میں سے ایک کے ہاں لے گیا اور وہ ایک مہینہ وہیں رہی پھر اس کا ویزا آ گیا اور وہ شوہر کے ساتھ چلی گئی۔“

میں آپا کو سادہ سی اور عام ذہانت رکھنے والی عورت سمجھتی تھی لیکن انہوں نے اپنی بیٹیوں کی شادی کے لیے جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ کوئی بہت ذہین عورت بھی نہیں سوچ سکتی ہے۔ پھر انہوں نے اس پر عمل بھی کر لیا اور کامیاب بھی رہیں۔ بلکہ ایسی کامیابی حاصل کی جو انہوں نے اس سے پہلے سوچی بھی نہیں تھی۔ انہوں نے نہ صرف اپنی بیٹیوں کو اپنے گھر کا کیا بلکہ بے شمار غریب بچیوں کے رشتے کرائے تھے جن کے گھر والے استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے لاچار تھے، وہ از خود اپنی بیٹیوں کو کہیں بیاہ نہیں سکتے تھے۔ آپا نے بغیر ایک پیسہ لیے ان کی بیٹیوں کی شادیاں کرائیں اور وہ سب اپنے گھروں میں آباد تھیں۔ آج کل شادی کے بعد

طلاق کا رجحان بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ لیکن آپا کی کرائی کوئی ایک شادی بھی اس طرح ناکام نہیں ہوئی کہ طلاق کی نوبت آتی۔ وہ اب اکیلی ہی رہتی ہیں۔ میں جانے کے لیے اٹھی تو انہوں نے اصرار کر کے روک لیا۔ کھانا تیار تھا انہوں نے کھانا لگایا۔

”آپا آپ اکیلے رہ لیتی ہیں، کہاں وہ بھراپرا گھر اور کہاں اب آپ ہی ہیں یہاں؟“

”ہاں عمیرہ۔“ انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”اللہ بخشتے تمہارے منزل بھائی بھی ہمت ہار گئے۔ لیکن کیا کرتے بیماری کے باوجود کتنا ساتھ دیا میرا، اب تو عادت ہو گئی ہے۔ ویسے بچیاں آتی رہتی ہیں، انہوں نے ڈیوٹی لگائی ہوئی ہے ہر روز ہی کوئی شام کو آ جاتی ہے اور چند گھنٹے کے لیے یہاں رونق آ جاتی ہے۔ ہر چھٹی کے دن میں کسی بیٹی کے گھر جاتی ہوں اور سارا دن وہیں رہتی ہوں۔ اتوار کا دن تو بہت اچھا گزرتا ہے۔ عام دنوں میں بھی صبح سے شام تک میرج بیورو کی مصروفیت ہوتی ہے۔ پھر شام کو کوئی آ جاتا ہے۔ اکیلے رہنے کا موقع کم ملتا ہے۔“

آپا حوصلے سے کہہ رہی تھیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ صبر سے کام لیتی ہیں۔ اس عمر میں اس طرح اکیلے سب دیکھنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔ ”آپ کسی بیٹی کو ساتھ کیوں نہیں رکھ لیتی ہیں؟“

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بغیر کسی مجبوری کے شادی شدہ بیٹی کو ساتھ رکھنا درست نہیں ہے۔ اس سے بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اللہ نے صحت اور ہاتھ پاؤں دیے ہوئے ہیں۔ میری تو دعا ہے کہ بس چلتے پھرتے اٹھالے۔“

”آپا آپ کی سات بیٹیاں ہیں لیکن یوں سمجھ لیں آپ کی آٹھ بیٹیاں ہیں میرا گھر یہاں سے پاس ہے آپ کا جب دل چاہے میرے پاس آ جایا کریں اور میں بھی آیا کروں گی۔“

آپا خوش ہو گئیں۔ ان کے گھر سے آتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ جو لوگ اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں اور حالات کے سامنے سپر نہیں ڈالتے ہیں اللہ بالآخر ان کے لیے راستے نکال دیتا ہے۔ آج آپا کی تمام بچیاں اپنے گھر میں آباد ہیں اور وہ خود کسی کے سہارے کے بغیر زندگی عزت اور وقار سے گزار رہی ہیں۔ مجھے خیال آیا اور میں نے آپا کی اجازت سے ان کی یہ سچ بیانی لکھ کر آپ کی نذر کی ہے۔

!